ندیم کی نظمیں

ندیم کی نظمیں

جلد اوّل

احمد ندیم قاسمی

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

۱۹۹۱ء —

پبلشرز — نیاز احمد

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

تعداد : ایک ہزار

قیمت ۳۵۰/۰۰ روپے

کمبائن پرنٹرز - لاہور

اپنی پیاری بیٹی

منصُورہ احمد

کے نام

جو میرا فخر بھی ہے

اور

اردو نظم کی روشنی بھی

لوحِ خاک

آیندہ صدی کا اِنسان

(جوہری جنگ کے خوفناک امکان کے تناظر میں)

مری صدا پر گرفتِ شب ہے

مَیں پوری شدّت سے چیخ کر بھی

سُنائی دیتا نہیں کسی کو

مری بصارت کو تیرگی جذب کر رہی ہے

کہ ہر طرف دیکھنے کی خواہش میں

مَیں نے آنکھوں کی پُتلیاں توڑ پھوڑ دی ہیں

مری سماعت سکوت کی ایک گونج ہے

اور مرا دماغ ایک کوششِ رائیگاں ہے ریشم کے اُلجھے
گُچھّے کو کھولنے کی،

کہ مَیں نے اکیسویں صدی کو
ضمیر کے آئینے میں دیکھا ہے
اور انسان کو
کچھ ایسا نڈھال پایا ہے
جیسے سرسبز پیڑ کی شاخ
تیز جھونکوں کی زد میں آکر
لٹک پڑی ہو!

مارچ ۱۹۸۷ء

نمائش گاہ

میں ایک عجیب و غریب نمائش گاہ سے ہو کر آیا ہوں

یہ کٹے سروں، بے نور آنکھوں کی نمائش ہے

یہ آنکھیں کتنی سفاکی سے میرے اندر جھانکتی ہیں

جس سمت بھی جاؤں
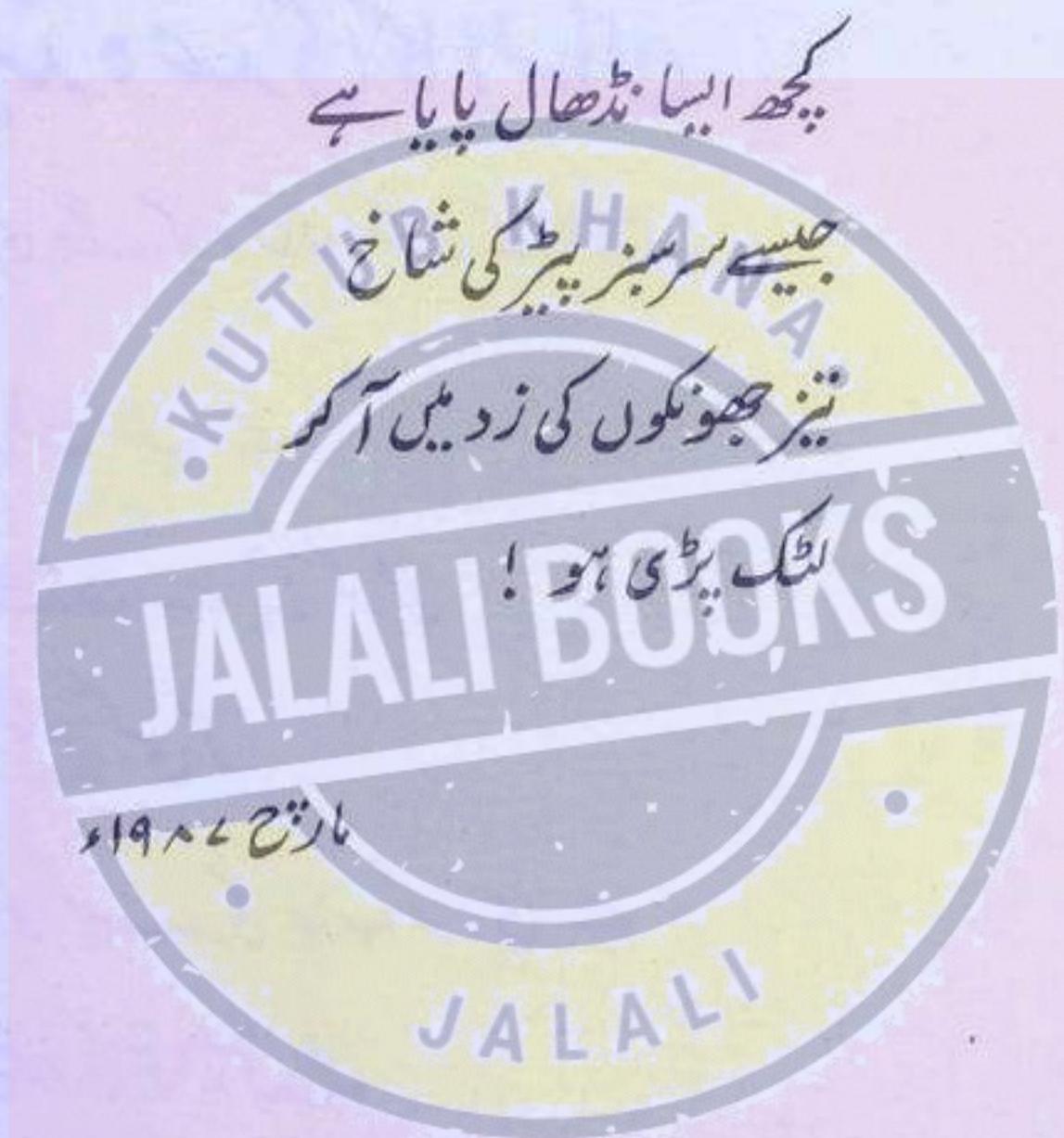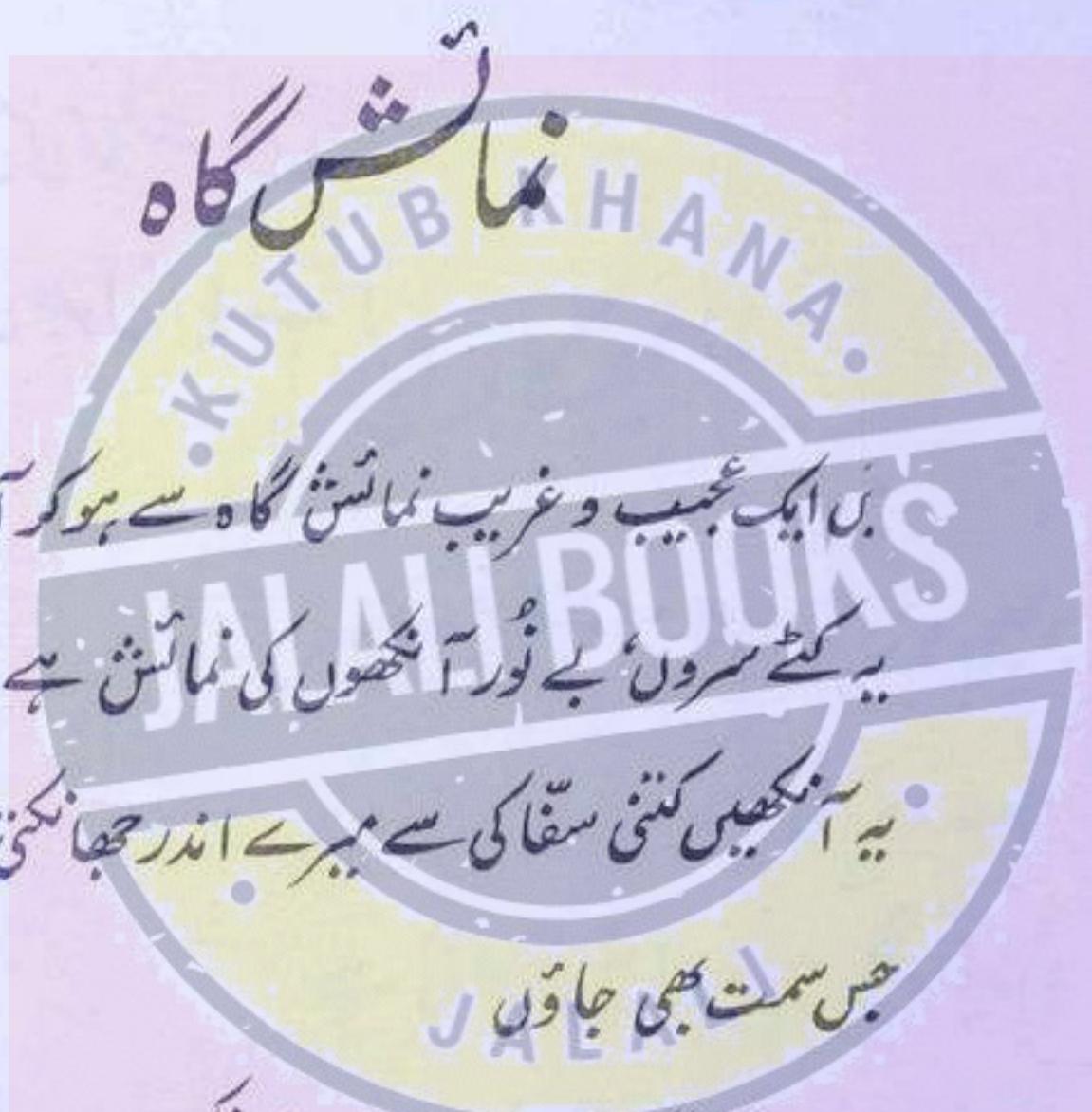
میرے تعاقب میں ہیں یہ ظالم آنکھیں

(وہ لوگ جنھوں نے سر کاٹے، کیوں آنکھیں کاٹنا بھول گئے)

ان سب کے پپوٹے ساکت ہیں

اور پتلیاں جیسے کسی کو مرتا دیکھ رہی ہیں

(مرے ہوئے، ہر چیز کو مرتا دیکھتے ہیں)

مَیں ابھی ابھی اس کٹے سروں کی نمائش گاہ سے نِکلا ہُوں

رہگیر مگر میری جانب کِتنی حیرت سے دیکھتے ہیں

پھر آنکھیں پھاڑے، آپس میں سرگوشیاں کرتے ہیں

اور کہتے ہیں :

یہ شخص سروں کی نمائش میں

اپنا سر ہی بھول آیا ہے !

فروری ۱۹۸۷ء

بھکارن

ابھی لوگ پوری طرح جاگتے بھی نہیں
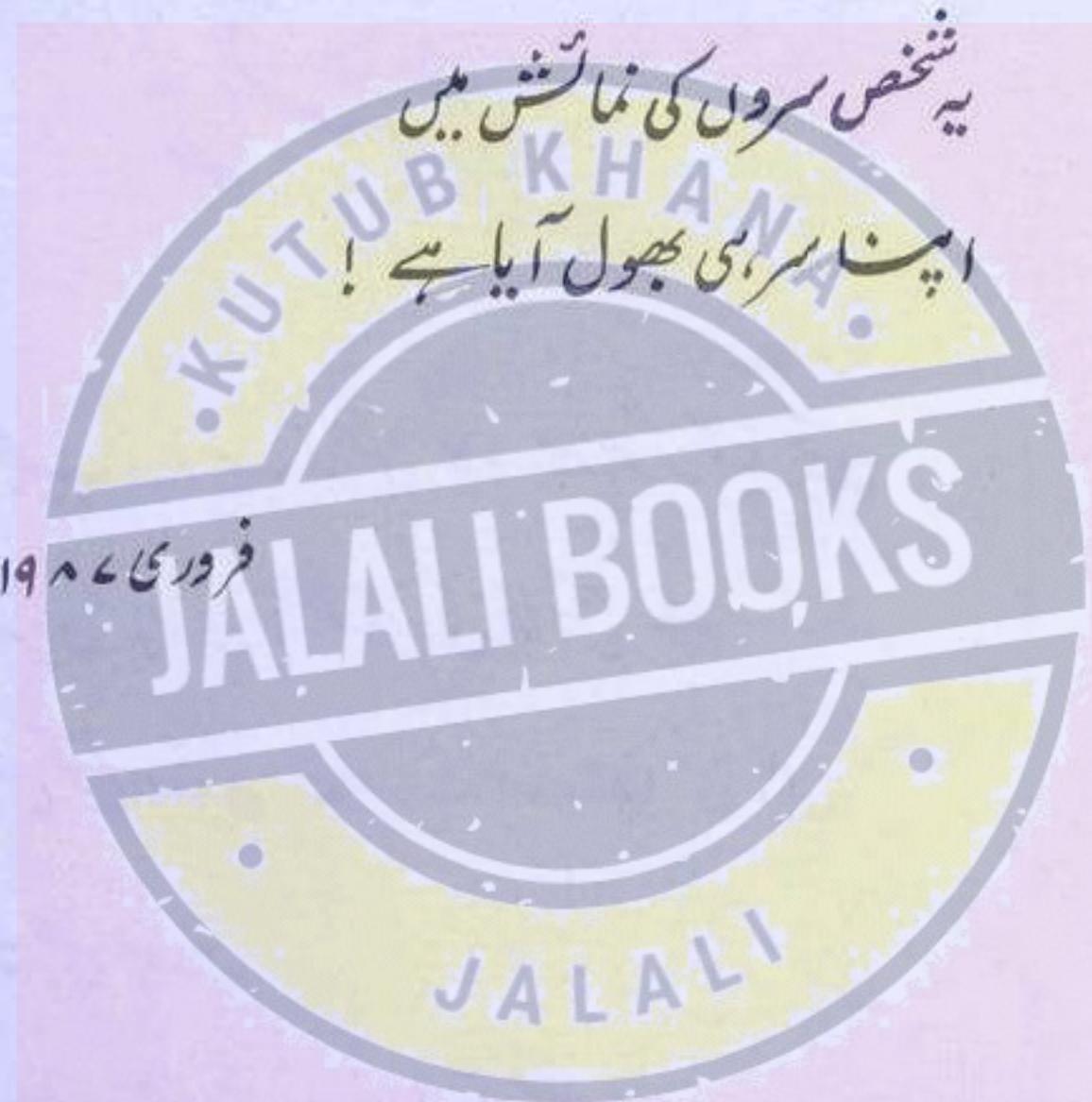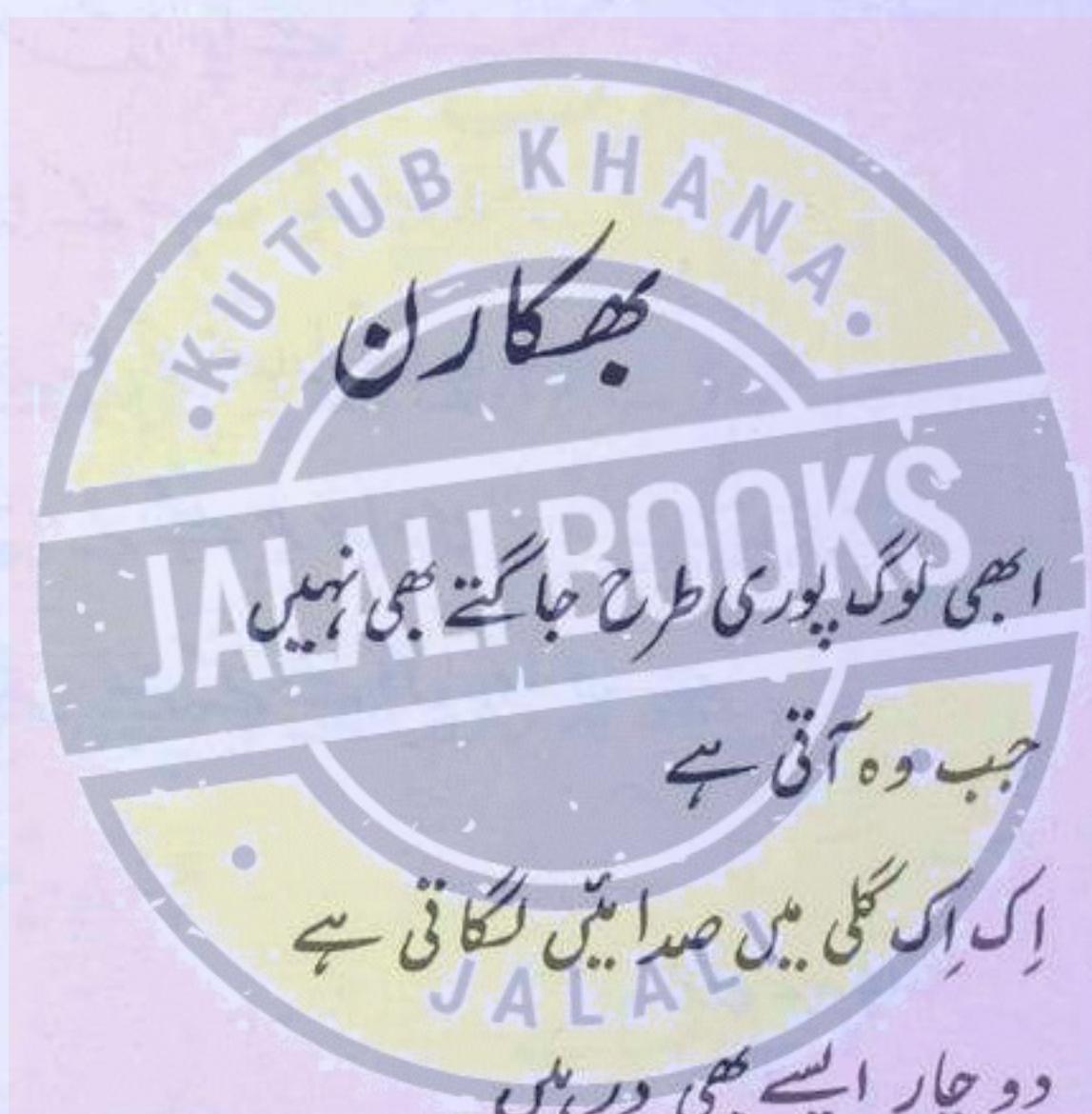
جب وہ آتی ہے

اِک اِک گلی میں صدائیں لگاتی ہے

دو چار ایسے بھی در ہیں

جنھیں کھٹکھٹاتی ہے

پھر جیسے دن کے سمندر میں غوطہ لگاتی ہے

اور ڈُوب جاتی ہے!

لیکن ابھی صُبح پُوری طرح سے چٹکتی نہیں

جب وہ جیسے زمیں سے اُگ آتی ہے

پھر سے صدائیں لگاتی ہے

ہر بار صرف اِتنا کہتی ہے :

مجھ کو خدا چاہیے

اے خدا کے بہت نیک بندو !

فقط ایک پل کو تمھارا خدا چاہیے

اُس خدا نے مجھے جو حیا دی

اُسے ڈھانپنے کے لیے اک ردا چاہیے

جون ۱۹۸۷ء

ضربِ مسلسل

جب کلہاڑے کی چوٹ تنے پر پڑتی ہے

تو سارا درخت

جڑوں سے لے کر دُور فلک کو چھُوتی ہُوئی

پھننگوں تک

کانپ اُٹھتا ہے
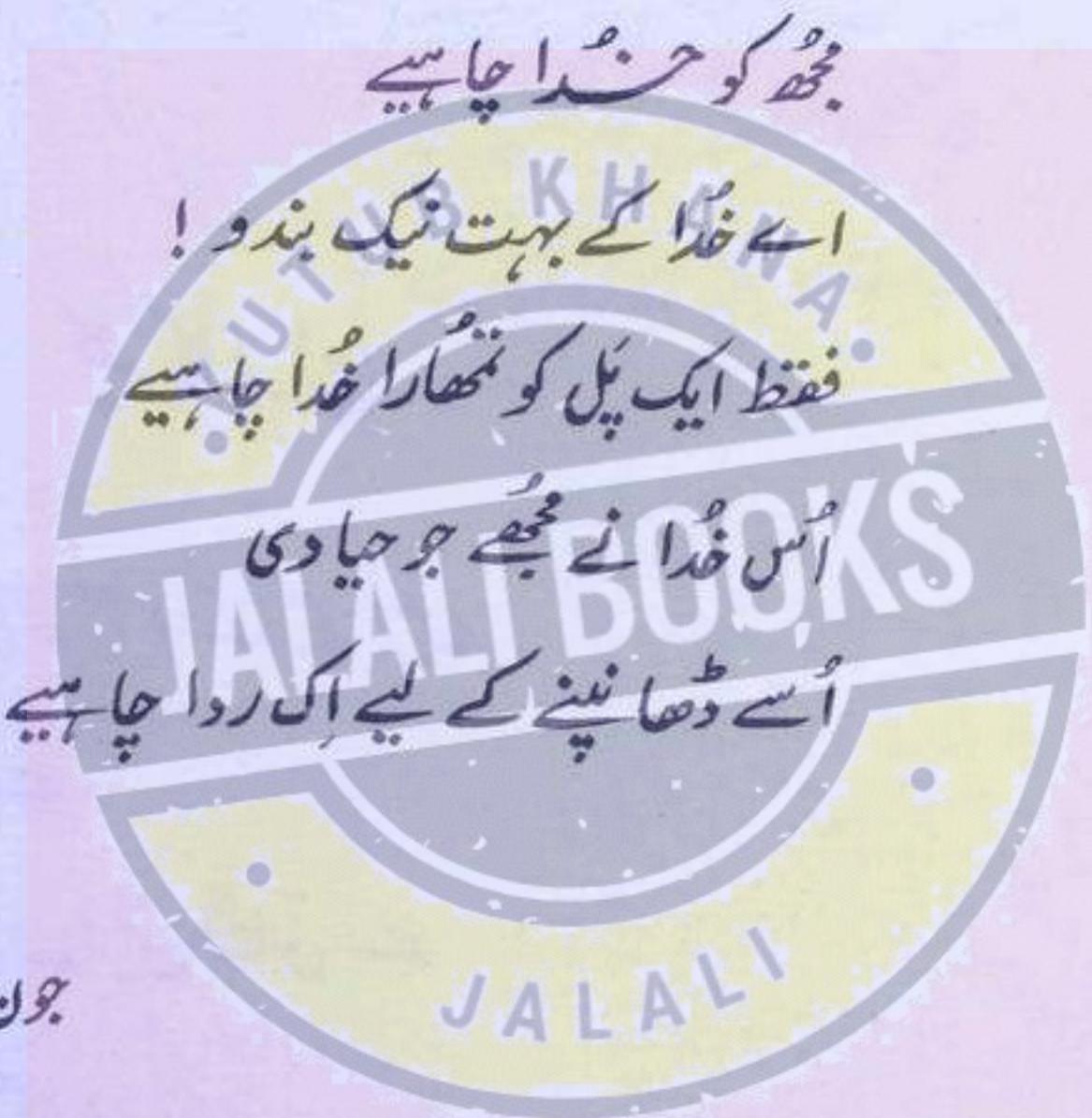
ایک اِک ٹہنی

ایک اِک پتّا

ہر چوٹ کے ساتھ لرزتا ہے

اور کلہاڑے کی ضرب

بڑے سفّاک تواتر سے

گُونج اُٹھتی ہے

یہ کافر ضرب

زمیں کا، اور زمیں پر بسنے والوں کا

دلدوز مقدّر ہے

اور میں بھی

سبز درختوں اور حسین انسانوں سے آباد زمیں کا

ایک ادنیٰ باشندہ ہوں !

مارچ ۱۹۸۷ء

یقیں نہیں آتا

(ایک دوست کا نوحہ)

اپنے دوست کی موت کا مجھے یقیں نہیں آتا
انسان جب سے پیدا ہُوا ہے، زندہ ہے،
اور زندہ رہے گا
وہ جو برسوں پہلے ایک انسان ادھر سے گزرا تھا
وہ میرا دوست تھا
جو اَب برسوں بعد اِدھر سے کچھ یُوں گزُرے گا
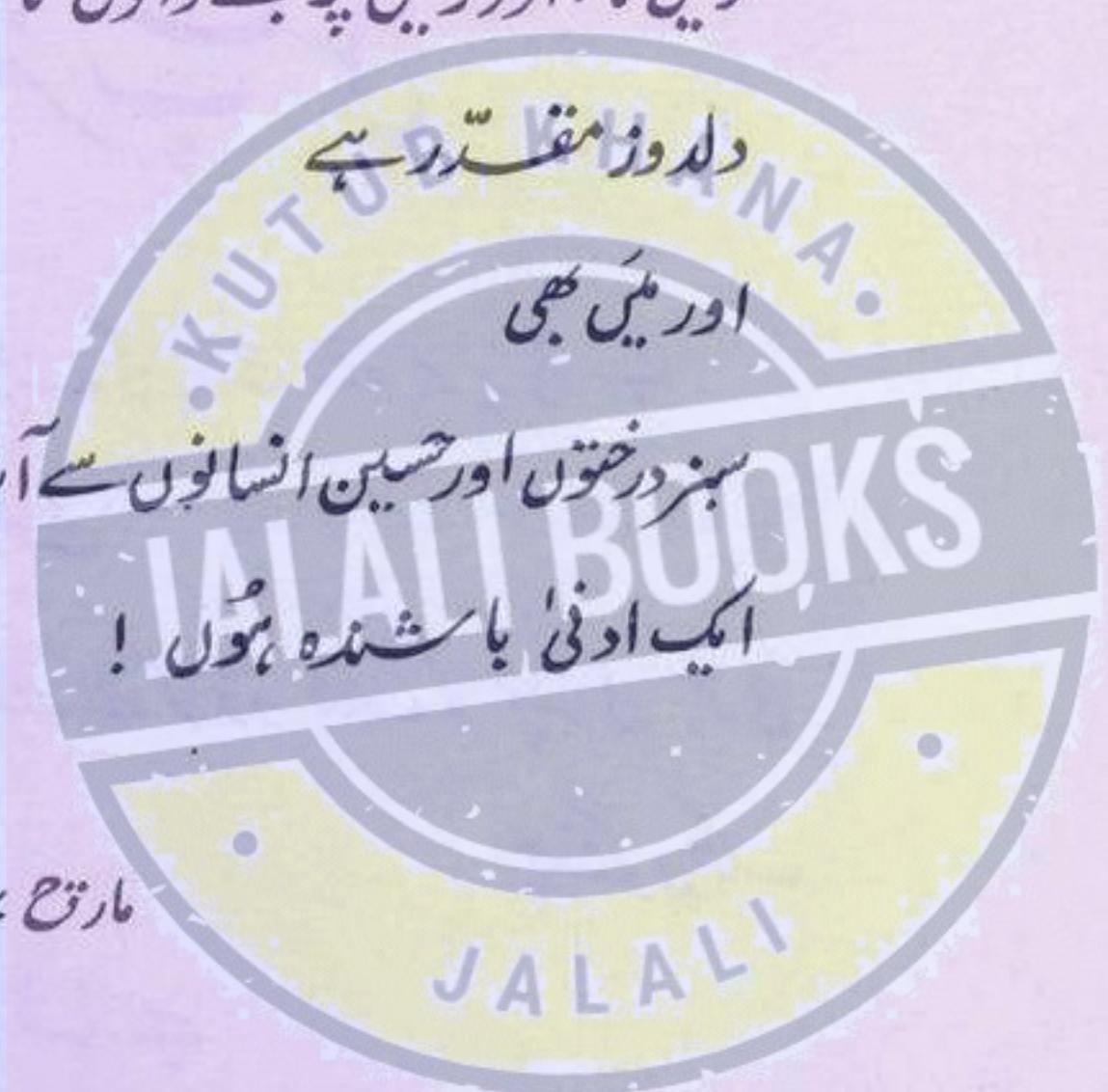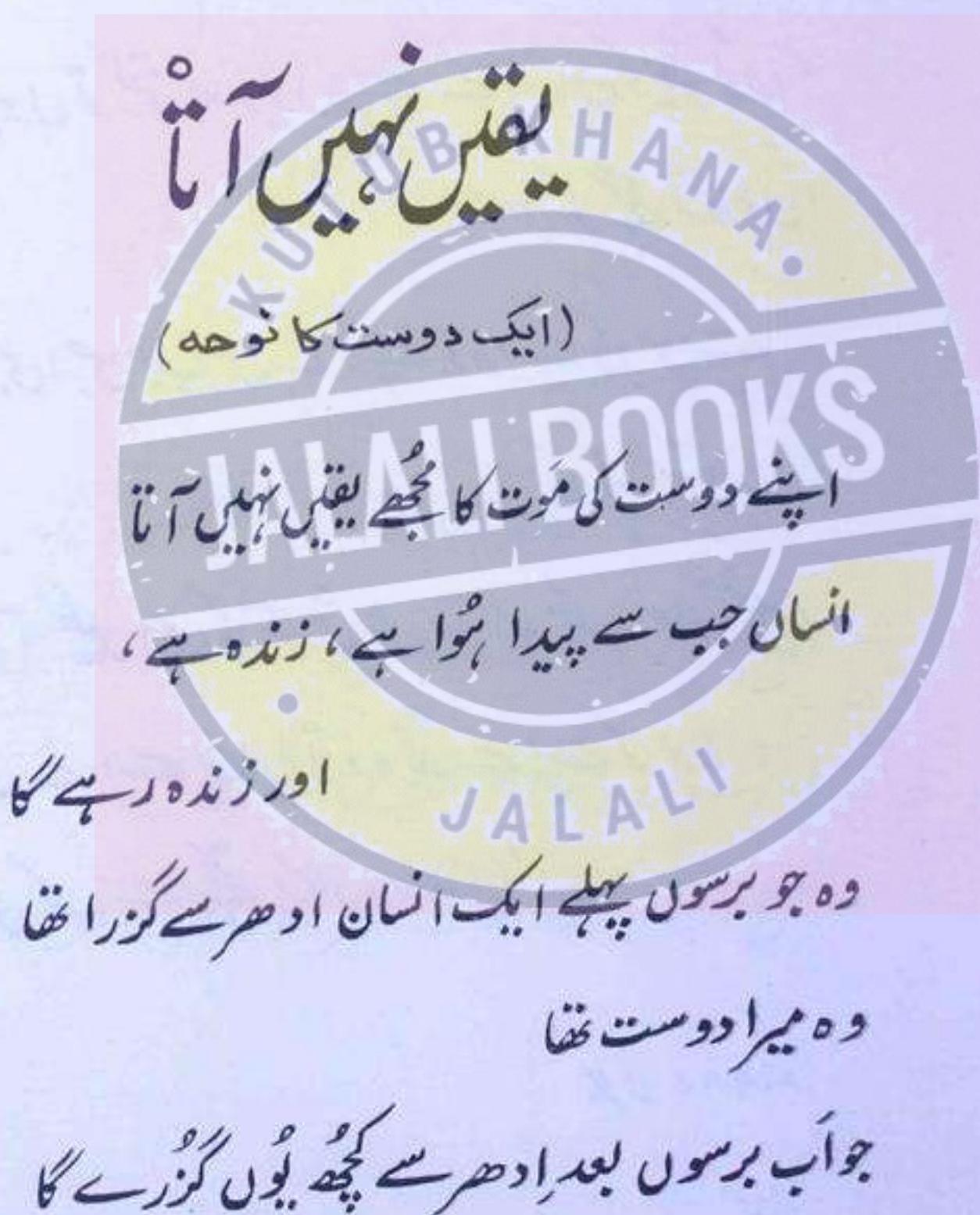
○ خان حمید اللہ خان نیازی، کلّہ خیل — جن کے نام میں نے اپنے قطعات کا مجموعہ "رم جھم" منسوب کیا تھا — ندیمؔ

جیسے وہ پہلی بار اِدھر سے گزُرا ہے

انسان تو ایک تسلسل ہے

وہ اپنے ماضی، اپنے حال اور اپنے مُستقبل میں

نسلوں اور زمانوں میں بٹ کر بھی زندہ رہتا ہے

میَں چاہُوں تو کتنی صدیوں پہلے کے انسان کو چھُو لُوں،

اس کو گلے لگا لوں،

جیسے ابھی ابھی جب میَں نے اپنے دوست کی موت

کی خبر سُنی،

تو میری آنکھیں اس کی تلاش میں حدِّ ابد تک جا پہنچیں

پھر میَں نے اسے پکارا تو وہ مجھ سے لپٹ کر بولا :

'میَں بھی کب سے تجھے پکار رہا تھا!'

جون ۱۹۸۷ء

بھنور

عجب بھنور ہے

کیسی کیسی شکلیں اس میں بنتی اور سنورتی ہیں

اور پھر اِک دائرے کے محرابی دروازے سے نِکل کر

سارے دریا کو آغوش میں لے لیتی ہیں

سطحِ آب پہ جیتے جاگتے شہر آباد نظر آتے ہیں!
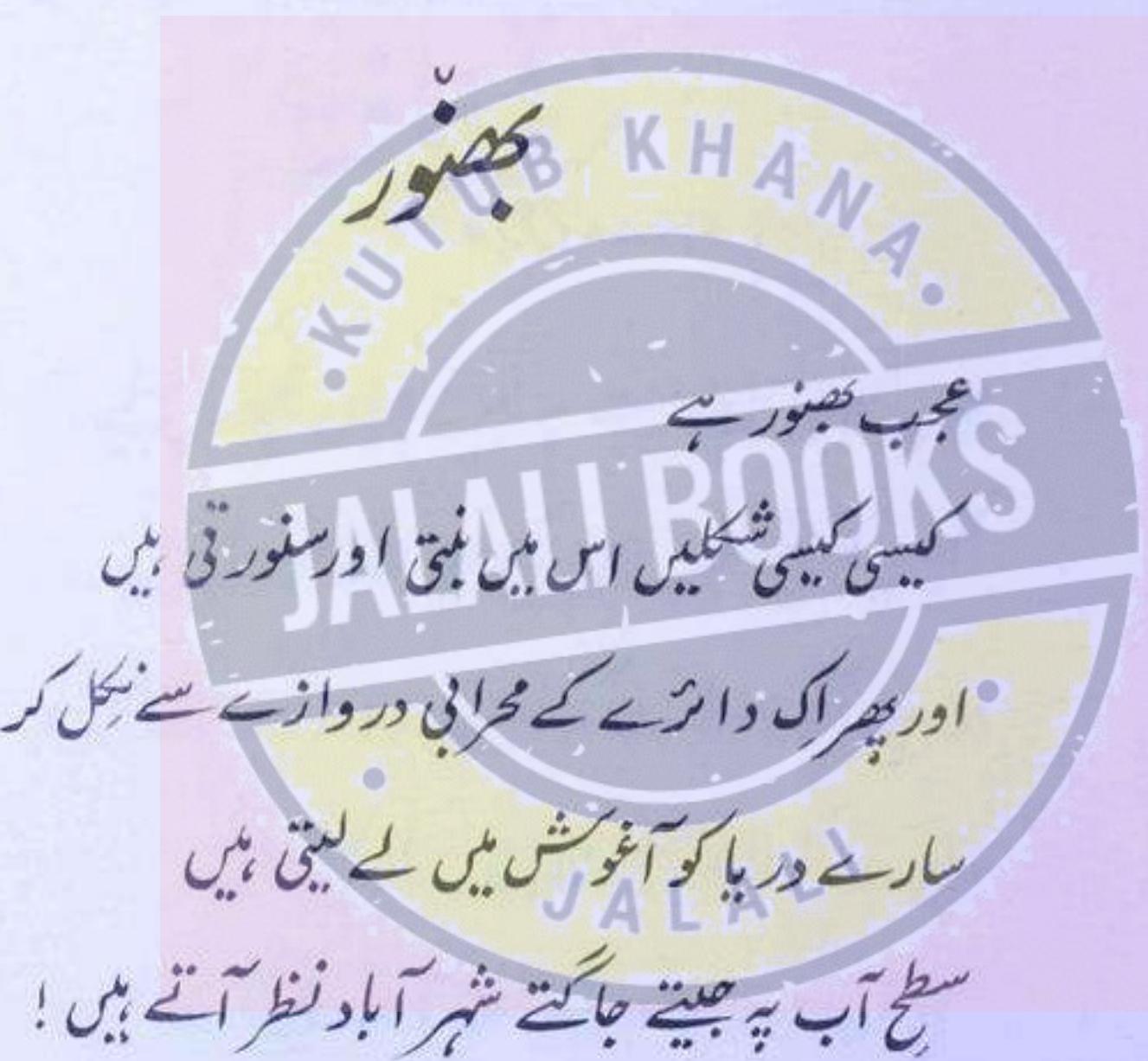
عجب بھنور ہے

لمحہ بہ لمحہ حلقہ بہ حلقہ پھیلے جاتا ہے

اور گھومے جاتا ہے

جس طرح کسی نے
گُوندھی مٹی چاک پہ رکھ کر
اِک اُنگلی یا اِک تنکے سے
تاریخ تخلیق مصوّر کو دی ہو!

مارچ ۱۹۸۷ء

ترقّی یافتہ

ساحلِ زیست پہ ہم سیپیاں چُننے پہنچے
جھولیاں بھر کے جو پلٹے
تو صدا آئی
کہ ان سیپیوں میں
وہ جو موتی سے نظر آتے ہیں
جرثومے ہیں
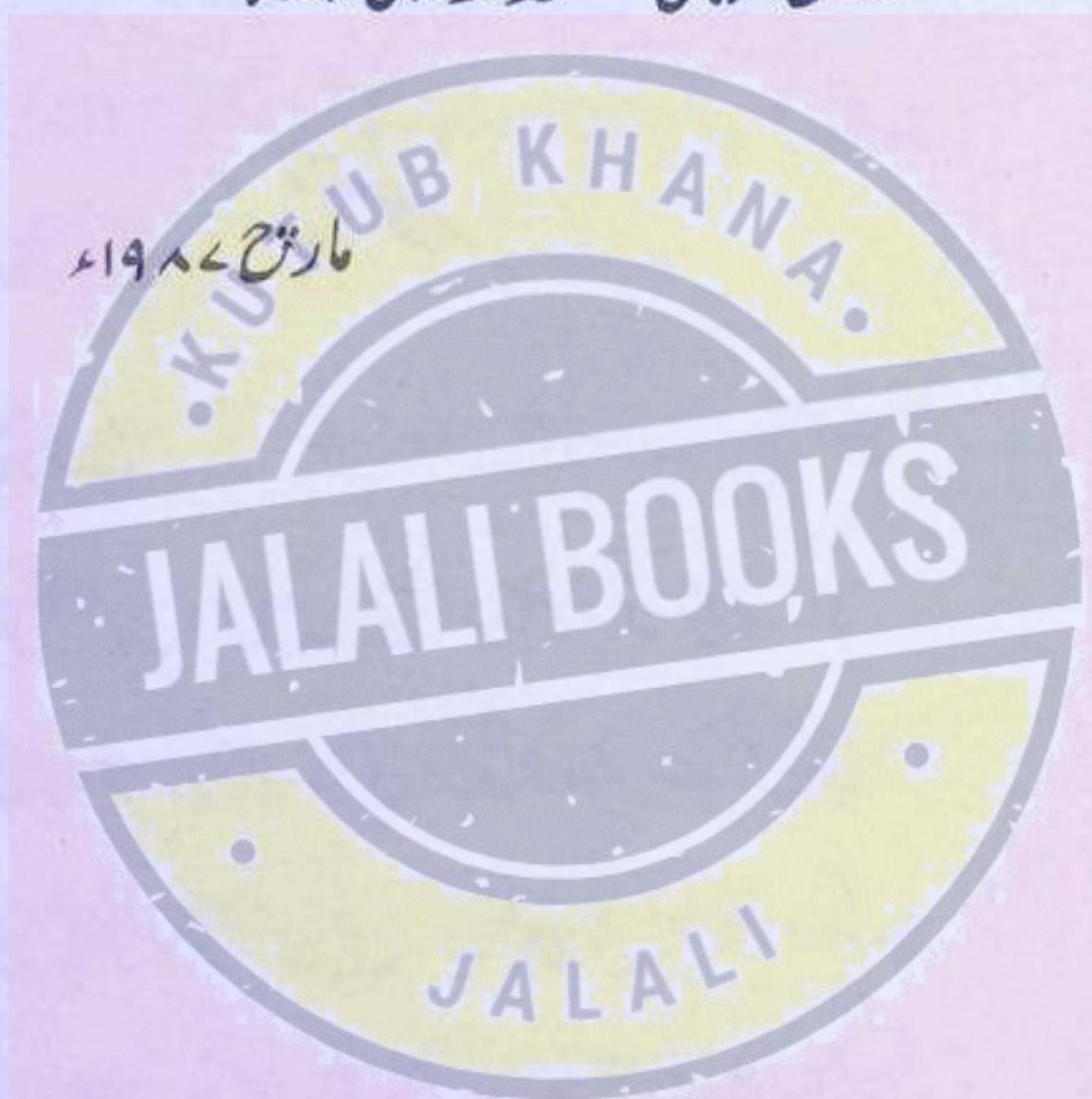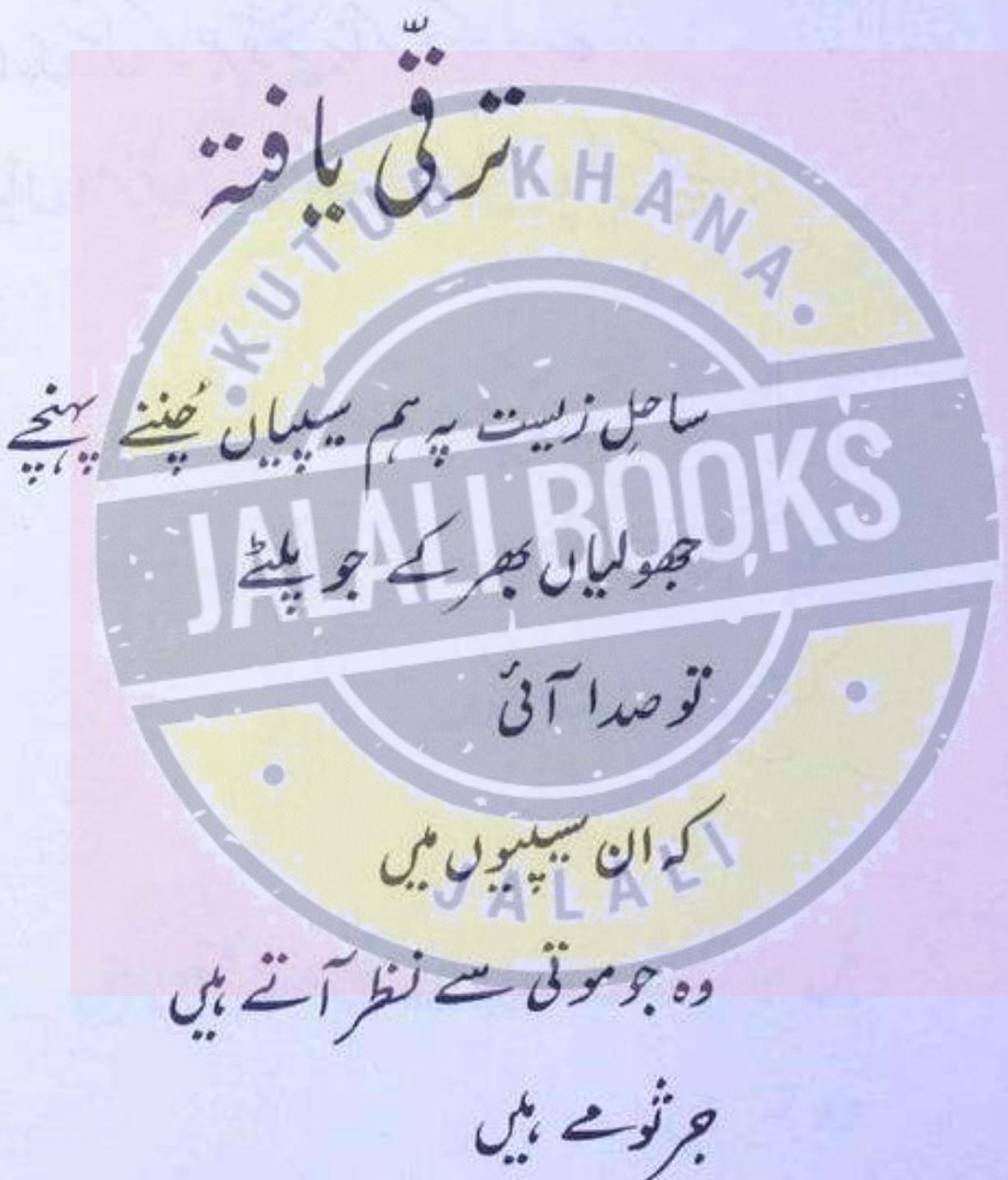
تم نے جب زیرِ زمیں جوہرِ ذرّہ توڑا ـــــ
تو اسی اثنا میں

موتی بننے کے لیے سیپیوں میں جتنے بھی قطرے اُترے
وہ چمکتے ہوئے جرثومے بنے
کہ جب انساں کا دماغ
اپنی ہی نسل کو جرثومہ بنا کر رکھ دے
سیپیاں، موتیوں کے نُور کا ناموس بچائیں کیسے!

ستمبر ۱۹۸۶ء

لذّتِ آگہی

مَیں عجیب لذتِ آگہی سے دوچار ہُوں
یہی آگہی مرا لطف ہے، مرا کرب ہے
کہ مَیں جانتا ہُوں
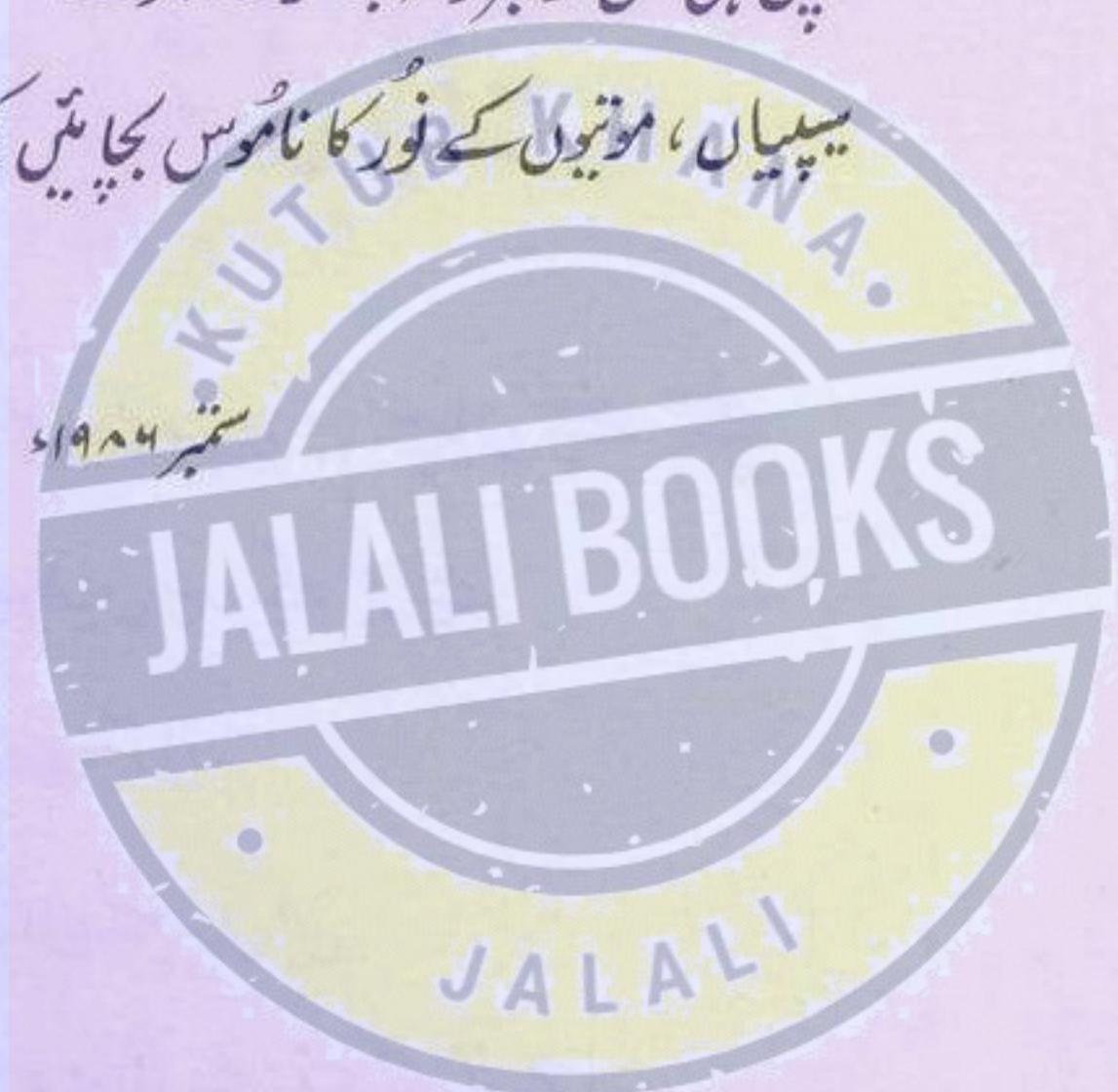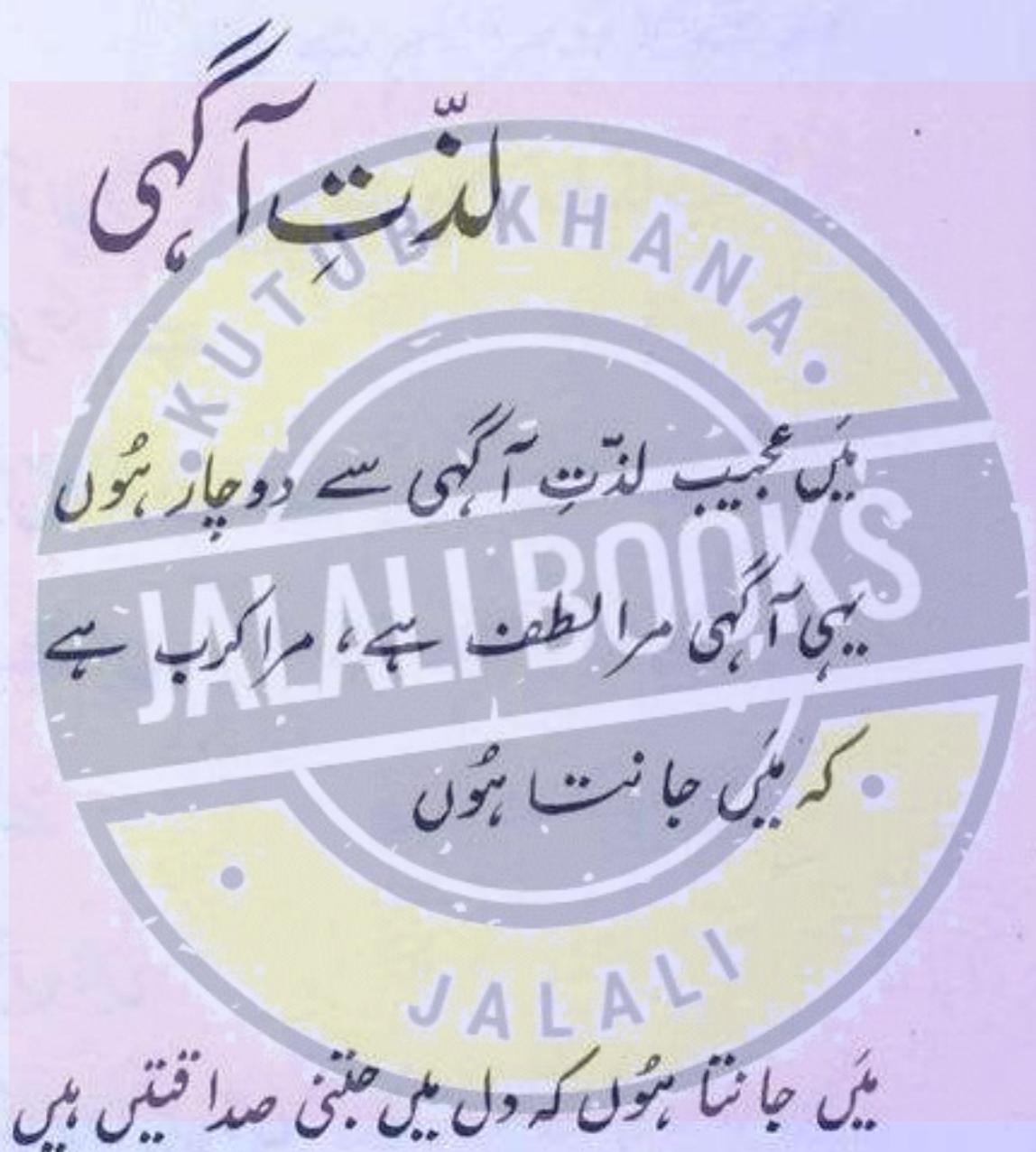
مَیں جانتا ہُوں کہ دل میں جتنی صداقتیں ہیں
وہ تیر ہیں
جو چلیں تو نغمہ سُنائی دے
جو ہدف پہ جا کے لگیں تو کچھ بھی نہ بچ سکے
کہ صداقتوں کی نفی ہماری حیات ہے!

مرے دل میں ایسی حقیقتوں نے پناہ لی ہے

کہ جن پہ ایک نگاہ ڈالنا

سُورجوں کو بطونِ جاں میں اُتارنا ہے!

میَں جانتا ہُوں

کہ حاکموں کا جو حکم ہے

وہ دراصل عدل کا خوف ہے

وہ سزائیں دیتے ہیں

اور نہیں جانتے

کہ جتنی سزائیں ہیں

وہ ستم گری کی روائیں ہیں
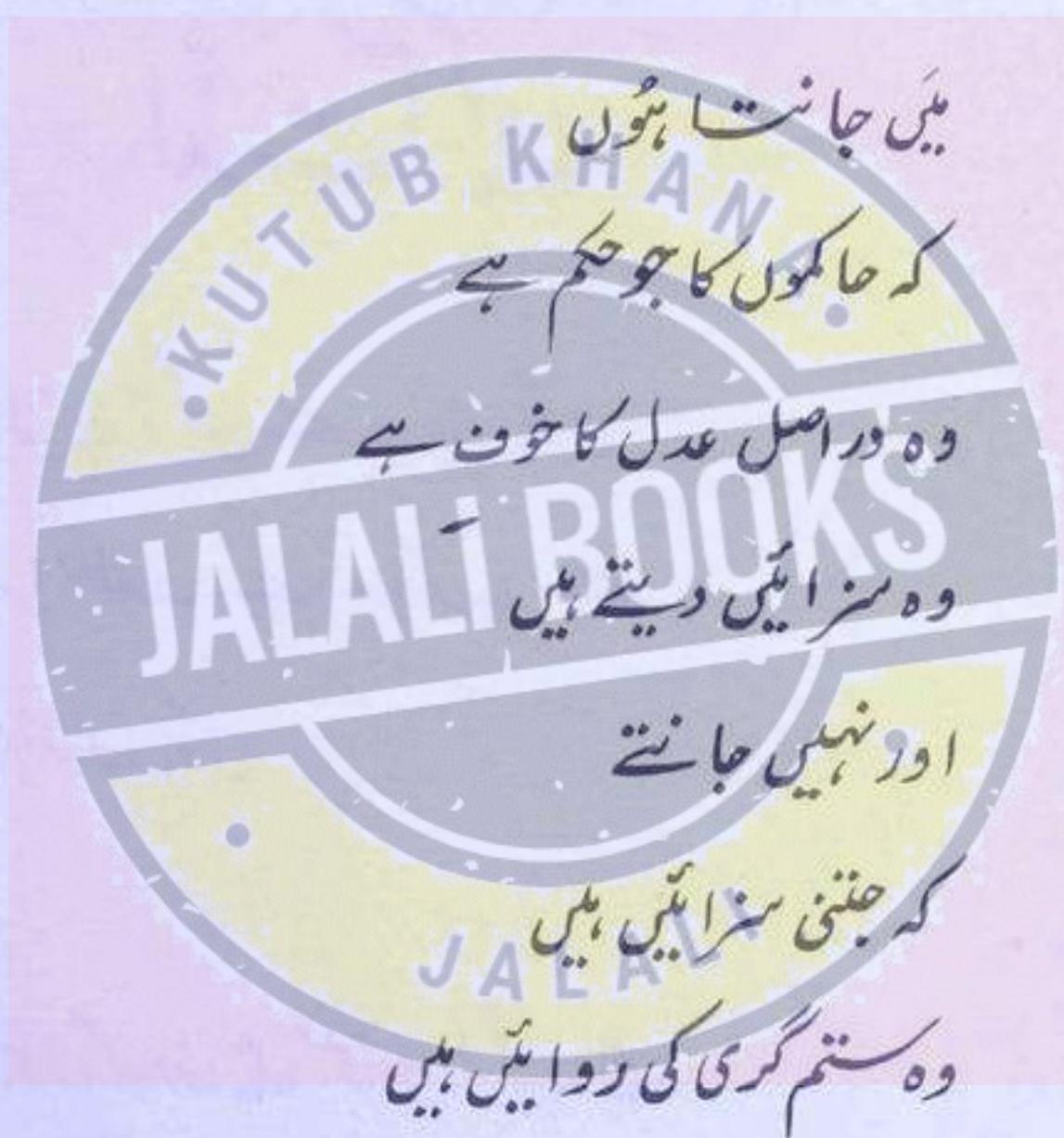
مجھے علم ہے

یہی علم میرا سرور ہے

یہی علم میرا عذاب ہے

یہی علم میرا نشہ ہے
اور مجھے علم ہے
کہ جو زہر ہے
وہ نشے کا دُوسرا نام ہے!
میں عجیب لذّت آگہی سے دوچار ہوں!!

جون ۱۹۸۶ء

آثارِ قدیمہ

معیاروں کے میناروں کی بنیادوں کو

شور زمیں نے چاٹ لیا ہے

اب تو صرف اک جنبش سے

صرف ایک ذرا سے جھٹکے سے

تہذیبوں کو

پیوندِ زمیں ہو جانا ہے
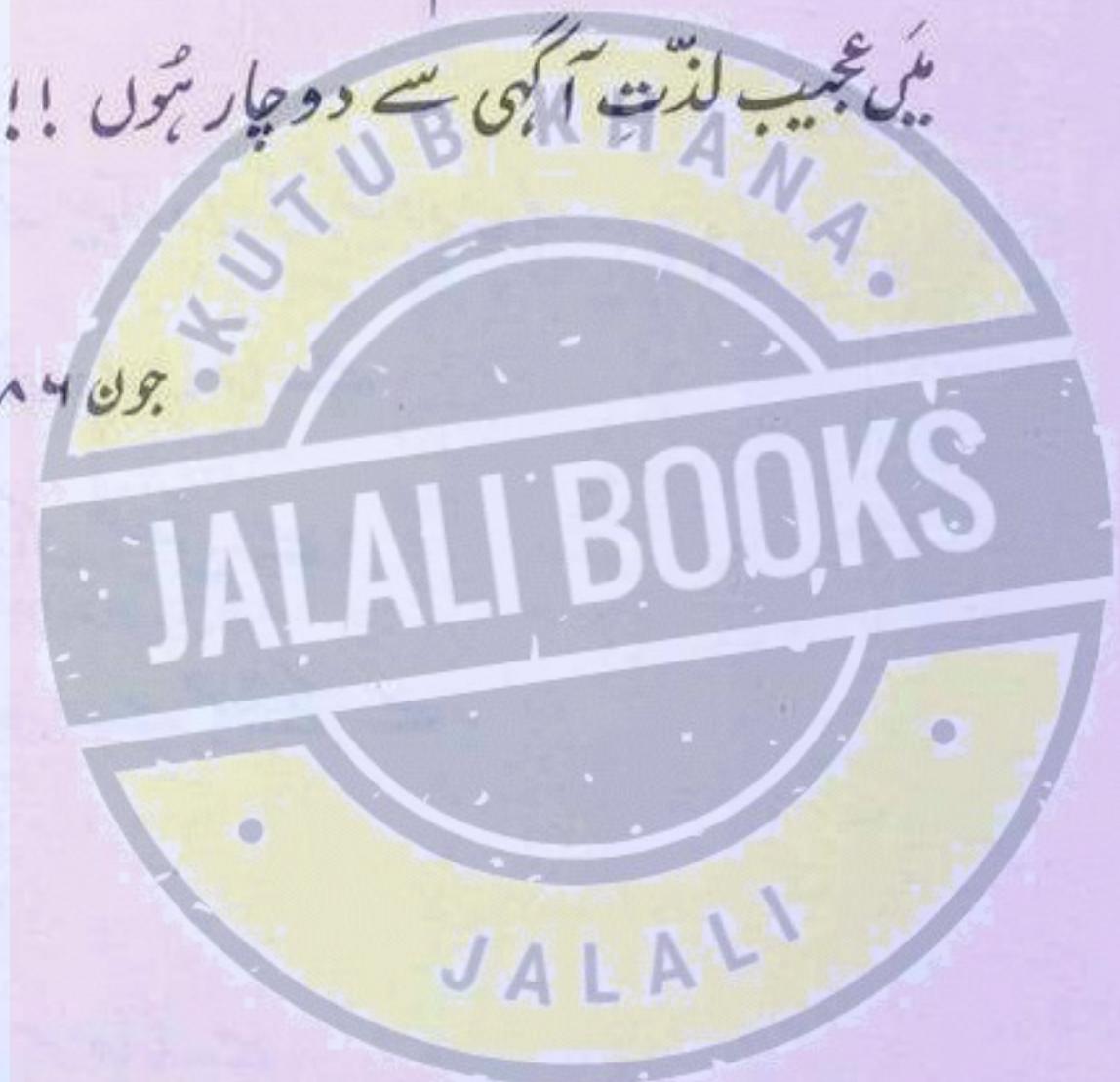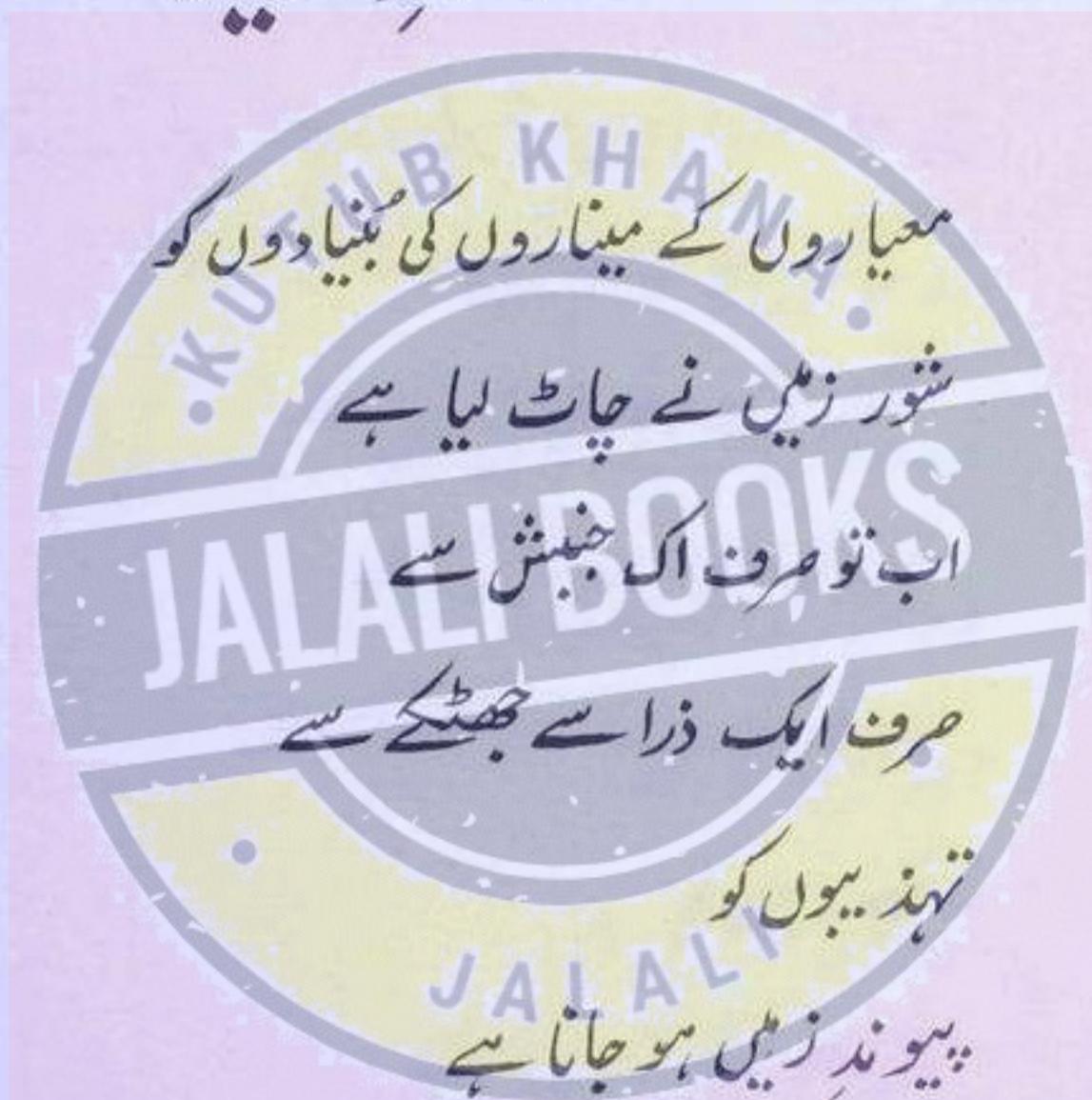
پھر صدیوں بعد

ان کے آثار کا کھوج ملے گا

اور ہمارے صدیوں بعد کے بچے

ان کی اک اِک خشت پہ

تاریخوں کے صحیفے رقم کریں گے

اور کہیں گے :

آج سے کتنی صدیاں پہلے

کاغذ کے میناروں پر بلّور کی چھتیں سجا کر

لوگ سمجھتے تھے

تعمیر کا فن معراج پہ جا پہنچا ہے !

فروری ۱۹۸۶ء
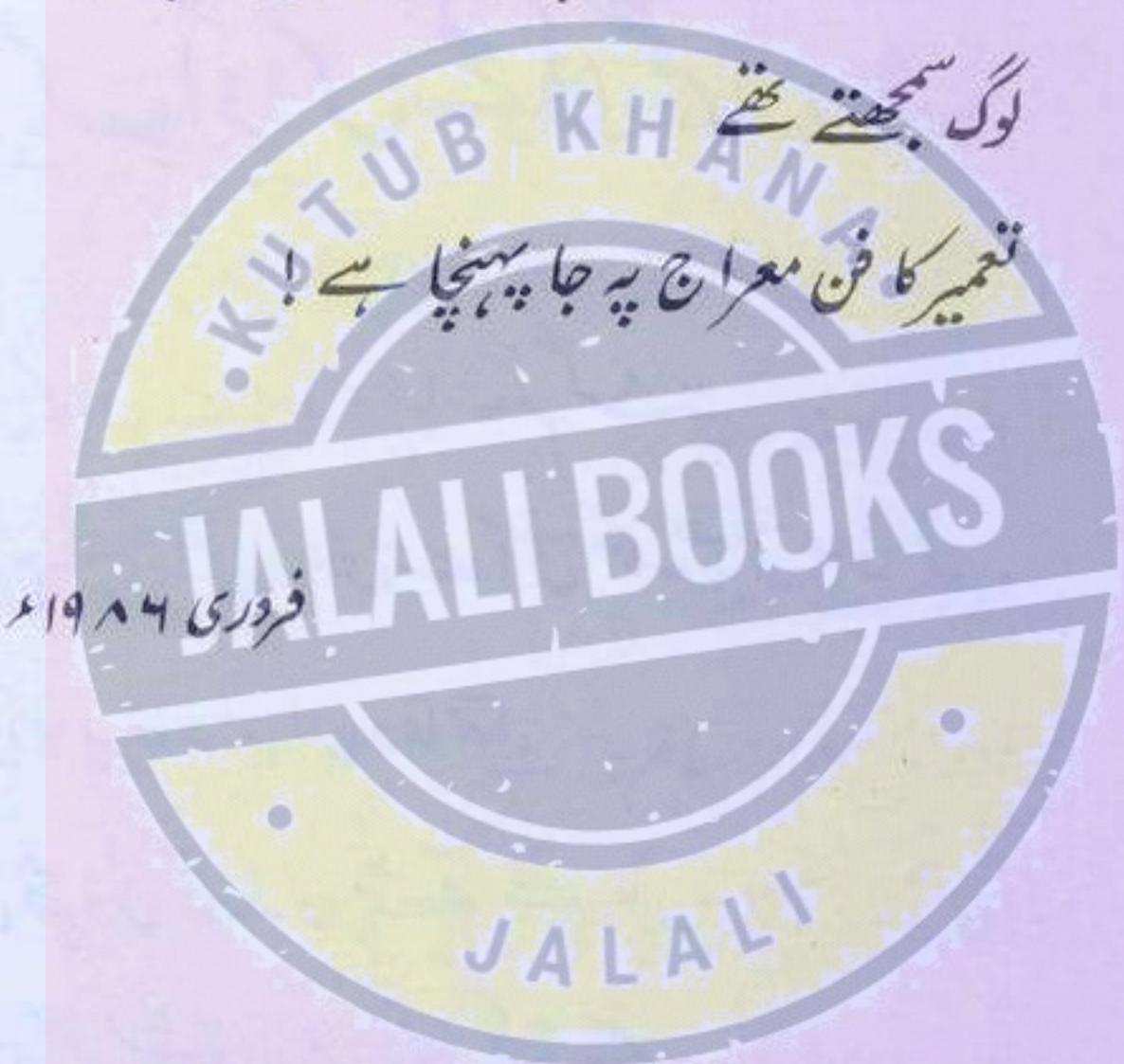
ایک اُداس لمحے کی نظم

اب لاؤں کہاں سے بساطِ حیاتِ گم گشتہ

وہ بساط جو بچھتی تھی تو افق سے اُفق تک پھیلتی جاتی تھی

اور اس کا ہر خانہ میدانِ وغا تھا

جس میں مُہروں کے رَن پڑتے تھے

اور کشتوں کے پشتوں پر پشتے لگتے تھے

وہ فرصتِ عشق کہاں سے لاؤں

جس نے کُل آفاق کے چاروں گوشوں کو آپس میں ملا کر

گرہ لگا دی تھی

اور پورے نظامِ کون و مکاں کو
گیند بنا کے اُچھال دیا تھا

اب وہ یقیں، وہ صلابت کہاں سے لاؤں
جس کے دَم سے ہر پَل دائمی لگتا تھا

ہر شے با معنی ہوتی تھی

اب دُھند ہے
اور سنّاٹا ہے
اور نا معلوم مسافت ہے
اور دُور آفاق پہ لکھی ہُوئی
اِک بے مفہوم عبارت ہے

جنوری ۱۹۸۶ء

میرے روز و شب

بس اب تو یہ روز و شب ہیں میرے
کہ صُبح سے شام تک خُود اپنا لہو جلاتا ہوں

اس بہانے
خُود اپنی ہی آگ تاپتا ہوں
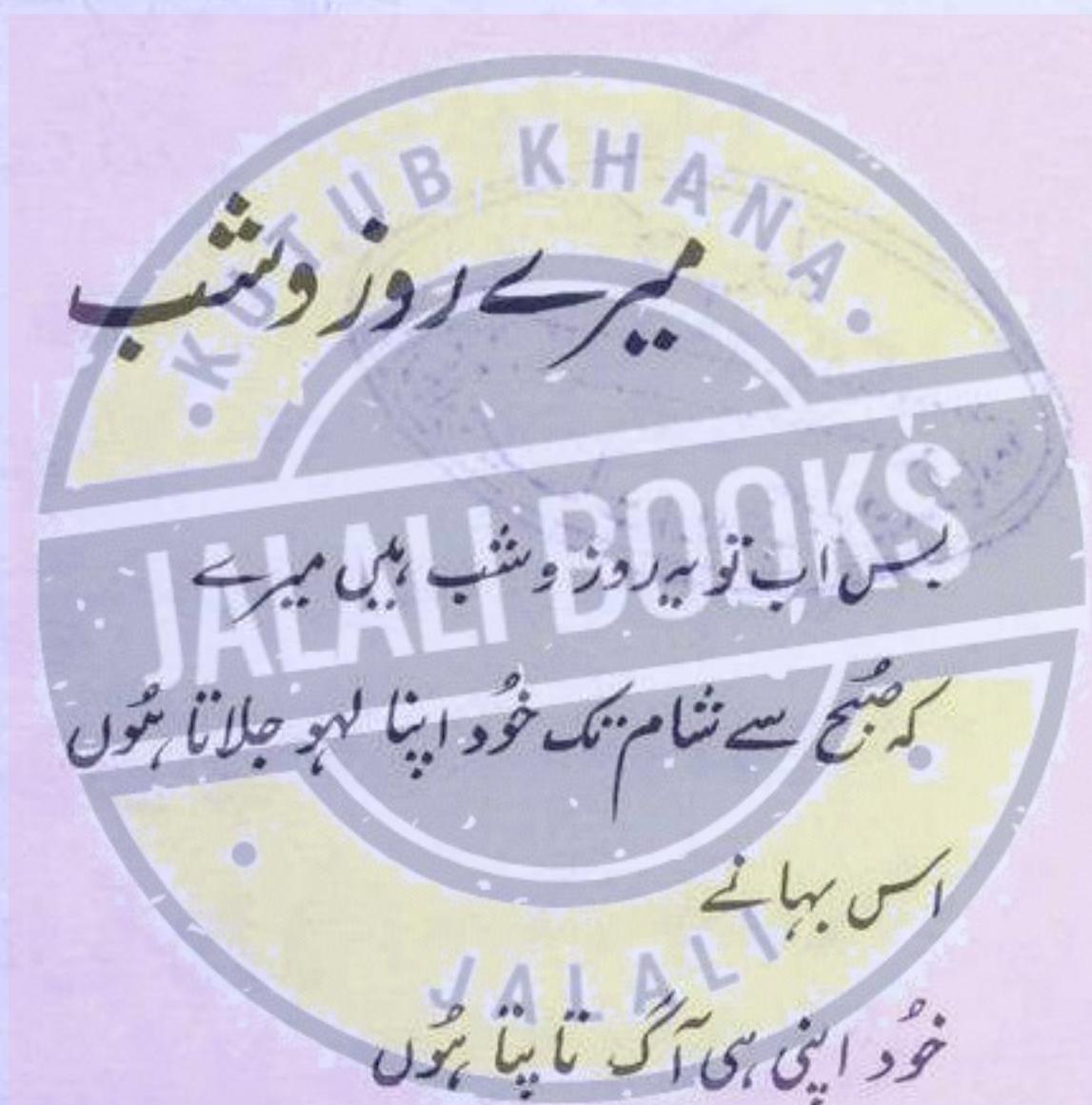
کبھی اگر عدل کے کلیجے میں خنجر اُترے —
کبھی اگر بولتے ہُوئے ہونٹ، سِل کے رہ جائیں —
اور آنکھوں کی سیپیوں سے

جھٹک لیے جائیں

اَن گنت پتلیوں کے موتی ـــــ

خدا اگر آدمی سے اک بار اور رُوٹھے

تو میرے اندر لہو کے شعلے بلند ہوتے ہیں

اور میں بُجھتے بُجھتے اکثر یہ سوچتا ہُوں

کہ میرے باطن میں روز و شب کوئی ذبح ہوتا ہے

ورنہ آخر کہاں سے اُبلے مرے بدن میں لہو کے چشمے

کہ آسمانوں کے عکس بھی ان کے آئنوں میں لہو لہو ہیں

اکتوبر ۱۹۸۵ء

ایک ویران دِن کے نام

رات نے دن کو روندا ہے، پامال کیا ہے
ورنہ سُورج اِتنا میلا میلا کیوں ہوتا
مٹیالا سا، پیلا سا، یرقان زدہ سا
سُورج، جس سے سیّاروں نے نُور لیا تھا
اور توانائی حاصل کی تھی
سُورج، جس نے ہر شے کو روئیدہ اور بالیدہ
کیا تھا،
سُورج، جو صدیوں پیچھے، معبُود بھی تھا

اب اِتنا لاغر لگتا ہے

جس طرح کسی مزدُور کا چہرہ

جس پہ مسلسل محنت اور مسلسل فاقوں نے

حالات کے آڑے سیدھے خاکے کاڑھ دیے ہوں!

ستمبر ۱۹۸۵ء
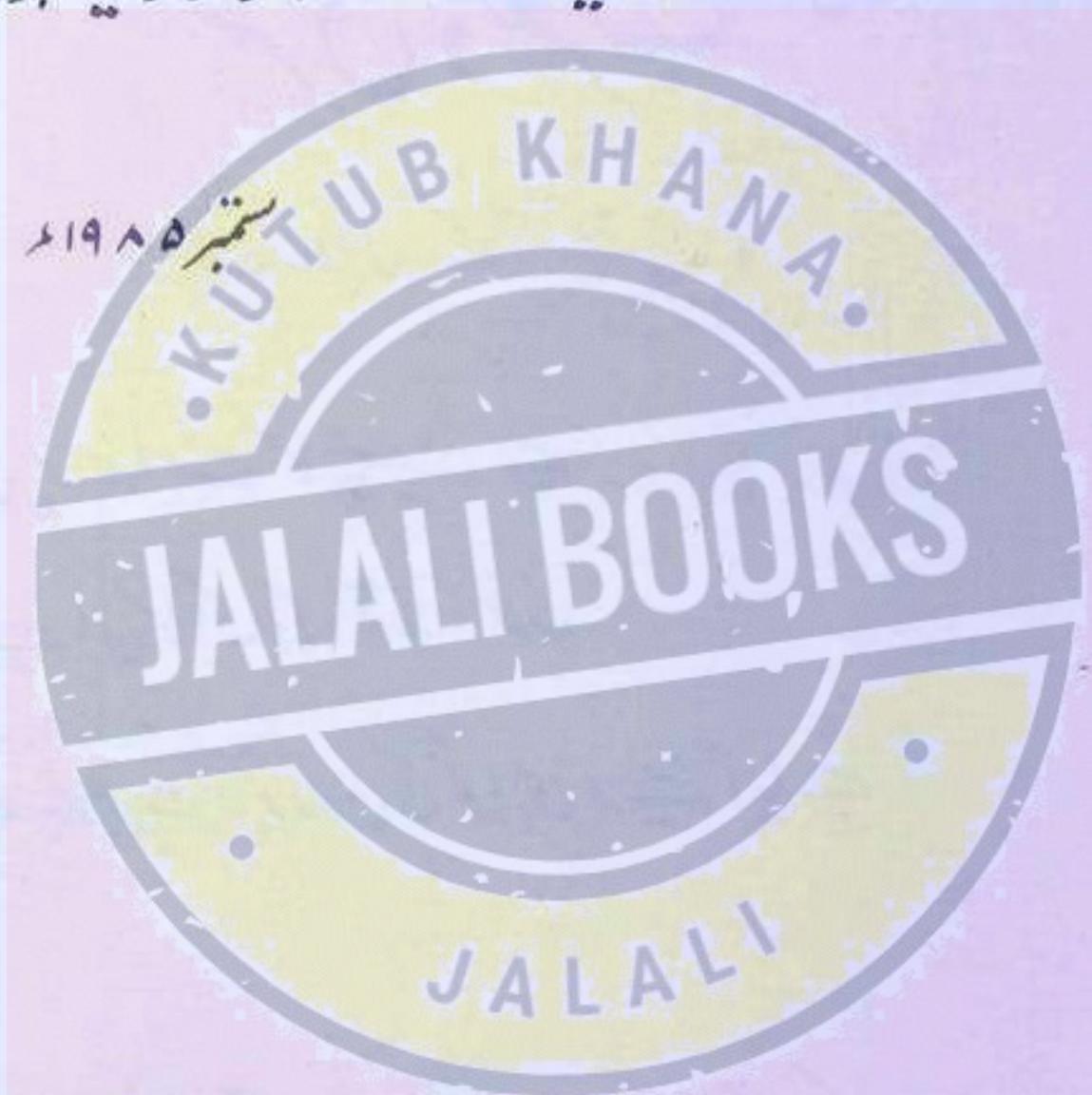
مشرق و مغرب

(خونِ رواں کے آئینے میں)

جبینوں پر ندامت کا پسینہ ہے

کہ جیسے ان کا اِک اِک قطرۂ خوں

ان کے بے غیرت وجُودوں کی گواہی دینے آیا ہے

لبادوں میں چُھپاتے پھر رہے ہیں اپنے ہاتھوں کو

جو رعشے کے توازن سے سنبھالے بھی نہ سنبھلیں

اور یہ رعشہ

بہت کچھ کر دکھانے کے عزائم

اور کچھ بھی کر نہ سکنے کی گواہی ہے

گواہی کی سزا سے کون اب تک بچ سکا ہے

اور یہ سچّی گواہی

وقت ہے

تاریخ ہے

اور یہ حقیقت ہے

کہ انساں کچھ بھی ہو

آخر وہ مسجودِ ملائک ہے!

جنوری ۱۹۸۵ء

درپن

آئینہ فریبی ہے
عکس جو بھی پڑتا ہے
ڈگمگانے لگتا ہے
تلملانے لگتا ہے
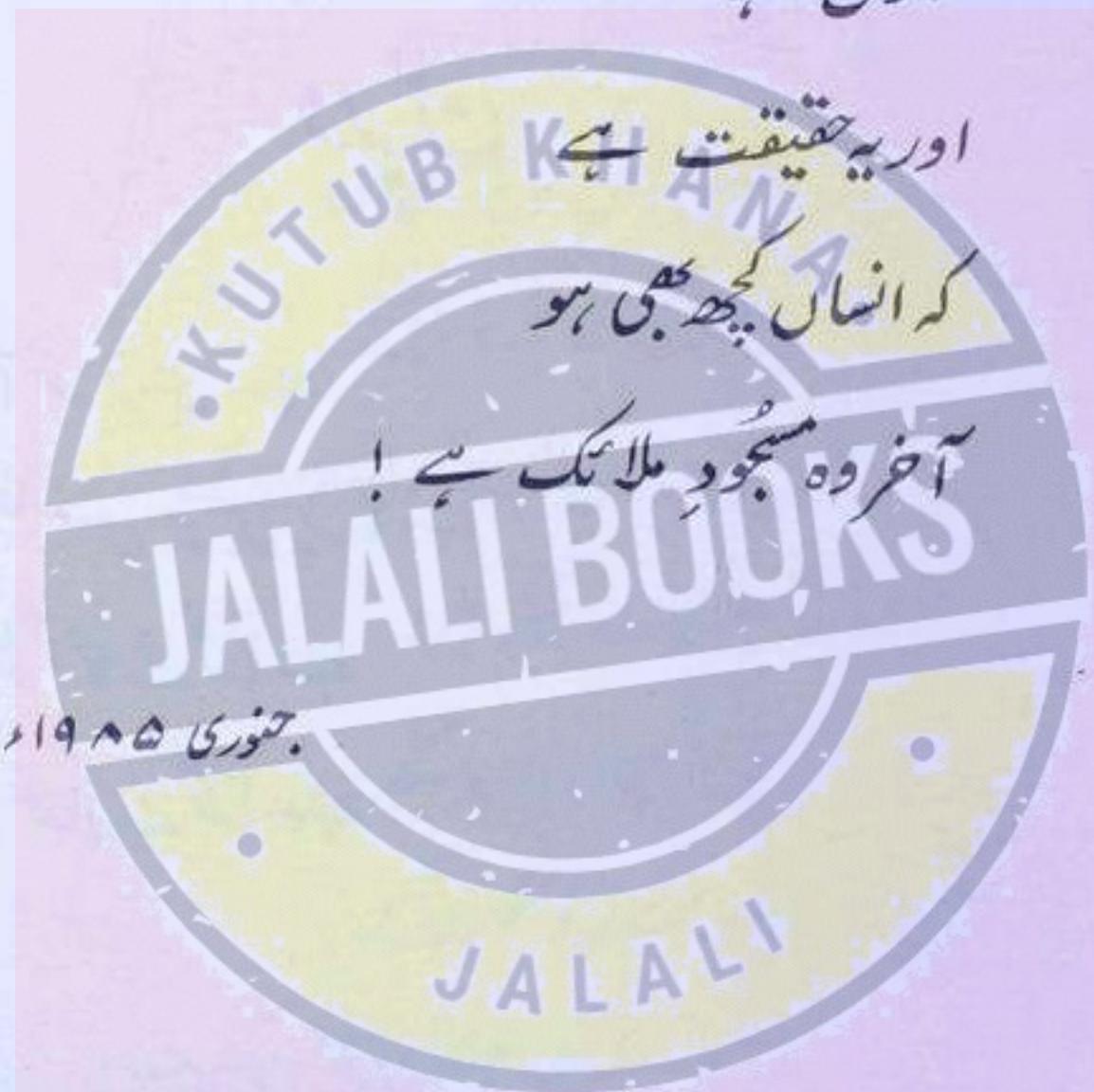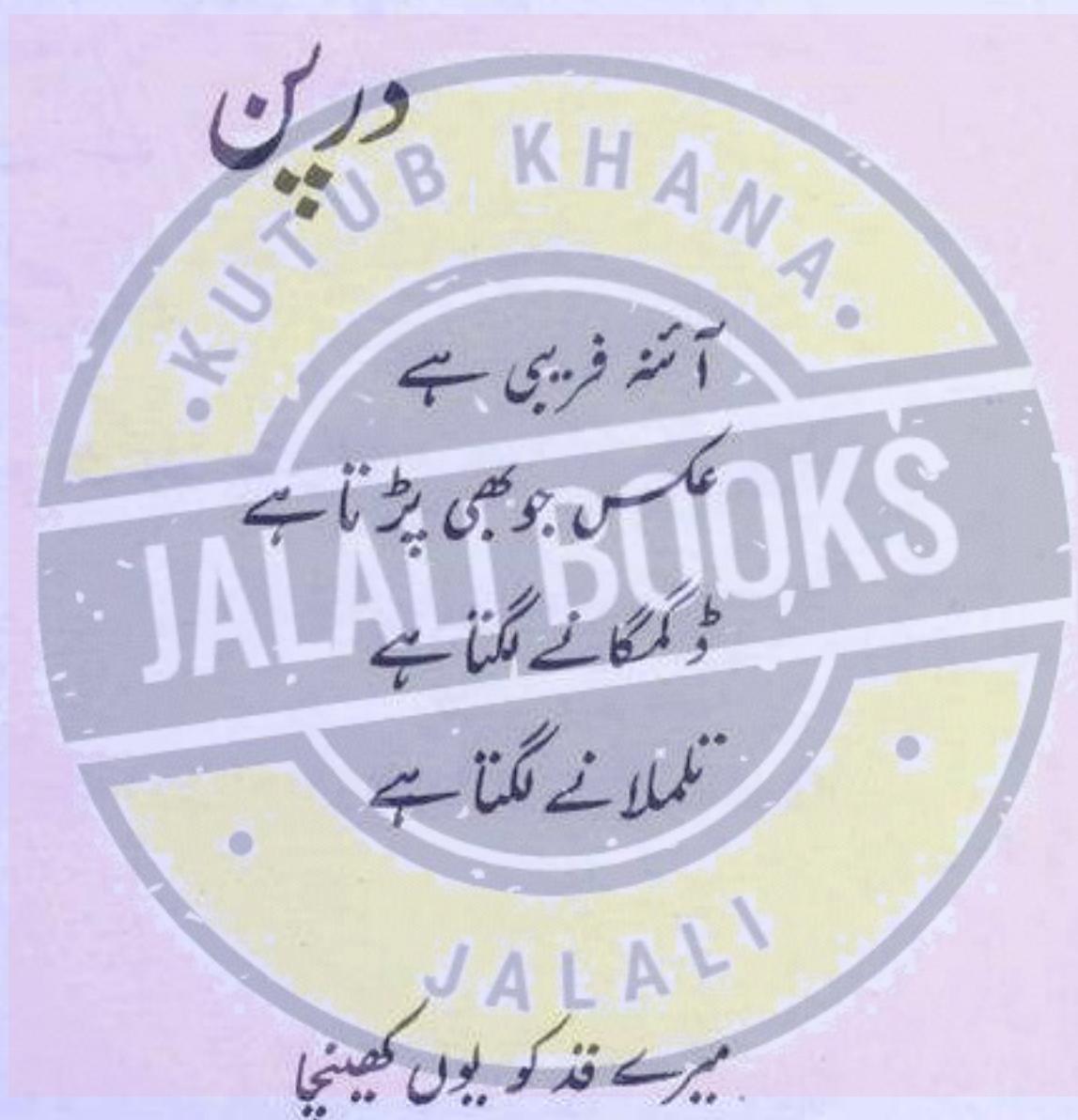
میرے قد کو یوں کھینچا
جیسے آسمانوں کو
چھُو رہا ہو سر میرا
اور ایک پیپل کو
اس طرح سکیڑا ہے
جیسے وہ حقیقت میں

صرف ایک پتّا ہے

آئینہ فریبی ہے
لیکن ایک چہرے کی
اس پہ حکمرانی ہے
عکس اس کا پڑتے ہی
جھلملانے لگتے ہیں
ہونٹ اس کے، گال اس کے
جگمگانے لگتے ہیں
نو بنو جمال اس کے
اور سمندر آنکھوں میں
بیکراں جلال اس کے
سارے خد و خال اس کے
حد یہ ہے، خیال اس کے
یعنی سب کمال اس کے!

جنوری ۱۹۸۵ء

"کُن" کے قریب کا ایک لمحہ

ہر سمت خلائے بیکراں ہے
تا حدِّ نظر دُھواں دُھواں ہے
ظلمات کا ایک دائرہ ہے
جو مثلِ سکوت گُونجتا ہے
جھگڑا ہی نہیں ہے کفر و دیں کا
"ہے" پر بھی گماں ہے "نہیں" کا
کچھ ہے تو وہی ہے جو نہیں ہے
اور وہ جو نہیں ہے، ہر کہیں ہے

ناگاہ سکوت ٹوٹتا ہے
ظلمات سے نُور پھُوٹتا ہے

ہیجان سا آگیا فضا میں
طوفاں سا اُمڈ پڑا خلا میں
معلوم نہیں اُٹھے کہاں سے
شعلے ہیں تمام بے اماں سے
اُٹھے تو جُھکے نہیں ابھی تک
لپکے تو رُکے نہیں ابھی تک
یہ گردشِ موقلم عجب ہے
بیتابیِ پیچ و خم عجب ہے

خوابوں میں خیال تل رہے ہیں
تخلیق کے باب کھُل رہے ہیں

جنوری ۱۹۸۴ء

گریہ

بہت مدّت سے

آنکھوں کی نمی

جب بے تموّج، بے تلاطم ہے

تو اس پر

بے حسی کی کائی جمنے ہیں
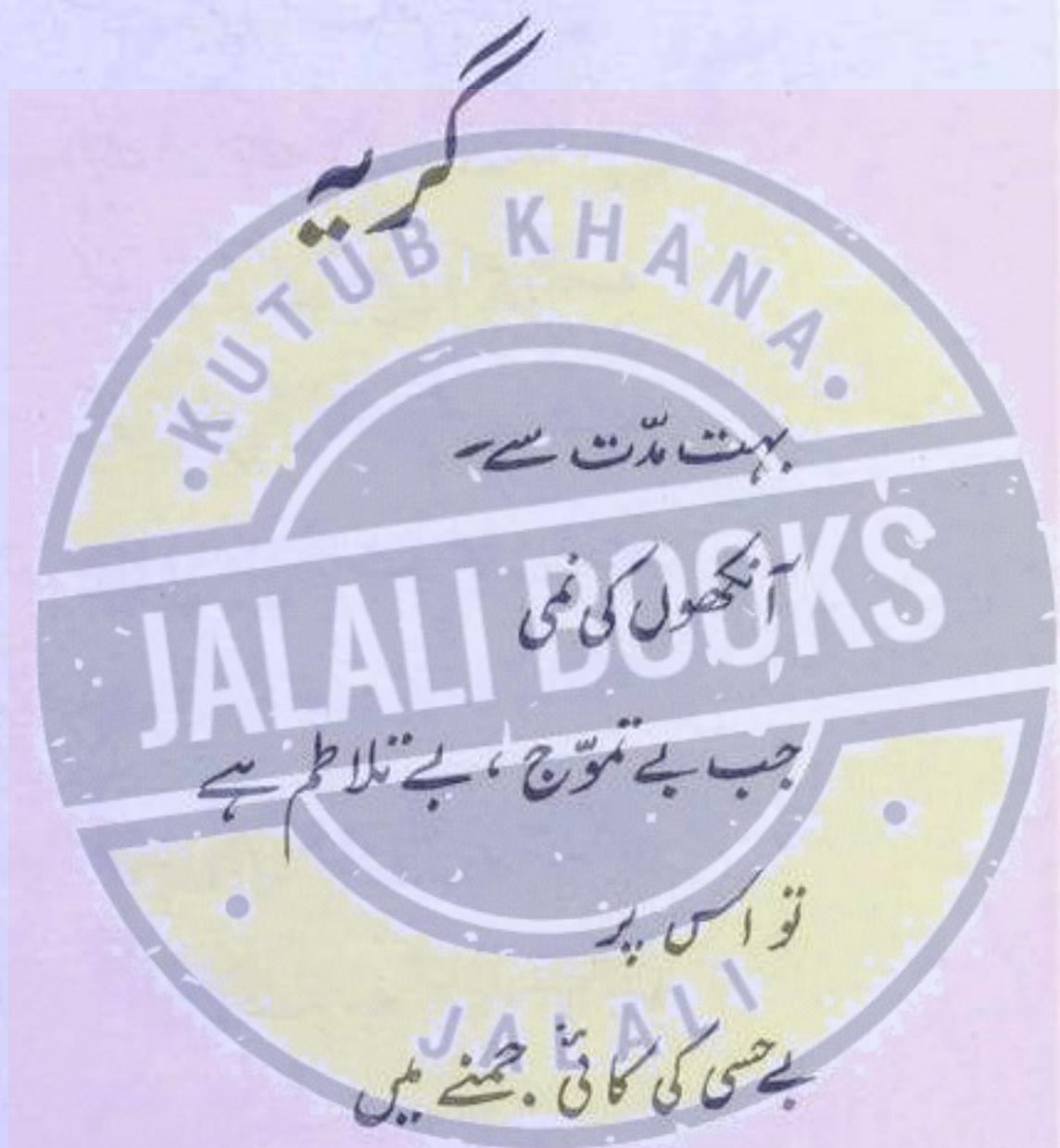
اگر کوئی رکاوٹ ہے

تو وہ شاید

مرے باطن کا گریہ ہے!

دسمبر ۱۹۸۳ء

پناہ

خزاں میں پتھروں پر کُہر جمتی ہے

تو آئینے بکھر جاتے ہیں

تا حدِّ بصارت

سنگ زاروں میں

اور اِن میں آسماں کے عکس
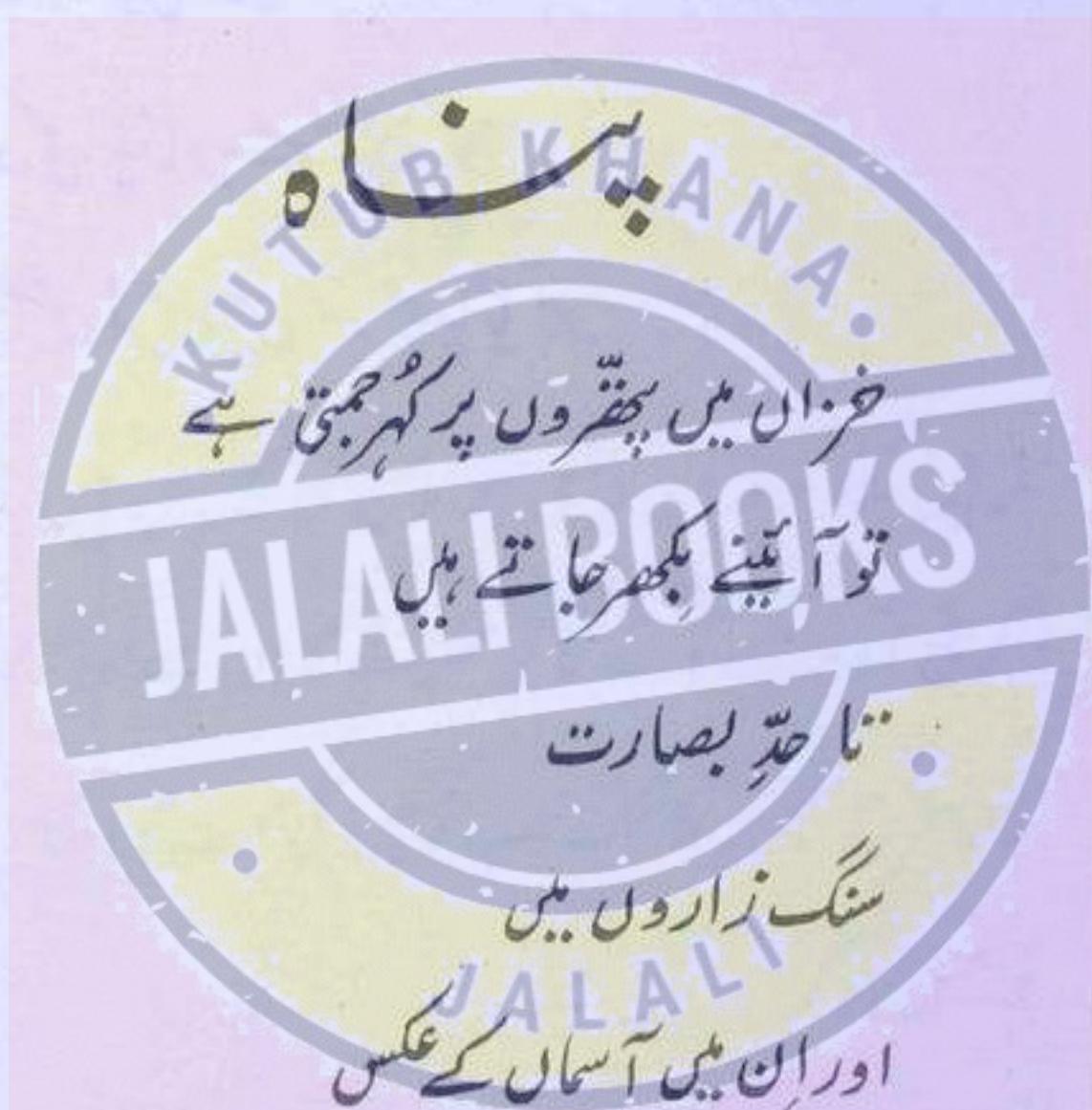
بٹ جاتے ہیں ٹکڑوں میں

ابابیلوں کے پَر اک آئنے میں سے گزُرتے ہیں

تو دھڑ اِک اور میں سے

اور خودرو جھاڑیوں کے ننّھے مُنّے پھُول

اُونچے آسمانوں اور فضا میں چار سُو اُڑتی

ابابیلوں پہ

اِتنے ٹُوٹ کر ہنستے ہیں

جیسے رفعتوں نے

وقت کی یلغار سے بچنے کو

آغوشِ زمیں میں سَر چُھپایا ہو

دسمبر ۱۹۸۳ء

ہبوط

زمیں کے گرد اَن دیکھی ہواؤں کی فصیلیں ہیں

کوئی اُوپر سے آئے گا تو ٹکرائے گا ان سے اور بھسم ہو جائے گا

جس طرح مسجودِ ملائک جب زمیں کی سمت آیا تھا

تو مس ہو کر ہواؤں سے

فضا میں جل بُجھا تھا

اُس کا جو ٹکڑا سلگتا رہ گیا تھا

اور زمیں پر گِر گیا تھا

اُس کو ہم انسان کہتے ہیں

دسمبر ۱۹۸۳ء

ہَوا کی دُعا

وہ آندھیاں، جو کسی دشت سے اُٹھیں گی کبھی
نہ جانے کون سے لمحے کے انتظار میں ہیں
کہ خاک و خس سے اَٹا جا رہا ہے شہر کا جسم

شدید دُھوپ بھی ہے، کربِ انجماد بھی ہے
کہ وہ ہوا، جو کبھی ڈالیوں میں گاتی تھی
کسی نشیب میں اُتری ہُوئی ہے برسوں سے

ہَوا چلے تو تموّج کا حشر پیدا ہو!
اسی کے دم سے سمندر کی سانس چلتی ہے
اسی کے رم سے روانی، اسی کے نم سے نمو

ہَوا چلے تو دماغوں میں لہلہائیں سوال
ہَوا چلے تو کسی چیخ کا جواب آئے
ہَوا چلے تو پہاڑوں کو گونج کی سُوجھے

ہَوا کے نام پہ اِک برگ بھی نہیں ہِلتا
تمام درد ہیں سینے، تمام گرد ہیں ذہن
ضمیر سر بگریباں، حیات شرمندہ
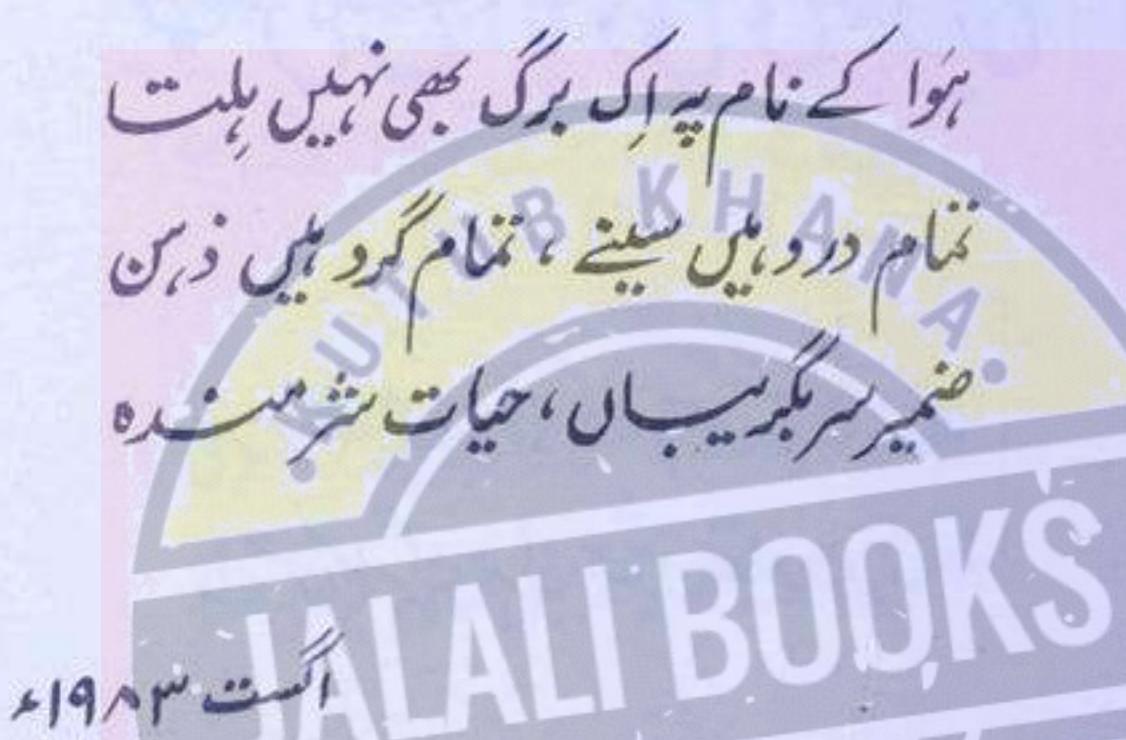
اگست ۱۹۸۳ء

جوشؔ ملیح آبادی کی یاد میں

(چند اشعار)

ہر مرحلے میں، سچ کی جسے جستجو رہی
دل جس کا مرگِ عدل سے شق تھا وہ جوش تھا

ظلمات سے سدا جو نبرد آزما رہا
اُمڈا ہُوا جو سیلِ شفق تھا، وہ جوش تھا

باطن میں نرم دل تھا، مگر جس کے سامنے
چہرہ غرور و جبر کا فق تھا، وہ جوش تھا

عصرِ رواں میں، سطوتِ باطل کے رُوبرُو
جس کے لبوں پہ نعرۂ حق تھا، وہ جوش تھا

اُس دَور کے صحیفۂ حُسن و حیات میں
جو رنگ و روشنی کا ورق تھا، وہ جوش تھا

وہ اپنی ذات میں تھا محبّت کی انجمن،
فن میں بھی جو طبق بہ طبق تھا، وہ جوش تھا

یوں تو بڑے بڑوں کو ہے پندارِ شاعری
اس دشت کا جو خطِّ افق تھا، وہ جوش تھا

فروری ۸۳ء

چاند گھبرا گیا
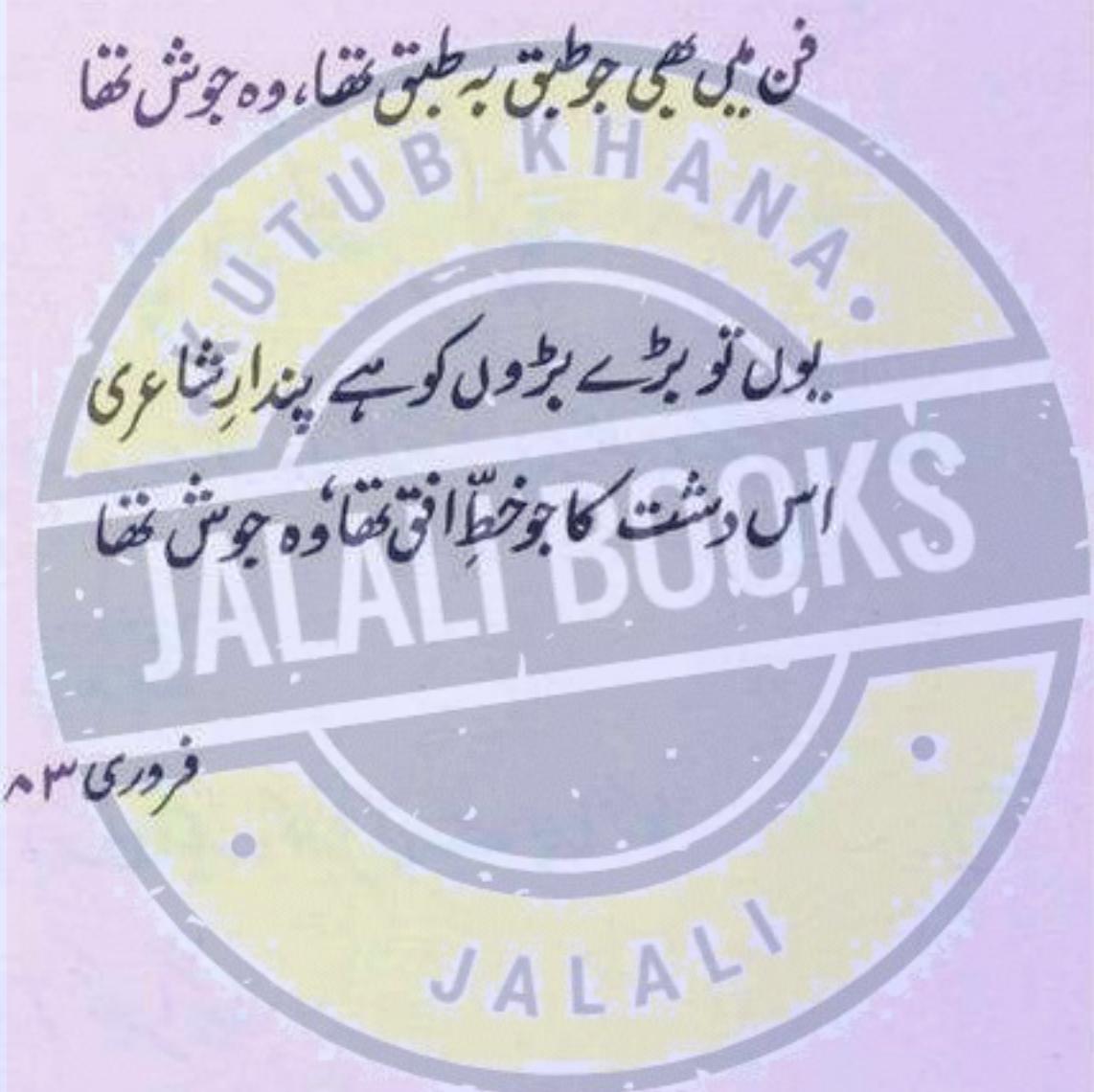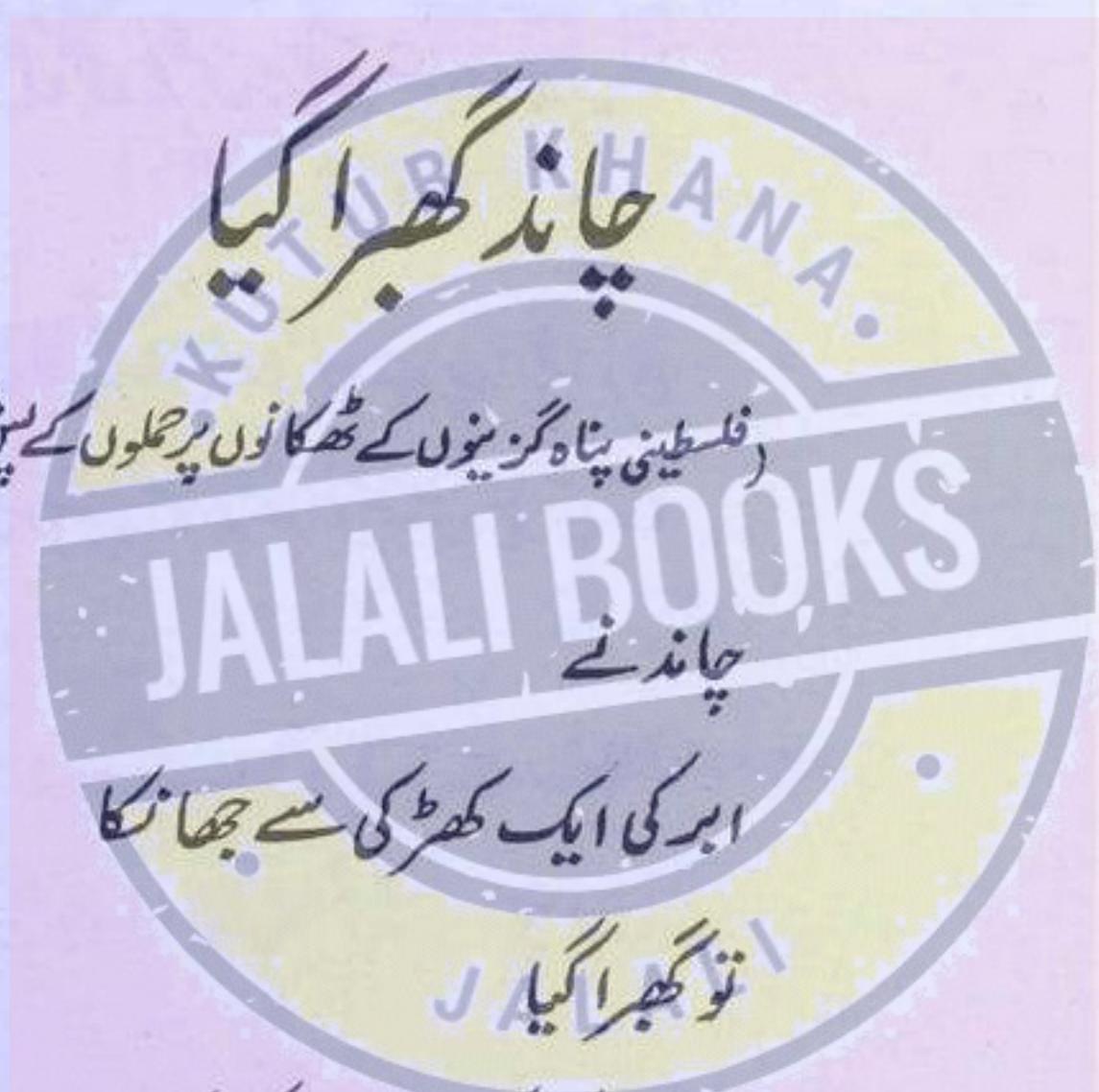
(فلسطینی پناہ گزینوں کے ٹھکانوں پر حملوں کے پس منظر میں)

چاند نے

ابر کی ایک کھڑکی سے جھانکا

تو گھبرا گیا

اور کھڑکی کے پٹ بند کر کے

گھنے بادلوں کو عبا کی طرح اوڑھ کر

چھُپ گیا

بادلوں میں مگر

اس کے چہرے کا سونا پگھلتا رہا

اس کے اشکوں کی چاندی چمکتی رہی
اور فلسطین کی خیمہ گاہوں میں
تہذیب کے پاسبانوں کے دلاّل
منظر کے دھبّے مٹانے میں
انسانیت کو ٹھکانے لگانے میں
مصروف تھے!

جنوری ۱۹۸۳ء

ممی

گزرتے وقت کے سفاک ہاتھوں سے

حنوطے جا چکے ہیں ہم

ہمارے پیکروں پر

خود ہمارے ہی حوادث کی اُڑائی گرد
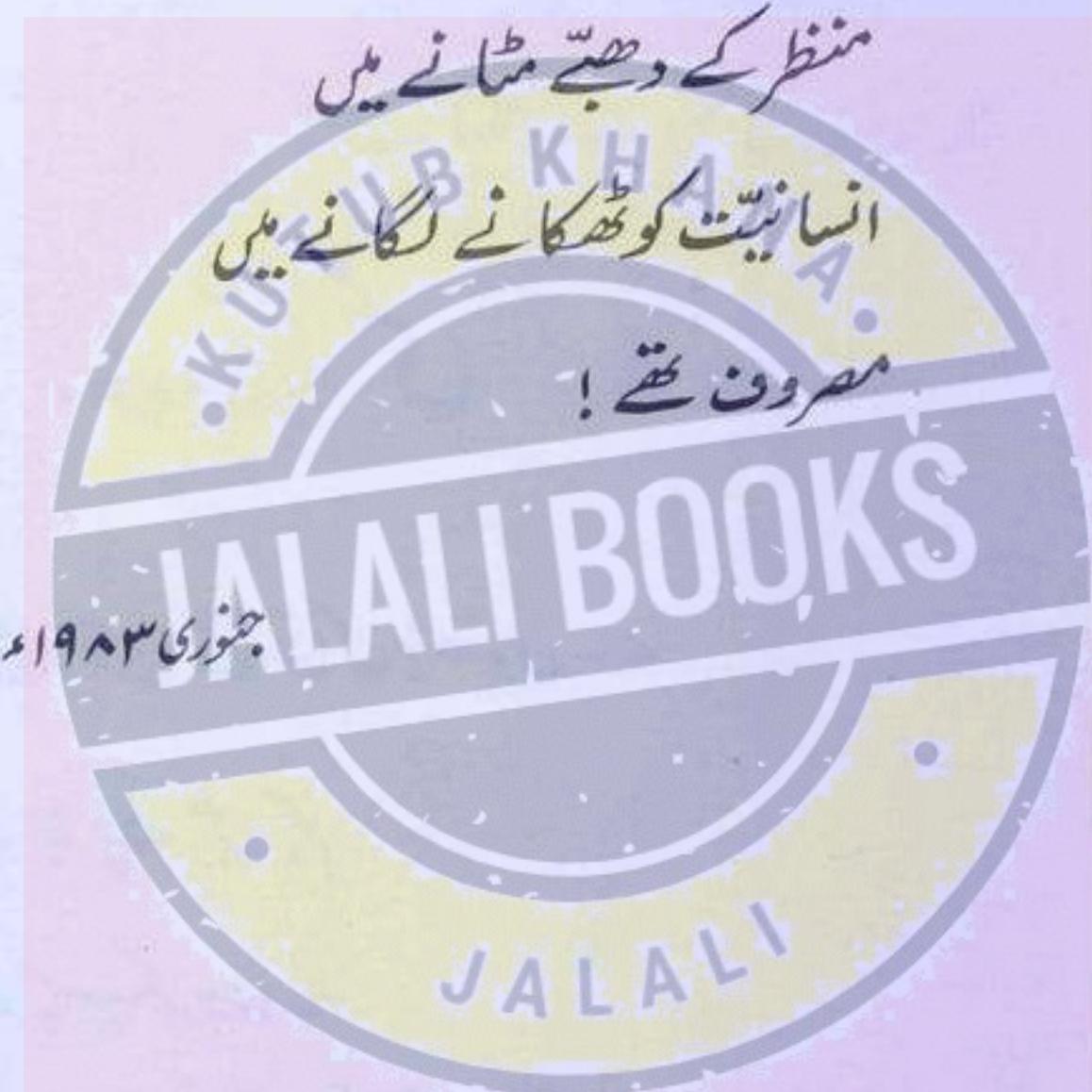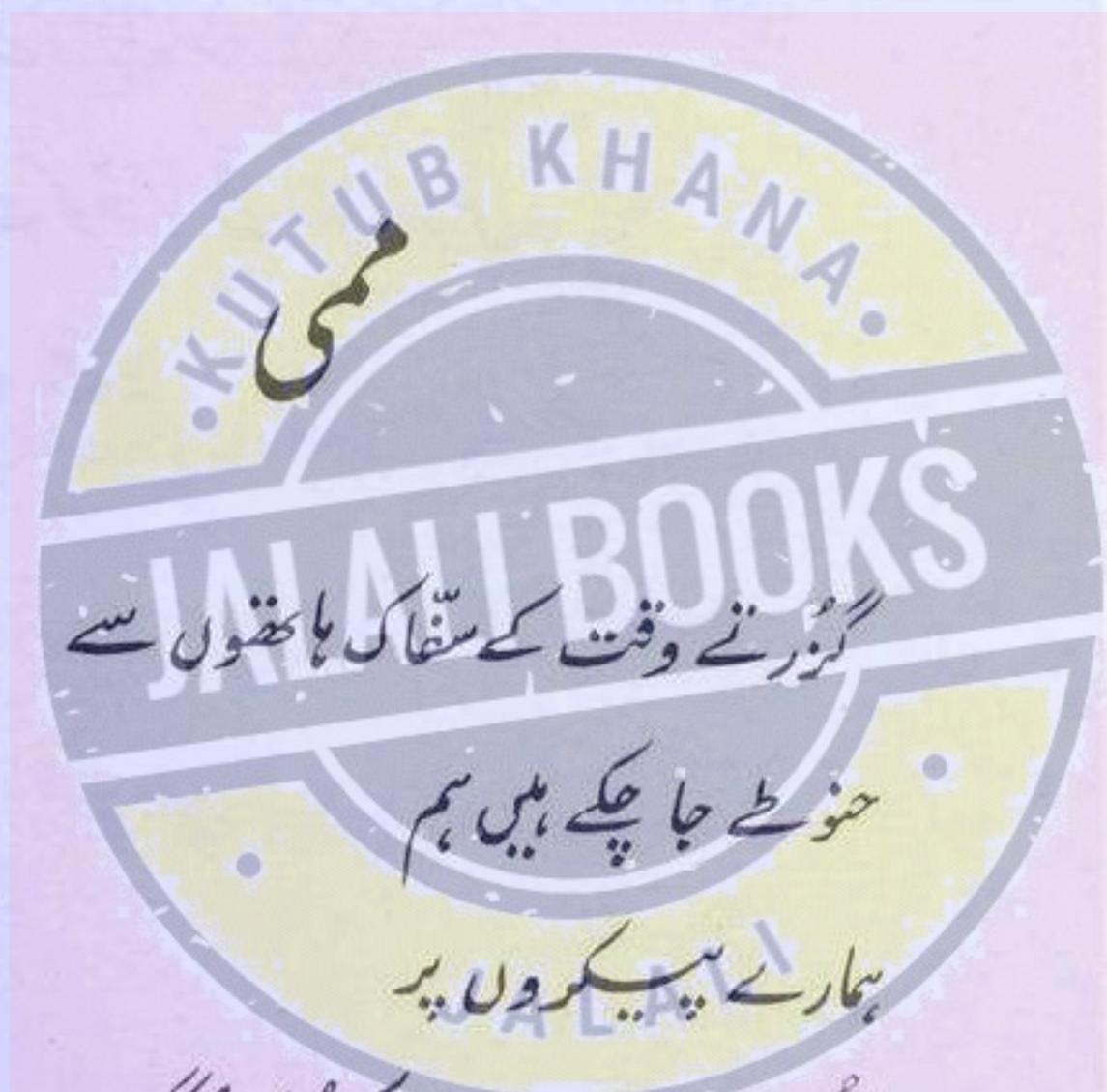
تہہ در تہہ جمی جاتی ہے

ہم تو دست و بازو کیا ہلائیں گے

مگر طوفاں بھی جیسے راستہ ہی بھول بیٹھے ہیں

کوئی جھونکا بھی ہم تک کب پہنچتا ہے

جو ہم پر ان گنت پرتوں کی صورت میں اُترتی گرد

کو آ کر اُڑائے،

ورنہ ہم اپنے بدن کے سب مساموں سے

وہ سبزہ پھوٹتا دیکھیں گے

جو قبروں کی مٹی سے نکلتا ہے!

جنوری ۱۹۸۳ء

"فاتحینِ بیروت" سے

تمہارے اوجِ تہذیب و ثقافت کا

زمانہ معترف ہے

اور مَیں بھی معترف ہُوں

صرف یہ ننھّا سا شکوہ ہے
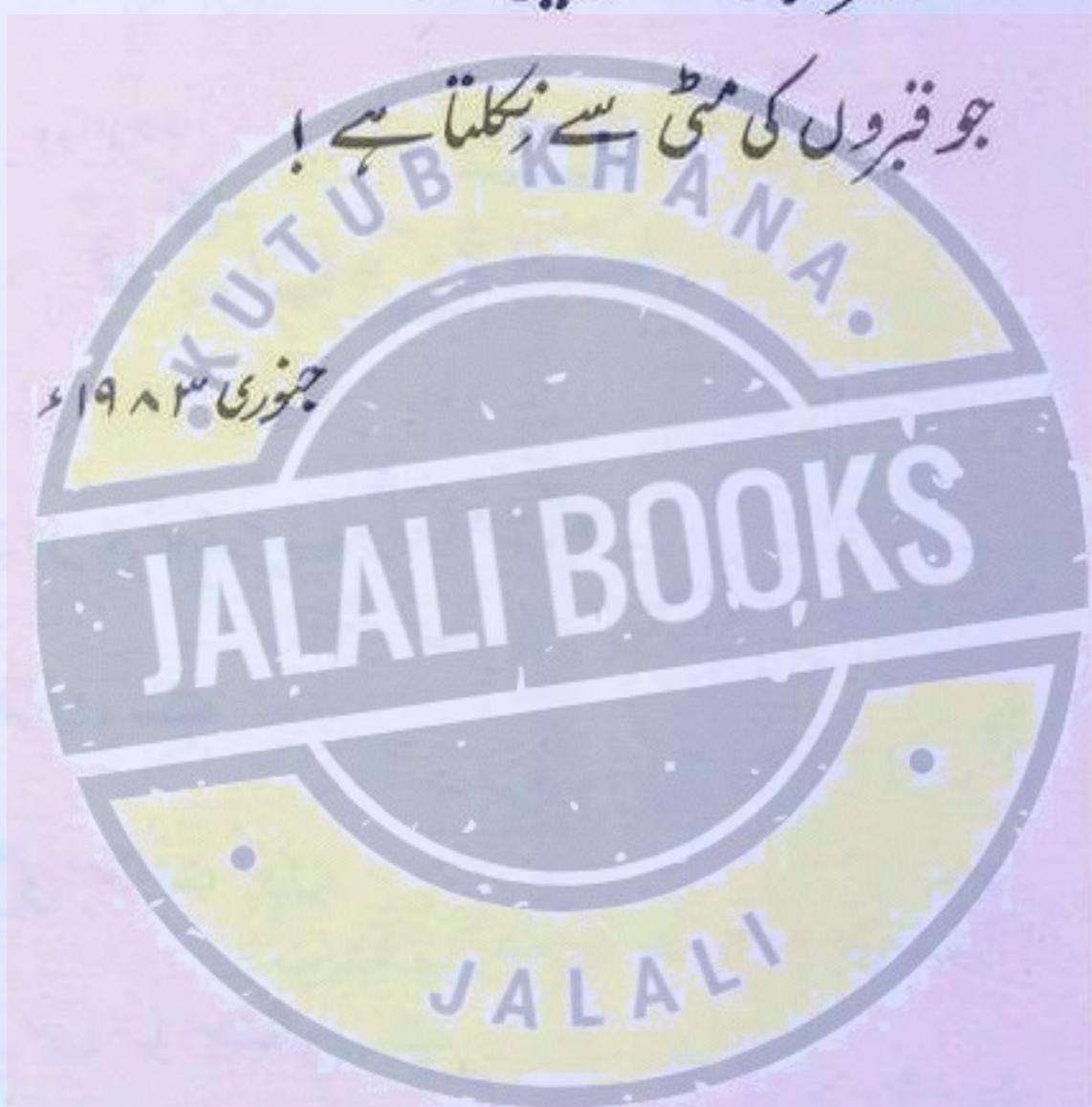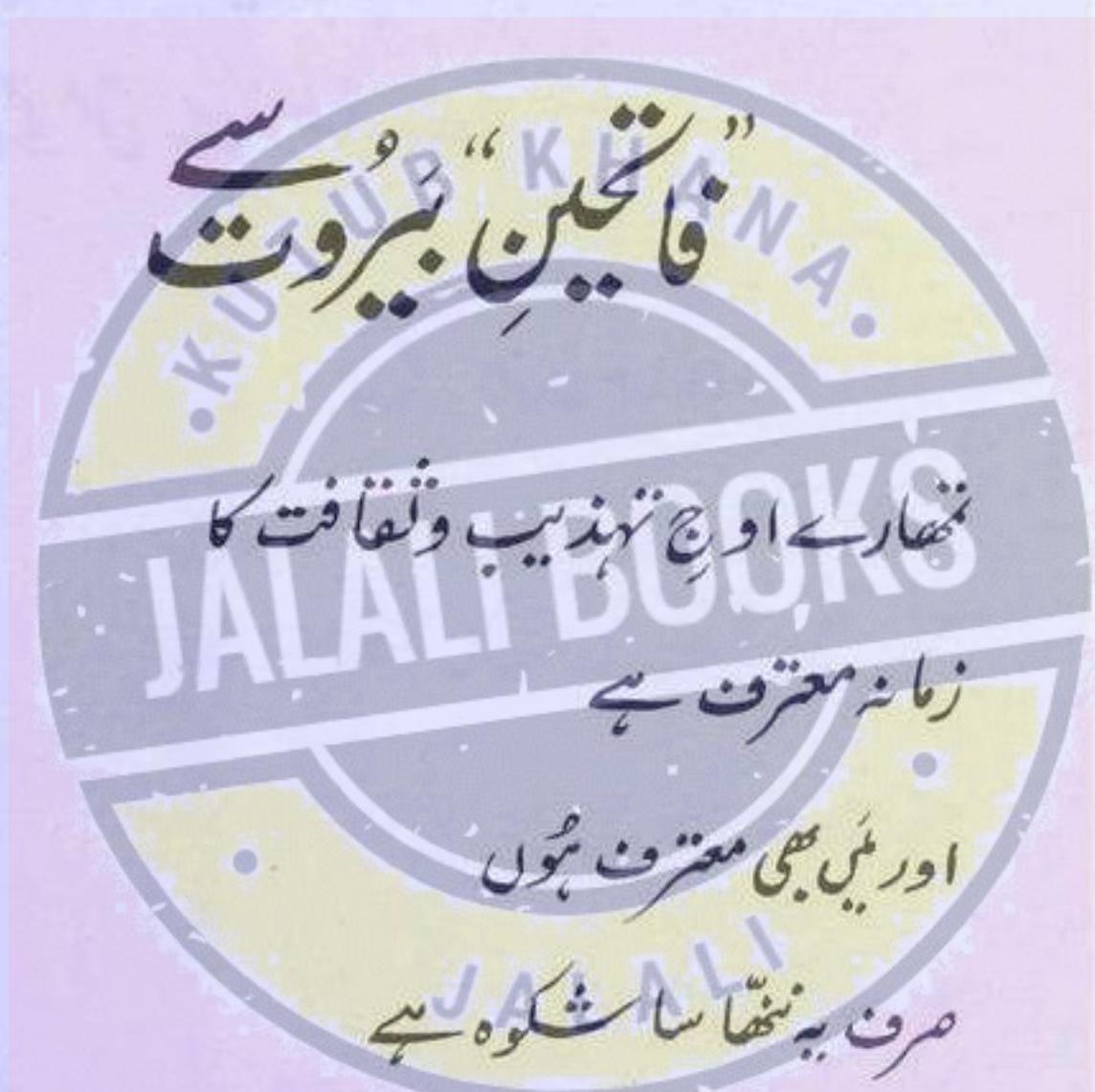
کہ تم بے خانمانوں کے کلیجوں میں اُترتی برچھیوں کو نو عجائب گھر میں

فن کارانہ اندازِ تناسب سے سجاتے ہو

مگر چھلنی کلیجے بھول جاتے ہو !

اکتوبر ۱۹۸۲ء

درد

وجود — احساسِ درد میں ہے

اگر یہ احساس ہی نہ ہو — تو

وجُود اپنے عدم کے گہرے میں ڈوب کر

بے وجود ہو جائے!
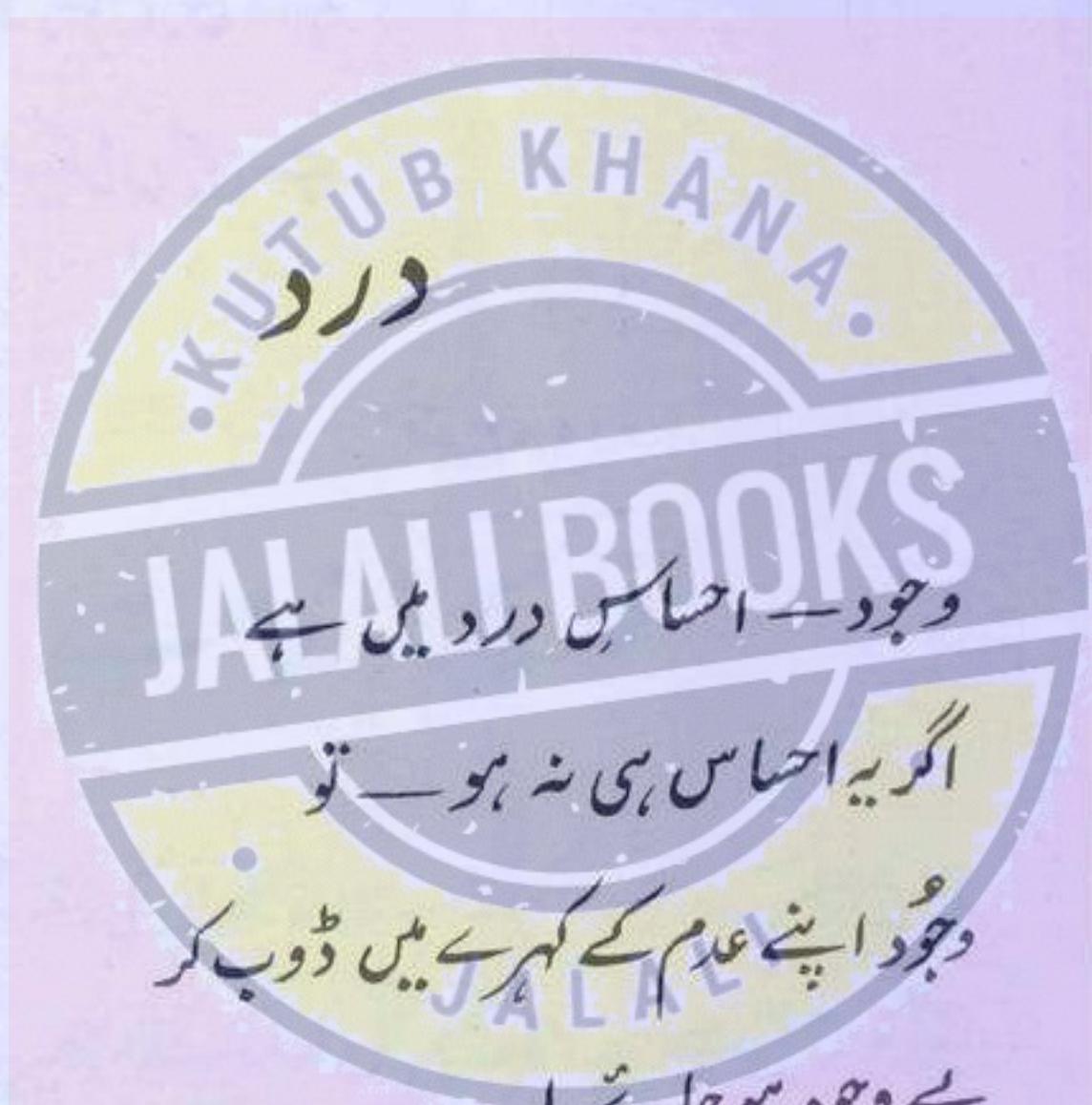
درد عرفانِ ذات ہے

کائنات کو درد ہی نے چھانا ہے

درد ہی زہرہ و زحل تک رسائی ہے

اور خدائی بھی نورِ درد سے مستنیر ہے

اس کی تابشوں سے

حیات — اور پھر حیات سے ماوراء کے سب ممکنات

روشن ہیں!

درد ہے تو جہاں بھی ہے

اور آدمی بیکراں بھی ہے

ستمبر ۱۹۸۲ء

خدیجہ زندہ ہے
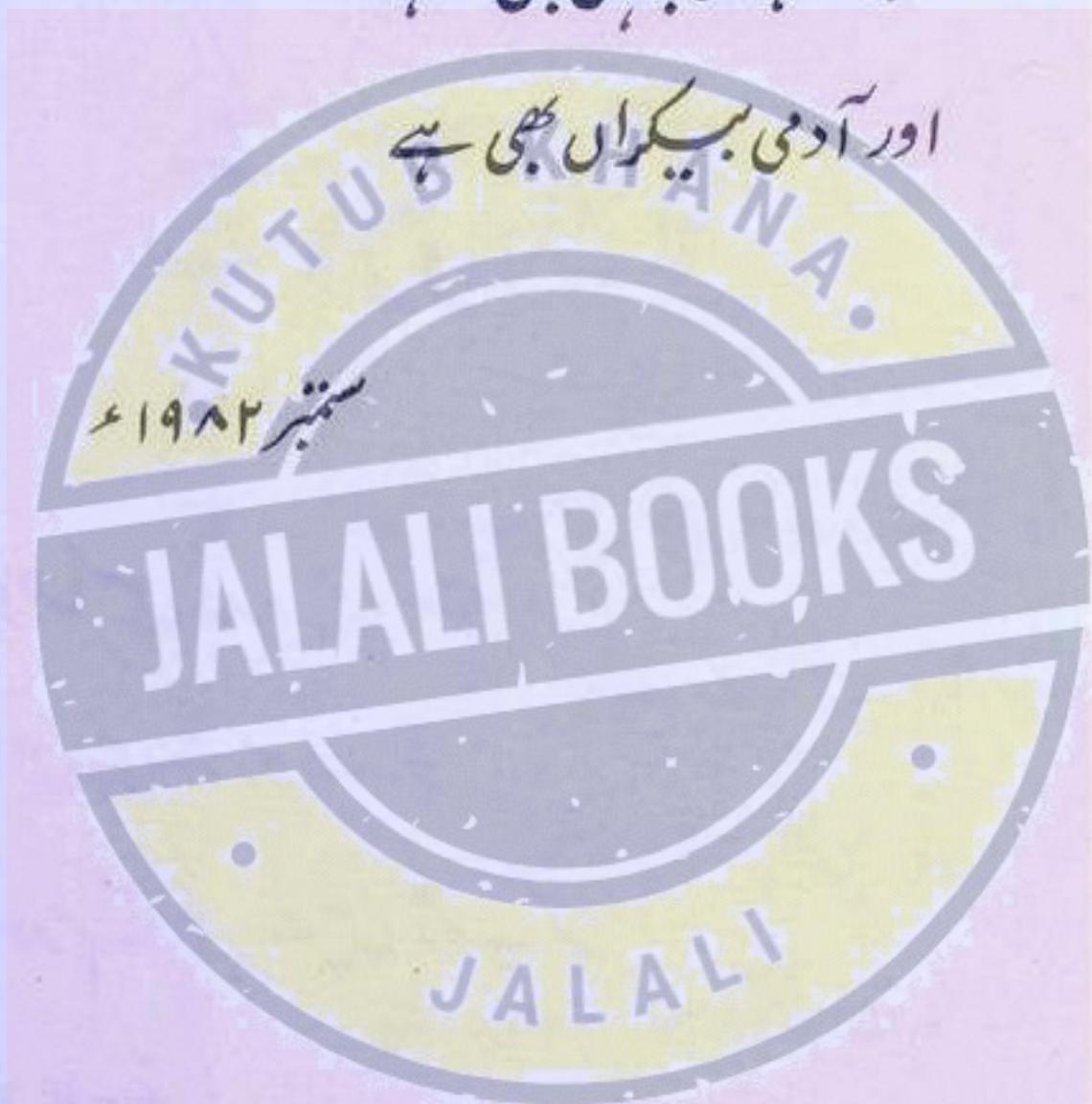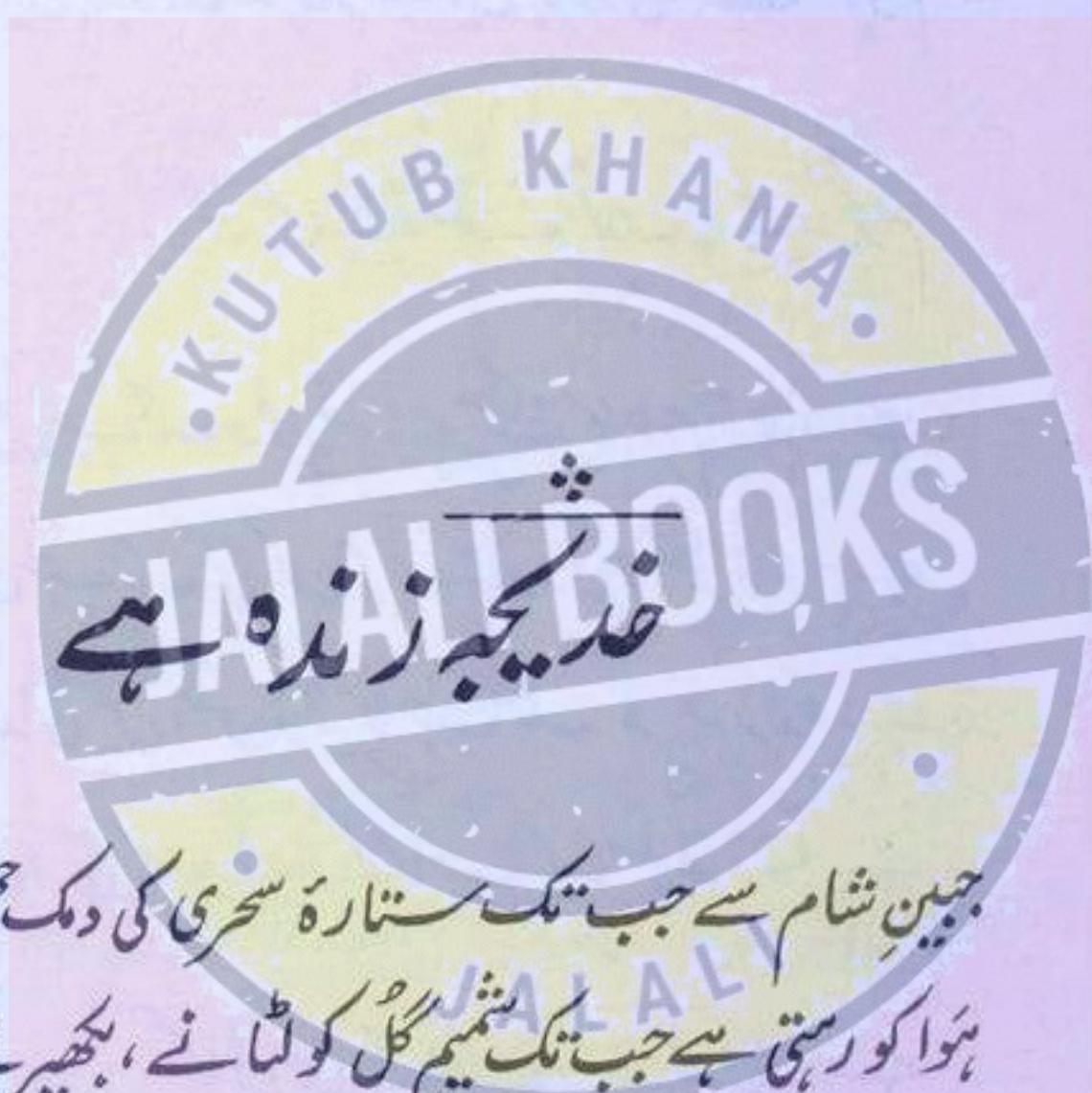
جبینِ شام سے جب تک ستارۂ سحری کی دمک جھلکتی ہے

ہَوا کو رہتی ہے جب تک شمیمِ گُل کو لٹانے، بکھیرنے کی لگن

گرفتِ دستِ خزاں میں بریدہ شاخ کو جب تک ہے انتظارِ بہار

فرازِ کوہِ اَنا سے، صدائے تیشۂ فرہاد جب تک آتی ہے

جو خامشی کے اُفق پر دیے جلاتی ہے

٭ خدیجہ مستور

مہک ہے خاک کی جب تک، خیال و خواب کی تا آسماں اڑان میں بھی
زمیں کے چہرے سے جب تک لہو شہید کا گردِ ملال دھوتا ہے
طلسمِ نطق سے جب تک درِ مقفّلِ دل ٹوٹتا ہے، کھلتا ہے
اِک ایک لفظ میں جب تک دھڑک رہے ہیں ہزاروں نئے نئے مفہوم

چمن میں جیسے شگوفے، فلک پہ جیسے نجوم

کلی کے رُوپ میں جب تک وفورِ نم سے چٹکنے کا عزم زندہ ہے
خلائے تیرہ میں جب تک کئی کروڑ ستاروں کا نظم زندہ ہے
غرض خدا کی خدائی میں، حسُن و خیر کا جب تک قرینہ زندہ ہے
شبِ حیات میں، سچ کا دِیا جلانے کا جب تک سلیقہ زندہ ہے

کمالِ فن کے فلک پر خدیجہ زندہ ہے

اگست ۱۹۸۲ء

ساتویں سمت

میں نے دیکھا کہ اک مجمعِ عام ہے

جو رواں ہے

مگر اس کا سارا سفر بے جہت ہے

شمال اور مغرب، جنوب اور مشرق، زمین اور افلاک سے

وہ گریزاں ہے

جیسے خدا نے کسی ساتویں سمت کی آگہی بخش دی ہو اُسے

کوہساروں کو چھُو کر انھیں گالا گالا کیے جا رہا ہے

مگر پھُول کی پتّیوں کے کناروں کی دھاروں سے

پوروں کے پرزے اُڑاتے چلا جا رہا ہے

اُدھر اس کے ہونٹوں پہ (اُن سب کے ہونٹوں پہ) نوحہ ہے
لیکن وہ نغمہ سا لگتا ہے
آنکھوں میں (اُن سب کی آنکھوں میں) آنسو ہیں لیکن ستارے
سے معلوم ہوتے ہیں
ہاتھوں میں (اُن سب کے ہاتھوں میں) خامے ہیں
ہر نوکِ خامہ پہ لفظوں کی شمعیں ہیں
جو سناٹوں سمت کی تیرگی میں چراغاں کیے جا رہی ہیں!

نومبر ۱۹۸۱ء

خدانخواستہ

میرے سینے پہ جو پتھر پڑا ہے

ہٹ تو سکتا ہے

مگر بازو مرے، شل ہیں

مجھے کروٹ بدلنا بھی نہیں آتا

جب اُٹھنا چاہتا ہوں، پسلیاں فریاد کرتی ہیں
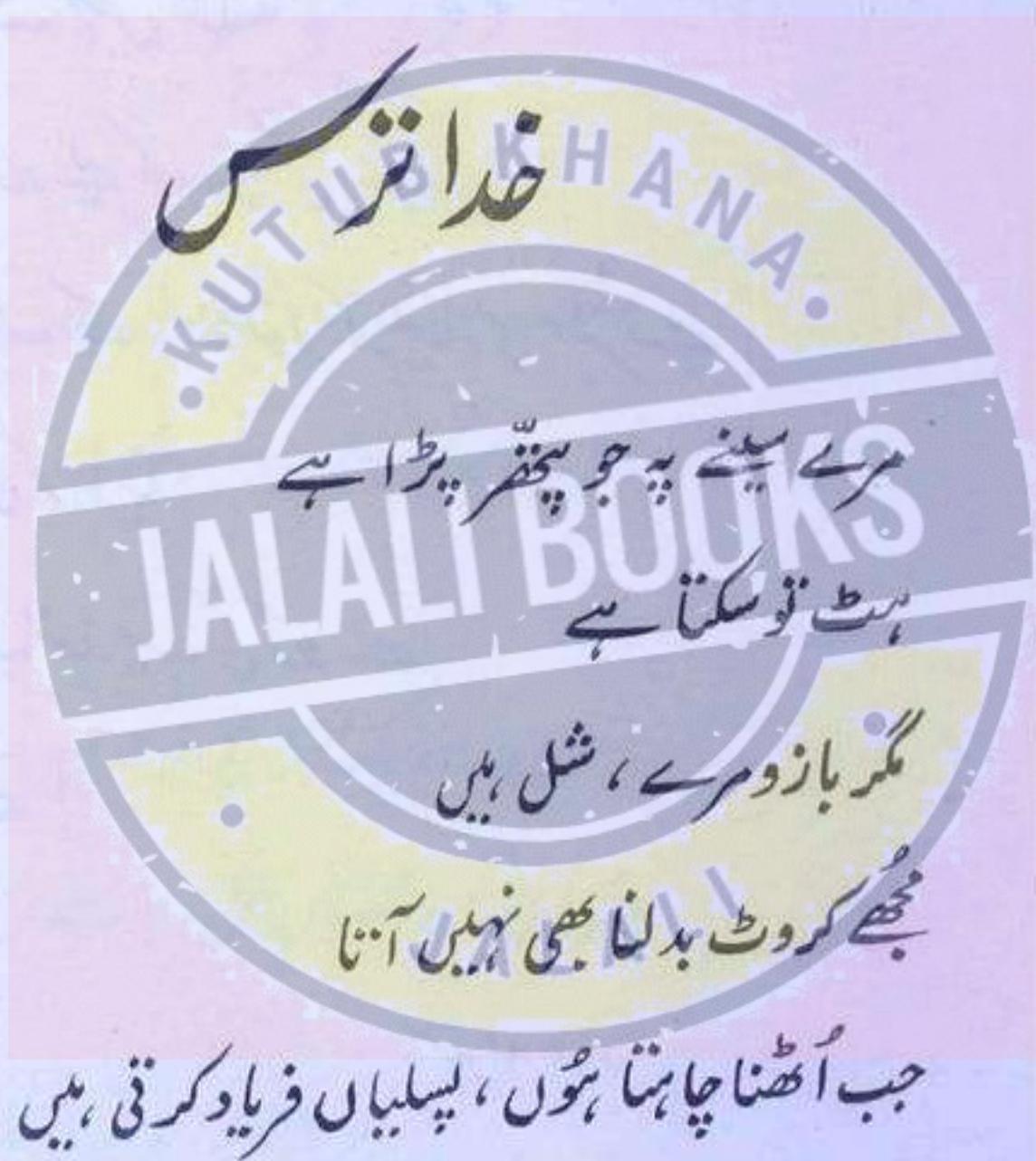
ابھی کچھ دیر میں اِک شخص آئے گا

کدال اور پھاوڑا لے کر

مجھے دیکھے گا

میری سانس کو محسوس کرنے کے لیے مجھ پر جھکے گا

اور سوچے گا :

ابھی اس کے نفس کی آمد و شد کے تسلسل میں

کوئی رخنہ نہیں ملتا

جو قبر اس کے لیے کھودی گئی ہے

اُس کو کل تک کے لیے محفوظ کر لینا ہی بہتر ہے

کہ زندہ دفن کر دینا

ہمارے مسلکِ تہذیب کی رُو سے

شقاوت ہے !

ستمبر ۱۹۸۱ء

دَورِ جوہر

برفاب دِئیے ہیں جل رہا ہے
فطرت کا چلن بدل رہا ہے

شعلوں سے ٹپک رہی ہیں بُوندیں
پھُولوں سے دُھواں نِکل رہا ہے
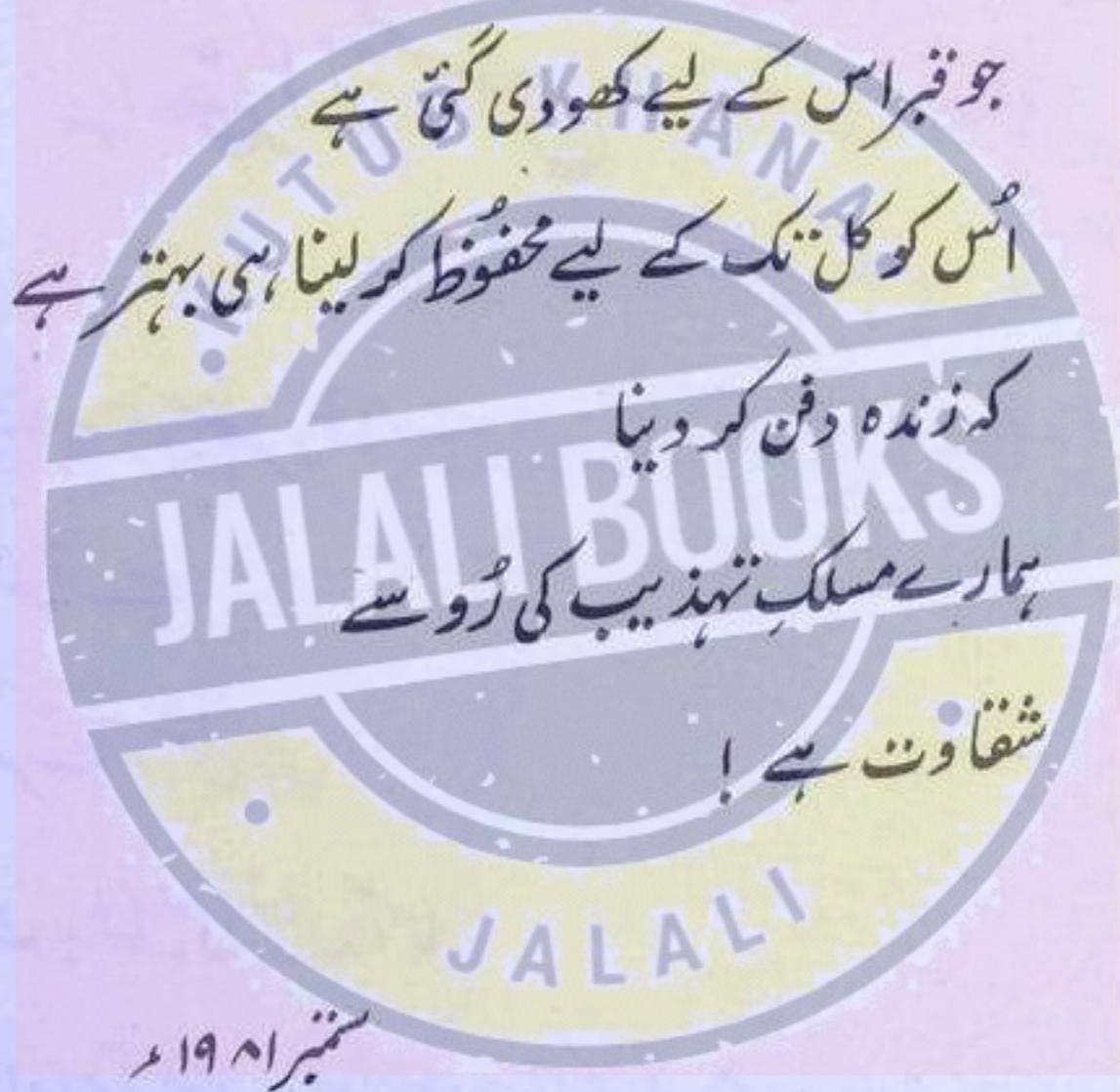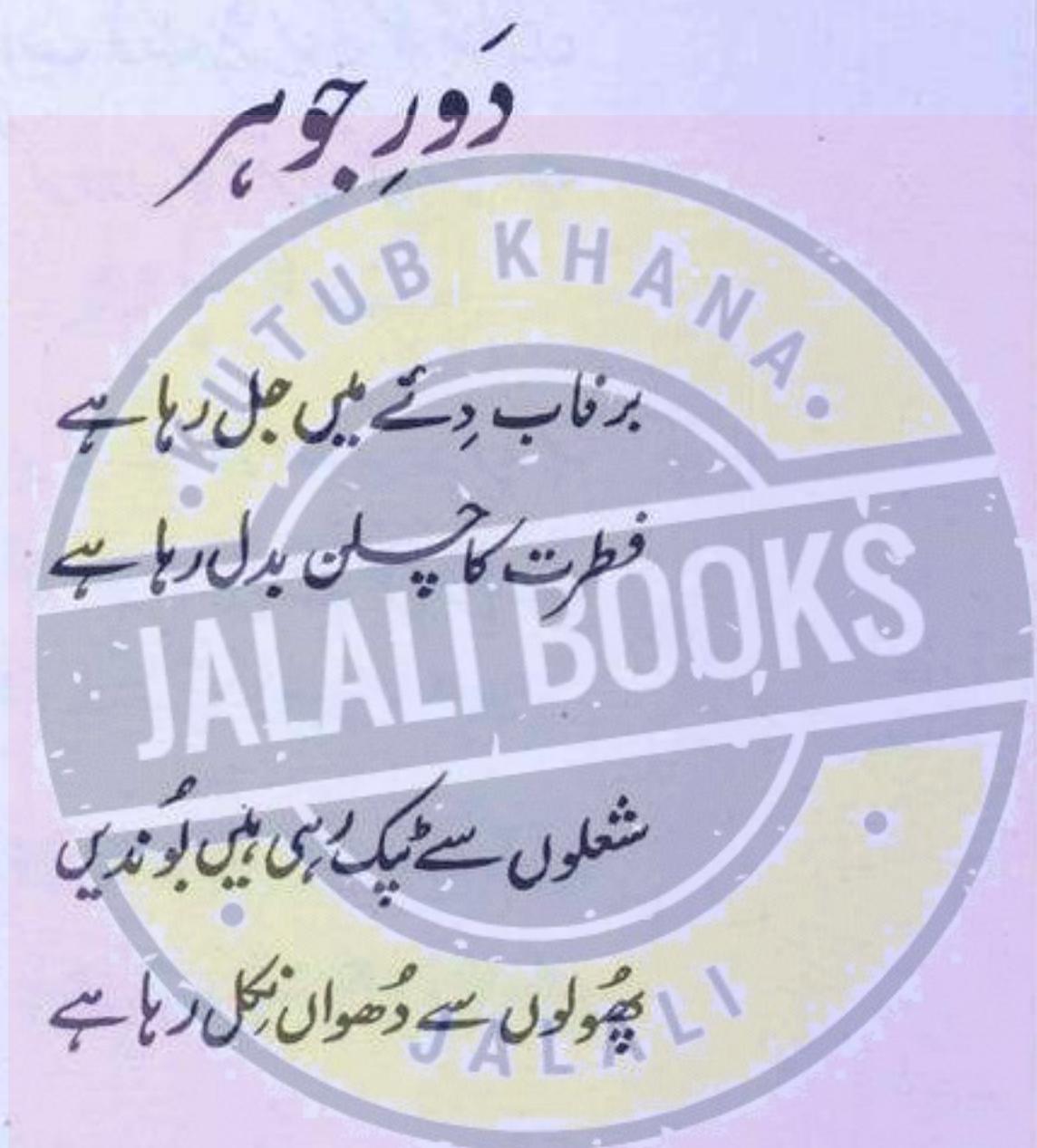
یہ وقت ہے یا کوئی درندہ!
لمحہ لمحہ نِگل رہا ہے

سُورج کو فلک پہ کون روکے
نِکلا ہے ابھی، کہ ڈھل رہا ہے

گردش کے قدیم راستے پر
مہتاب پھسل پھسل رہا ہے

اب ٹوٹ پڑیں گی کائناتیں
گردوں کا ستون گل رہا ہے

برپا ہے وہ سرِ حدِ ابد پر
جو حشر ازل سے ٹل رہا ہے

ذرّے کا مدار جس نے توڑا
بیٹھا ہُوا ہاتھ مَل رہا ہے
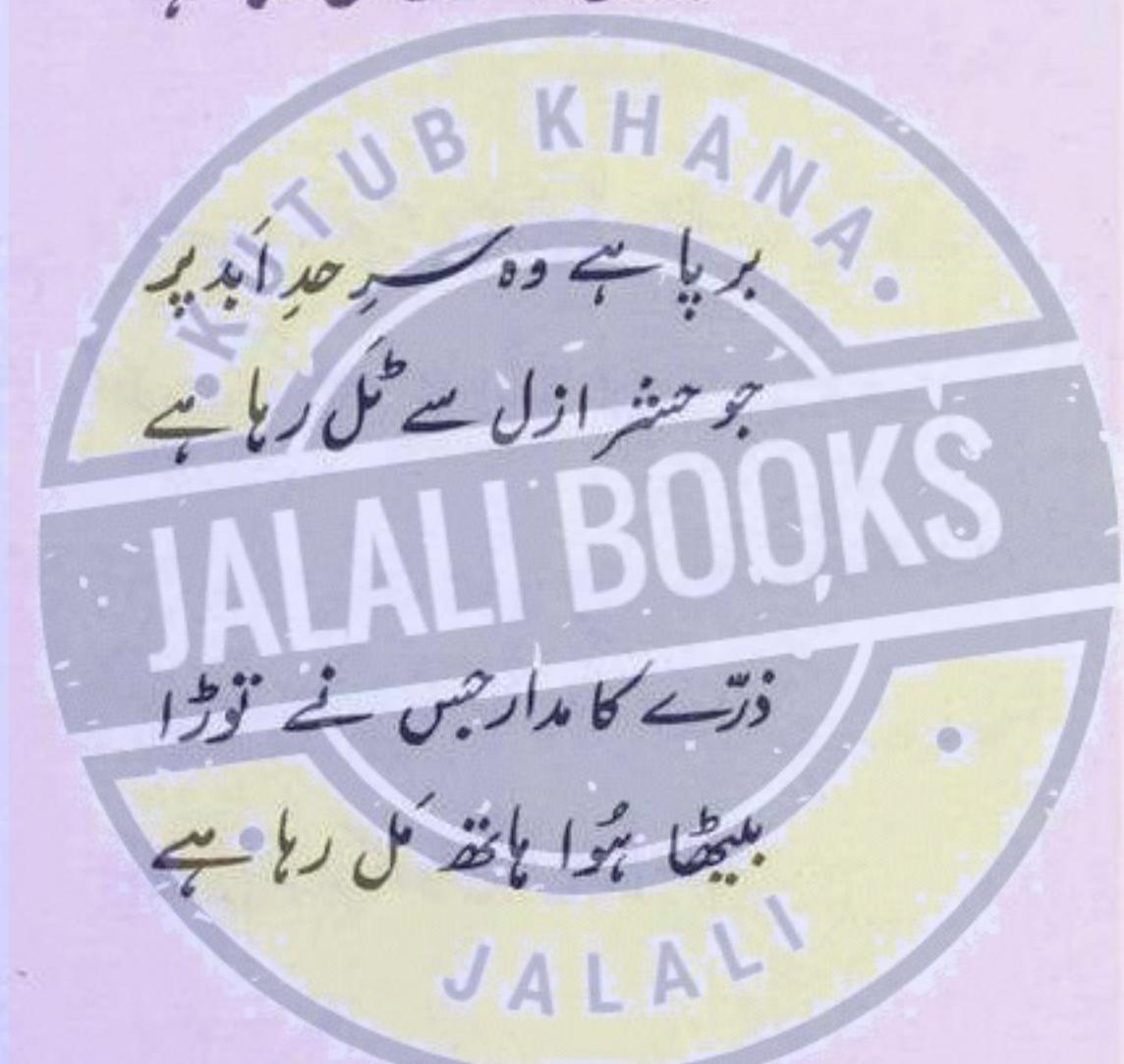
اِک ہول سا، سرزمینِ دل پر
آسیب کی طرح چل رہا ہے

انسان، اَجل کی گود بھرنے
بچّے کی طرح مچل رہا ہے

جولائی ۱۹۸۱ء

سمے کا جادُو

ابر کو جس قدر برسنا تھا
دھیرے دھیرے برس کے چھٹنے لگا
صُبح کے زرنگار چہرے سے
بادلوں کا حجاب ہٹنے لگا
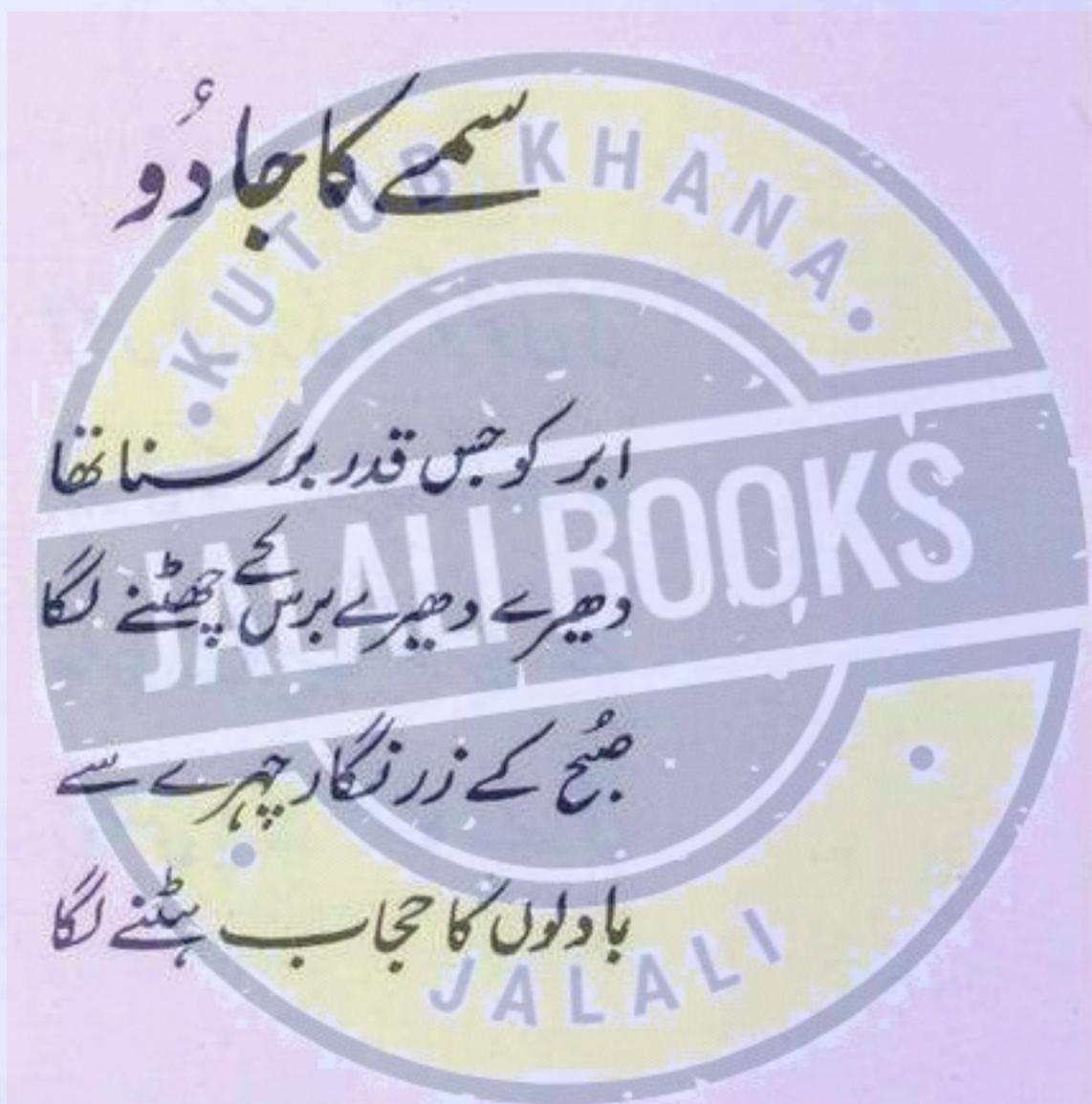
بھیگی بھیگی منڈیر پر، چڑیاں
ایک لمبی قطار میں بیٹھی،
دُھوپ میں پر سنوارنے کے لیے
پھڑپھڑانے لگیں، نکھرنے لگیں

پتّیاں، پھُول سے جُدا ہو کر
ڈولتے ڈولتے سنبھلتی ہُوئی
تازہ تازہ نہائے سبزے پر
موتیوں کی طرح بکھرنے لگیں

قوس میں اُڑتی ڈار کونجوں کی
نُور کی جستجو میں سرگرداں
بدلیوں کے قریب، سُورج سے
روشنی پا کے، جگمگانے لگی
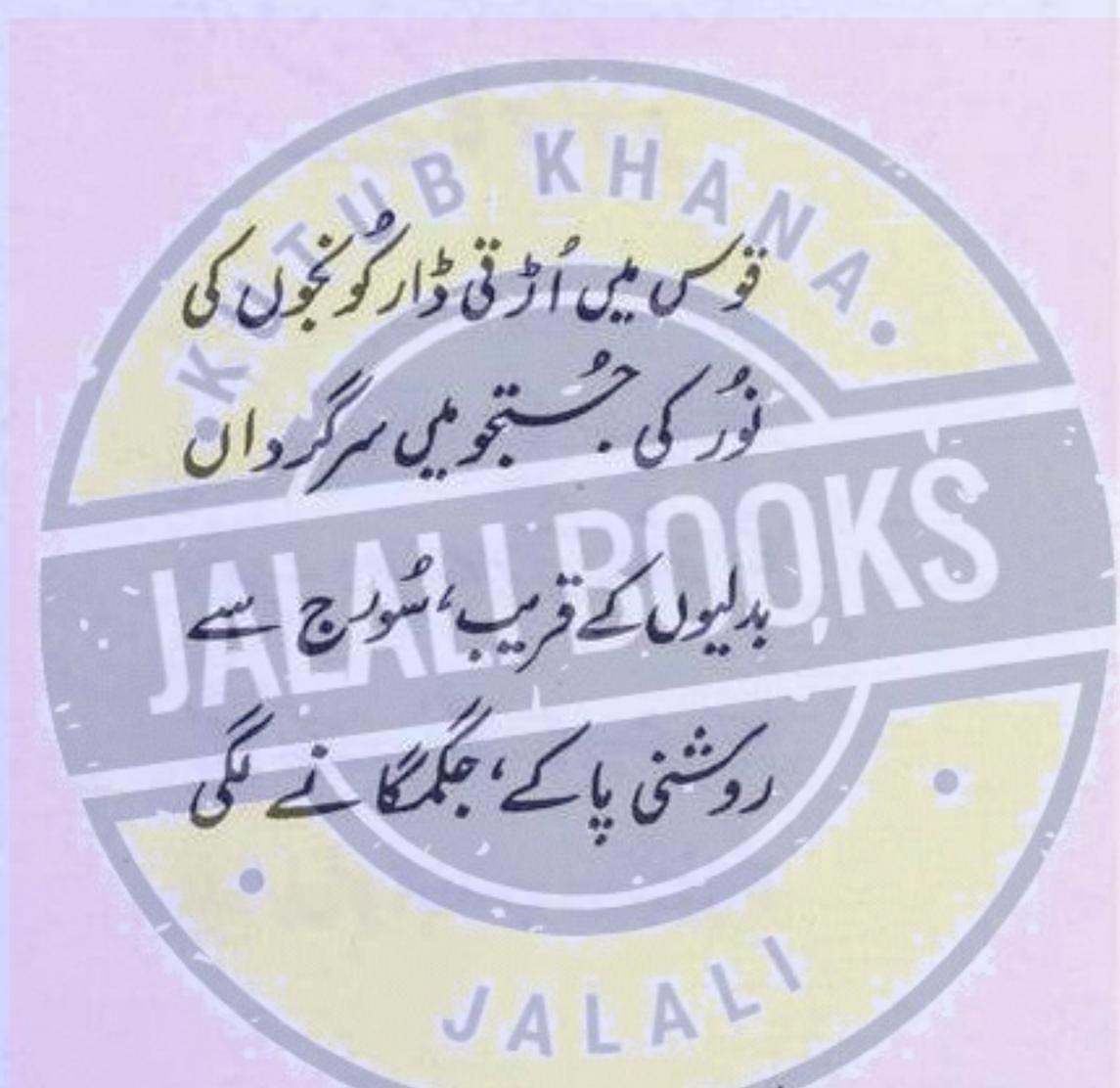
کیسا بالیدگی کا منظر ہے!
میری آنکھوں میں ڈبڈبائی نمی
دل کے سنسان ریگ زاروں میں
یاد کا پیڑ سا اُگانے لگی

میرے ماضی کے لمحے لمحے کا
جتنا پھیلاؤ تھا، سمٹنے لگا
حرف ڈوبے ہوئے اُبھرنے لگے
وقت جاتا ہُوا، پلٹنے لگا

مارچ ۱۹۸۱ء
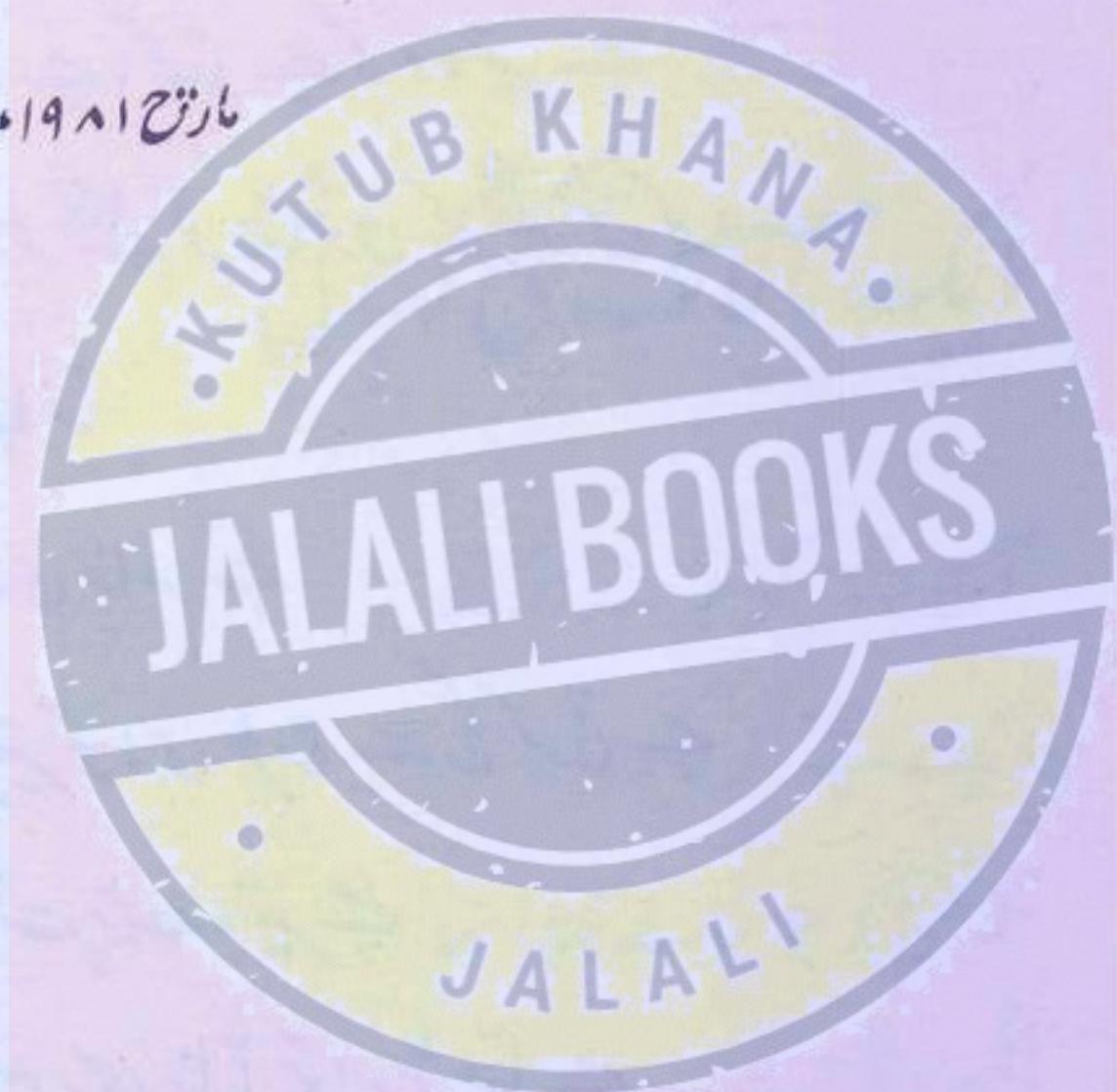
تیر انداز

جو بھی آتا ہے، سمجھتا ہے کہ وہ تیر ہے

چٹکی سے جو نکلے تو چٹانوں کے جگر شق کر دے

وہ نہیں جانتا

تاریخ بڑی ظالم ہے

وہ تو ہر تیر کو اس طرح سے کج کرتی ہے

کہ اگر وقت پڑے، تیر چلے

تو وہ قوسیں سی بناتا ہوا، بڑھتا ہے

مگر بڑھ کے کچھ اس طرح پلٹتا ہے

کہ خود تیر چلانے والا

آخرِ کار ہدف بنتا ہے!

فروری ۱۹۸۱ء

ایک تالاب کی کہانی

آج دفتر کو جاتے ہوئے

ایک بچے کو دیکھا

کہ تختی کو بلّا بنائے کھڑا تھا

مجھے دیکھتے ہی وہ بولا:

"چلو، گیند پھینکو!"
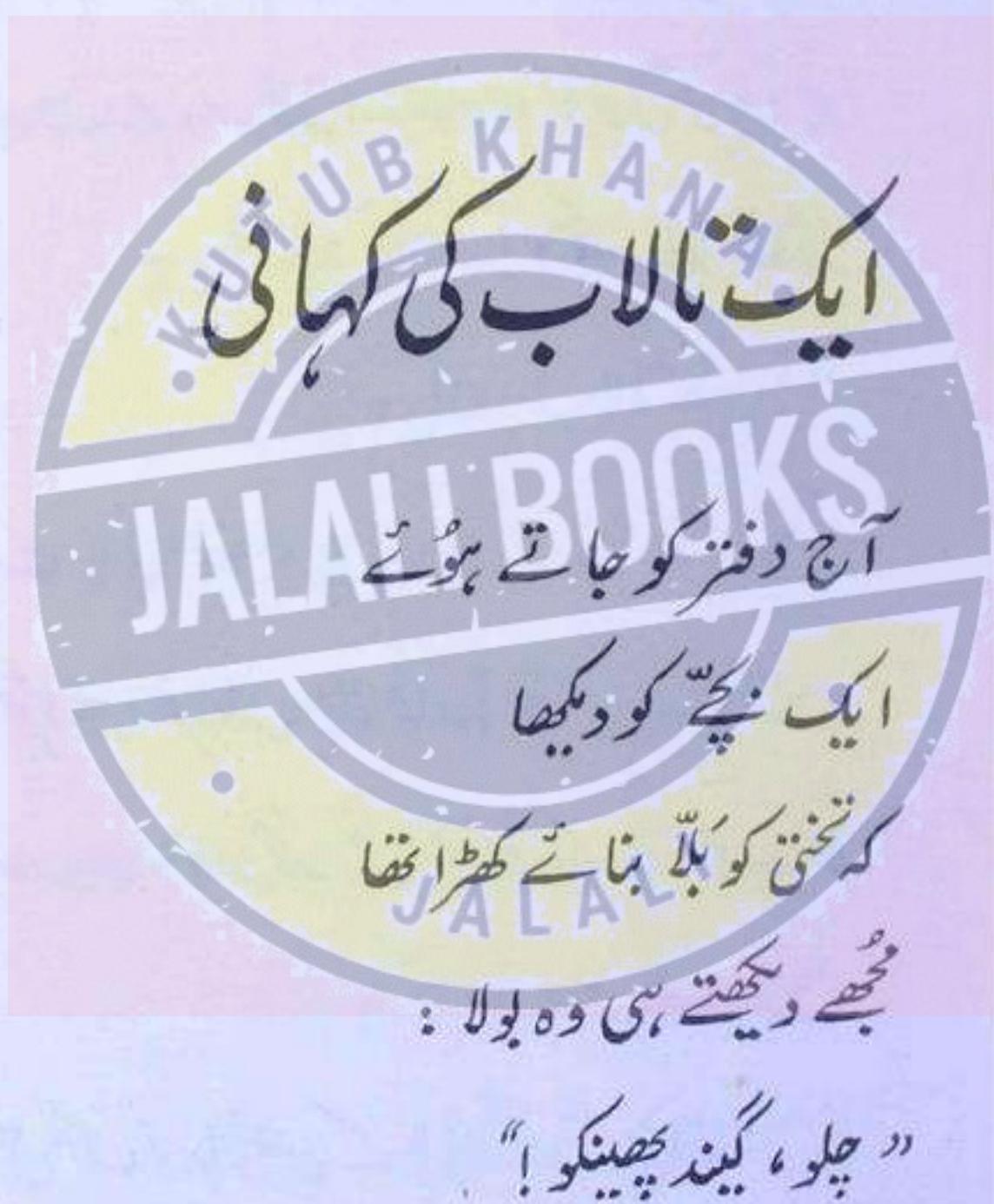
شہنشاہِ معصومیت کے یہ احکام جب میں بجا

لا چکا

تو یکایک میں بچپن کے ماحول میں تھا

مرے ہاتھ میں میری تختی تھی

اور سر پہ بستہ تھا

اور میری صحت بلا کی تھی

میں ہر قدم پر خود اپنے ہی گالوں کو ہلتا ہوا
دیکھتا تھا!

ابھی وقت باقی تھا

اور میں خراماں چلا جا رہا تھا

مرے مدرسے اور مجھ میں فقط ایک تالاب کا
فاصلہ تھا،

یہ تالاب کل تک تو بارش کے پانی سے لبریز تھا

آج لیکن نہ پنہاریاں گاگریں بھر رہی تھیں

نہ مرغابیاں تیرتی تھیں

فقط ایک شیشہ سا مشرق سے مغرب تلک جگمگاتا تھا
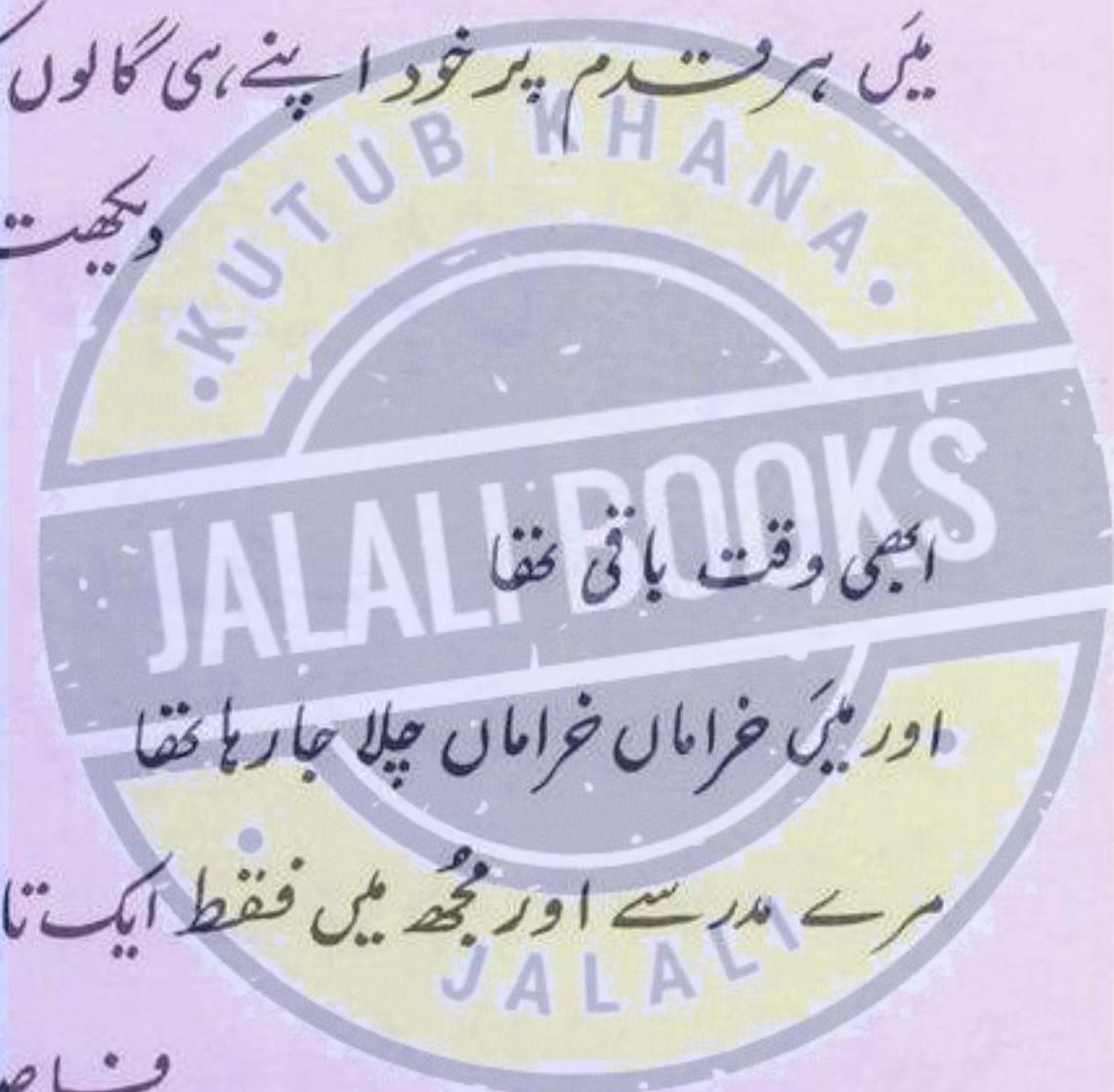
اور ایک دُھندلائے سُورج کو کتنی ہی موہوم قاشوں

میں بانٹے، زمیں پر بچھا تھا

مَیں کچھ سہما سہما سا، کچھ دم بخود سا کھڑا تھا

کہ استاد جی، مدرسے جاتے جاتے مرے پاس ٹھہرے

بڑے پیار سے، مجھ سے کہنے لگے:

"تم نے تالاب کا حال دیکھا؟

گئی رات شدّت کی سردی پڑی تھی

سو تالاب کی سطح نے منجمد ہو کے، تالاب کی ساری

صُورت بدل دی

ابھی دُھوپ جب تیز ہوگی

تو تالاب کی سطح چٹخے گی

پھر برف کی چادریں سی، یہاں سے وہاں، تیرتی

اور پگھلتی ہُوئی

آخرِ کار پانی میں گھُل جائیں گی

اور تالاب نیچے سے اُوپر اُبھر آئے گا!"

مُجھ کو پانی پہ رحم آ گیا

ٹھنڈ سے کانپتے کانپتے اس کا کیا حال ہو گا!

اسے برف کے قید خانے سے کیسے رہائی دلاؤں!

اسے دُھوپ میں لا کے کیسے بٹھاؤں!

یکایک مُجھے ہاتھ میں اپنی تختی نظر آ گئی

میں نے یخ سطح پر کھینچ کر اس کو مارا

تو برف ایک دم ٹھیکری ٹھیکری ہو گئی

اور نیچے سے پانی نے اِک قہقہہ مار کر مُجھ سے آنکھیں ملائیں

تو جیسے مُجھے دو جہاں کی خوشی گھڑیوں گھڑیوں مِل گئی!

اب میں دفتر کو جاتا ہُوں

اور اپنی عینک لگی آنکھ سے دیکھتا ہُوں

کہ چاروں طرف سطح پر برف چھائی ہُوئی ہے

مگر میرے ہاتھوں میں تختی نہیں ہے

اُسے میرا علم، اور عمر، اور کتنے کڑے تجربے چھین

کر لے گئے ہیں،

مَیں محبوس پانی کی حالت پہ کُڑھتا ہُوں

اور صرف کُڑھتا ہُوں

اور صرف کُڑھنے سے سُورج چمکتے نہیں

اور برفیں پگھلتی نہیں ہیں!

فروری ١٩٧١ء

۷۰

نقصِ بصارت

معالج نے یہ کل مجھ کو بتایا :
"تری بینائی میں فرق آگیا ہے
تری ضد نے تجھے یہ دن دکھایا
—
اگر کچھ ڈر ہے تجھ کو اندھے پن سے
تو سورج کو نہ دیکھا کر، وگرنہ
چٹخ جائیں گے یہ آئینے، چھن سے!"
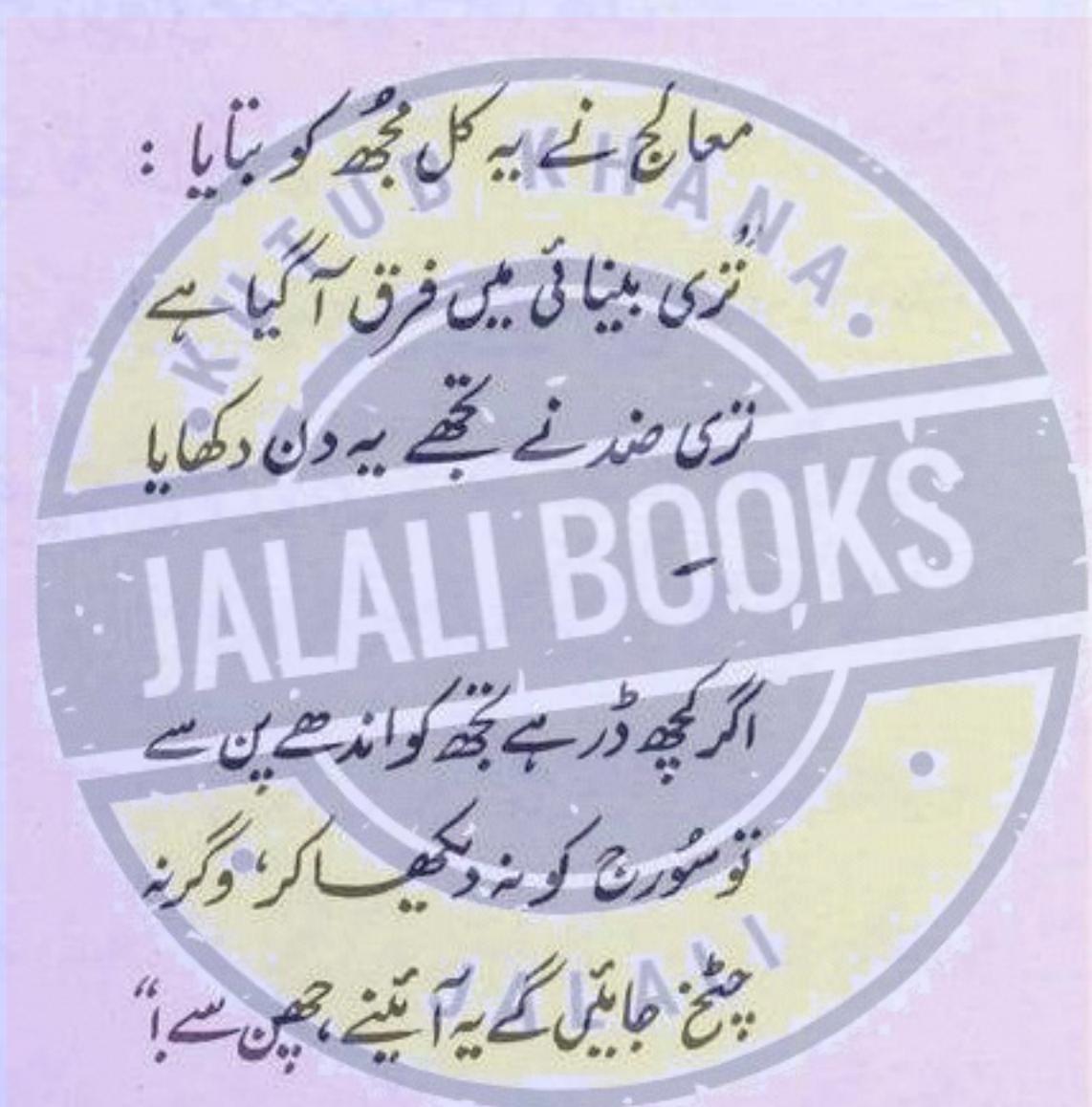
حقیقت کا نظارا کر رہا ہوں
مگر میرے معالج کو گلہ ہے
میں سورج کو مسلسل دیکھتا ہوں

جنوری ۱۹۸۱ء

نوحہ

اطہر نفیس* کی یاد میں

ہم آج خود سے بچھڑنے لگے ہیں تیرے بعد
تو چل بسا ہے کہ ہم مر گئے ہیں تیرے بعد

دلوں کو آبِ روانِ وفا کہاں سے ملے
محبتوں کے چمن جل بجھے ہیں تیرے بعد

ہر ایک شاخ صلیبِ بہار لگتی ہے
شجر شجر سے وہ پتے گرے ہیں تیرے بعد

تُو کیا گیا کہ وہ معیارِ رنگ و بُو بھی گیا
دہانِ زخم ہیں، جو گُل کھلے ہیں تیرے بعد

* وفات : ۲۱- نومبر ۱۹۸۰ء

جدھر نگاہ اُٹھے ، کچھ نظر نہیں آتا
کہ کائنات میں آنسو بھرے ہیں تیرے بعد

تری جہت ہی کچھنی کشش جہات میں ہم نے
تری طرف ہی قدم اُٹھ رہے ہیں تیرے بعد

رہِ سفر ، کہ جو باقی ہے ، کون کاٹے گا
دیے حیات نے گُل کر دیے ہیں تیرے بعد

۲۱۔ نومبر ۱۹۸۰ء (شب)

کیا اسیری ہے کیا رہائی ہے!
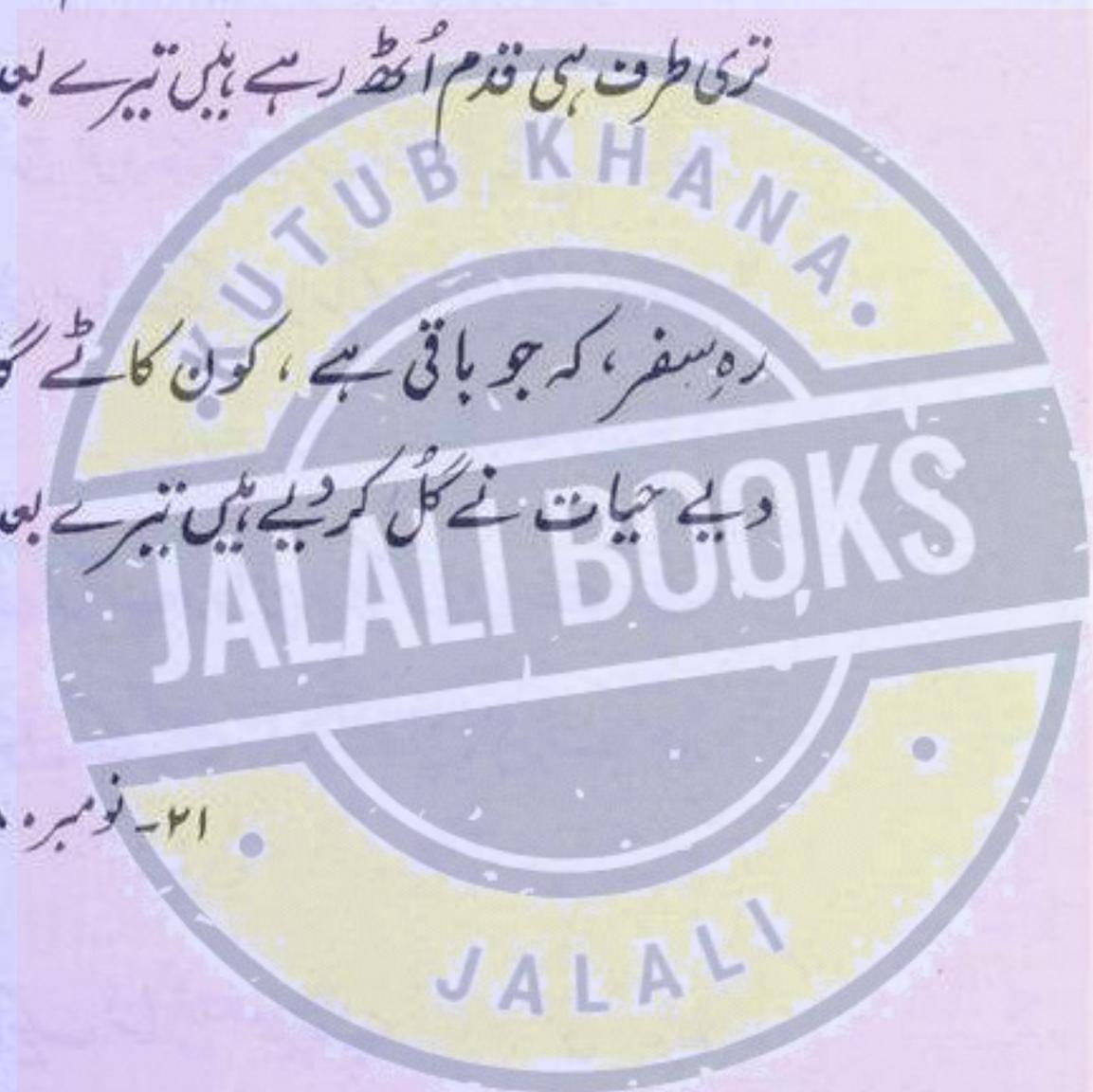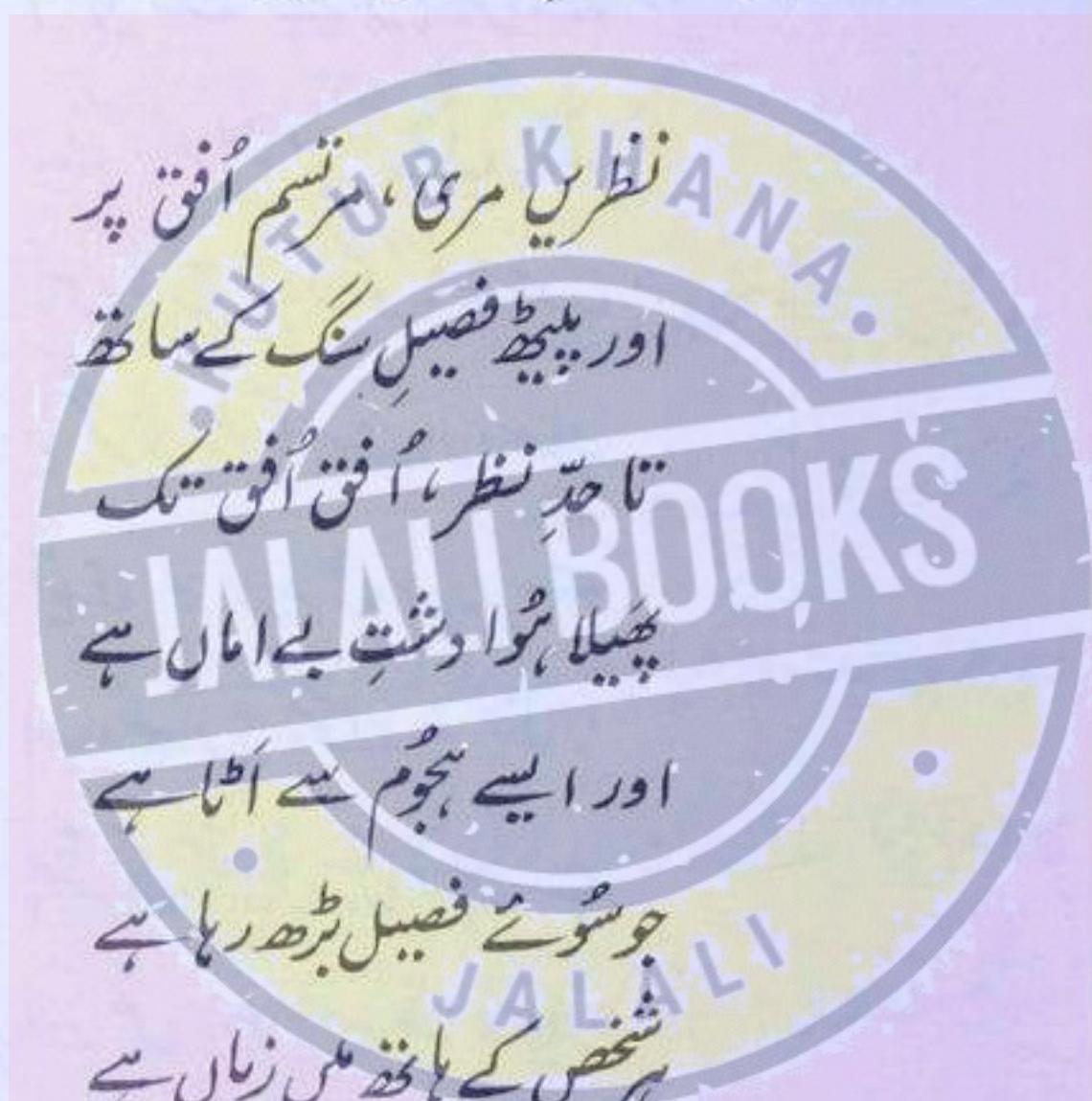
نظریں مری، مرتسم اُفق پر
اور پلیٹھ فصیلِ سنگ کے ساتھ
تا حدِّ نظر، اُفق اُفق تک
پھیلا ہُوا دشتِ بے اماں ہے
اور ایسے ہجُوم سے اَٹا ہے
جو سُوئے فصیل بڑھ رہا ہے
ہر شخص کے ہاتھ میں زباں ہے
چابک کی طرح جو چل رہی ہے
ہر شخص کی رُوح، باہر آ کر
اور جسم کا انضمام کر لبادہ
بچّے کی طرح مچل رہی ہے
آنکھوں سے شرار گر رہے ہیں

ملبوس میں آگ جل رہی ہے
القصّہ، بہت عجب سماں ہے

بِکھرا ہُوا یہ ہجُوم سارا
دشمن سے مجھے رہا کرانے
لے کر مرا نام، یوں پکارا
جس طرح پہاڑ گُونجتے ہوں
یا گِرتا ہو آبشار دھارا
قیدی کو نوید مل رہی ہے
اب دیکھ رہا ہُوں یہ نظارا
بِھنّور کی فصیل ہل رہی ہے
اور مَیں، جو اسیر تھا بچارہ
ملبے میں کچل کر اور دب کر
ملبے کی طرح بِکھر گیا ہُوں
اے ہم نفسانِ درد! مجھ کو
کچھ میرا سراغ دو، خدارا!

ستمبر ۱۹۸۰ء

خرید و فروخت

وہ مجھے بیچنے نکلا ہے

مگر کون خریدے گا مجھے!

وہ مری غیرت و معیارِ حمیّت کو کہاں بیچے گا!

یہ وہ اجناس ہیں جن کی کوئی قیمت ہی نہیں

اور قیمت کوئی دینے کو جو تیار ہو

وہ پوری زمیں
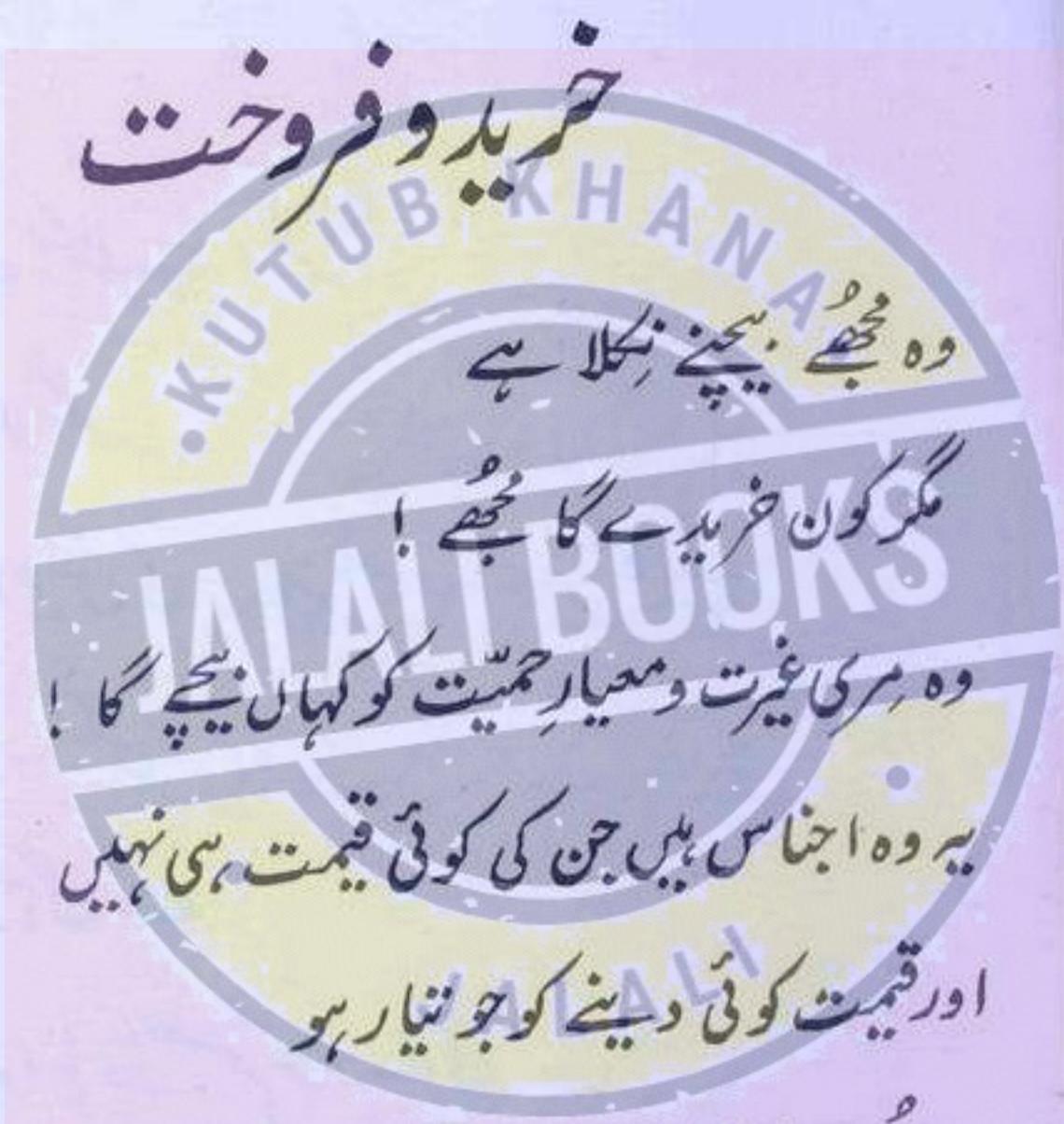
اور ستارے جو زمیں سے نظر آتے ہیں

کہاں سے دے گا؟

وہ مجھے بیچنے نکلا ہے

مگر میرا ضمیر اتنا گراں ہے

کہ مجھے کوئی خریدے گا تو بِک جائے گا

اور بِک کر بھی مرے دام نہ دے پائے گا

وہ مجھے بیچنے نکلا ہے مگر

میرے آقا کو اگر

فرش سے تا عرش کی ہر چیز تھما دے مرا گاہک

تو تھما دے — لیکن

مجھ میں وہ آگ ہے

جو بڑھتا ہُوا ہاتھ بھسم کر دے گی
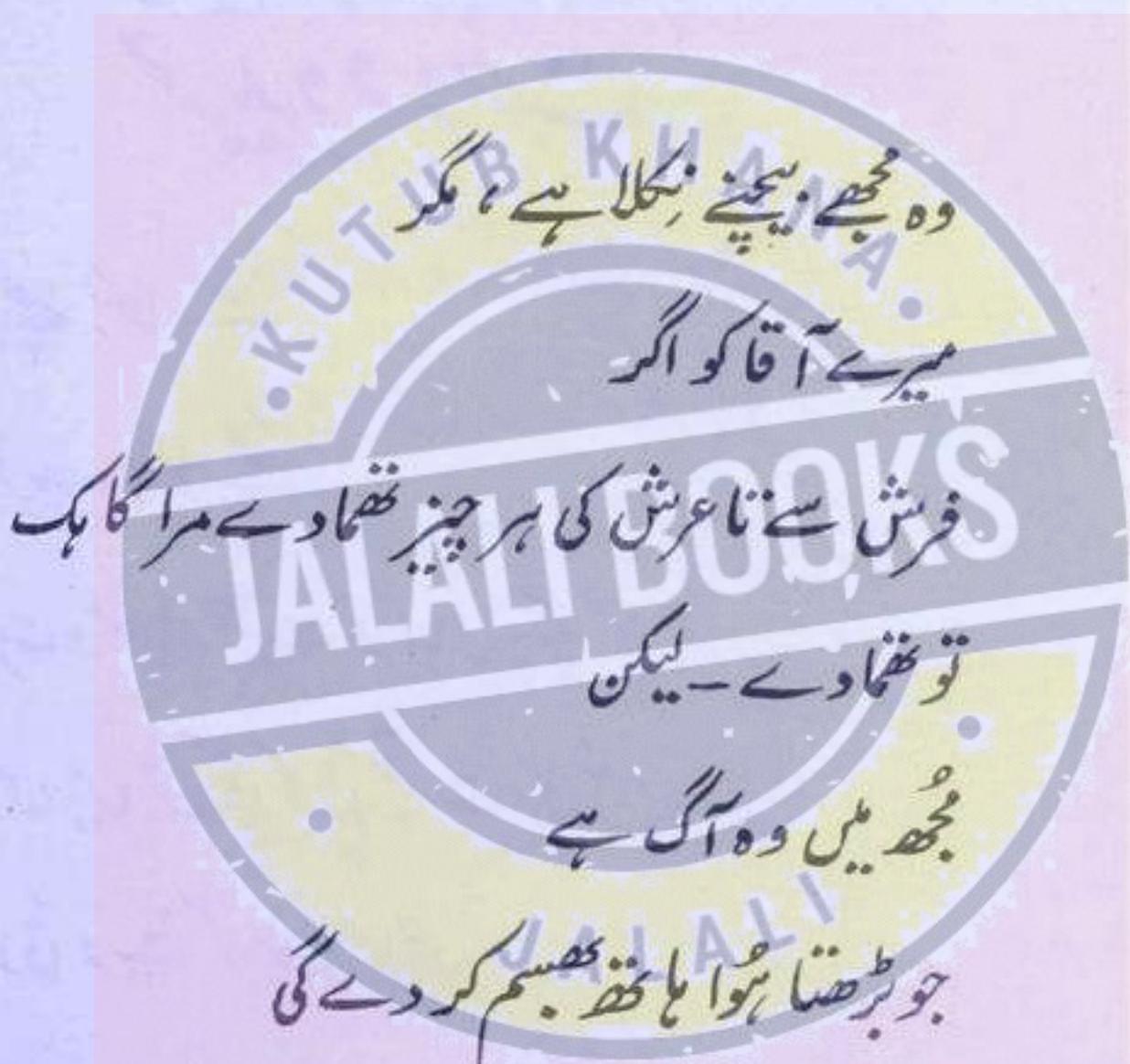
صرف اِک چیز ہی قیمت مری کم کر دے گی

بے ضمیری — کہ جو ہستی کو عدم کر دے گی

ستمبر ۱۹۸۰ء

ڈر

ہم بھی کیا لوگ ہیں

جو زیست سی نعمت کو بھی

ڈر ڈر کے بسر کرتے ہیں

ہم یہ کہتے ہیں
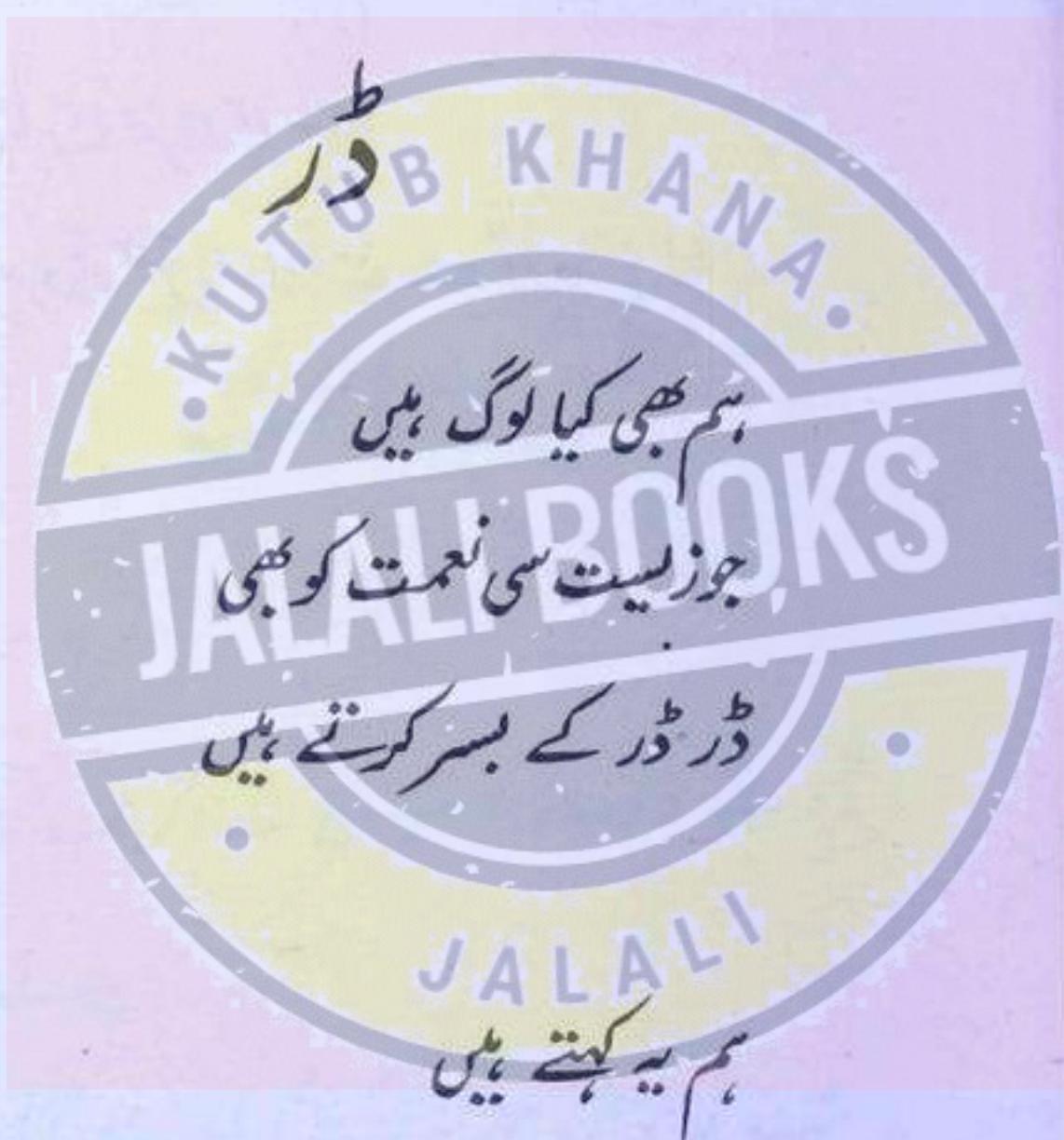
کہ جو پھول کھِلا ہے، اسے مُرجھانا ہے

لیکن اس پھول کو کھِلنے کی تو کچھ داد ملے

اس کا یہ عزم تو دیکھو

کہ وہ اس علم کے باوصف کھِلا ہے

کہ بالآخر اسے مُرجھانا ہے !

رنگ و بُو کا یہ صحیفہ ہے

اسے ڈر سے نہیں۔ چشمِ محبت سے پڑھو

اور ڈرنا ہی ضروری ہے

تو پھر مردنیِ حسّ لطافت سے ڈرو !

اگست ۱۹۸۰ء

نطق و سماعت
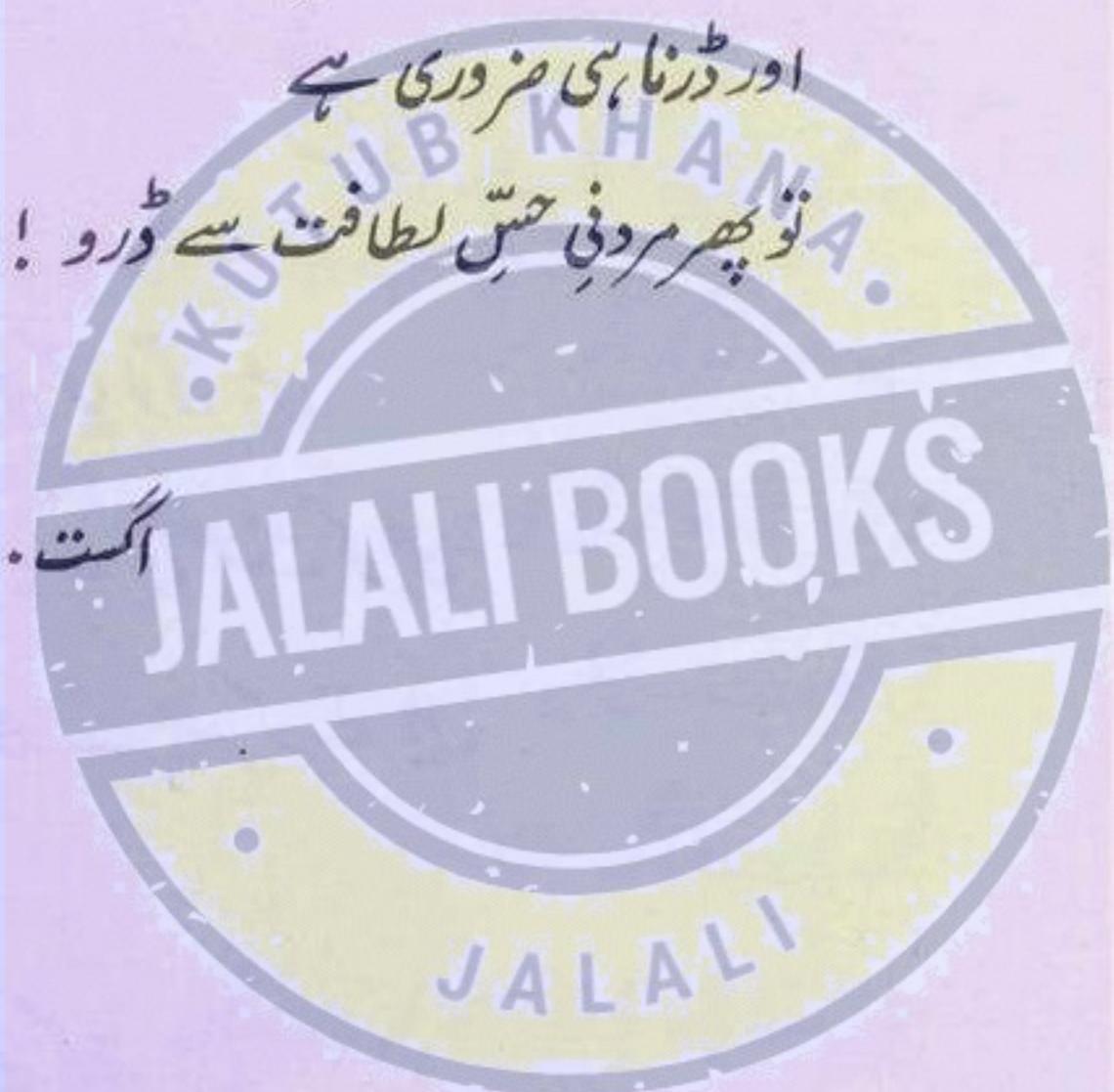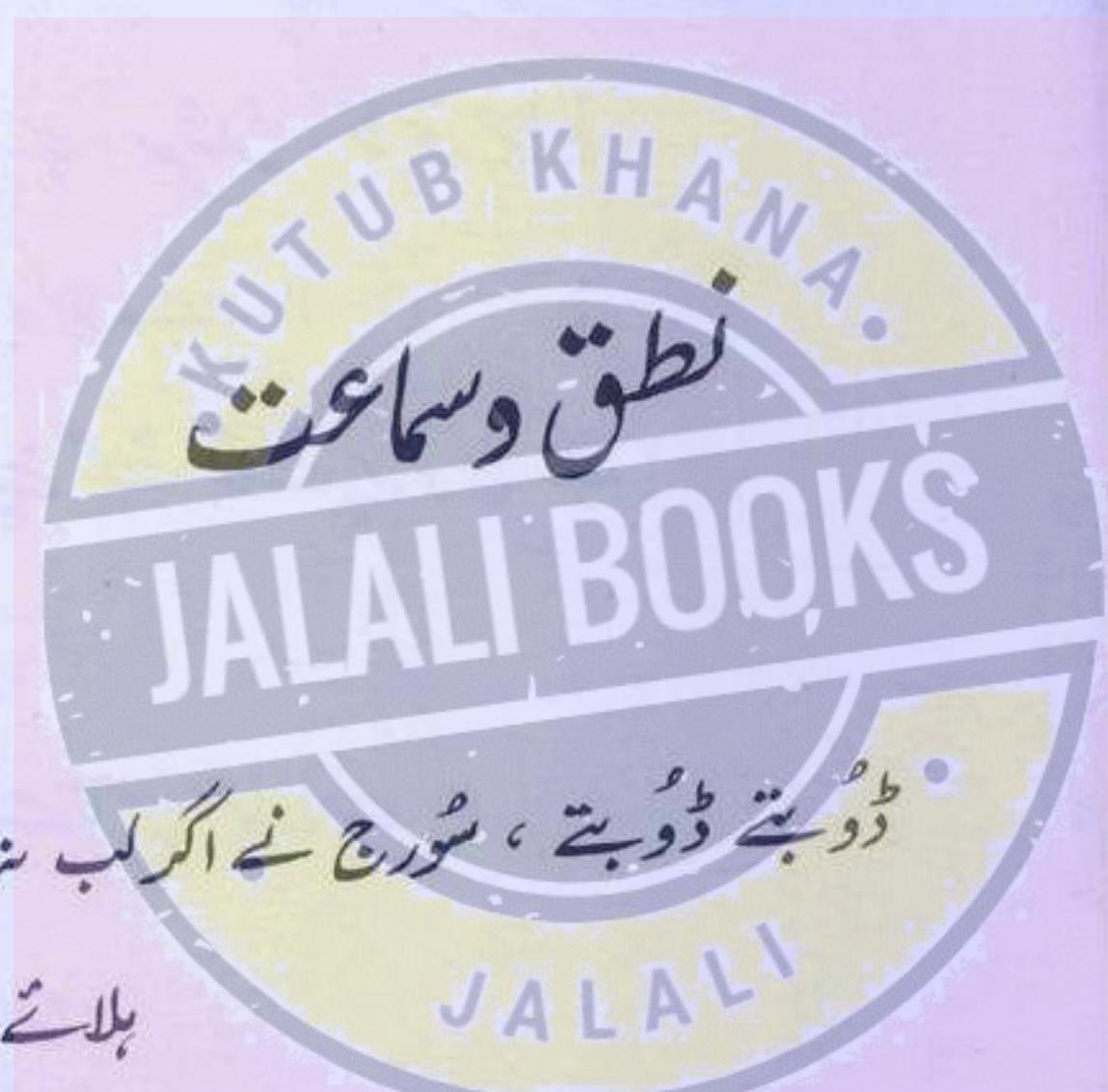
ڈوبتے ڈوبتے، سورج نے اگر لب نہ
ہلائے ہوتے
شبِ خاموش میں یہ گونج کہاں سے آتی!

مَیں نے پتھّر کو جو پتھّر سے بجایا ہے
تو کہسار میں اِک قہقہہ گونجا ہے — جیسے
جوشِ اظہار میں لفظوں کا دھماکا کہیے!

کچھ تو کوئل نے کہا ہے

کہ وہ کوکی ہے

تو دل میں کوئی شے ٹوٹی ہے!

کچھ تو کہتی ہے، سرِ شاخ، تڑپتی چڑیا

کہ وہ جب بولتی ہے

کائنات اپنے سمیٹے ہوئے پر تولتی ہے!

کرّہ خاک سے تا سبع سماوات

سبھی بولتے ہیں
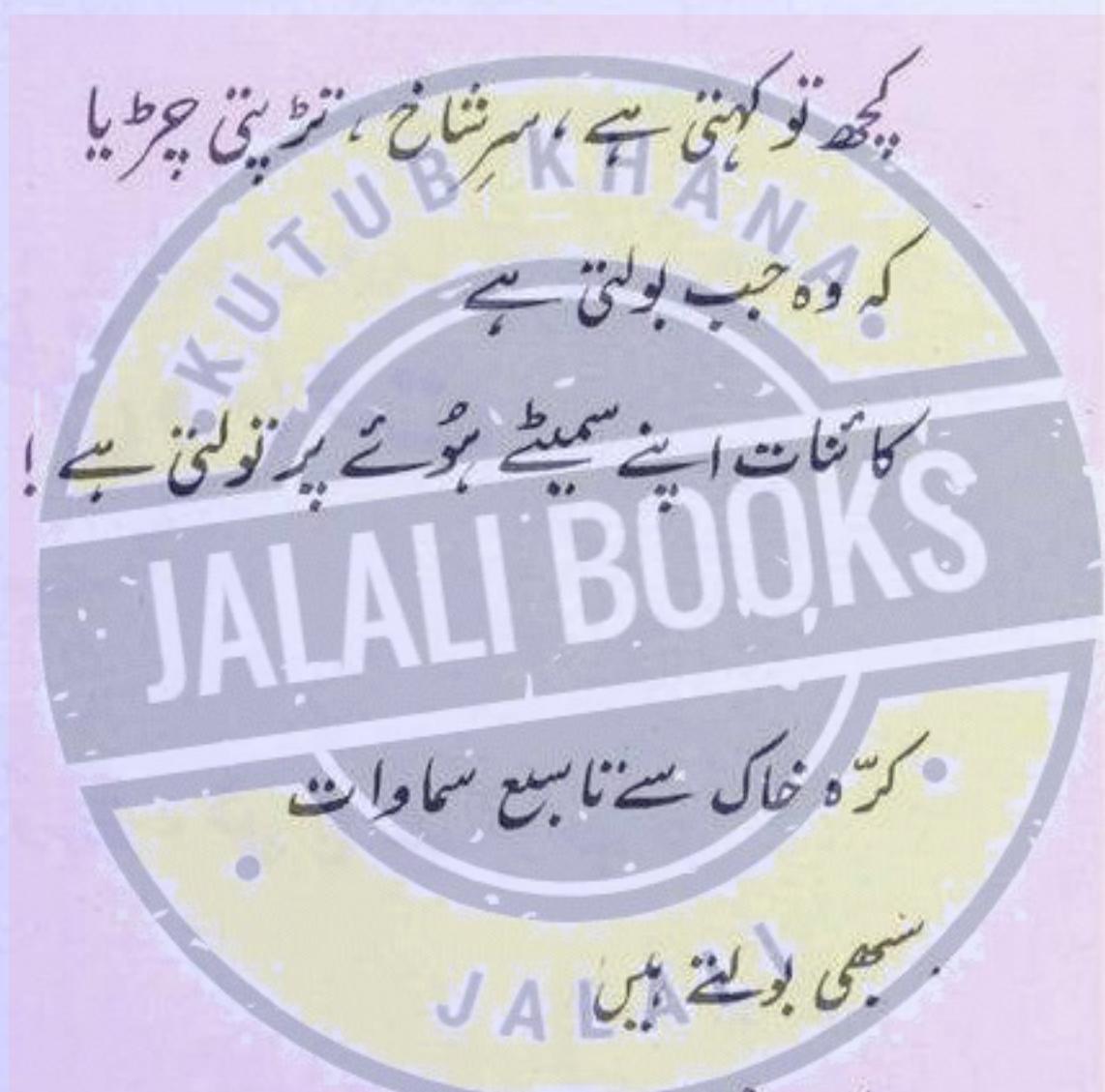
اور سبھی سنتے ہیں

ہاں، مگر نطق سے تا حدِّ سماعت

جو مسافت ہے

مفاہیم کے بچھولوں سے اَٹی رہتی ہے

اور لوگوں کو یہاں

رنگ سے رغبت ہے، نہ نکہت سے لگاؤ کوئی

وہ فقط بولتے ہیں

اور فقط سُنتے ہیں

اگست ۱۹۸۰ء

حیوانِ ناطق
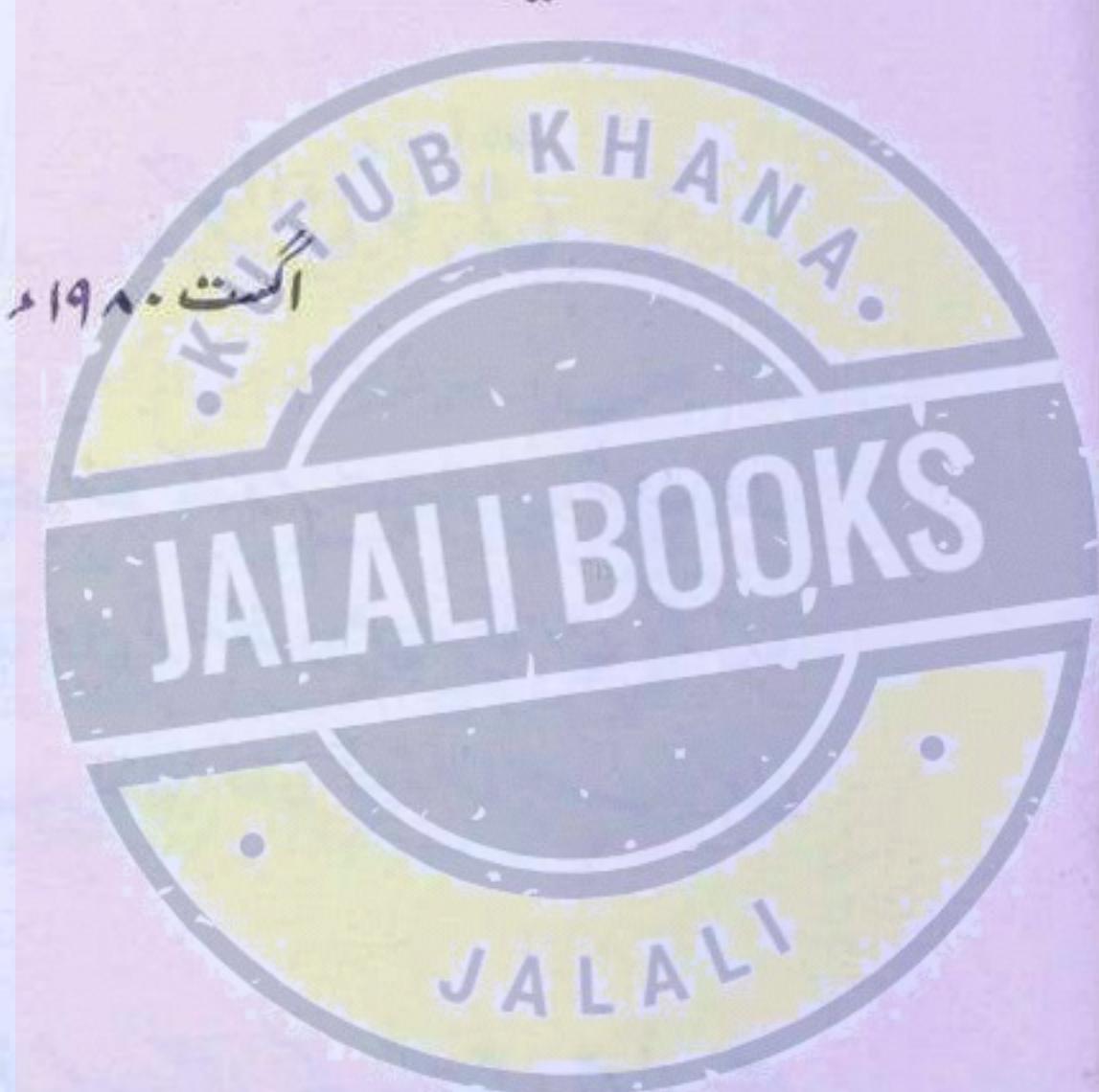
میں اپنے لفظ کے دم سے جہاں میں اشرف ہوں
میں سوچتا ہوں تو لفظوں میں سوچتا ہوں، کہ میں
بغیرِ لفظ فقط تودۂ عناصر ہوں

زباں تو خیر سبھی کے دہن میں ہوتی ہے
وہ گُلدُمیں ہوں کہ چڑیاں، وہ مور ہوں کہ چکور
وہ تیندوے ہوں کہ اژدر، وہ اسپ ہوں کہ شتر
وہ باز ہوں کہ کبوتر، شغال ہوں کہ غزال
مگر زباں کو وہ الفاظ سے سجاتے نہیں
وہ حرف و صوت کے رشتوں کو آزماتے نہیں

مَیں آج لفظ کا اِک معجزہ دکھاؤں گا
بھڑک رہا ہے جو شعلہ سا، میرے باطن میں
اسے مَیں لفظ کی زنجیر میں کروں گا اسیر
زباں پہ لاؤں گا، عالم میں عام کر دُوں گا

مگر یہ میری زباں ہے کہ سنگ ریزہ ہے!
صدا سے لفظ کا اعزاز کس نے چھین لیا!
ہزار لفظ سنور کر زباں پہ آتے ہیں
مگر لبوں کی حدوں سے گزر نہیں پاتے
تڑپ تڑپ کے وہیں ٹُوٹ پھُوٹ جاتے ہیں

یہ اور بات کہ مَیں عام جان دار نہیں
مَیں اپنے لفظ کے دم سے جہاں میں اشرف ہوں

جولائی ۱۹۸۰ء

زندگی کے لیے ایک نظم

زندگی !

مَیں کہاں تک ترے اِک چراغِ گریزاں کا پیچھا کروں !

زندگی !

میرے تلووں میں اتنے پھپھولے ہیں

جتنے ترے گزرے لمحات ہیں !
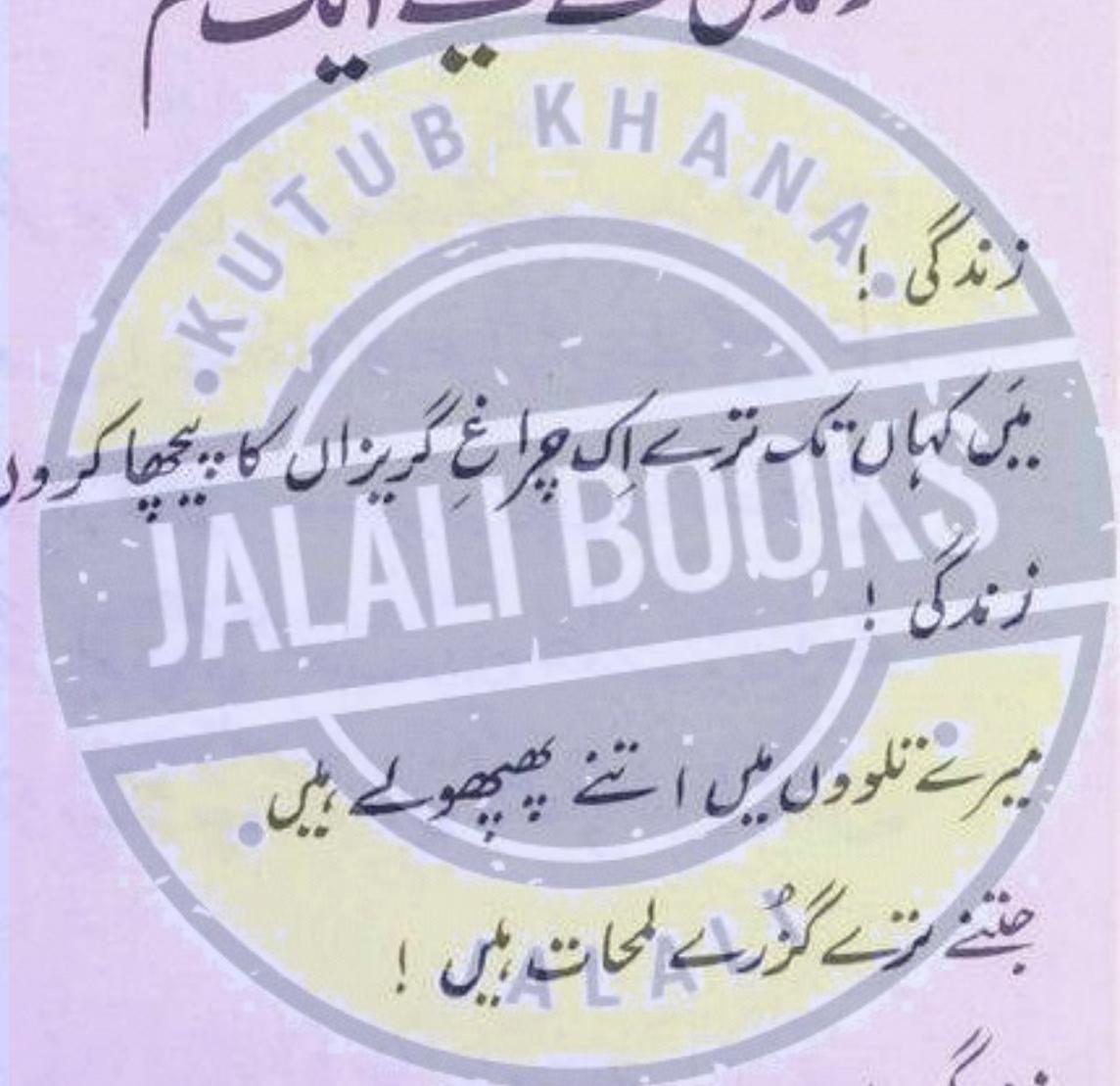
زندگی !

میرے اندر جو تنہائیوں کے خلا ہیں

وہ تیری عطا ہیں !

مَیں زندہ رہا تو ترے نام کی لاج رکھنے کو زندہ رہا

ورنہ مرنا تو ـــــ

اے زندگی !

— اتنا آسان ہے

جتنا دشوار ہے زندہ رہنا !

زندگی !

اب میں تھک سا گیا ہوں

مجھے حسنِ انساں بھی

اور حسنِ فطرت بھی

اور حسنِ تخیّل بھی

کچھ ادھورے سے لگتے ہیں

جھومر میں جیسے فقط ایک نگ کی کمی

پورے جھومر کی تکمیل پر حرف لاتی ہے
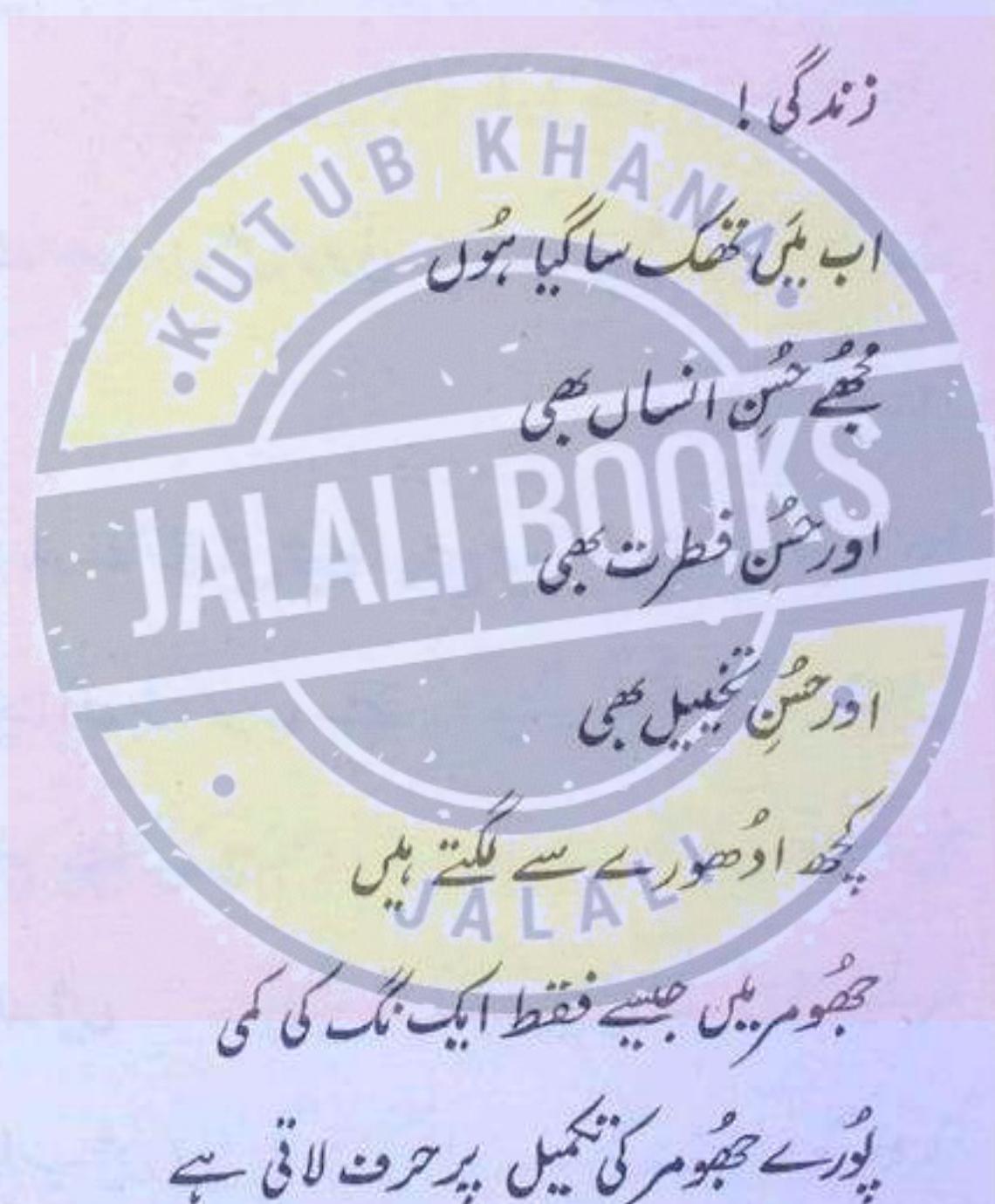
ہر چیز پژمردہ ہے

اب نیا پھول بھی اپنی خوشبو کو زنجیر کہتا ہے

اور ایسی زنجیر میں قید رہنے سے افسردہ ہے!

آج میں رات بھر صُبح کی راہ تکتا رہا

اور جب صُبح آئی

تو جیسے وہ مریم ہے

جو رات بھر

اپنی پاکیزگی کے حصاروں میں روتی رہی ہے!

میں اب ڈر کے مارے نگاہیں جھکا کر ہی چلتا ہُوں

اب سامنے دیکھنا اِک بڑا کرب ہے

سامنے ایک ملبہ ہے — !

ٹُوٹے ہُوئے در ہیں
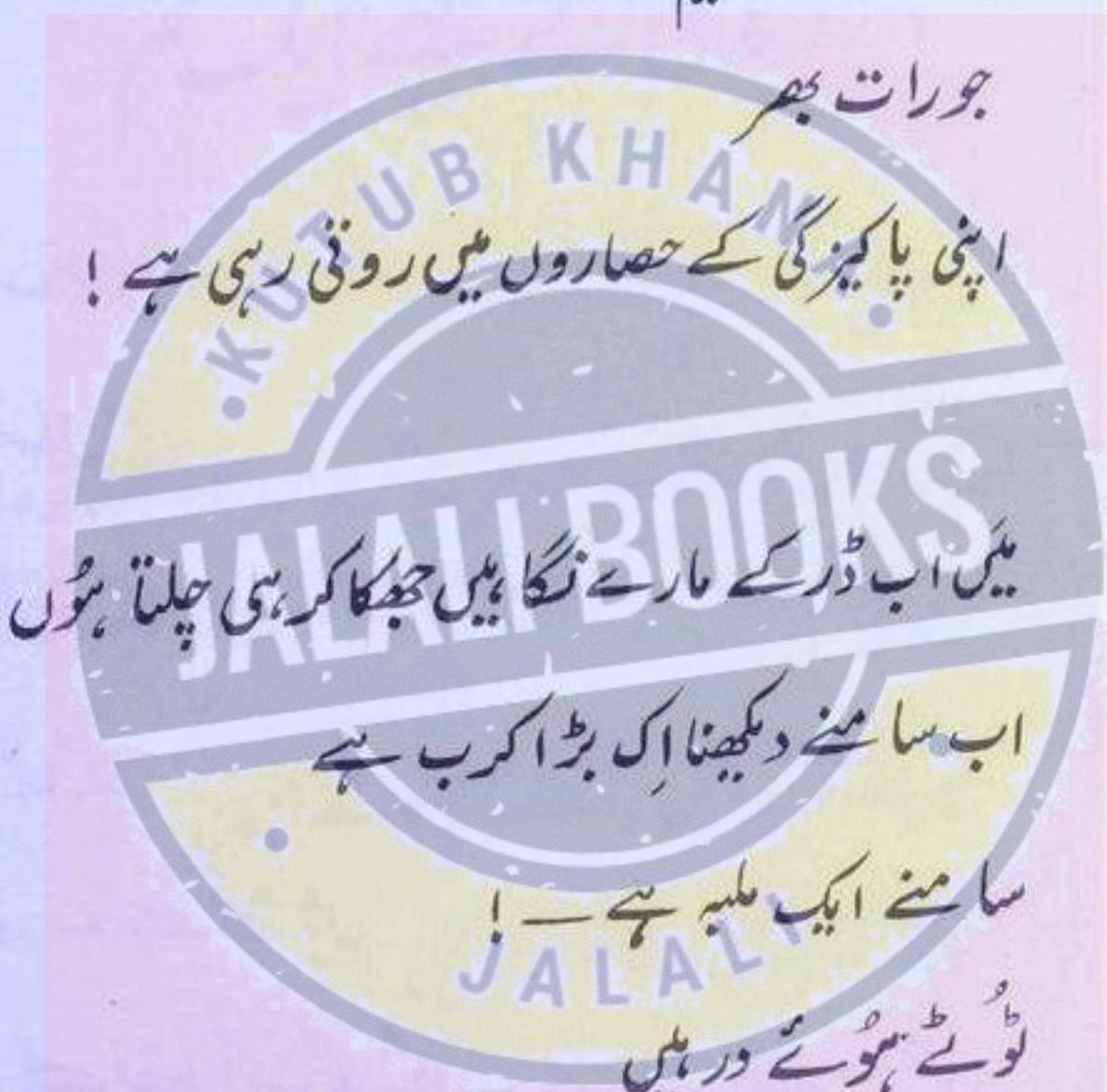
(یعنی مرے خواب ہیں)

اور کچُلے ہُوئے سر ہیں

(جو تیرے برتاؤ ہیں)

اور ان سب پہ بکھری ہُوئی

آسمانوں کے بِلّور کی کِرچیاں ہیں!

زندگی!

تُو بہت خوبصُورت سہی

مجھ سے میری محبّت بھی کم خوبصورت نہ تھی!

میَں نے ہر جسم میں

اور ہر عکس میں

اور ہر سائے میں

تیرے پر تو اُجاگر کیے

میَں نے انسان کو تجھ سے اک والہانہ محبّت کی تلقین کی

مرنے والوں کے حق میں دعا کی تو یہ کی

کہ وہ دُوسری زندگی — دائمی زندگی میں

سلیقے سے زندہ رہیں

موت کے خوف کے ختم ہونے پہ بھی

حُسن و خیر اُن کا کردار ہو

ان کا اپنا ضمیر ان کا معیار ہو!

زندگی!

اب تو میرے قریب آ

مجھے لمس کی حدتیں بخش

میرے لہو میں اُتر

اور میری تھکن کو سمیٹ اس طرح

جیسے جاتا ہوا آفتابِ جہاں تاب

اپنی شعاعیں سمیٹے!

مئی ۱۹۸۰ء
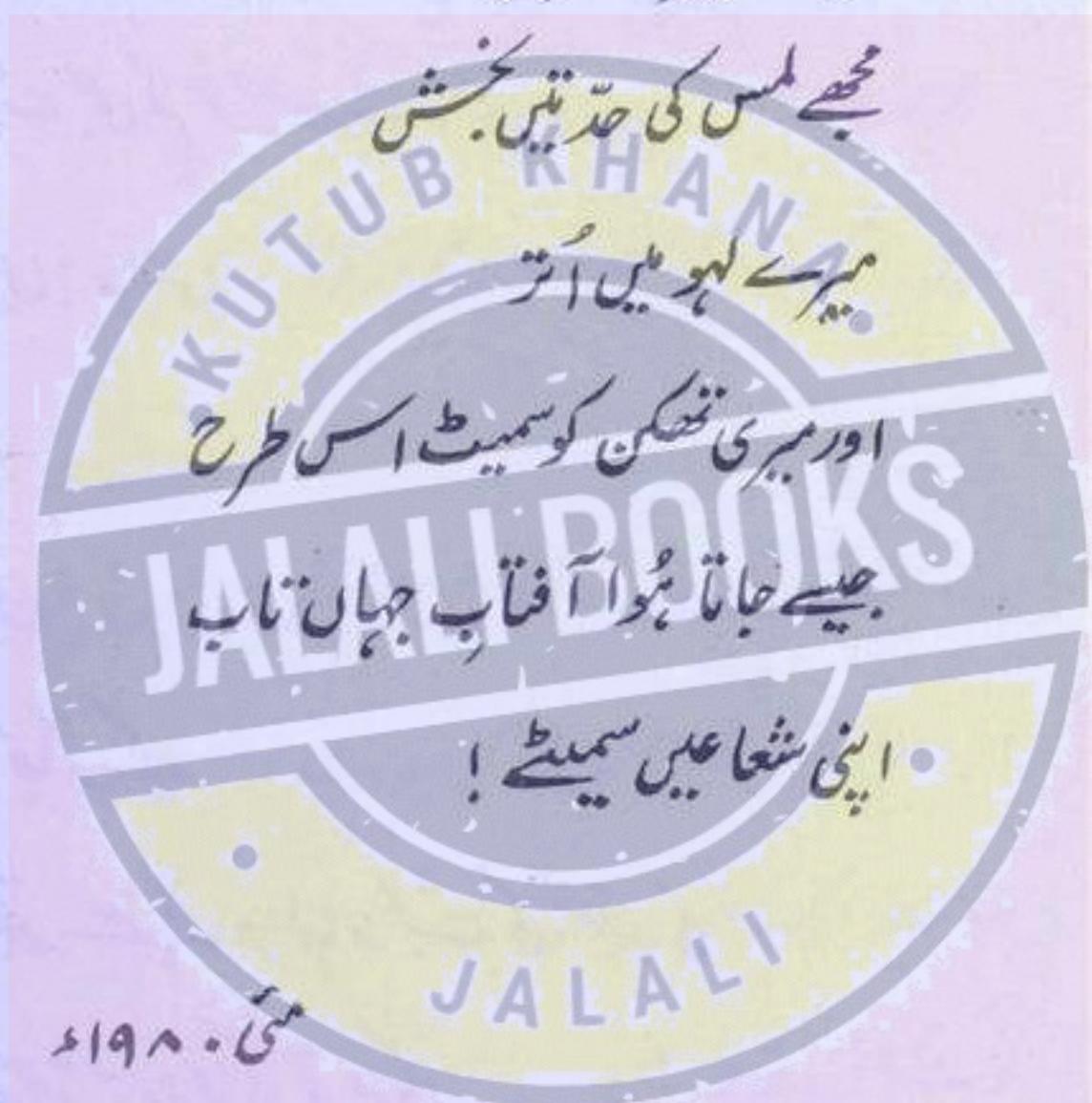
حشر

خدایا
اب کوئی مخلوقِ نو تخلیق کر
انساں کی تخلیق تیری آخری تخلیق کیسے ہے !
کہ تیرے کائناتی دائروں میں
ہر گھڑی گردش نہ ہو تو محوروں کی دھجیاں اُڑ جائیں
جیسے انساں
ان گنت صدیوں کی یکسانی سے اُکتا کر
کسی لمحے —
کسی بھی بے بصر لمحے
خود اپنی دھجیاں ہاتھوں میں لے کر
تیرے در پر آنے والے ہیں !

مارچ ۱۹۸۰ء

وطن کے لیے ایک دُعا

خدا کرے ۔ کہ مری ارضِ پاک پر اُترے
وہ فصلِ گُل، جسے اندیشۂ زوال نہ ہو

یہاں جو پھُول کِھلے، وہ کِھلا رہے صدیوں
یہاں خزاں کو گزُرنے کی بھی مجال نہ ہو

یہاں جو سبزہ اُگے، وہ ہمیشہ سبز رہے
اور ایسا سبز، کہ جس کی کوئی مثال نہ ہو

گھنی گھٹائیں یہاں ایسی بارشیں برسائیں
کہ پتھّروں سے بھی، روئیدگی محال نہ ہو

خدا کرے ۔ کہ نہ خم ہو سرِ وقارِ وطن
اور اس کے حسن کو تشویشِ ماہ و سال نہ ہو

ہر ایک فرد ہو تہذیب و فن کا اوجِ کمال
کوئی ملول نہ ہو، کوئی خستہ حال نہ ہو

خدا کرے ۔ کہ مرے اِک بھی ہموطن کے لیے
حیات جرم نہ ہو، زندگی وبال نہ ہو

خدا کرے ۔ کہ مری ارضِ پاک پر اُترے
وہ فصلِ گُل جسے اندیشۂ زوال نہ ہو

مارچ ۱۹۸۰ء

فن اور غیر فن

ابابیلوں نے

نیلے آسمانوں پر

اڑانوں سے

عجب قوسیں بنائی ہیں!

اگر یہ سب کی سب قوسیں

ہنرمندانِ فن کے موقلم چُن لیں

تو کوئی بھی انھیں شہپارۂ فن کیسے مانے گا

کہ فن

اس عصرِ بے محور میں

اِس ہنگامۂ ابہام میں

اس لمحۂ تجرید میں

اتنا حسیں

اتنا کھرا

اتنا حقیقی

اور صداقت کے قریں، ہوگا

تو وہ کچھ اور ہوگا

فن نہیں ہوگا!

مارچ ۱۹۸۰ء

بدستور

جھٹپٹے کے غرفے ہیں
لمحے اب بھی مِلتے ہیں
صُبح کے دُھندلکے میں
پُھول اب بھی کِھلتے ہیں
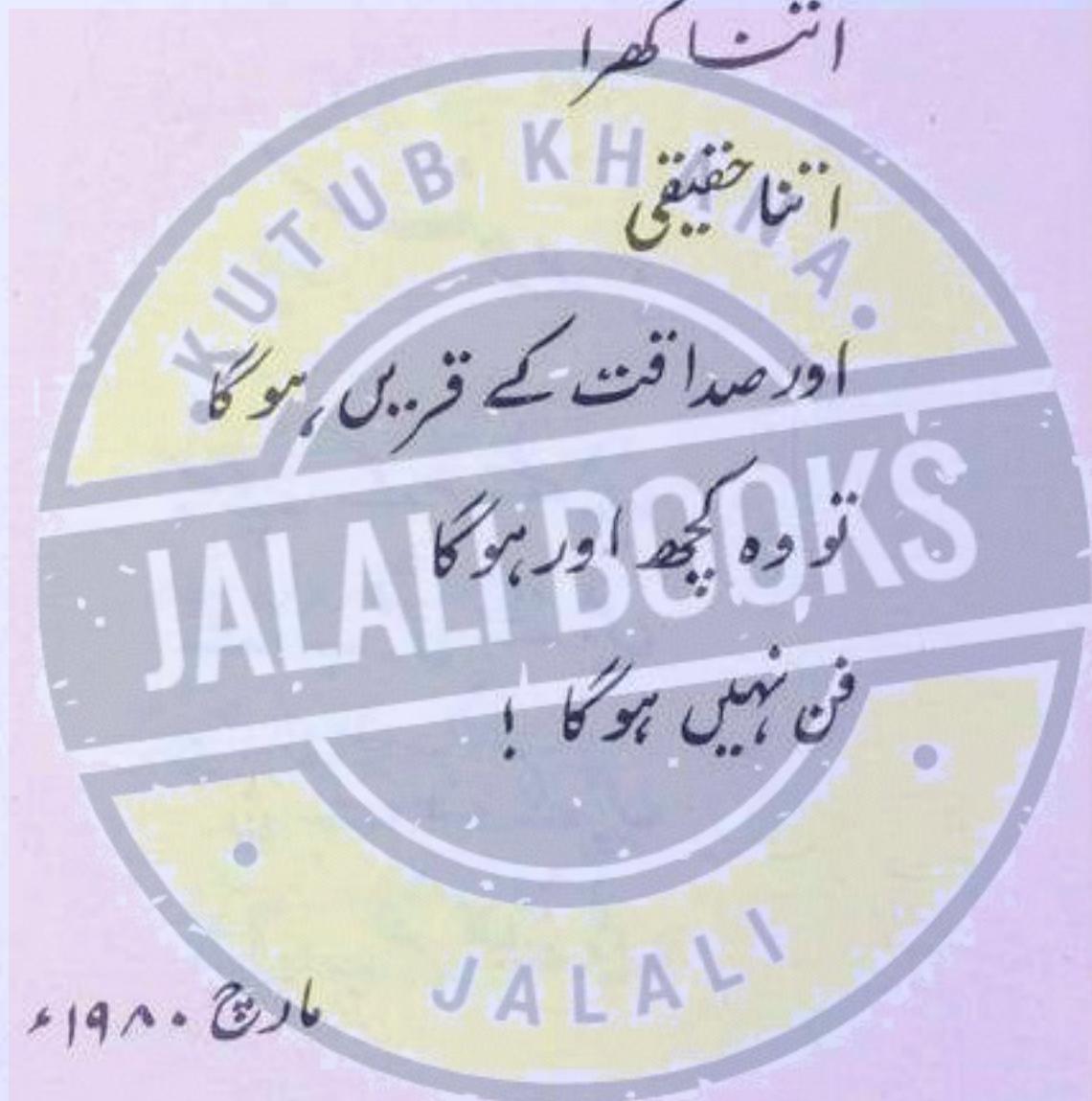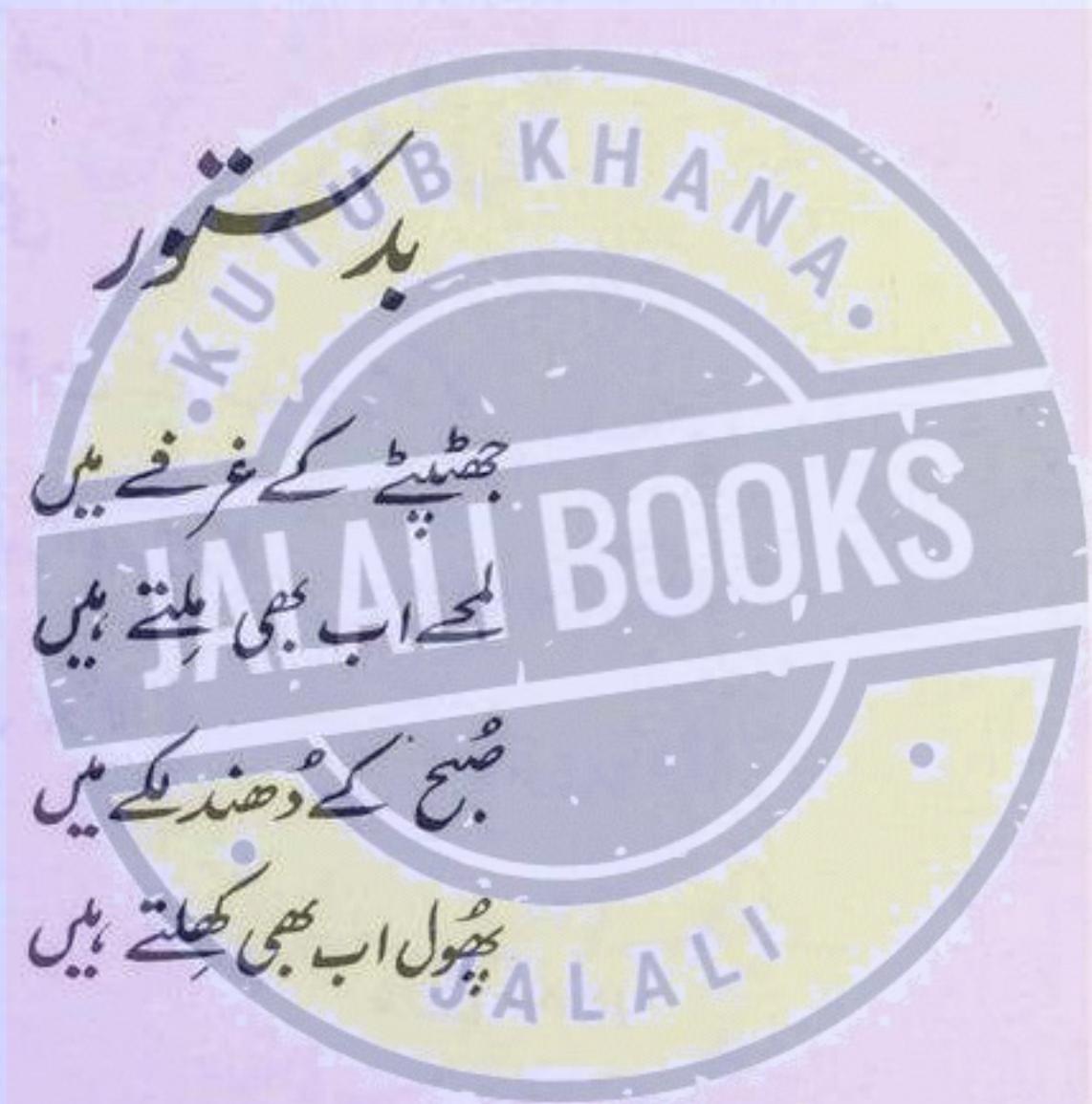
اب بھی کوہساروں پر
سرکشیدہ ہریالی
پتھّروں کی دیواریں
توڑ کر نِکلتی ہے

اب بھی آب زاروں پر
کشتیوں کی صورت میں
زیست کی توانائی
زاویے بدلتی ہے

اب بھی گھاس کے میداں
شبنمی ستاروں سے
میرے خاک داں پر بھی
آسماں سجاتے ہیں
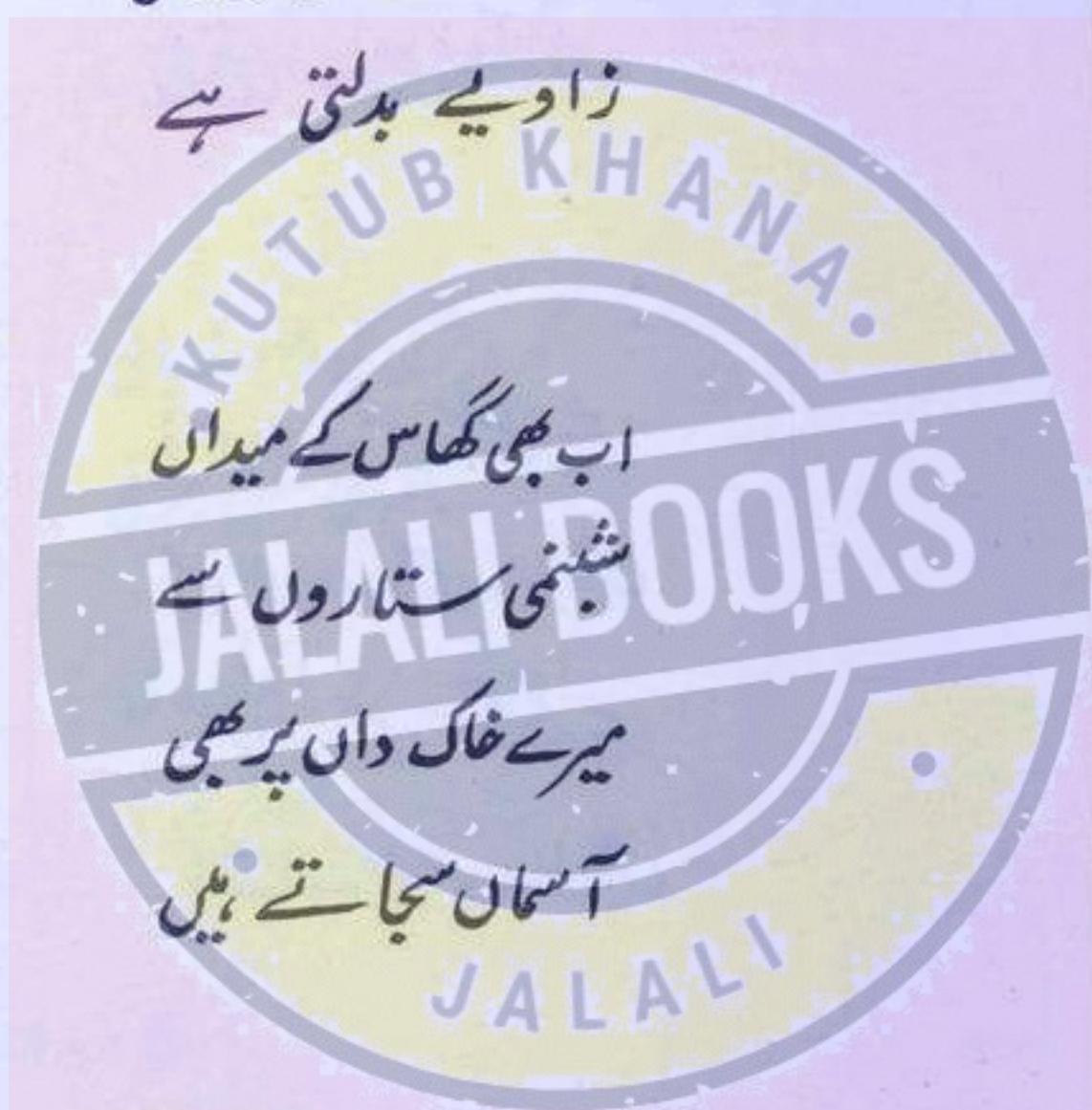
اب بھی کھیت گندم کے
تیز دھوپ میں تپ کر
اس غریب دھرتی کو
زرفشاں بناتے ہیں

سائے اب بھی چلتے ہیں

سُورج اب بھی ڈھلتا ہے

صبحیں اب بھی روشن ہیں

راتیں اب بھی کالی ہیں
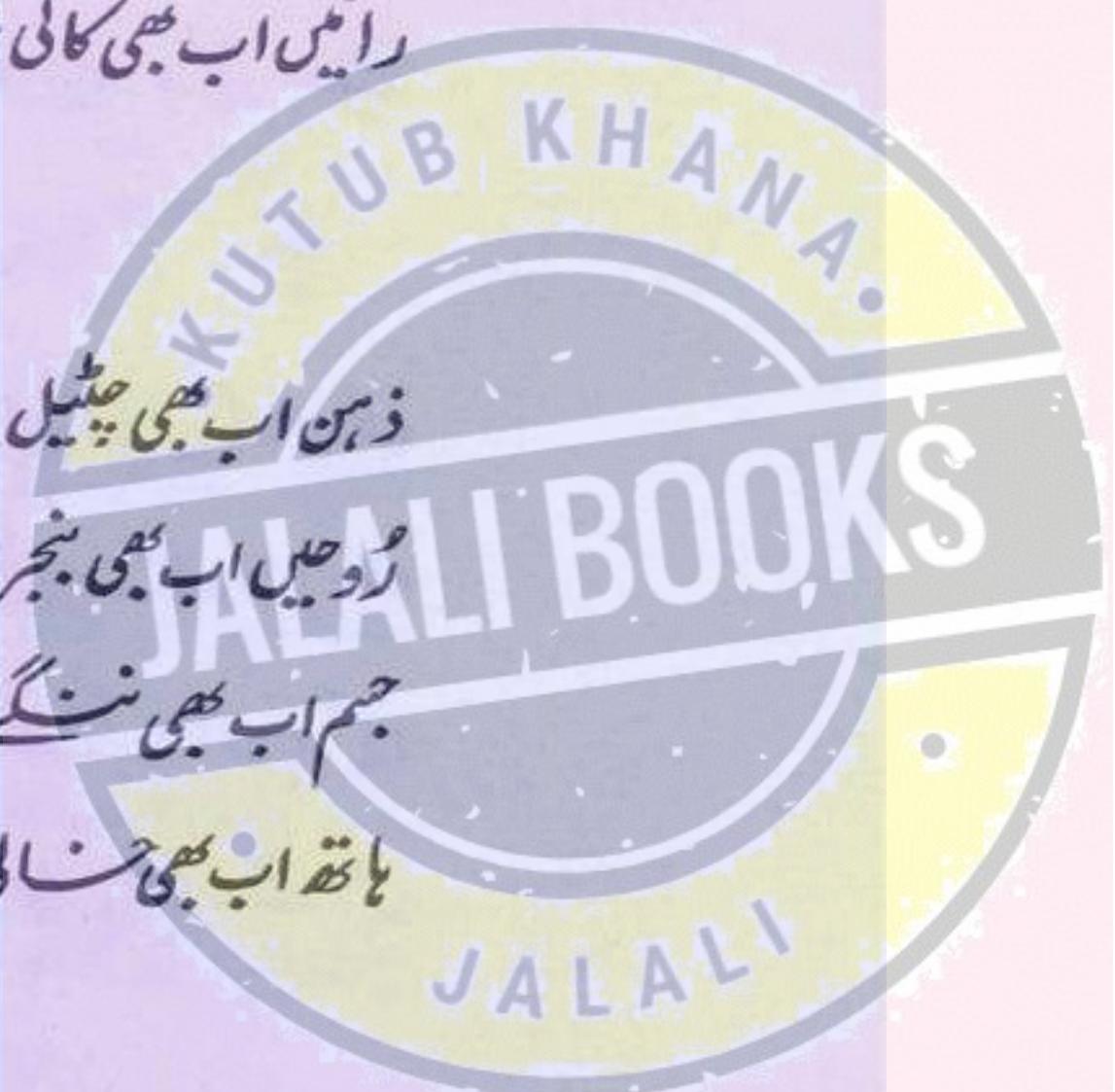
ذہن اب بھی چٹیل ہیں

رُوحیں اب بھی بنجر ہیں

جسم اب بھی ننگے ہیں

ہاتھ اب بھی خالی ہیں

اب بھی سبز فصلوں میں

زندگی کے رکھوالے

زرد زرد چہروں پر

خاک اوڑھے رہتے ہیں

اب بھی ان کی تقدیریں
منقلب نہیں ہوتیں
منقلب نہیں ہوں گی
کہنے والے کہتے ہیں

گردشوں کی رعنائی
عام ہی نہیں ہوتی
اپنے روزِ اوّل کی
شام ہی نہیں ہوتی

مارچ ۱۹۸۰ء

تمازتِ عصر

اس قدر تیز تمازت میں کوئی کیا بولے
بول ہونٹوں پہ جب آتا ہے تو جھُن جاتا ہے
ایک اِک حرف پہ ہوتا ہے شرارے کا گماں
ایک اِک لفظ الاؤ سا نظر آتا ہے
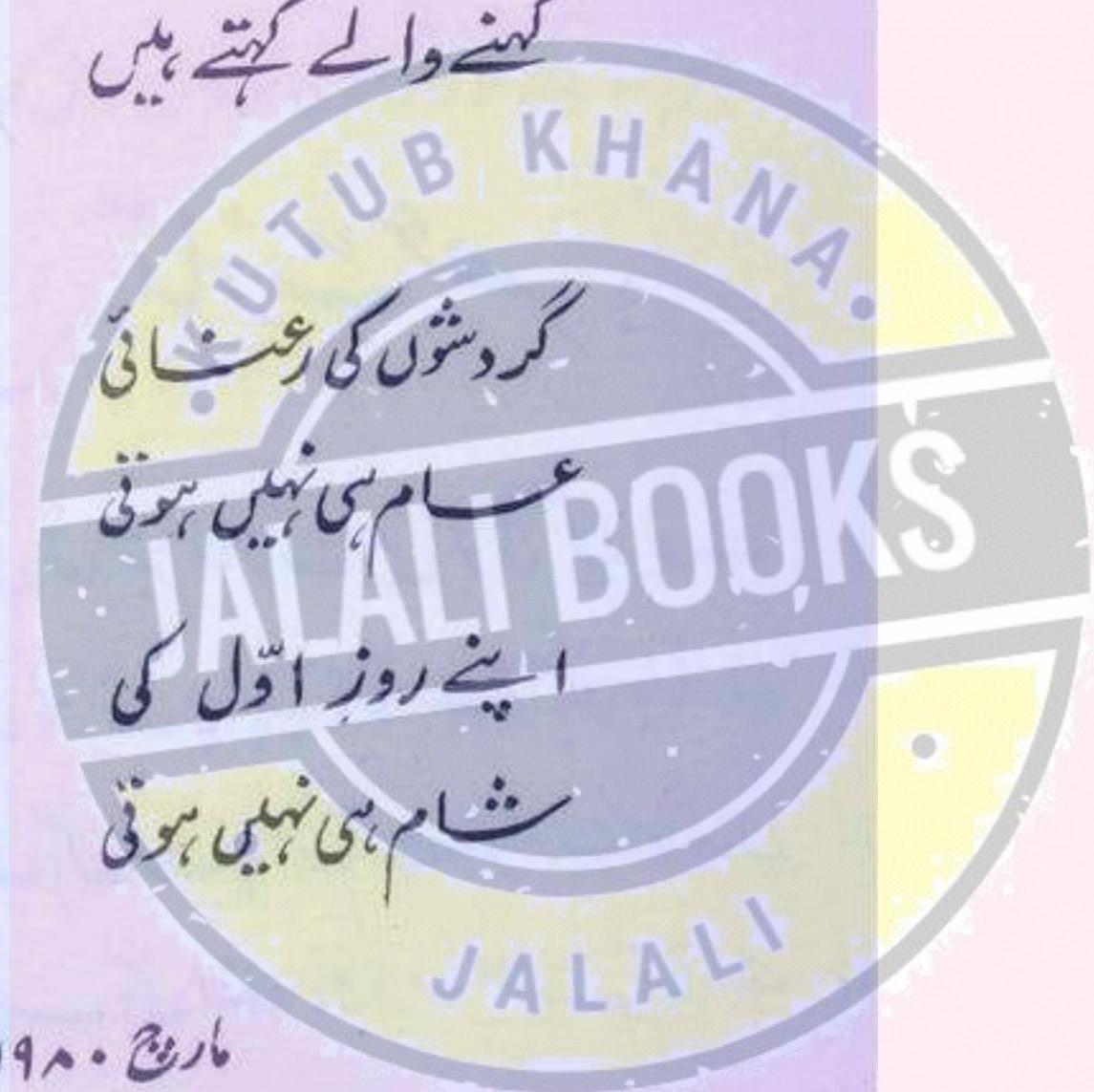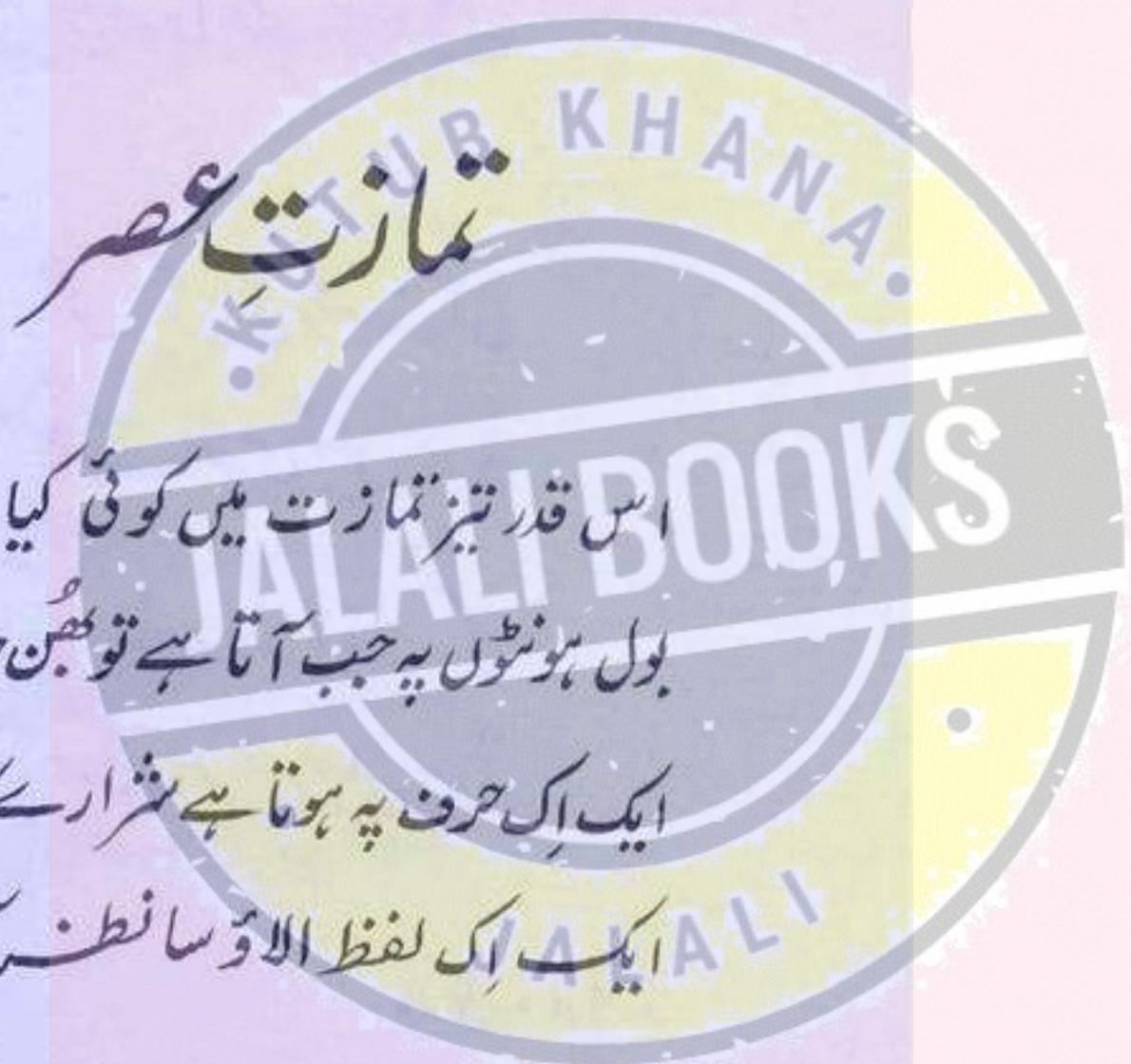
سُلگ اٹھتا ہے جب اظہار کا دامانِ حریر
سُننے والوں پہ برس جاتی ہے مفہوم کی راکھ
یُوں نہ مفلوج ہُوئی تھی کبھی شعروں کی زباں
یُوں بگڑتی کبھی دیکھی تھی نہ فن کار کی ساکھ

قدر دانو ! مَیں کہاں تک سرِ بازارِ حیات
فن کو اور اس کے مفاہیم کو جلتا دیکھوں
مَیں نے مانا کہ سخن فہم و ہُنر پرور ہو
اِس نمازت کو بُجھا لُوں تو غزل عرض کروں

اگست ۱۹۷۹ء

افلاکِ زمینی

آسمانوں کی طرف مت دیکھو

آسمانوں میں تو اتنی سی حقیقت بھی نہیں

کہ کسی لمس کو ممنون کریں

اور انسان جسے چھُو نہیں سکتے

اُسے تسلیم کہاں کرتے ہیں!
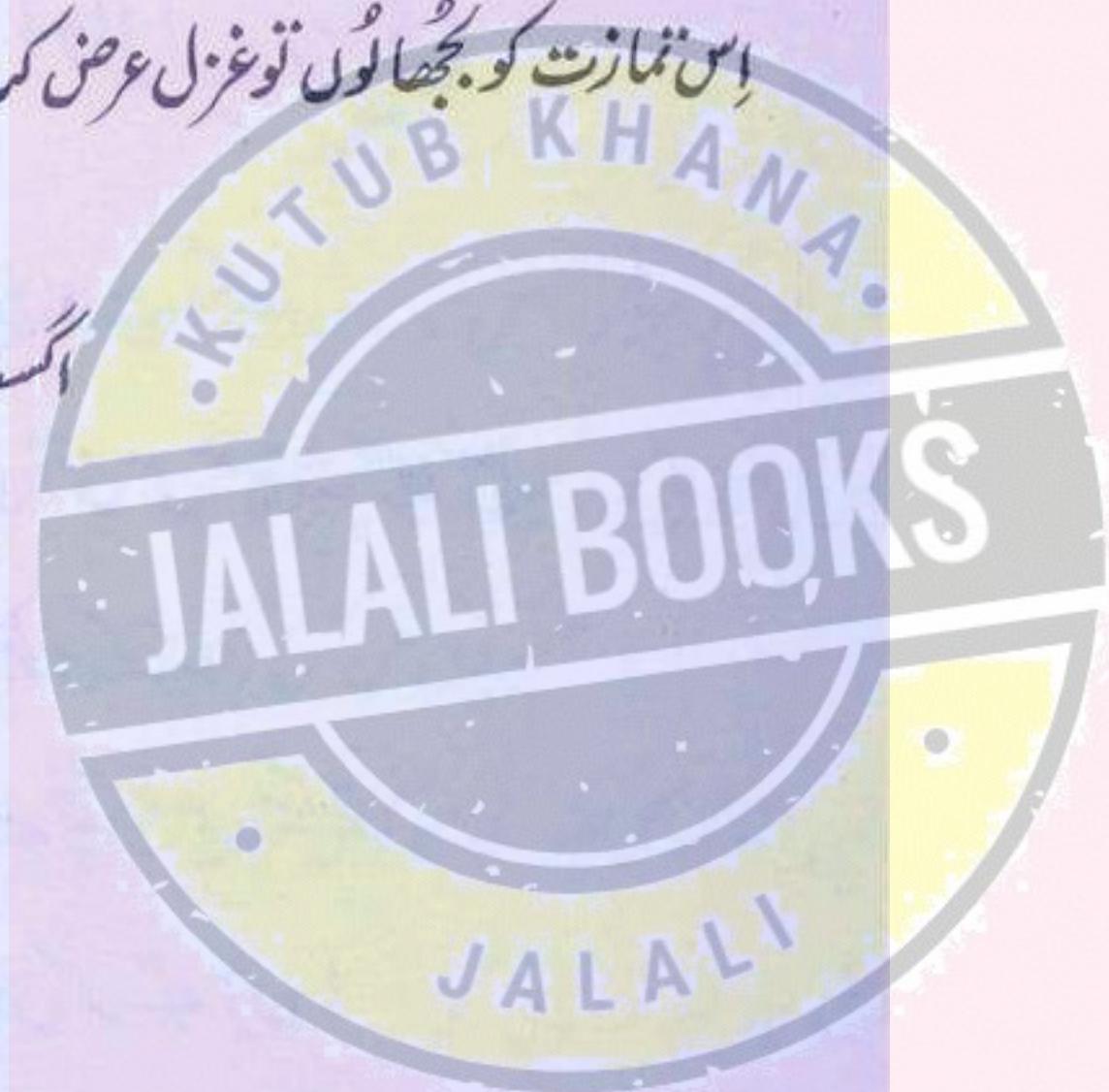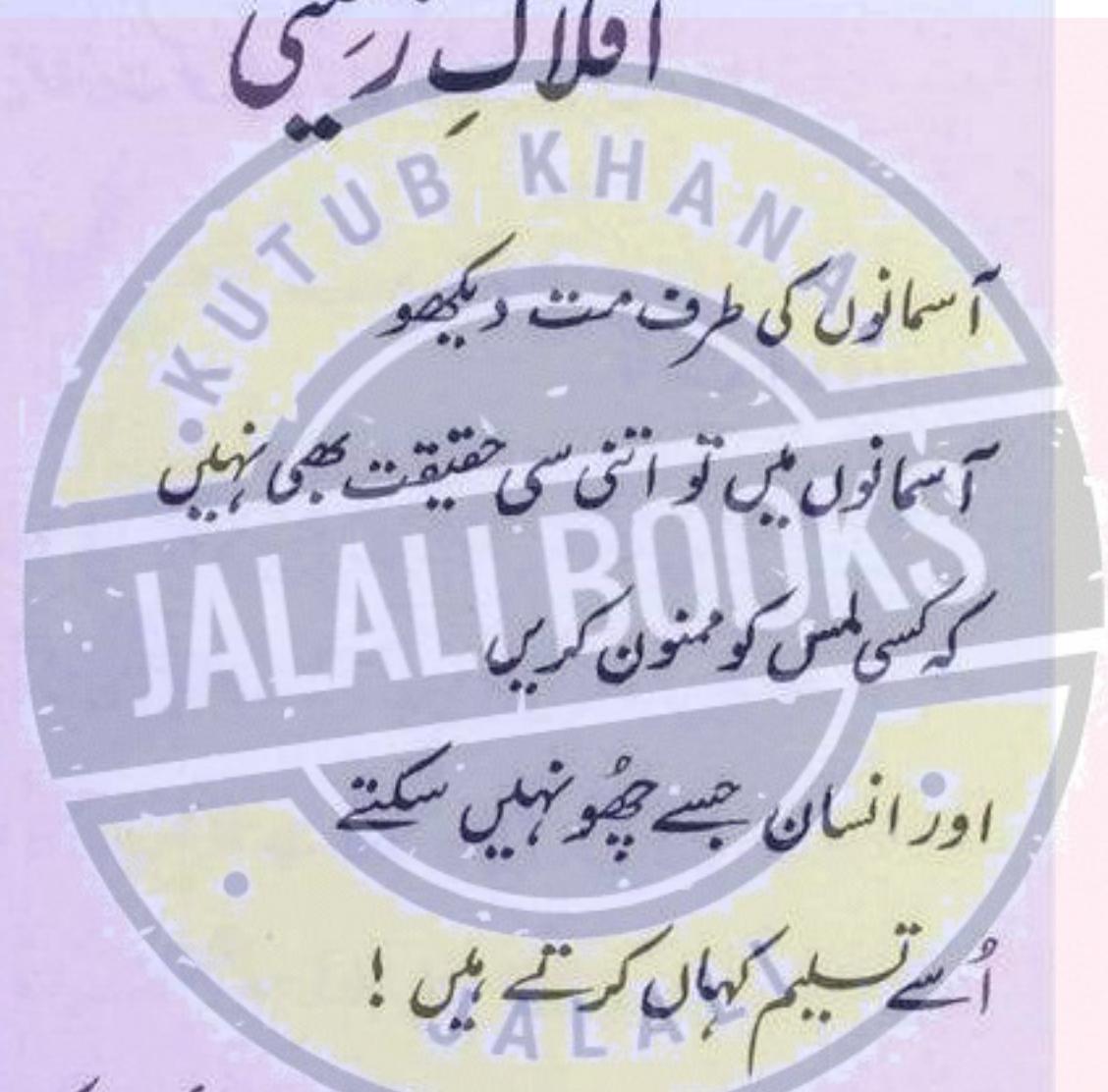
آسمانوں سے پرے ہے حدِ امکانِ رسائی ان کی

آسماں کچھ بھی نہیں

وہ حقیقت میں بصارت کی رسائی کے افق ہیں

وہ خلاؤں کے عمق ہیں

وہ بلاوا ہیں

مگر صرف بلاوا ہیں

فقط گونج ہیں

اور گونج فقط عکس ہے آوازوں کا

آسمانوں کی طرف مت دیکھو

تم زمیں پر ہو تو اُس تک حدِ امکانِ رسائی پھیلاؤ

اُس کی مخلوق کو دیکھو کہ جو چہروں میں، دماغوں میں، دلوں اور ضمیروں میں کئی رنگ کے افلاک لیے پھرتی ہے

انہی افلاک کو چھونے کا کوئی چارہ کرو

اپنی بھرپور توانائی کو

آسمانوں کے سرابوں میں نہ آوارہ کرو

اگست ۱۹۷۹ء

حجاب

ریت صحراؤں کی، تپتی ہے تو چلاتی ہے :

میرے اندر بھی تو گلزار اُگانے کی اُمنگیں ہیں

جو پوری نہیں ہوتیں تو سُلگ اُٹھتی ہیں

کوہساروں سے صدا آتی ہے :

سنگ میں رنگ تو ہوتے ہیں

مگر سنگ کے سینے میں اُتر جاؤ

تو خوشبو سے بھی خالی نہیں پاؤ گے اُسے

برف کہتی ہے :

فقط یخ نہیں پیکر میرا

مجھ کو پگھلا کے بہاؤ تو بھڑک اٹھوں گی

اور برساؤں گی، دمکاؤں گی، گرماؤں گی

ہم جو مٹی کے کھلونے نظر آتے ہیں

اگر کوئی کرید ے تو اسی مٹی میں

ذرّے ذرے سے اُڈتے ہُوئے انوار بھی ہیں

ڈھیر رنگوں کے بھی

خوشبوؤں کے انبار بھی ہیں

ایسے کردار بھی ہیں

جیسے سرما میں سجل دھوپ کا، گرما میں گھنی چھاؤں کا

کردار ہُوا کرتا ہے

وہی سب کچھ

جسے ہم پیار کا اعجاز بھی کہتے ہیں

جو صُورت گرِ کونین نے

تخلیقِ دو عالم میں سمویا تھا فراوانی سے

اگست ۱۹۷۶ء

تنہائی

مَیں نے کل رات کے سنّاٹے میں

ایک دلدوز مسافت طے کی!

مَیں سمجھتا تھا، ابد کا کوئی ساحل ہی نہیں

اور مرے سامنے ساحل تھا
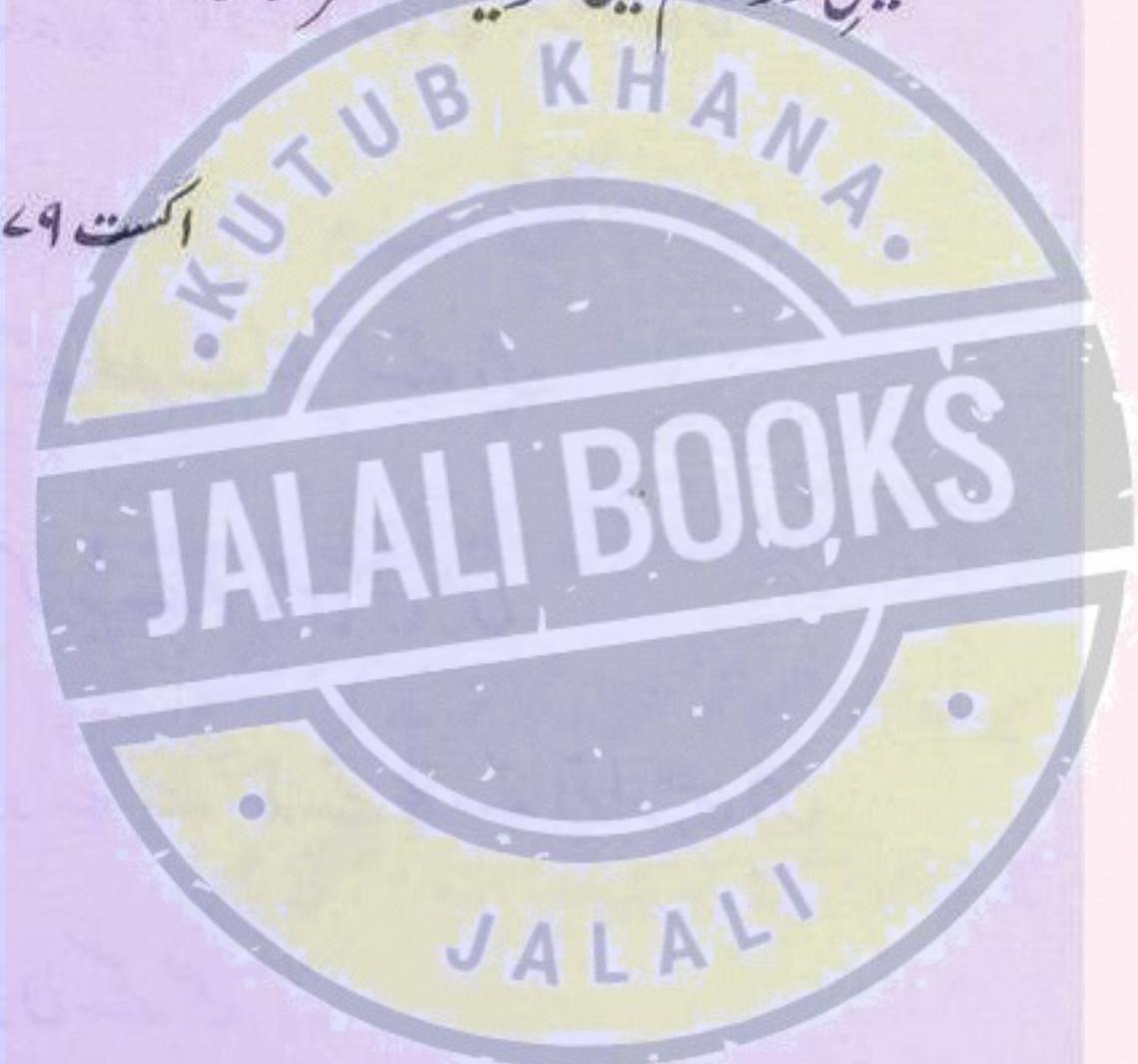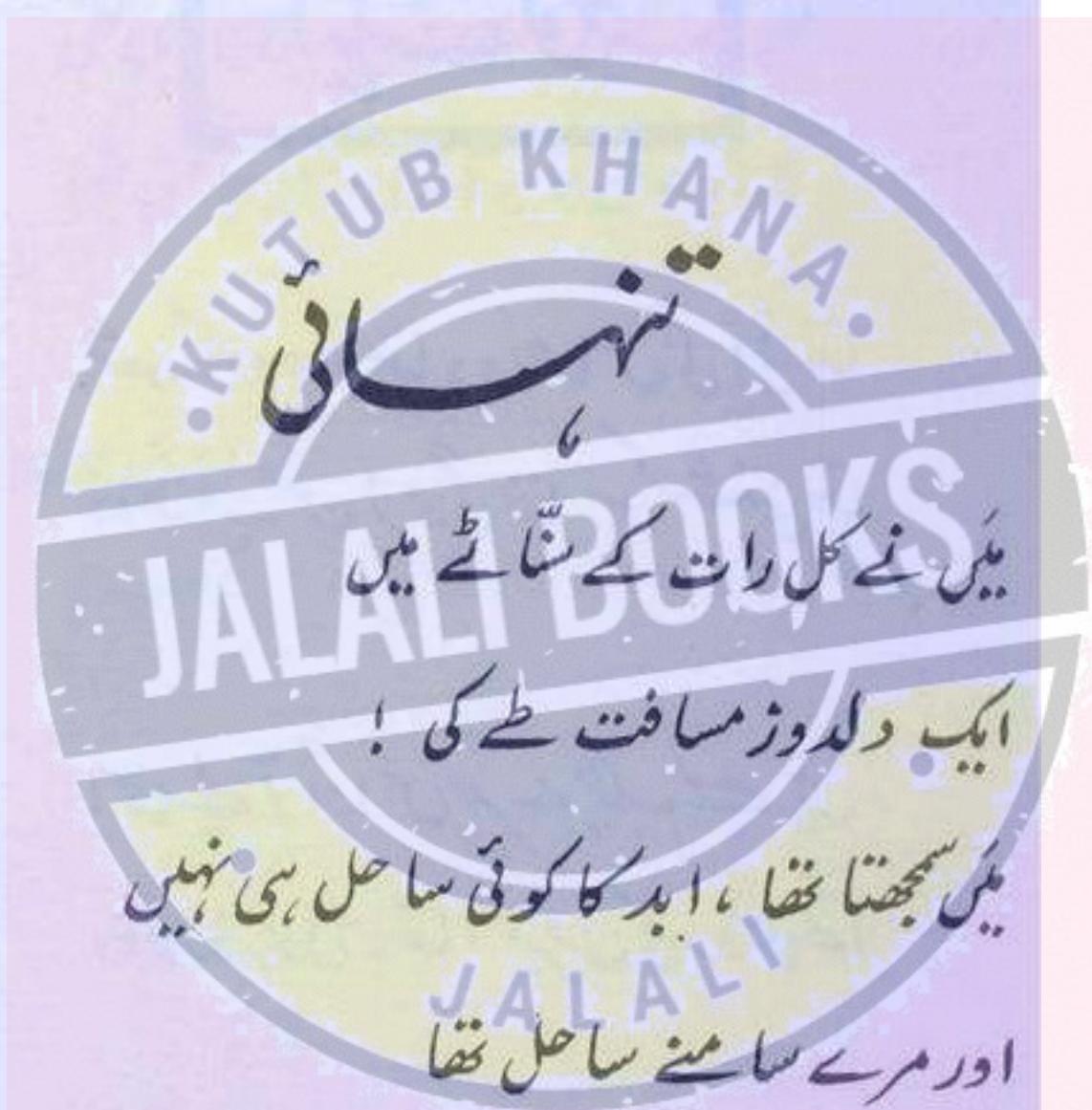
جہاں وقت کے قدموں کے نشاں تک بھی نہ تھے

کچھ بھی موجود نہ تھا!

مَیں بھی موجود نہ تھا!!

اگست ۱۹۷۹ء

شعور کی دھار تھا وہ احساس کی اَنی تھا
وہ طالبِ حسنِ زندگی تھا سو کشتنی تھا

اِسی لیے تو اُداس چہرے چمک رہے ہیں
وہ نورِ ذہنوں کا تھا، ضمیروں کی روشنی تھا

فرازِ دار و رسن سے اس کا مقام پُوچھو
کہ اس کا معیارِ عشق کس درجہ آہنی تھا

مَیں اس کی تر دامنی کی سوگند کھا رہا ہُوں
کہ وہ تو دل کا غنی تھا اور بات کا دھنی تھا
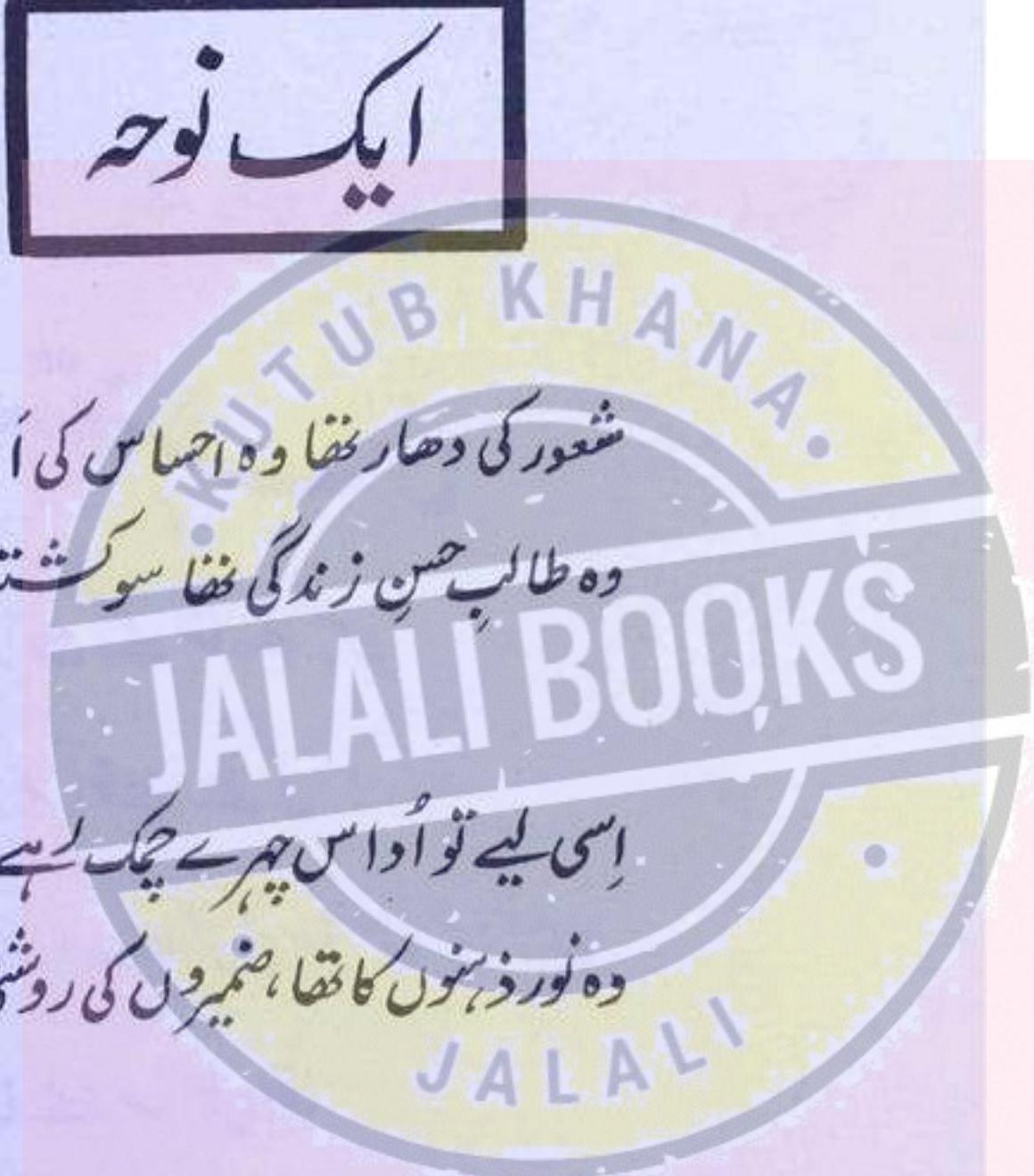
تم اُس کی آواز پارہ پارہ نہ کر سکو گے
کہ جسم تو خیر جسم تھا اور شکستنی تھا

لہو لہو پتّیوں سے شب سرخ ہو رہی تھی
کہ ایک گل کا یہ آخری رقصِ جانکنی تھا

۵-اپریل ۱۹۷۹ء
(شب)
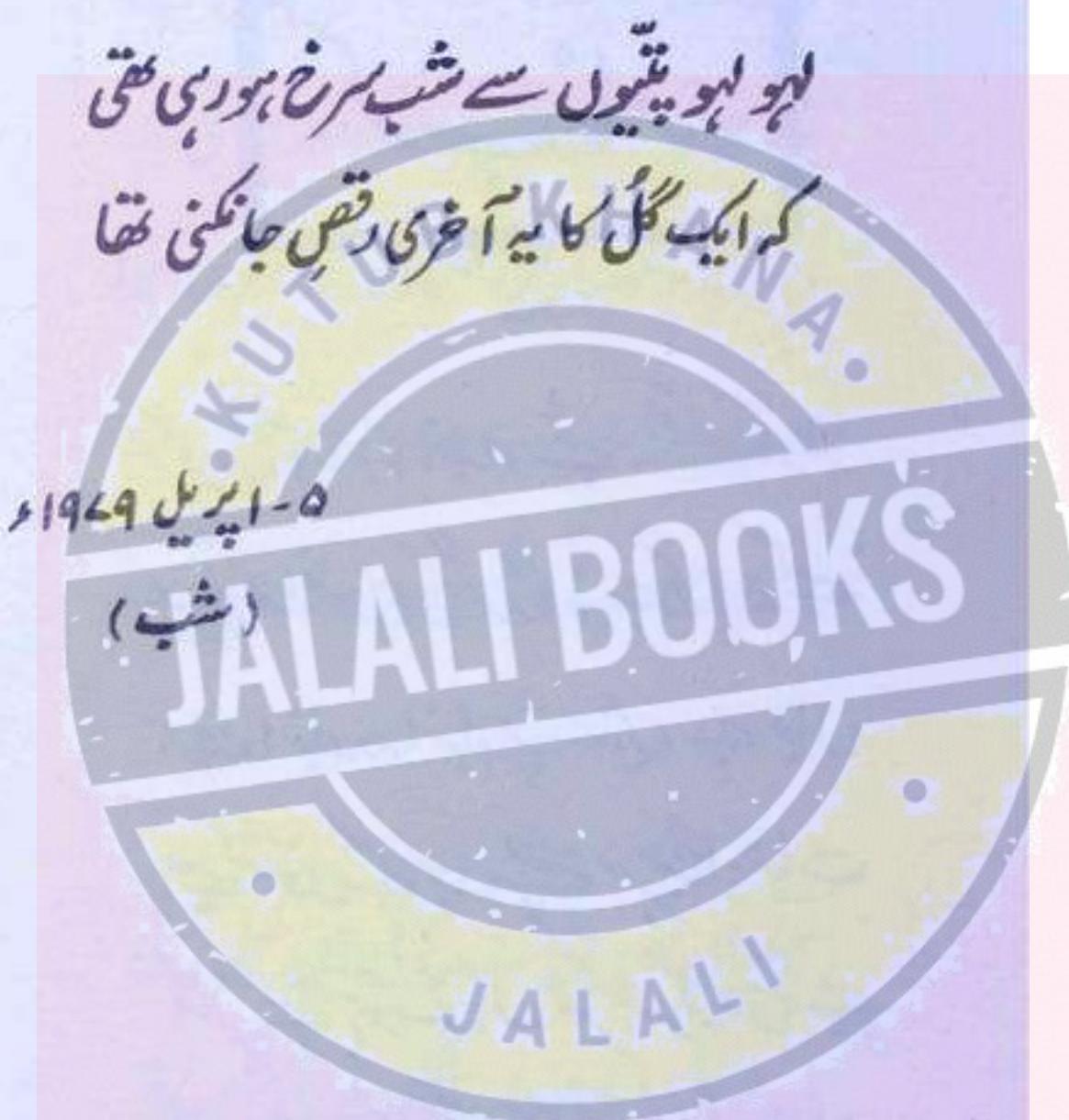
کرب آمادۂ اظہار ہے — لیکن آواز
میری سانسوں کی گزرگاہ سے گزرے کیسے!
حرف انبار در انبار پڑے ہیں بے جاں
جیسے کشتوں کے ہوں پشتے سرِ جنگاہِ حیات
شعر کہتے ہوئے اک عمر بسر کر دی ہے
لیکن اب جا کے کھلا مجھ پہ یہ اظہار کا راز
شدّتِ کرب میں الفاظ بھی مر سکتے ہیں

چاند ٹکڑا ہوا، سہما ہوا، جاتا ہوا چاند
دیکھتا ہے، کہ ستاروں کی لویں مدھم ہیں

اور ہر لَو میں ہے اِک قطرۂ خوں کی تصویر
نہ خلاؤں میں گماں ہے کسی تابانی کا
نہ اُفق پر نظر آتی ہے اُجالے کی لکیر
رات کے جبر سے جب خامشی چلّاتی ہے
تیز ہوتی ہوئی چھُریوں کی صدا آتی ہے
دشت و کہسار میں، ظلمات سے آلودہ ہُوا
صرف یہ بات بڑے درد سے کہہ پاتی ہے
— چاند جب ڈوبتا ہے، چاندنی مر جاتی ہے

سیپیاں سی جو نظر آتی ہیں نیلی نیلی
اِن میں کل رات بصارت کے دِیے روشن تھے
وہ بصارت کہ جو فردا کا بھی نظّارہ کرے
اور ماضی کے دُھندلکے بھی درخشاں کر دے
برگِ ہر گل پہ فروزاں جو لہو شبنم ہے
اس میں تاریخ نے پایا ہے کمالِ تجسیم
اور تاریخ وہ گمبھیر حقیقت ہے، جیسے

وقت کی مصلحتیں قید نہیں رکھ سکتیں

میرے آدرش کے ٹکڑے ہیں کہ آئینے ہیں
ہاتھ اُٹھتے نظر آتے ہیں تو کٹتے سر بھی
آنچ دیتی ہے مری رُوح کی خاکستر بھی
جب سہارا کوئی چھُوٹا تو ستارہ ٹوٹا
دل جو دھڑکا تو فلک میں ہوئیں درزیں پیدا
جو قیامت مرے اندر ہے، وہی باہر بھی
اس قدر عام ہے خونِ رگِ مظلوم کا فیض
موسمِ زرد میں گُل رنگ ہُوئے پتھر بھی
غم اک آسیب کی صُورت ہے مرے گھر پہ محیط
خیمہ زن ہے کوئی پرچھائیں مرے آنگن میں
چند سائے نظر آتے ہیں برونِ در بھی

ہم جو مظلوم ہیں، مجبور ہیں، بے مایہ ہیں
ہم جو سب دیکھ کے بھی بول نہیں پاتے ہیں
اور جب بولتے ہیں، نطق سے شرماتے ہیں

ہم ہیں پامال، مگر تیز ہَوا کے دَم سے
پاؤں کے نقش، سرِ دن تک بھی اُبھر جاتے ہیں
ہم تو وارث ہیں شہیدوں کے جمالِ فن کے
وہ جو پیوندِ زمیں ہو کے نکھر جاتے ہیں
اور نسلوں کے ضمیروں میں اُتر جاتے ہیں

۵-اپریل ۱۹۷۹ء

ایک اور زلزلہ
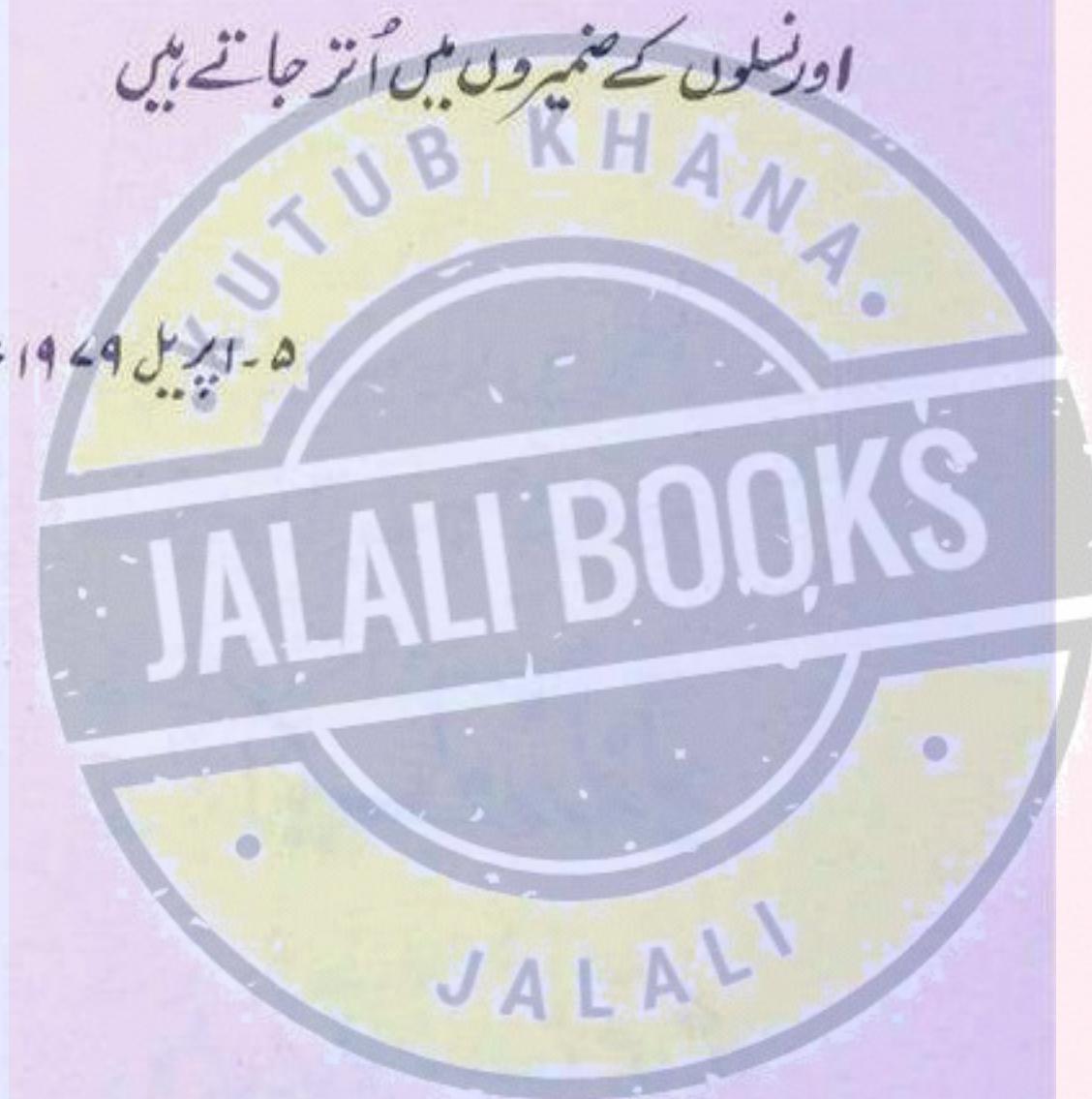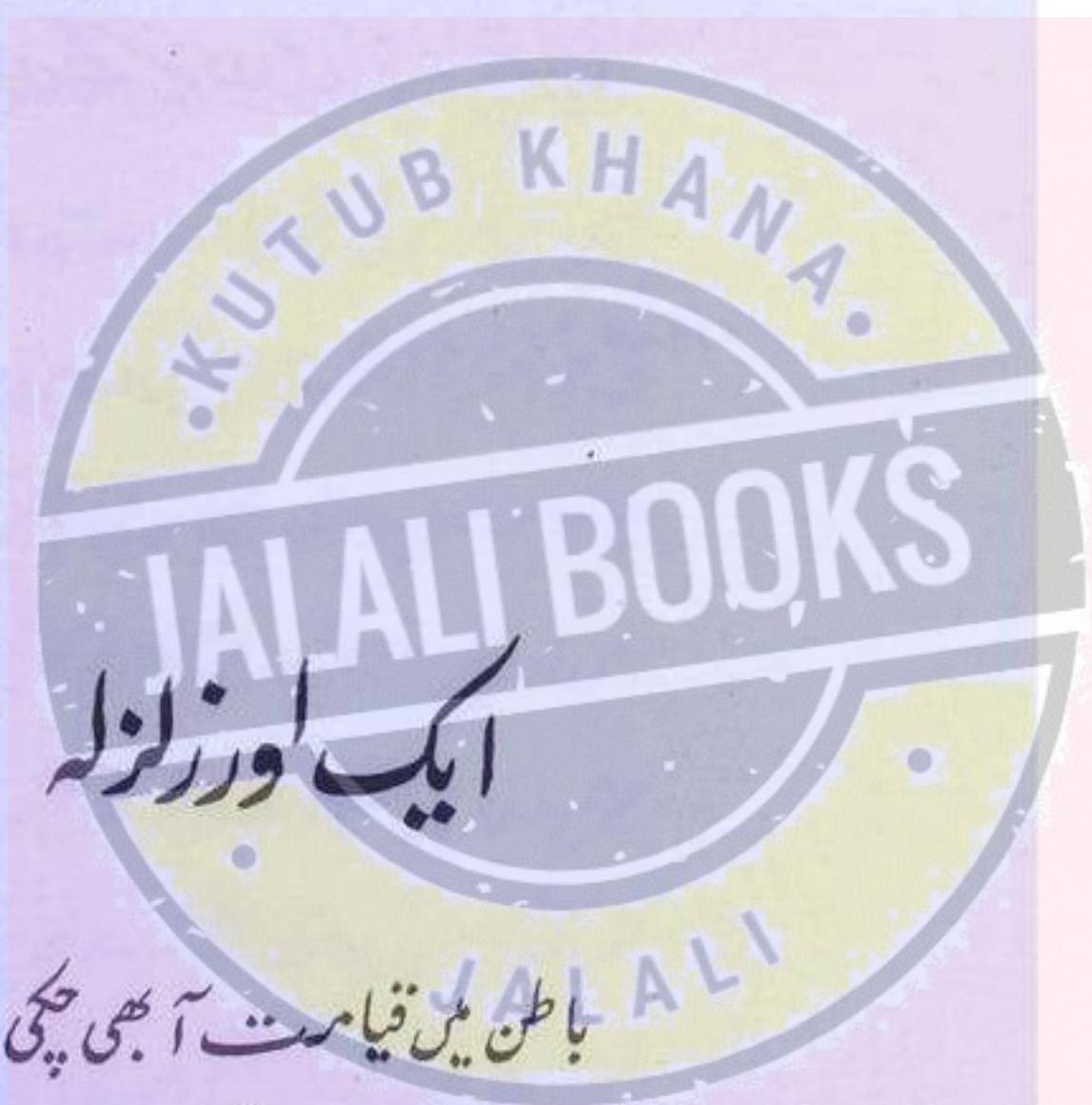
باطن میں قیامت آ بھی چکی
ظاہر میں نہ جانے کب آئے
کب زلزلے سے ہل جائے زمیں
اور جھک جائے پربت کی جبیں
کب ٹکڑے چاند کے اُڑ جائیں
شہروں پہ سمندر چڑھ آئیں

کب گردشوں کے رُخ مُڑ جائیں
کب وقت کے بے کل قدموں میں
بیچ رات کی بیڑی پڑ جائے
یہ سارا کھیل اُجڑ جائے
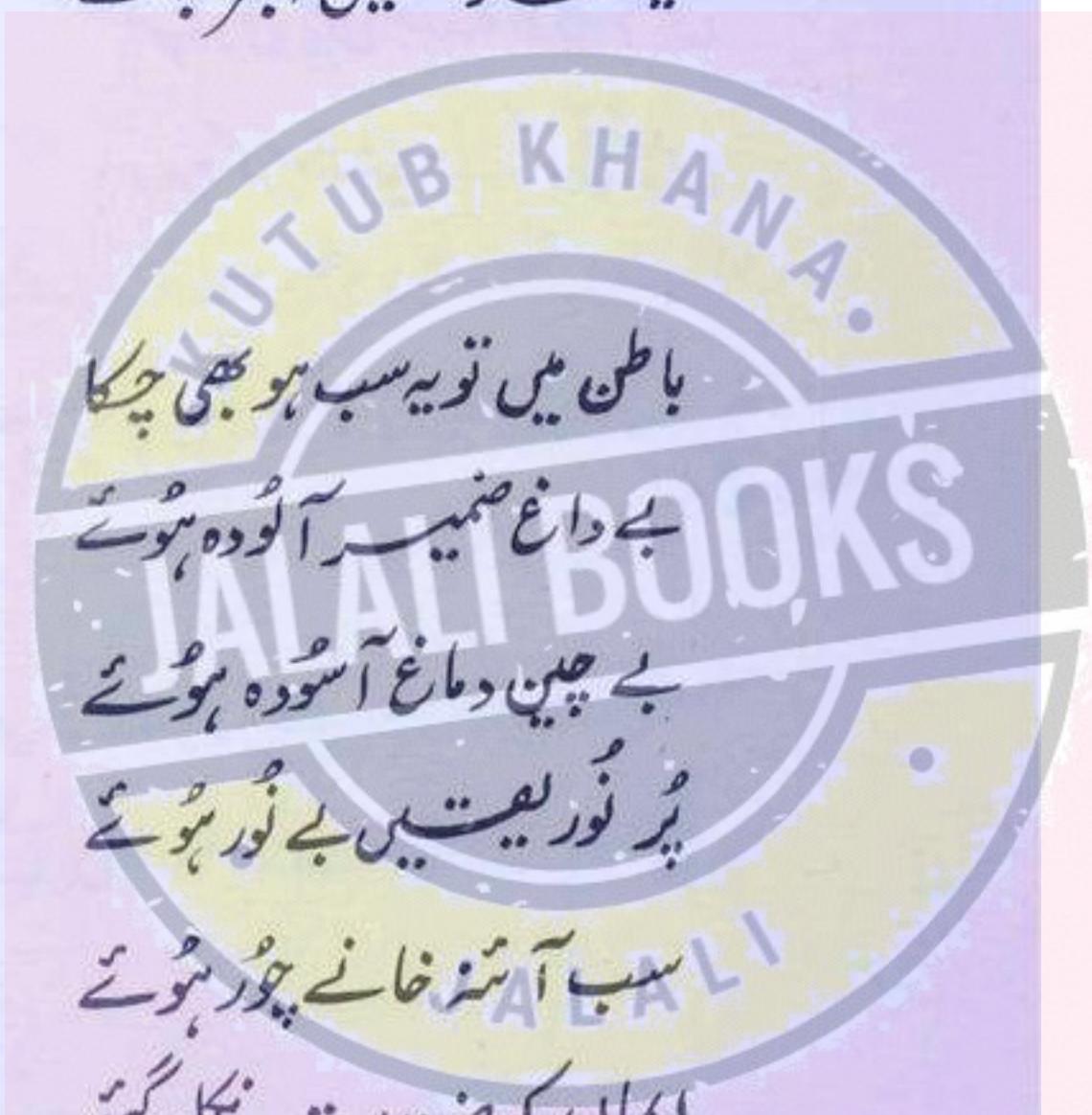
باطن میں تو یہ سب ہو بھی چکا
بے داغ ضمیر آلُودہ ہُوئے
بے چین دماغ آسُودہ ہُوئے
پُر نُور یقیں بے نُور ہُوئے
سب آئینہ خانے چُور ہُوئے
ایماں کو ضرورت نگل گئی
ایقاں کو جبلّت نگل گئی
انساں کا وجُود اِک صحرا ہے

جو سنّاٹے کی زد میں ہے
میدانِ حشر کی حد میں ہے

اب دل میں عقیدہ کوئی نہیں
دیدہ کہ شنیدہ — کوئی نہیں

اپریل ۱۹۷۹ء
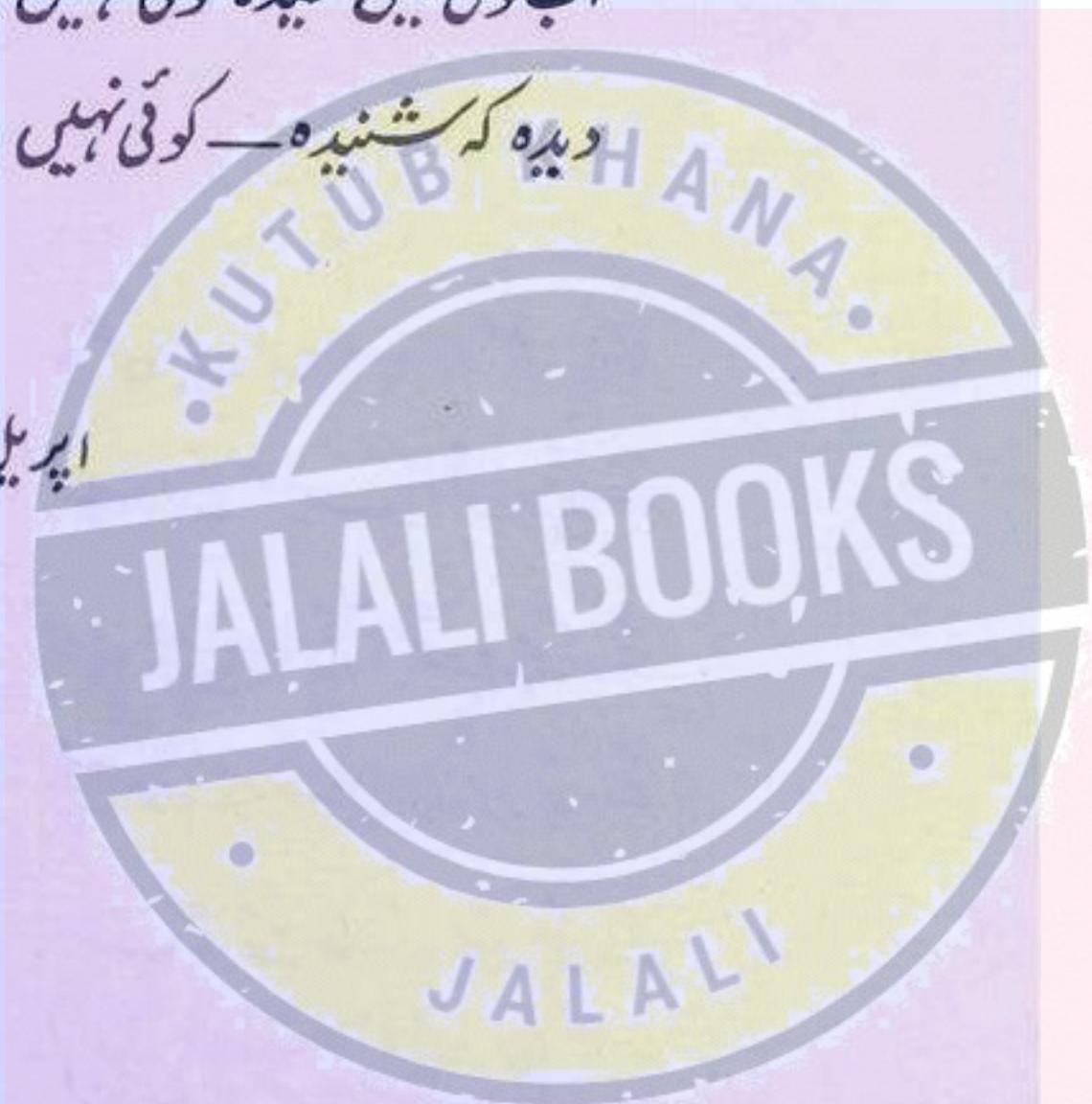
وطن کے لیے ایک نظم

سارے رشتے ہیں وطن اور زمیں سے محکم
مَیں نے اُڑتے ہوئے دیکھے ہیں یہ پرچم باہم

منعکس ہے اسی چہرے میں جمالِ عالم
میری تخلیق ہے مٹی سے، سو مٹی کی قسم
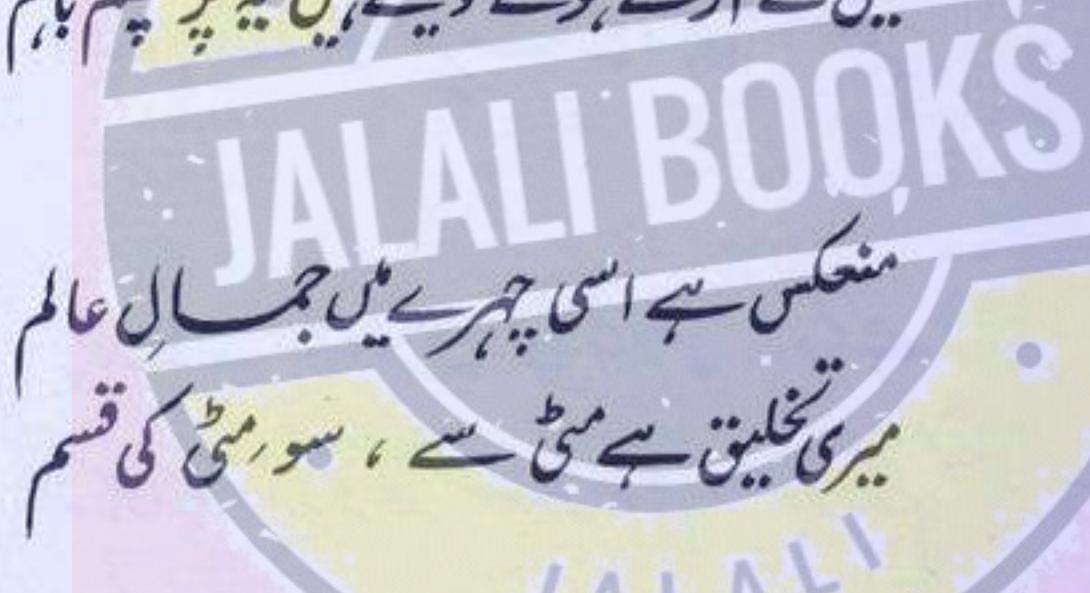
یہی مٹّی مری جنّت ہے، کہ اس مٹّی میں
چپّے چپّے سے جھلکتا ہے گلستانِ ارم

وقت جیسا بھی ہو، پیار اپنی عبادت میں مگن
دل کی دُنیا میں بدلتے نہیں رہتے موسم

قدم اُٹھیں تو ہیں دھڑکن دلِ منزل کی سُنوں
سفرِ شوق میں ہوتی رہیں راہیں پُرخم

جن کو معلوم نہ تھا رازِ جہاں داریِ عشق
تڑ بتیں ہیں انہی اقوام کی، تا حدِ عدم

میں تو یہ دیکھ کے پت جھڑ میں بھی ہنس دیتا ہوں
ایک پتّہ ہے سرِ شاخ ابھی مستحکم

کچھ طلب ہے تو بس اتنی، کہ وطن زندہ رہے
نہ ہوائے زر و گوہر، نہ غمِ دام و درم

اس کے کہسار بھی مخمل کی قبا میں ملبوس
اس کے صحراؤں کی ہے ریت بھی ریشم ریشم

گنگناتے ہوئے چلتے ہیں ہوا کے جھونکے
اور کر جاتے ہیں غزلیں دلِ شاعر پہ رقم

واشگافی مجھے مطلوب ہے، جو صبح میں ہے
شاعری شام نہیں ہے کہ ہو مبہم مبہم

صبح — فطرت کی عدالت جو کھُلی — تو دیکھا
خشک پتّوں سے بھی گرتی نہیں ہے شبنم

مارچ ۱۹۷۹ء

ایک بہار آفریں لمحہ

شش جہات میں رقصاں، نکہتِ بہاری ہے
ہر طرف مشیّت کا، فیضِ عام جاری ہے

ڈالیاں خمیدہ ہیں، جیسے رنگ بھاری ہے
گل فشاں درختوں نے، کیا زمیں نکھاری ہے
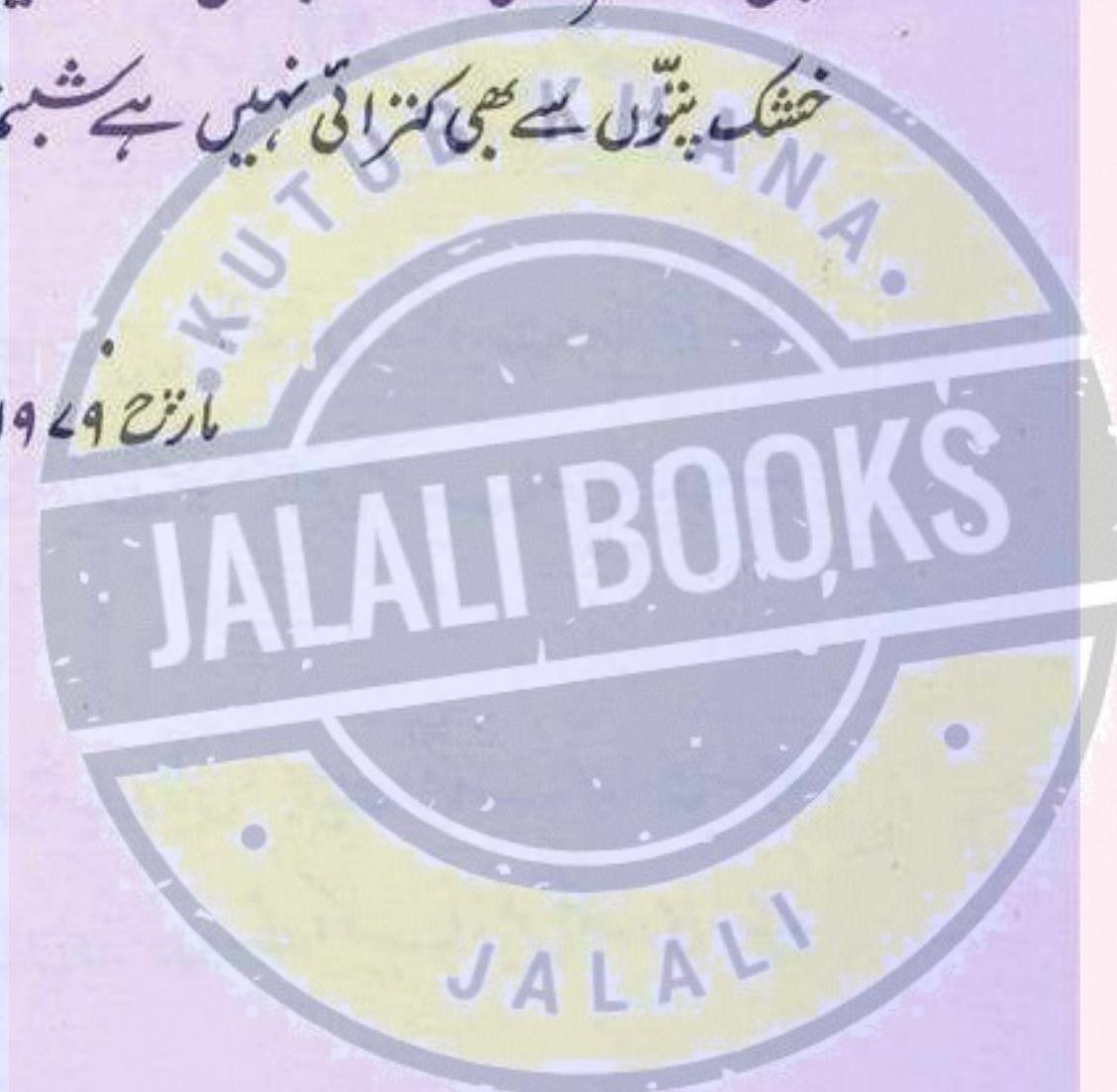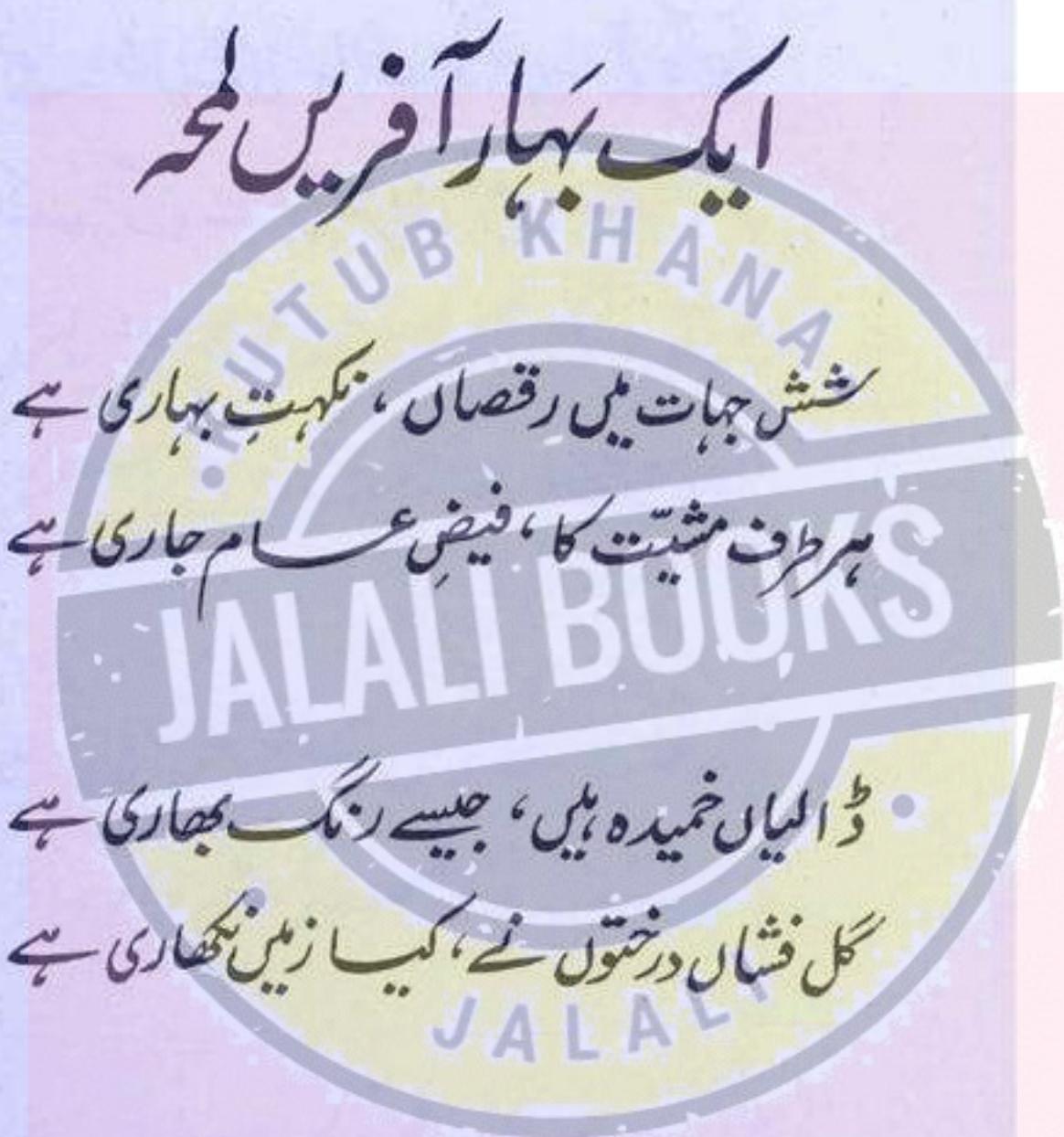
آج تو افق بھی ایک سبز سبز دھاری ہے
یاد نے مرے دل میں، صُورت اِک اُبھاری ہے

ابرؤں میں خنجر ہیں، آنکھ میں کٹاری ہے
پھر بھی کتنی سیدھی ہے، اور کتنی پیاری ہے

چال ڈھال میدانی، رنگ کوہساری ہے
اس کا حُسن، شہکارِ فنِ کردگاری ہے

کتنی بے کرانی ہے! کتنی بے کناری ہے
شش جہات میں رقصاں، نکہتِ بہاری ہے

مارچ ۱۹۷۹ء

تکمیل

زمین آدھی تاریک ہے

آدھی روشن ہے!

سُورج کبھی اِس طرف ہے

کبھی اُس طرف

آدھی انسانیت سو رہی ہے

مگر آدھی بیدار ہے!

اور خُدا،
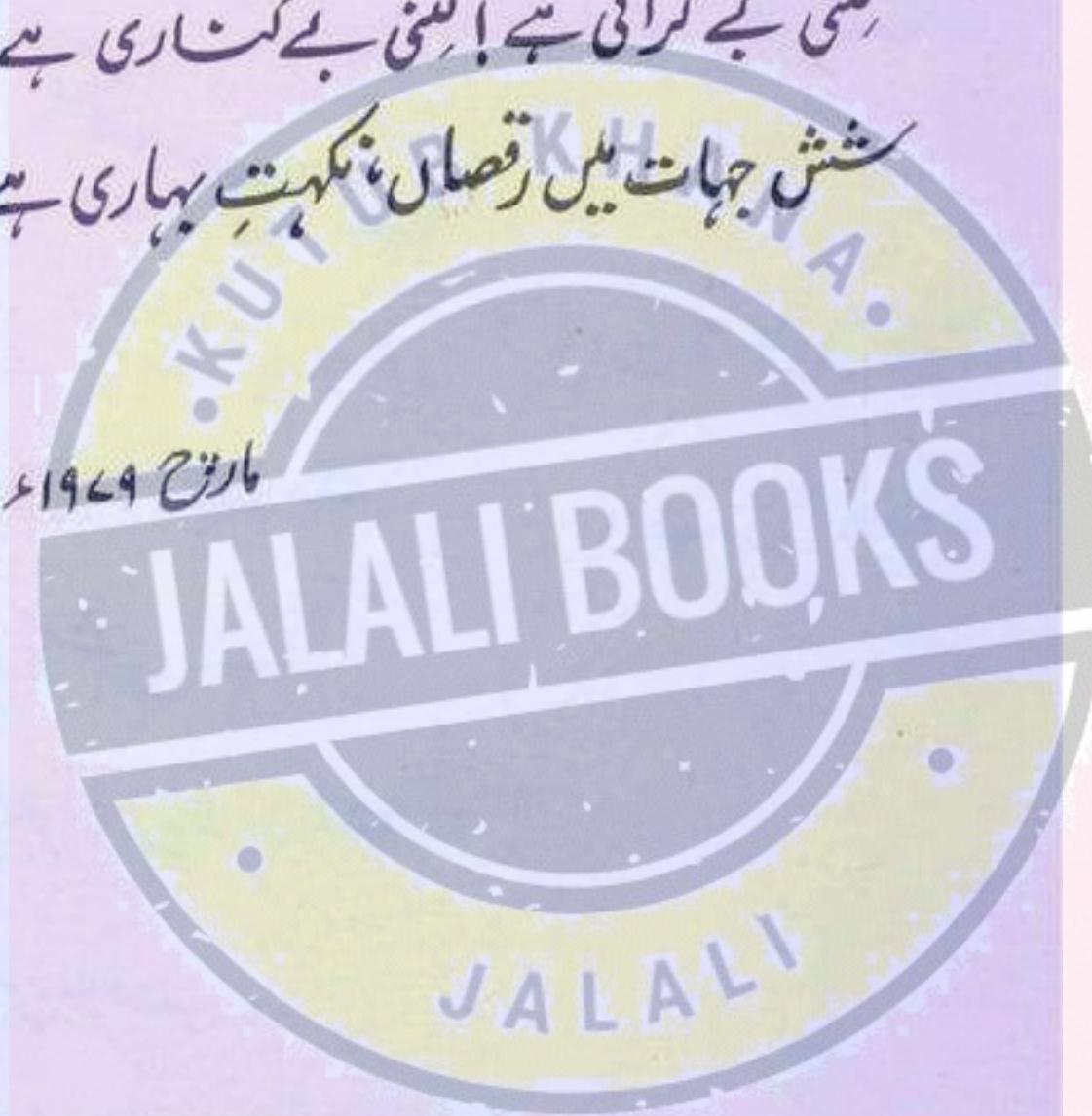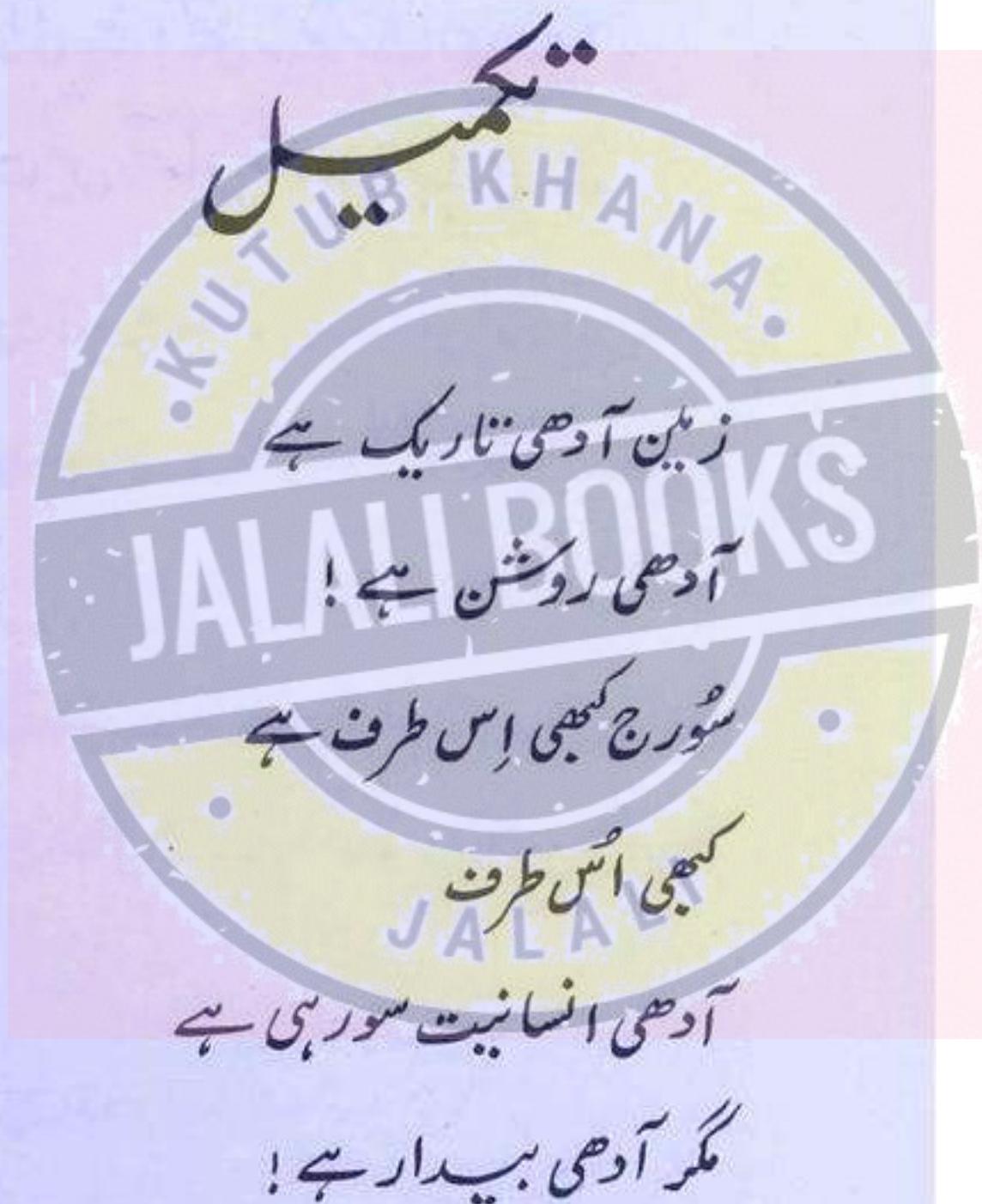
جو فقط ایک ہے،

اِن تضادات پر

اس تنوّع پہ

آسودہ ــــ !

ہر دائرے سے نیا دائرہ اس طرح پیدا کرتا

چلا جا رہا ہے،

کہ جیسے ابھی کائنات اپنی تکمیل پانے کی خاطر

تگ و دو میں ہے !

مارچ ۱۹۷۹ء

برف کا خوف

اگر برف گرتی ہے
گرتی رہے
آخرِ کار اس کو
تمازت کی یلغار میں
یُوں پگھلنا ہے
کچھ ایسی وارفتگی سے پگھلنا ہے
جیسے نہ پگھلی
تو پتھّر کی ہو جائے گی

مارچ ۱۹۷۹ء

اِنکشاف

ابھی ابھی

اِک عجیب احساس

میرے دل پہ
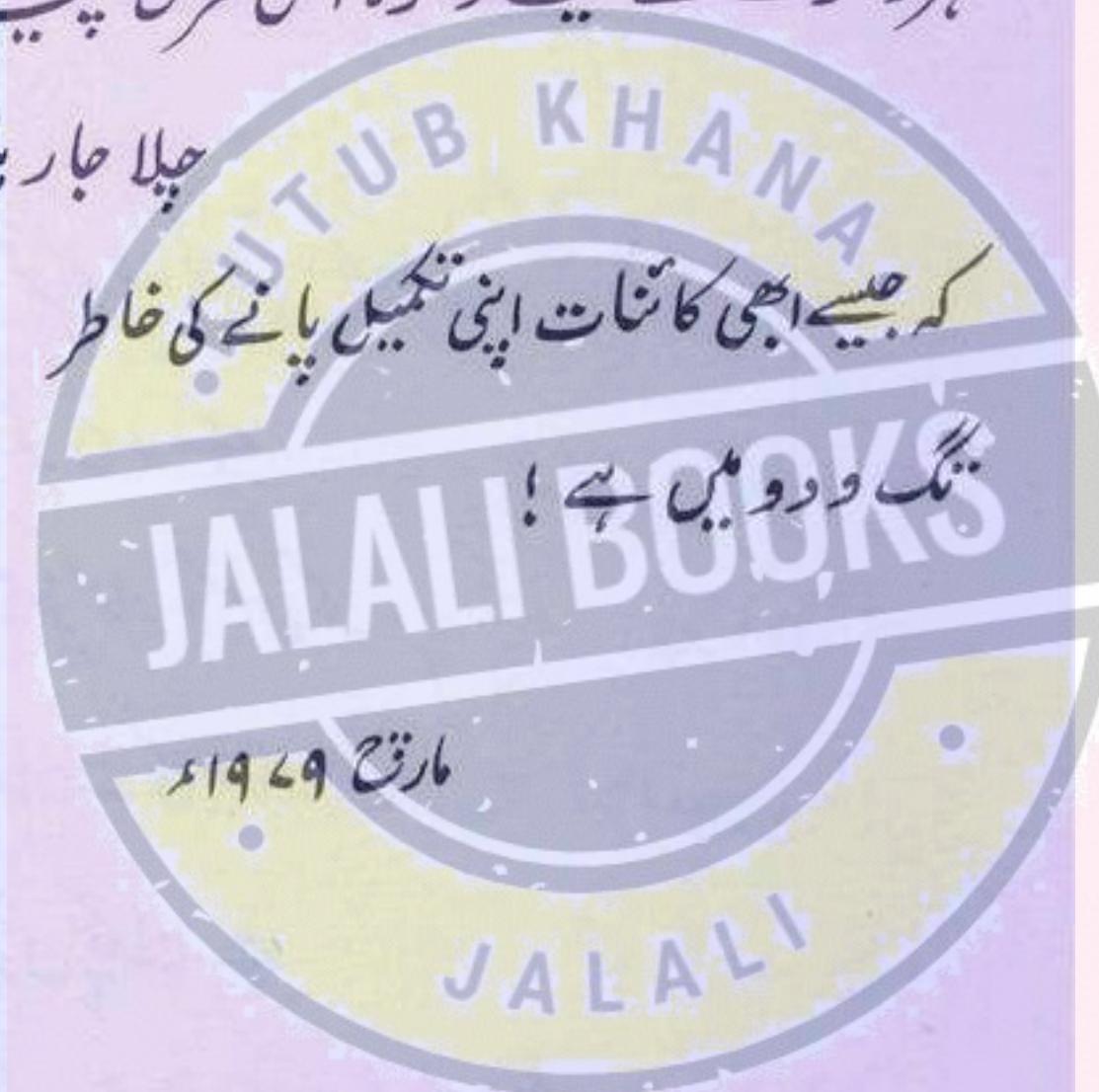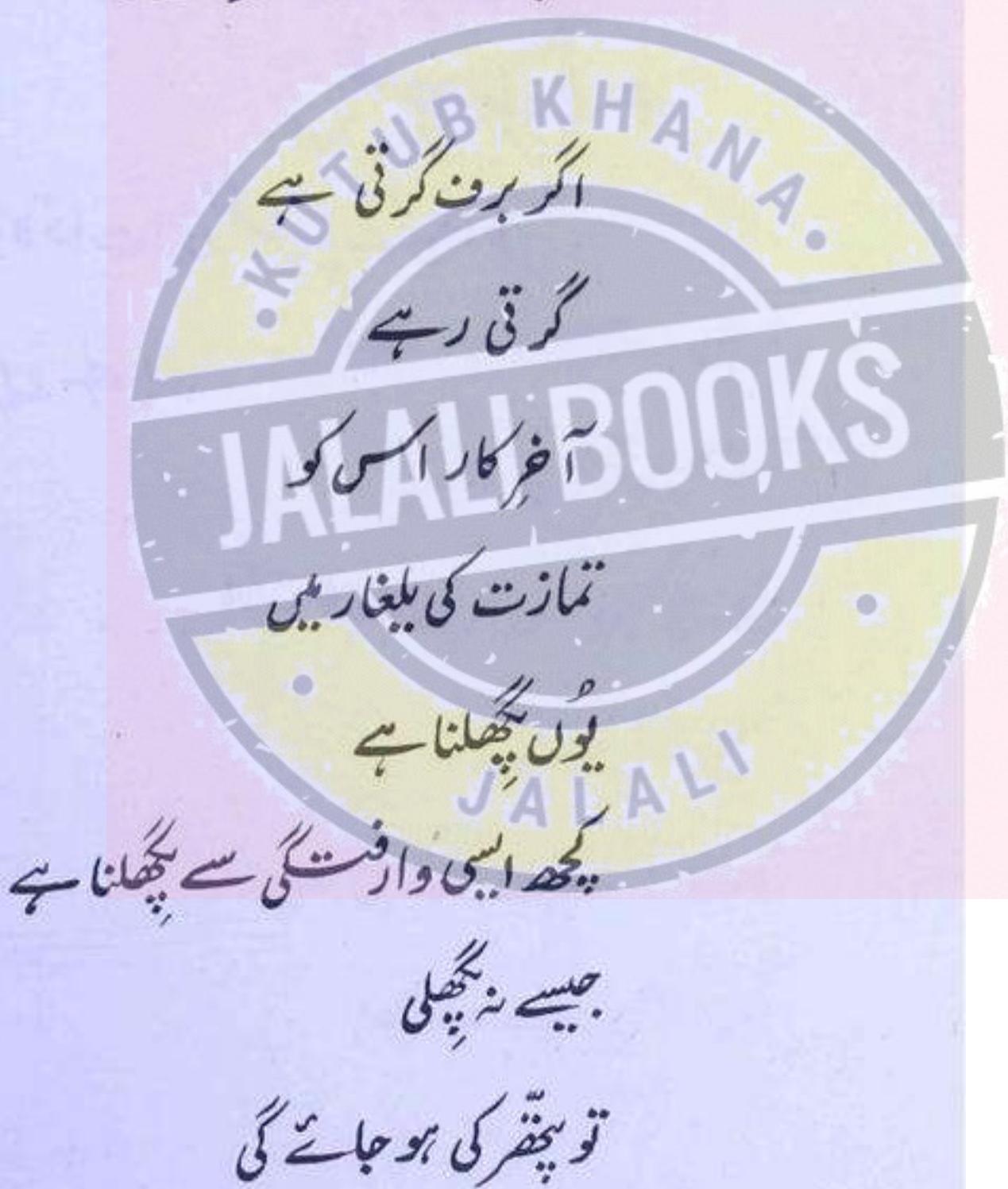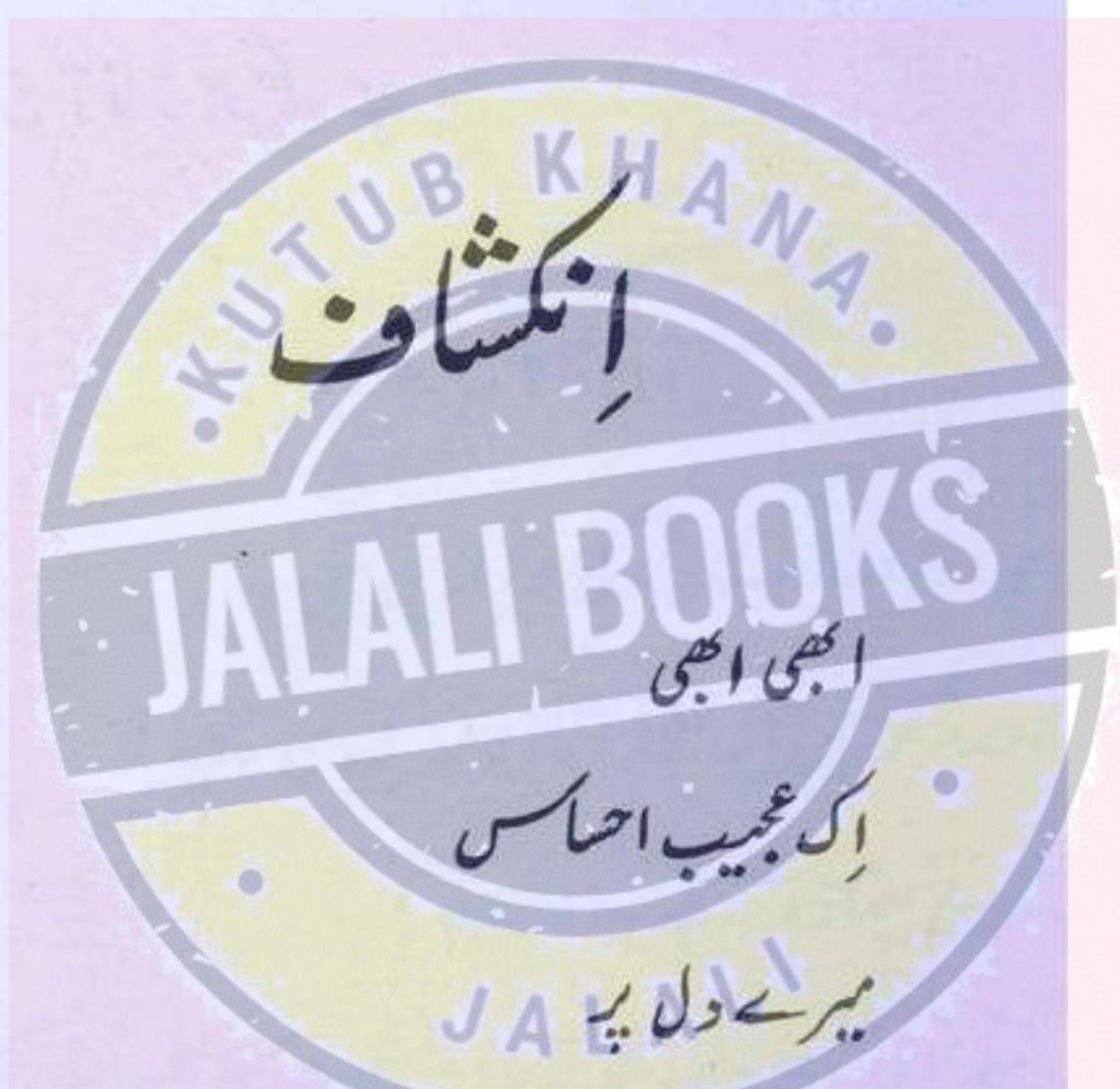
کئی برس کی جمی ہوئی گرد جھاڑ کر

مسکرا کے بولا...

کہ اب اک آزاد قوم کے ایک فرد ہو تم!

یہ انکشاف اس طرح کا ہے

جیسے رات بھر سو کے

دوپہر کی تپش میں جب کوئی آنکھ کھولے

تو دُھوپ بولے

کہ صبح آغاز ہو چکی ہے!

مارچ ۱۹۷۹ء

تدفین

چار طرف سنّاٹے کی دیواریں ہیں

اور مرکز میں اِک تازہ تازہ قبر کھُدی ہے

کوئی جنازہ آنے والا ہے !

کچھ اور نہیں تو آج شہادت کا کلمہ سُننے کو
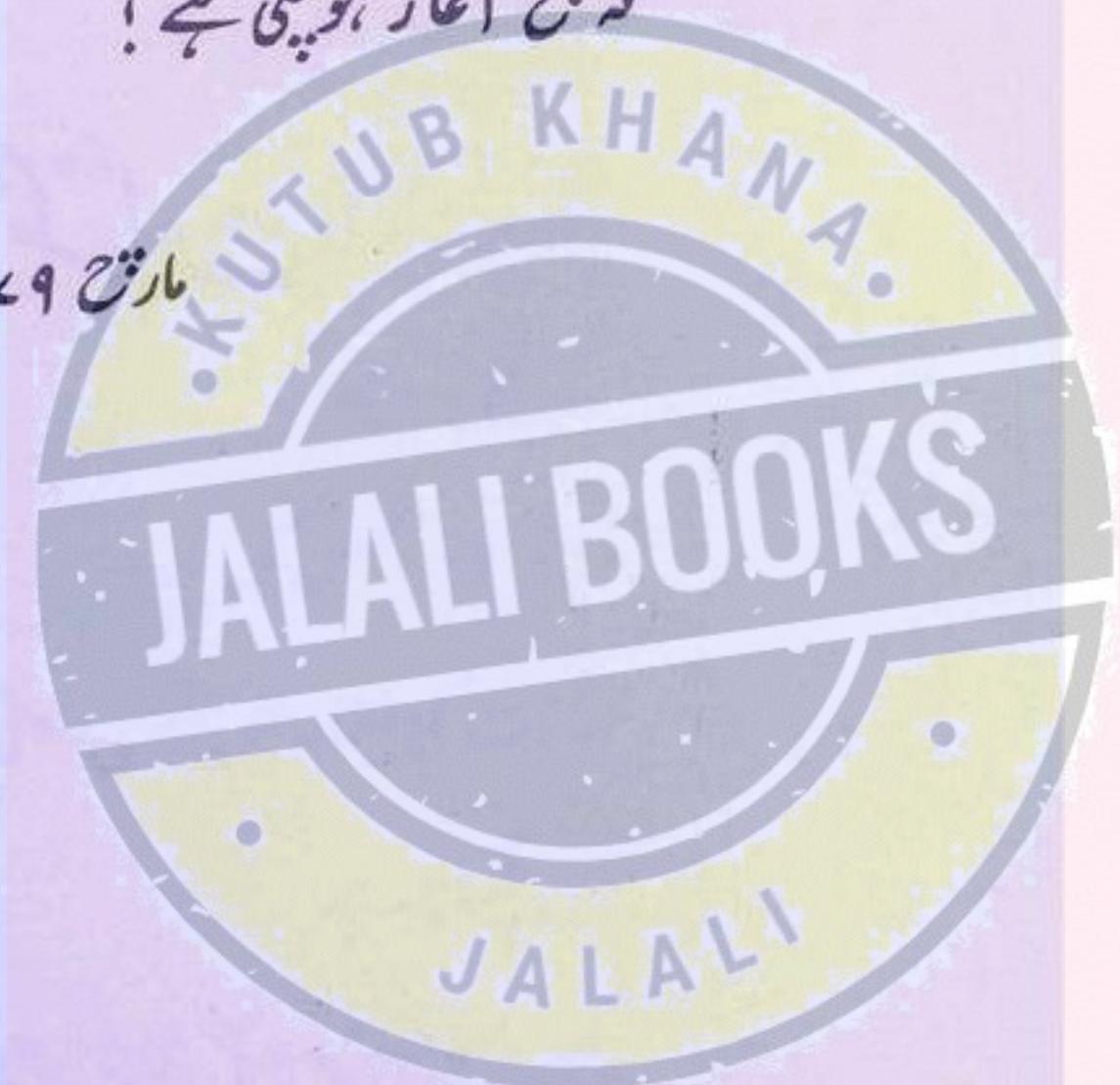
مِلے گا

کانوں کے اِک صدی پُرانے قُفل کھُلیں گے

آج مری قلّاش سماعت کو آواز کی دولت

ارزانی ہوگی !

دیواروں کے سائے میں اِک بہت بڑا انبوہ نمایاں
ہوتا ہے
جو آہستہ آہستہ قبر کی جانب آتا ہے
اِن لوگوں کے قدموں کی کوئی چاپ نہیں ہے!
لب ہلتے ہیں لیکن حرف، صدا بننے سے پہلے
مرجاتے ہیں!

آنکھوں سے آنسو جاری ہیں
لیکن آنسو تو ویسے بھی
دل و دماغ کے سنّاٹوں کی تمثالیں ہوتے ہیں!

میّت قبر میں اُتری ہے
اور حدِّ نظر تک لوگ بلکتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں
اور حرف دکھائی دیتے ہیں
اور کان دھرو تو سنّاٹے ہی سنائی دیتے ہیں

جب قبر مکمّل ہو جاتی ہے

اِک بُوڑھا

جو "وقت" نظر آتا ہے اپنے حُلیے سے

ہاتھوں میں اُٹھائے کتبہ، قبر پہ جُھکتا ہے

جب اُٹھتا ہے تو کتبے کا ہر حرف سُلگنے لگتا ہے

یہ لوحِ مزار "آواز" کی ہے!

فروری ۱۹۷۹ء

ایک اسیرِ ذات سے

کب تک اپنے باہر سے، چشم بستہ بھاگو گے؟
کب تک اپنے اندر کی اُلجھنوں سے اُلجھو گے؟

کب تک اپنے شانوں پر اپنا بوجھ لادو گے؟
ہانپتے ہوئے، آخر کتنی دُور جاؤ گے؟

اپنے خول سے باہر جب نگاہ ڈالو گے
اپنی ذات کے اندر، کائنات دیکھو گے

اِک بڑی مسافت ہے، اپنا تجزیہ کرنا
جنگلوں سے گزرو گے، پربتوں میں بھٹکو گے

ایک بار اگر کر لو ، آپ احترام اپنا
اپنا عکس تکتے ہی ، آئینے نہ توڑو گے

رسم و راہِ فطرت سے دوستی اگر کر لو!
پت جھڑوں میں مہکو گے ، آندھیوں میں چہکو گے

کھیت رقص کرتے ہیں ، تال پر ہواؤں کے
دل کی کھڑکیاں کھولو ، تم بھی لہلہاؤ گے

ذہن کے سمندر میں چاند نُور گھولے گا
جب سفینۂ جاں کے بادبان کھولو گے!

جنوری ۱۹۷۹ء

زمیں سے دُور

یہاں سے اُڑ کے، مَیں جب آسماں پہ جاؤں گا
بہت عجیب نظر آئے گی زمین مجھے
وہ نیم دائرہ روشن، وہ نیم دائرہ فق
بس ایک نُور کی قوس، اور ایک ظلمت کی
نہ فاصلوں کا تصوّر، نہ منزلوں کا شعور
نہ کوئی برِّ عظیم، اور نہ کوئی بحرِ عظیم
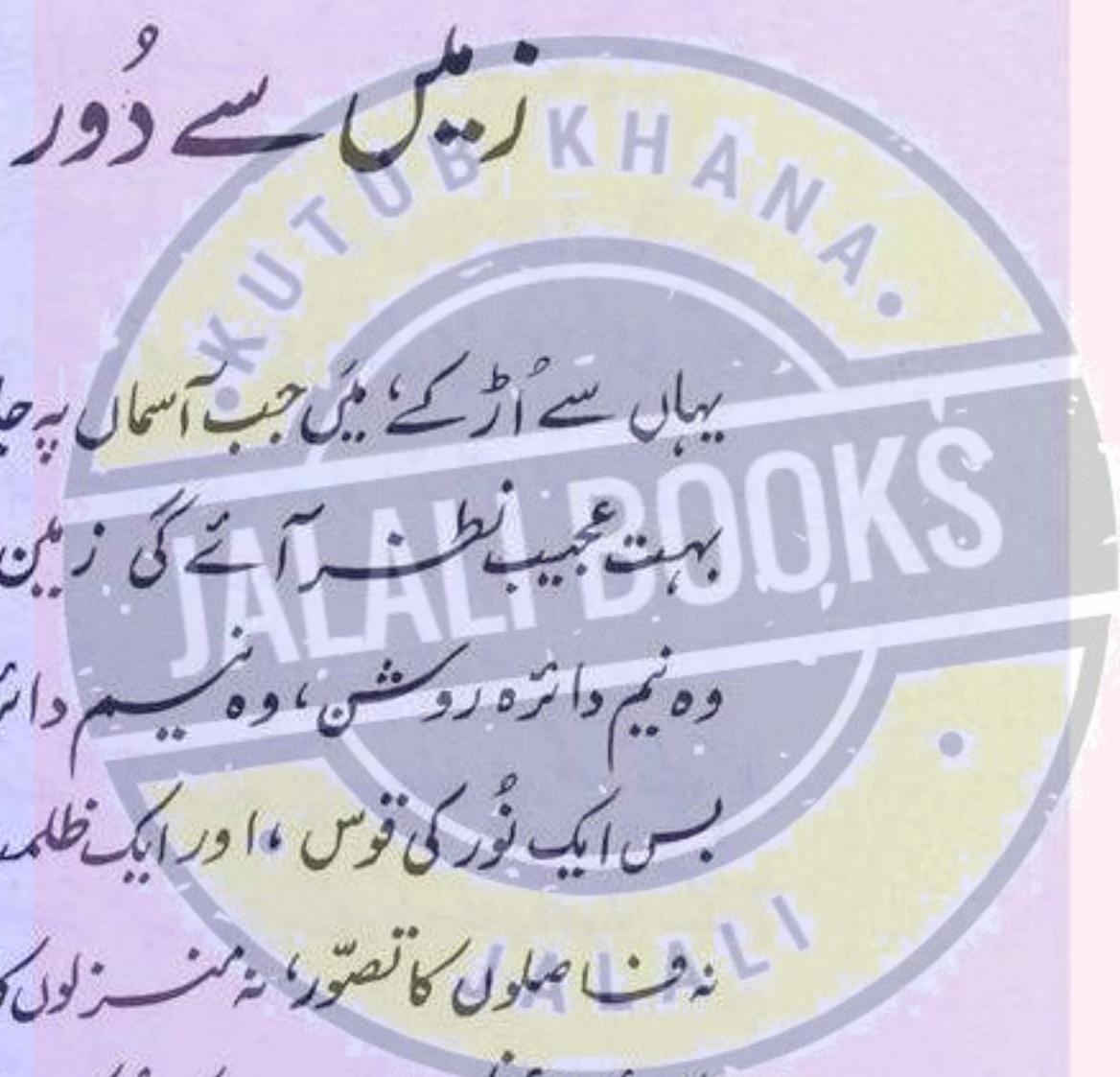
مگر مرے لیے بامعنی اور پُر مایہ
کہ اس زمیں پہ، اِدھر یا اُدھر، کہیں نہ کہیں

ترے جمالِ حیات آفریں کے پرتَو سے
دلوں میں بوقلموں پھُول کھِل رہے ہوں گے

مرے لیے تو زمیں پر بس ایک ذات ہے — تُو !
اِسی لیے تو مری ساری کائنات ہے — تُو !

دسمبر ۱۹۷۸ء
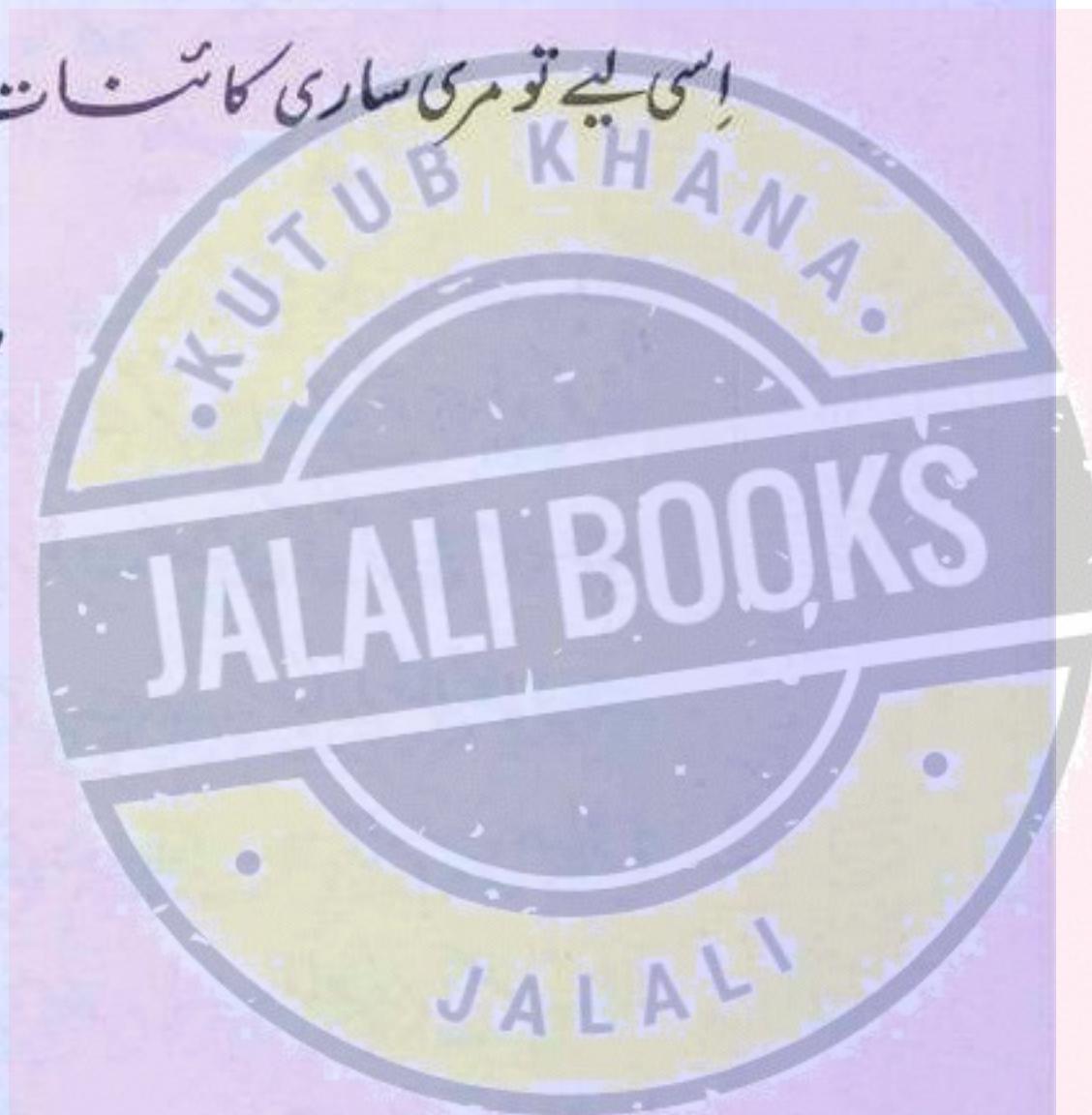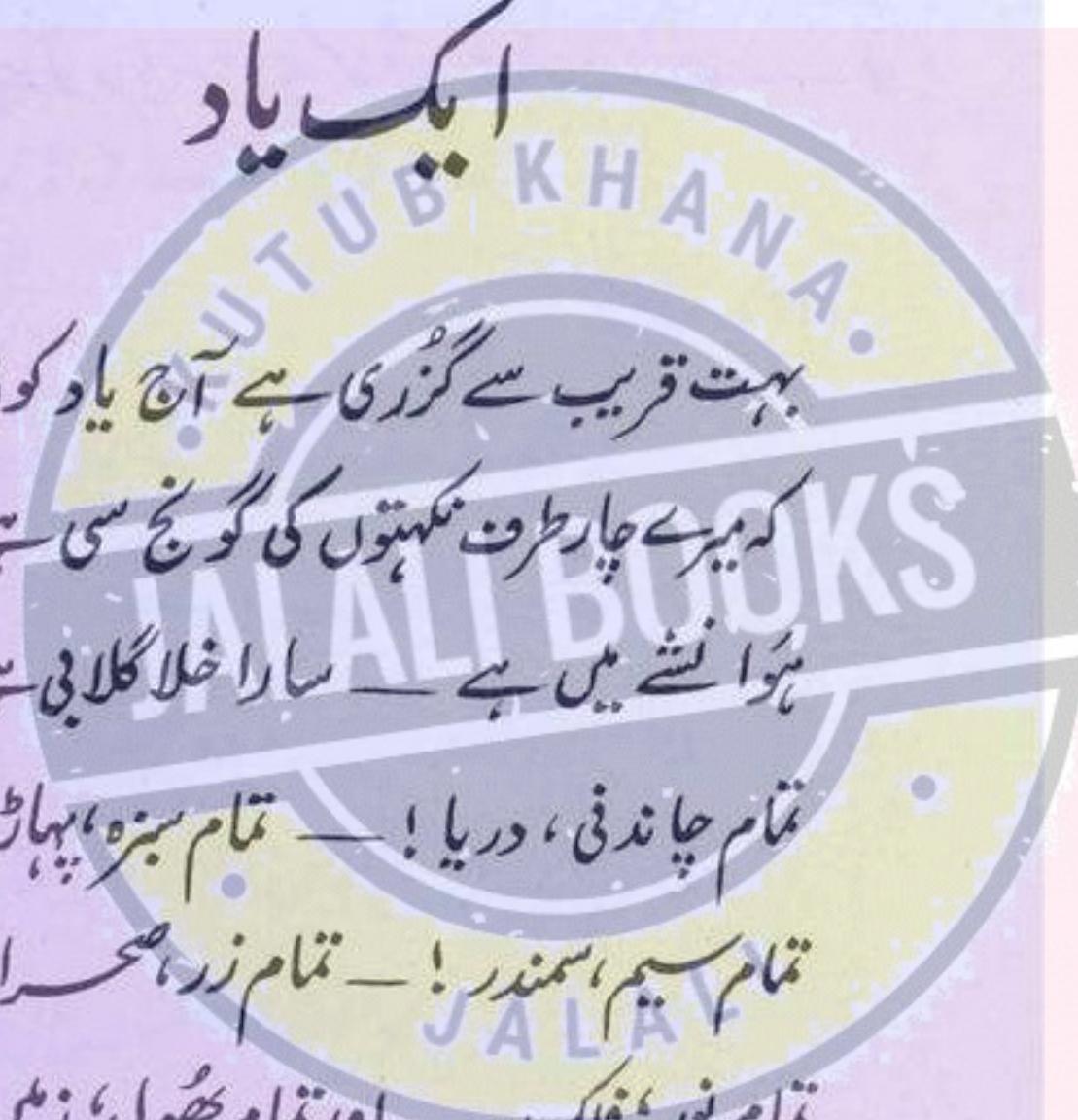
ایک یاد

بہت قریب سے گزری ہے آج یاد کوئی

کہ میرے چار طرف نکہتوں کی گونج سی ہے

ہوا نشے میں ہے — سارا خلا گلابی ہے

تمام چاندنی، دریا! — تمام سبزہ، پہاڑ!

تمام سیم، سمندر! — تمام زر، صحرا!

تمام نور، فلک — اور تمام پھول، زمیں!

فضا تو خیر، مرا دل بھی منجمد نہ رہا

ستارے ٹانک دیے برف میں شعاعوں نے

شعاعیں، جو کسی سورج بدن سے نکلی ہیں،

دسمبر ۱۹۷۸ء

حُسنِ بے حساب

تمھارے حُسن کو جتنے رُخوں سے دیکھتا ہُوں
شمار کرنے جو بیٹھوں، شمار کر نہ سکوں

اگر فقط مژہ ہائے دراز کا ہو بیاں
تو نیم دائرے اِتنا ہجوم کرتے ہیں
کہ جن سے گردشِ سیارگاں بھی شرمائے

اگر حدیثِ لبِ شعلہ وش کہوں، تو مجھے
کئی ہزار مثالیں حصار میں لے لیں،
اور اِک مثال کا چُننا ہو اِس قدر دُشوار
کہ میرا فن سپر انداز ہو کے رہ جائے

میں اپنے وقت کا تنہا حساب دانِ جمال
تمھیں جو سامنے پاؤں تو سوچ میں پڑ جاؤں
کہ اتنا حسن مرے فن سے کیسے سمٹے گا
میں کائنات کو مٹھی میں کیسے بند کروں

دسمبر ۱۹۷۸ء

دوام

دُھند

کُہر میں لپٹا سُورج نِکلا

دشتِ فلک کے ہاتھ میں جیسے طشت پُرانا!

چار طرف اشجار نہیں، اشجار کے سائے استادہ ہیں

شاخیں برگ و ثمر سے خالی
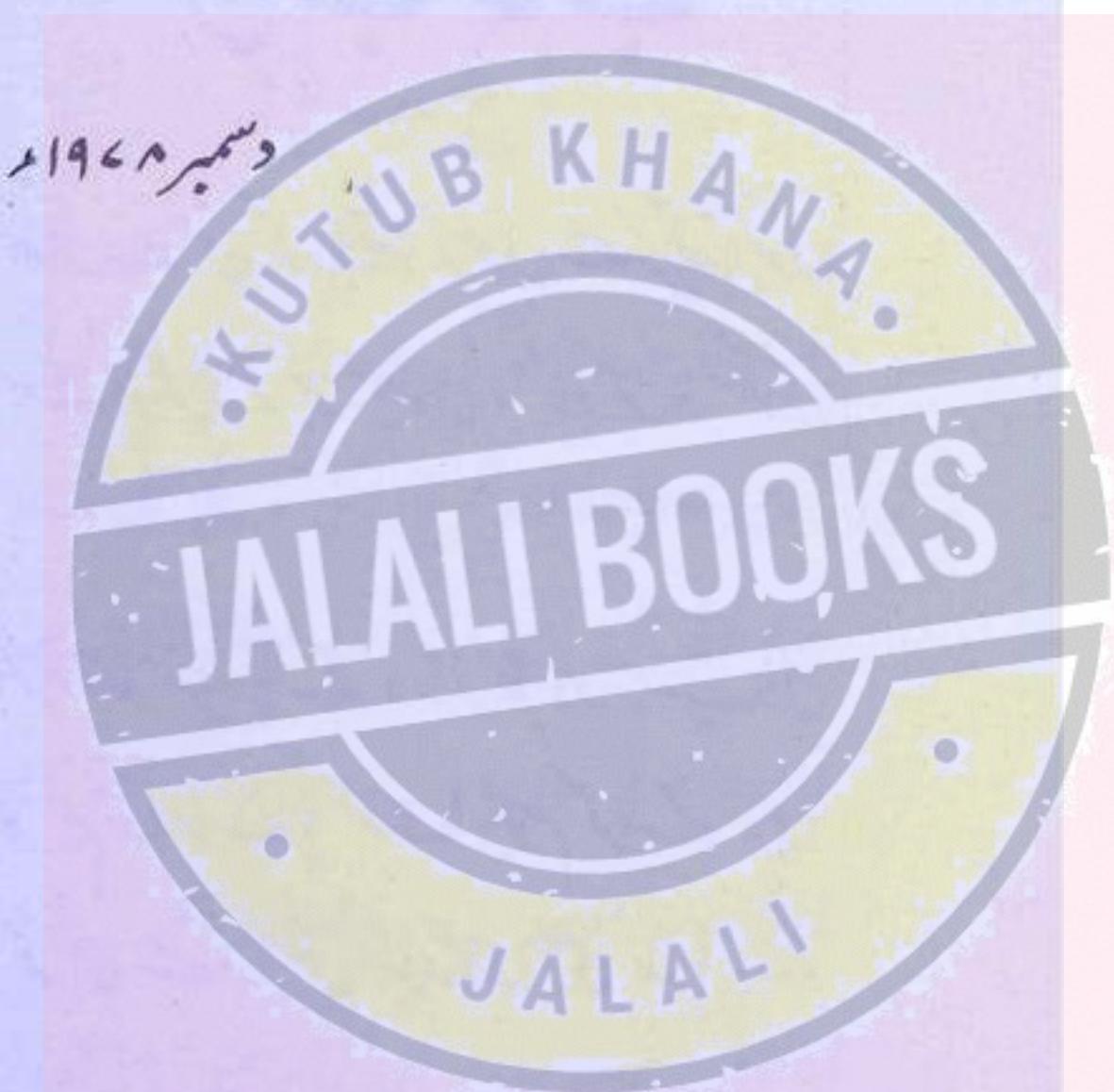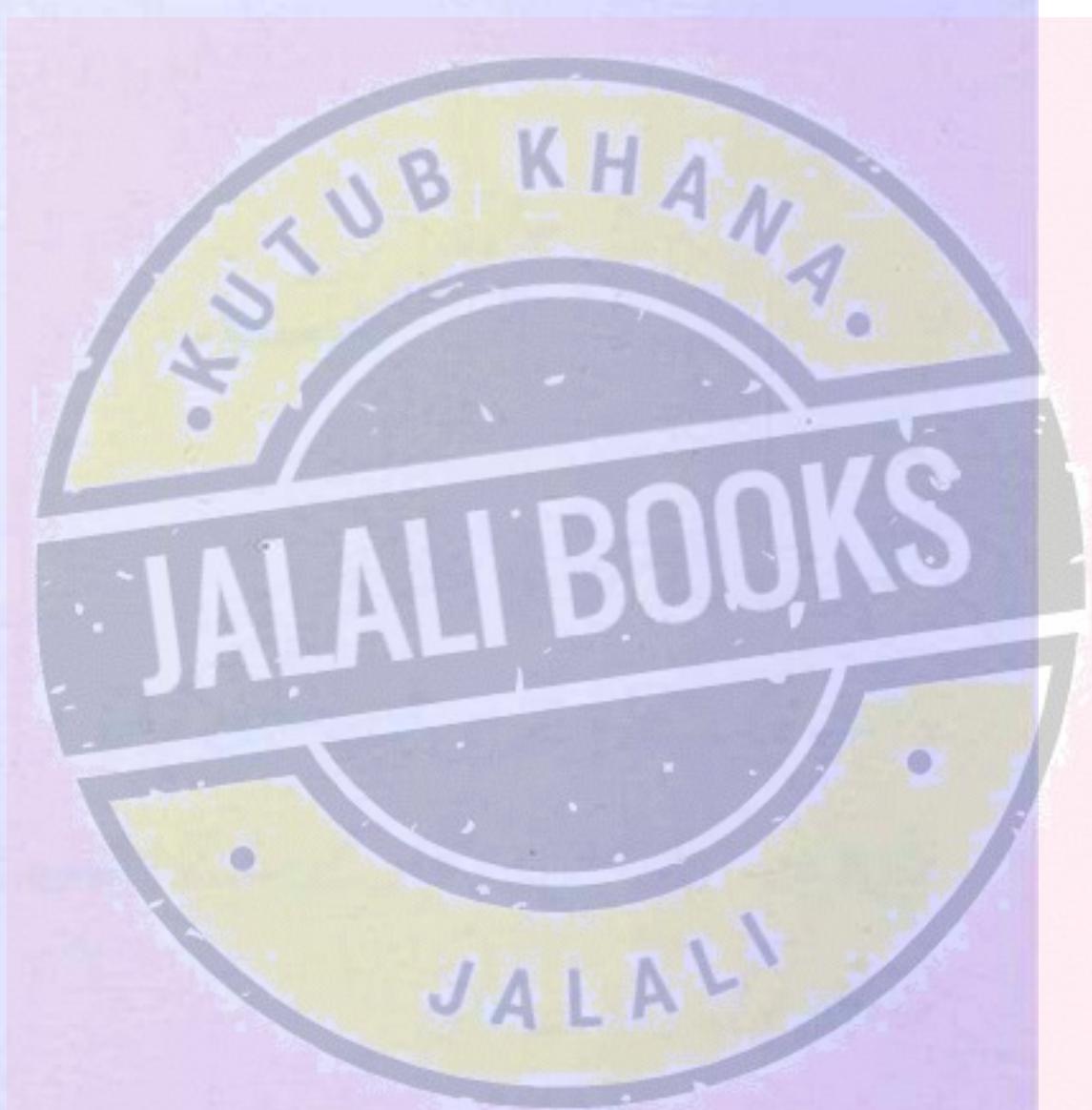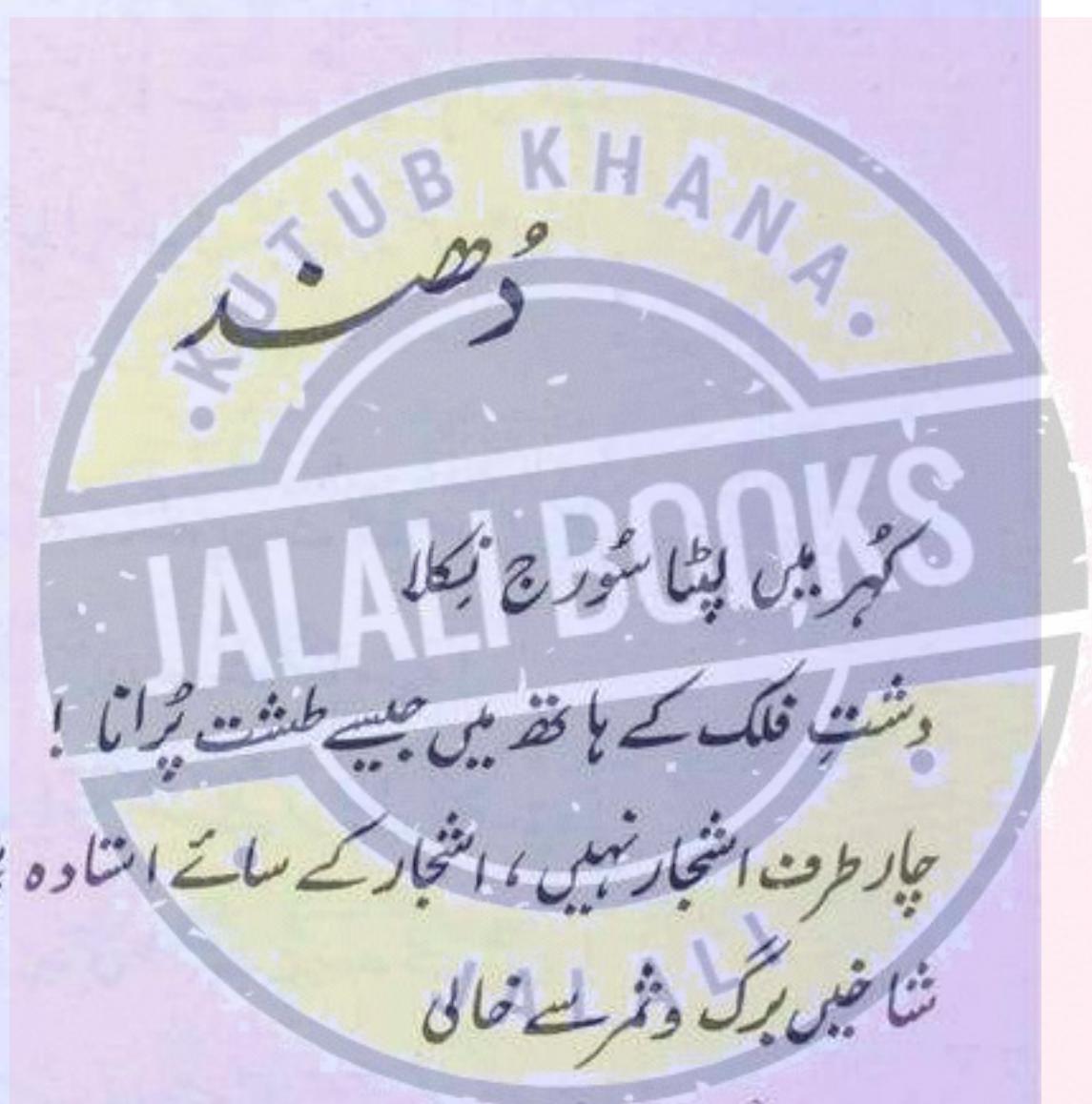
ہریالی بھی دُھندلی دُھندلی، کالی کالی!

پھول، سحر کے دھوکے میں انگڑائی لے کر پتّی پتّی بکھر گیا ہے!

چڑیا اپنے رین بسیرے سے نکلی ہے لیکن رستہ بھول گئی ہے!

سڑک پہ تانگے کے گھوڑے کی ٹاپیں گولے چھوڑ رہی ہیں!

ایک غبارے بیچنے والا

بچوں سے محروم گلی میں آ کر جیسے سوچ رہا ہے
روؤں یا آواز لگاؤں !
چمنی سے جو دھوئیں کا اِک مینار اُبھرا تھا
کہرے میں جیسے گڑا ہوا ہے !
بچہ ماں سے ضد کرتا ہے — صبح کہاں ہے ؟
صبحیں ایسی مٹیالی کیسے ہو سکتی ہیں !

اِک سورج کے دھندلے پن نے کتنے مسائل جنم دیے ہیں !
جیسے قدرت کا آئین بدلنے لگا ہے !
وقت بھی جیسے پاؤں گھسٹ کر چلنے لگا ہے !
روشن چہروں پر بھی دھبّے پڑنے لگے ہیں !
پتّے پیار کے پیڑوں سے بھی جھڑنے لگے ہیں !

نومبر ۱۹۷۸ء

بلیغ آنکھیں

مَیں جھانکتا ہُوں جب اُس کی بلیغ آنکھوں میں
بصارتوں پہ صحیفے اُترنے لگتے ہیں

مری نگاہ میں تحلیل ہو کے اس کے نقوش
لہُو کی طرح رگوں سے گزُرتے لگتے ہیں

بہت شدید ہے اُس لمحے کی گرفتِ جمال
کہ زخم بھی مرے دل میں سنورنے لگتے ہیں

سمندروں کی تہوں سے، چھڑا کے دامنِ چاک
صدی صدی کے سفینے اُبھرنے لگتے ہیں

چٹکنے لگتی ہیں خواب و خیال کی کلیاں
قریب و دُور، ستارے بکھرنے لگتے ہیں

اکتوبر ۱۹۷۸ء

غوطہ
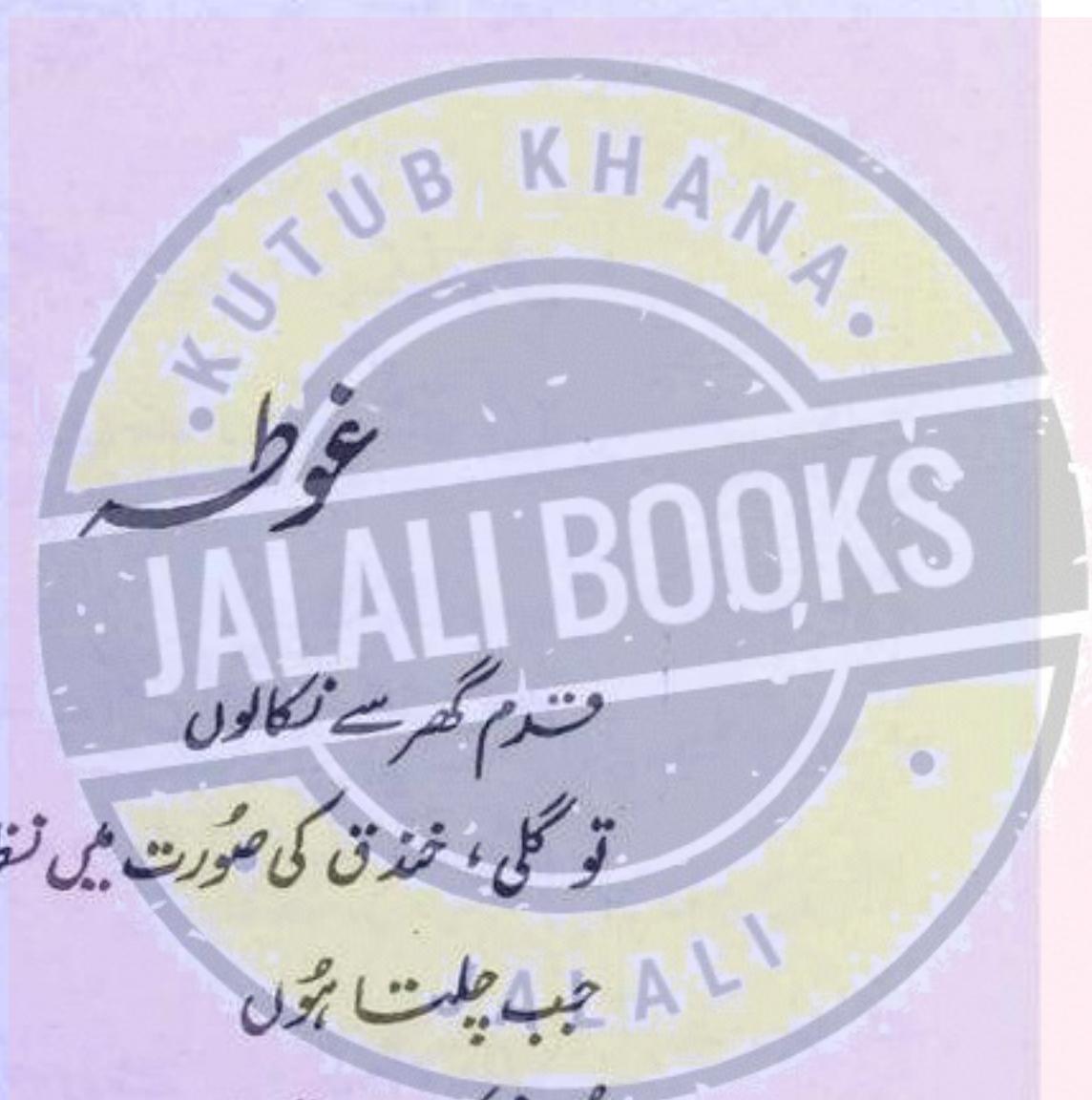
قدم گھر سے نکالوں
تو گلی، خندق کی صُورت میں نظر آتی ہے!
جب چلتا ہُوں
یُوں محسوس ہوتا ہے
کہ مَیں اُترا چلا جاتا ہُوں!
میرے شہر کو دھرتی کے ماتھے کا
اُجالا کہنے والے
جھُوٹ کب کہتے تھے

لیکن یہ گئے دن کی کہانی ہے

کہ جو بستی زمیں پر حُسنِ تہذیب و تمدّن

کا نمونہ تھی !

وہ اب تحت الثریٰ کی سرحدوں کے آس پاس

اِک غار میں بِکھری ہُوئی محصُور بیٹھی ہے

اسی باعث میں اپنے شہر کی گہرائیوں میں

یُوں اُترتا ہُوں !

کنوئیں میں جیسے بچّہ گر پڑے تو غوطہ خور اُترے !

جولائی ۱۹۷۸ء

دائرے
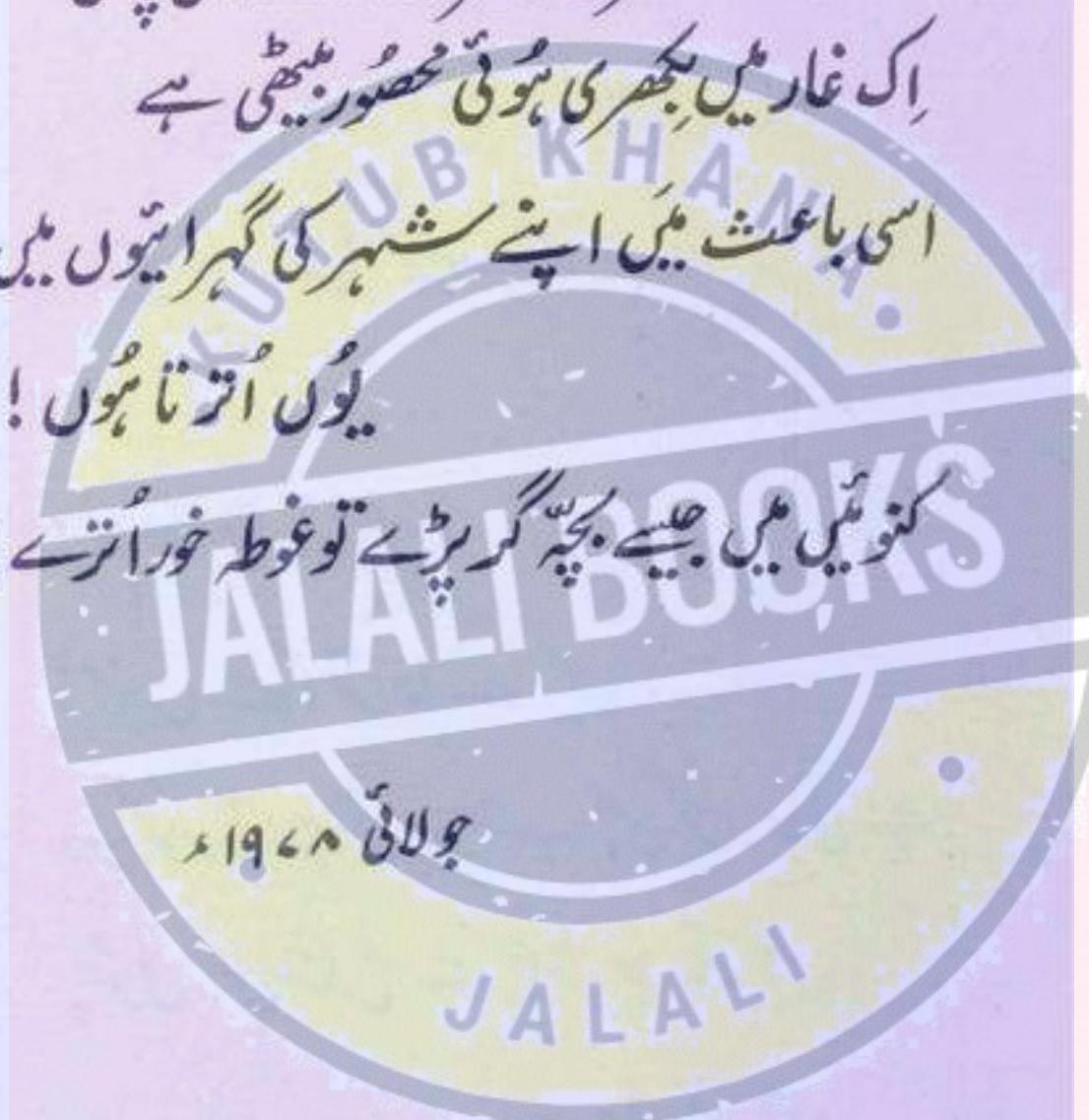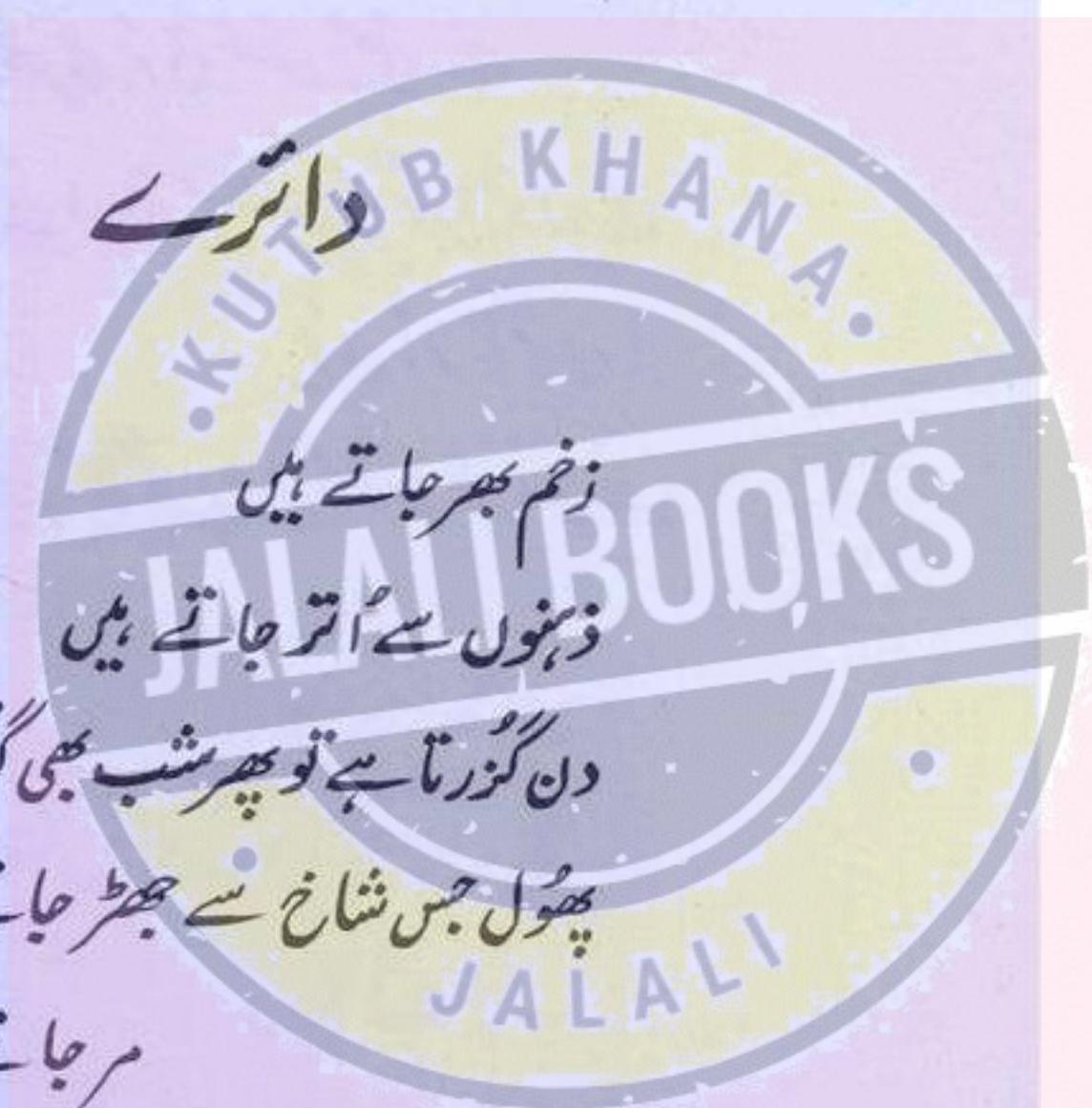
زخم بھر جاتے ہیں
ذہنوں سے اُتر جاتے ہیں
دن گزرتا ہے تو پھر شب بھی گزر جاتی ہے
پھول جس شاخ سے جھڑ جاتے ہیں
مر جاتے ہیں

چند ہی روز میں
اُس شاخ پہ آئندہ کے پھولوں کے نگینے
سے اُبھر آتے ہیں!

تیرے جانے سے مری ذات کے اندر
جو خلا گونجتا ہے
اِک نہ اِک دن اسے بھر جانا ہے
اِک نہ اِک روز تجھے
میری پھیلی ہوئی، ترسی ہوئی باہوں میں
پلٹ آنا ہے!

جولائی ۱۹۷۸ء

بلاوا

بارشوں کے موسم میں

بُوندیوں کی دستک نے

میرے گھر کے دروازے

مجھ پہ کھول ڈالے ہیں

جولائی ۱۹۷۸ء

قریب آؤ تو دیکھوں

قریب آؤ تو دیکھوں

تم مرے معیار کی حد تک حسیں ہو

یا پھر اس معیار سے بھی ماوراء ہو

جیسے انساں کے تصوّر میں خُدا ہو!

جولائی ۱۹۷۸ء

یاد

رات کے وقت، مرے دل پہ، تری یاد کا ہاتھ
اِتنی نرمی سے اُترتا ہے کہ جیسے شبنم
اِک چٹکتی ہوئی نورستہ کلی پر اُترے

جولائی ۱۹۷۸ء

حواس

بصارت منجمد ہے

اور زباں اک برف پارے کی طرح سُن ہے

مرے یخ ذائقے میں ریت کے ذرّات اُڑتے ہیں

سماعت اس قدر بے دست و پا ہے

صرف سنّاٹے کی مبہم اور بہیم چیخ اس کی دسترس میں ہے

زمیں کو سُونگھتا ہوں تو خلا کی باس آتی ہے

فقط اِک حِس ابھی زندہ ہے

مستقبل کے لمسِ دِلربا کی حِس!

مسلسل ارتقا کی حِس!

خدا کی حِس!

جولائی ۱۹۷۸ء

معیارِ رہنمائی

اِک مشتِ زر سے عشق کا سودا نہ کیجیے
انساں کے وقار کو رسوا نہ کیجیے

جذبے کا خون، فطرتِ انساں کا خون ہے
ایسا جو جی بھی چاہے تو ایسا نہ کیجیے

سجدہ بھی کیجیے تو بڑی تمکنت کے ساتھ
اپنی اَنا کے وزن کو ہلکا نہ کیجیے

آئینہ دیکھنا ہے تو منظر ہزار ہیں
صرف ایک اپنا عکس ہی دیکھا نہ کیجیے

جب تک ہیں خرمنوں پہ ستارے رُکے ہُوئے
بادل سے بجلیوں کا تقاضا نہ کیجیے

صحراؤں کا گھٹاؤں سے رشتہ غلط سہی
لیکن سمندروں پہ تو برسا نہ کیجیے

انساں نے حرف و صوت کو معنی عطا کیے
مفہُومِ کائنات سے کھیلا نہ کیجیے

تہذیب کے لباس سے دھوکا نہ کھائیے
چوروں پہ اپنے مُلک کا در وا نہ کیجیے

تلقین کر رہا ہے غریبوں کو شیخِ شہر
سب کیجیے پہ کوئی تمنّا نہ کیجیے

جولائی ۱۹۷۸ء

یہ کیا گونج ہے؟

میں اِس رات کی بے ازل، بے ابد خامشی میں

جو اِک گونج سی سُن رہا ہُوں
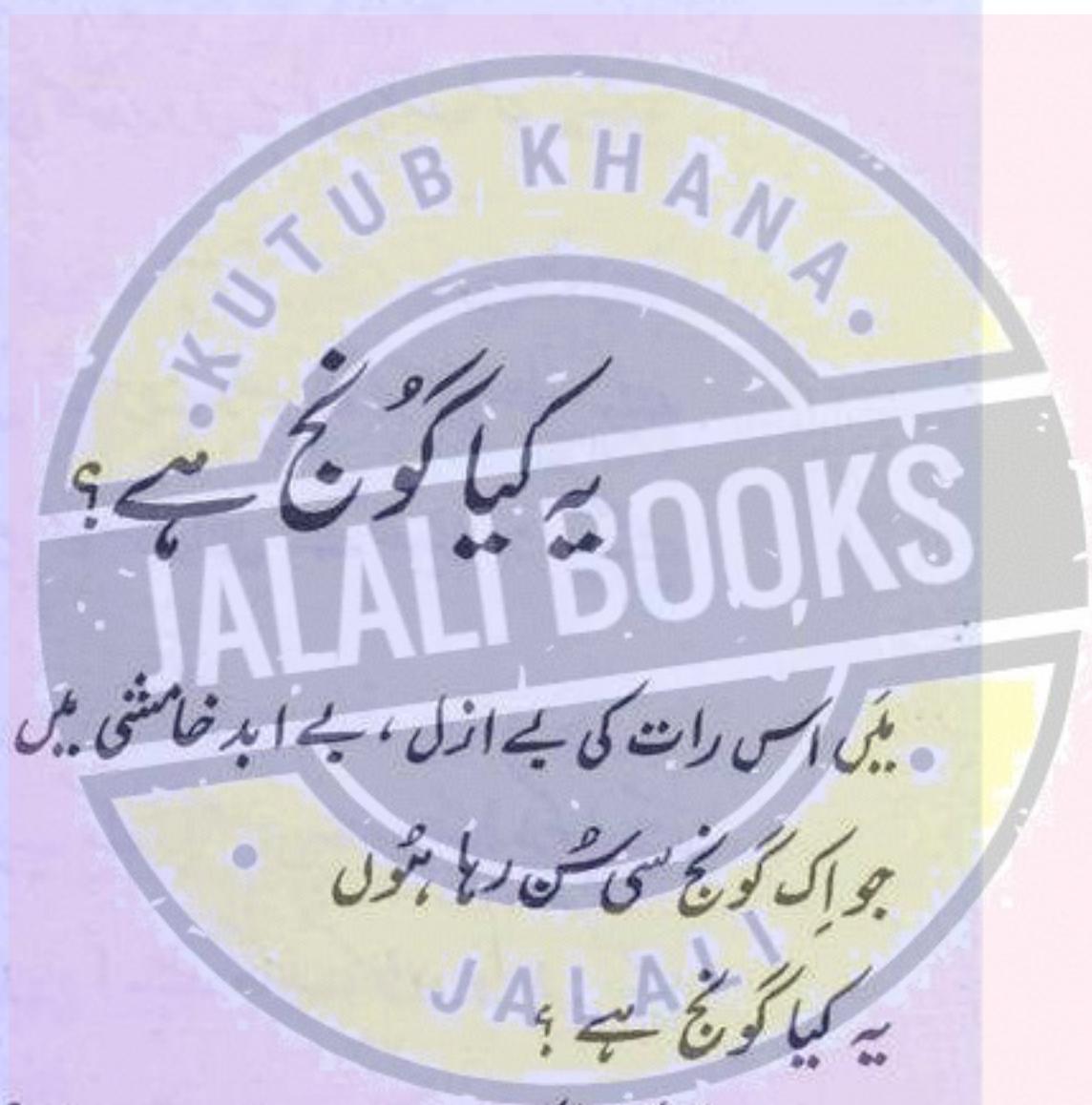
یہ کیا گونج ہے؟

کائناتوں کے کس گوشۂ بے نہایت سے آئی ہے؟

اس کے تسلسل میں صرف ایک ہی لفظ کیوں گونجتا ہے؟

یہ اک لفظ کیا ہے جسے "کُن" کے بعد اتنی عظمت ملی ہے؟

یہ لفظ اپنی تکمیل کی جُستجو میں

کئی سُورجوں کے مقدّر پہ منڈلا رہا ہے

یہ کیا اسم ہے جو بھری کائناتوں کو بے اسم

کرنے چلا ہے؟

یہ کیا گُونج ہے جو قیامت کے آثار سی ہے؟

یہ چکّی کے پاٹوں کے چلنے کی ——سات آسمانوں

کے اک دُوسرے کو

کچلنے کی آواز کیا ہے؟

خلاؤں کی بے انتہائی میں کچھ پِس رہا ہے کہ

کچھ بن رہا ہے؟

یہ سب کچھ نہیں ہے تو کیا ان گنت کائناتوں

کا خالق خدا

اِک نیا تجربہ کر رہا ہے؟

جون ۱۹۷۸ء

ایک اِنسان مِلا

سرِ شہراہِ حیات — اِک عجب انسان مِلا

اس کے ظاہر میں جو رعنائیاں تھیں
اس کے ذہن اور ضمیر اور محبت کی توانائیاں تھیں

اس کی باتوں میں جو سچائیاں تھیں
ایک سُلجھے ہوئے ادراک کی دانائیاں تھیں

اس کے لہجے میں جو برنائیاں تھیں
ایک جاگے ہوئے وجدان کی انگڑائیاں تھیں

اُس کی آنکھوں میں جو گہرائیاں تھیں
گو سمندر کی سی تا حدِّ نظر پھیلتی تنہائیاں لگتی تھیں ـــ
مگر انجمن آرائیاں تھیں !
جیسے اُس شخص کی یزداں سے شناسائیاں تھیں

ایک انسان ملا یا کوئی عرفان ملا !
جیسے فطرت کی طرف سے مجھے کُچھ اور جیسے جانے کا
ایک فرمان ملا !
سفرِ زیست کو ایقان سے طے کرتے چلے جانے کا
سر و سامان ملا !
سرِ شہراہ حیات ـــ اِک عجب انسان مِلا !

مارچ ۱۹۷۸ء

رشتے

نہیں! — کوئی رشتہ بھی اس دہر کا — بے نہایت نہیں

اِک خدا ہے

جو بے ابتدا اور لا انتہا ہے

کِسی سے مگر اُس کا بھی کوئی محسوس رشتہ نہیں ہے

یہ محسوس رشتے تو جسموں کی حدّت سے تخلیق پاتے ہیں

اور وہ جو بے جسم ہے

اس سے رشتہ کوئی کیا نکالے!
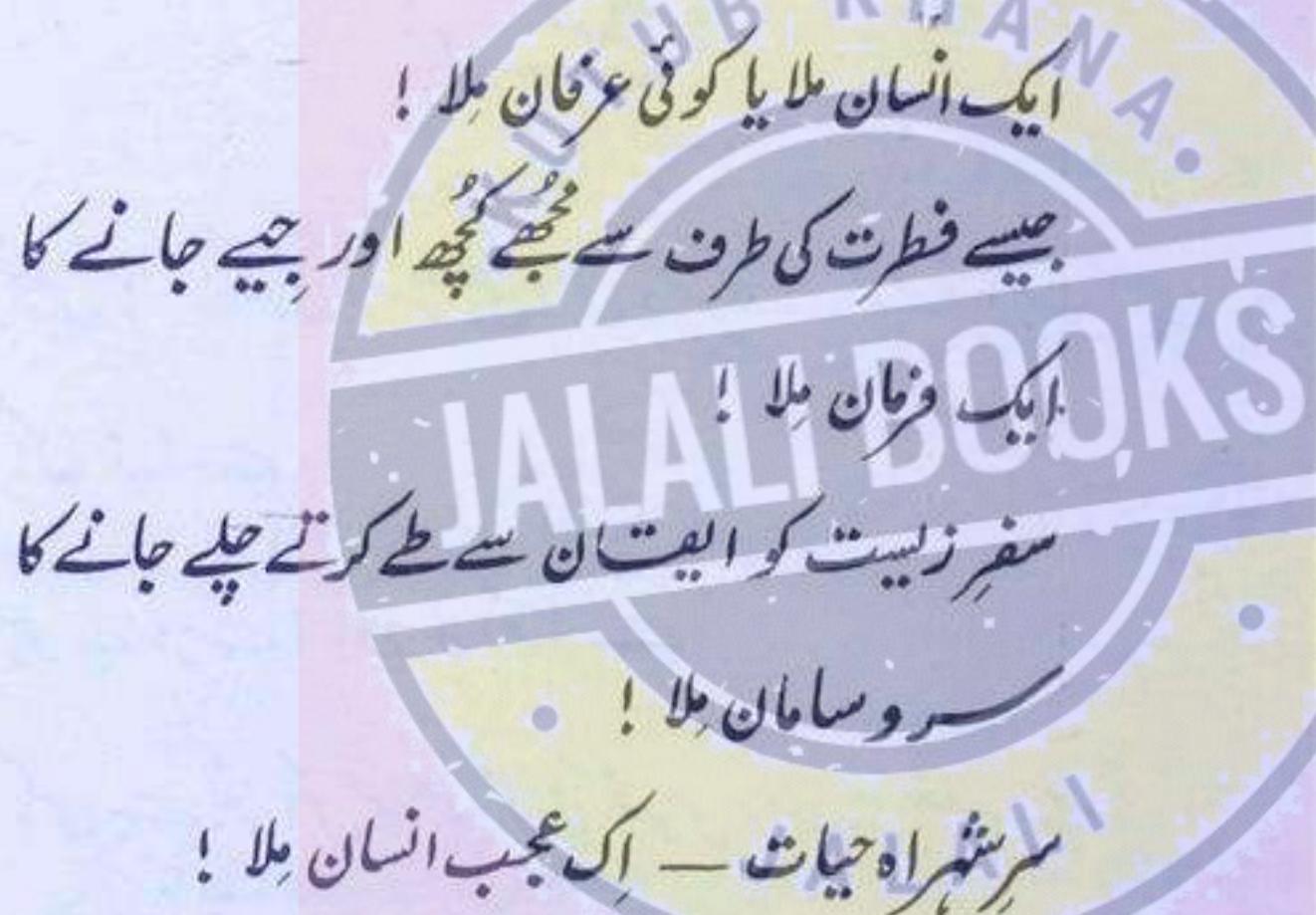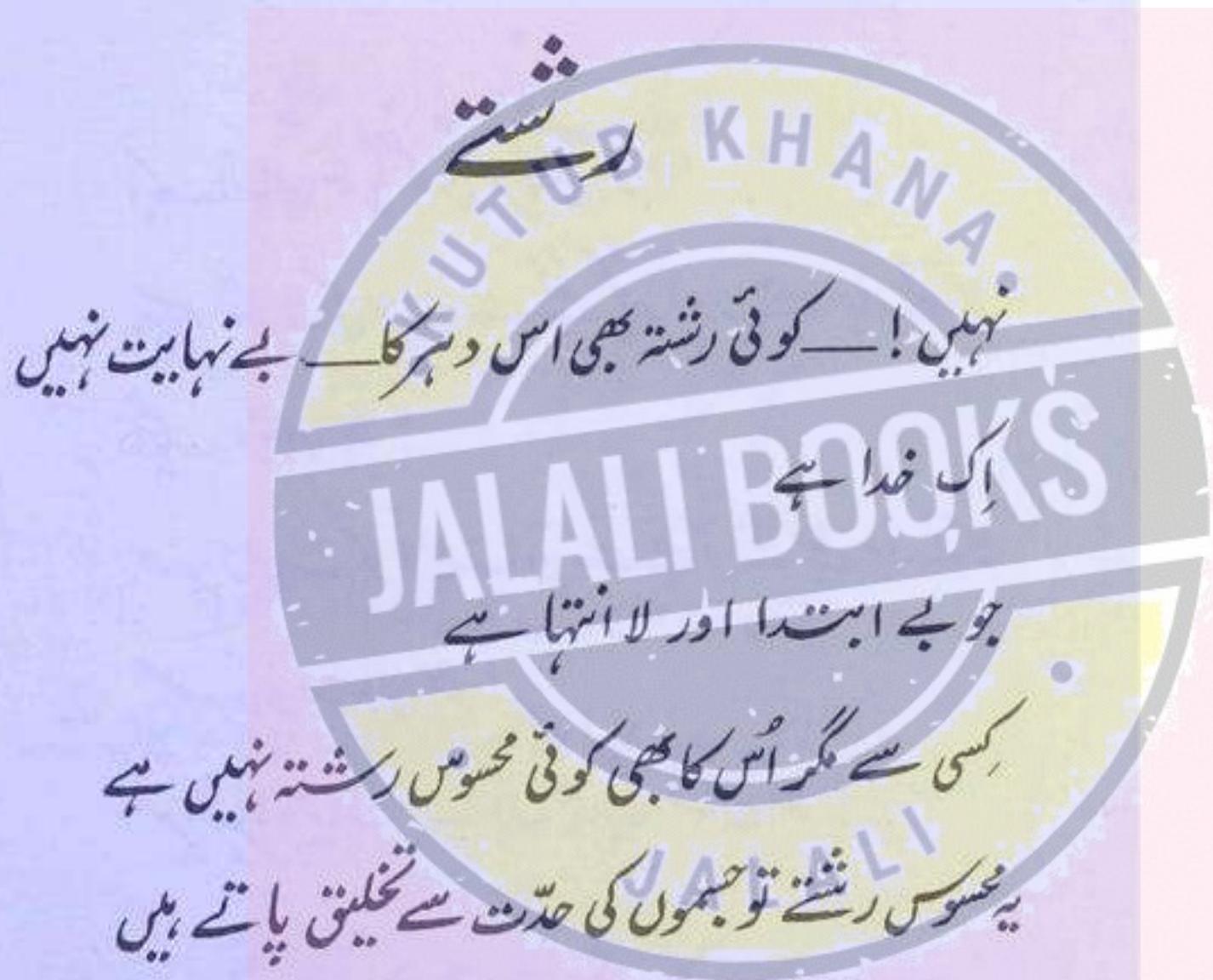
ورائے بدن ایک رشتہ وہ ہے

جس میں رُوحوں کی آپس میں تحلیل ہوتی ہے !

اپنے خدا سے یہ رشتہ تو امکان میں ہے

مگر اس کی رُوحِ بسیط اِک سمندر ہے !

قطرہ اگر اس میں مل جائے

اپنی اَنا کھو کے نابُود ہو جائے

اور یہ حقیقت تو اہلِ خدا کو بھی معلوم ہو گی

کہ نابُود ہونا نہایت ہے

(نابُود ہونا نہایت نہیں ہے تو پھر اور کیا ہے ؟)

وہی برف — جو سردیوں میں پہاڑوں کے سینے سے لگ کر

پڑی سو رہی تھی !

کڑی دُھوپ سے رشتہ پیدا ہُوا تو مچل کر پہاڑوں سے اُتری !

وہ دریاؤں میں دندناتی ہُوئی

اِک نئے رشتہ کی سرخوشی میں گٹکتی ہوئی ، گنگناتی ہُوئی

بحر سے جا ملی !

اور پہاڑوں نے دیکھا

کہ اُن پر فقط برف کی دھجیاں رہ گئیں

اور محبّت کا رشتہ نہایت کو پہنچا

کہ اس دہر کا کوئی رشتہ بھی ہو، بے نہایت نہیں

جب کہ روزِ ازل سے یہی کچھ ہُوا ہے

تو ممکن ہے، اب کے بھی ایسا ہی ہو

دُھوپ اپنی محبّت کے رشتے کا پیچھا کرے

بحر سے برف کی سب نمی چوس لے

جگمگاتے ہوئے شہپروں پر اٹھا کر اسے

جب پہاڑوں کے نگروں سے گزُرے
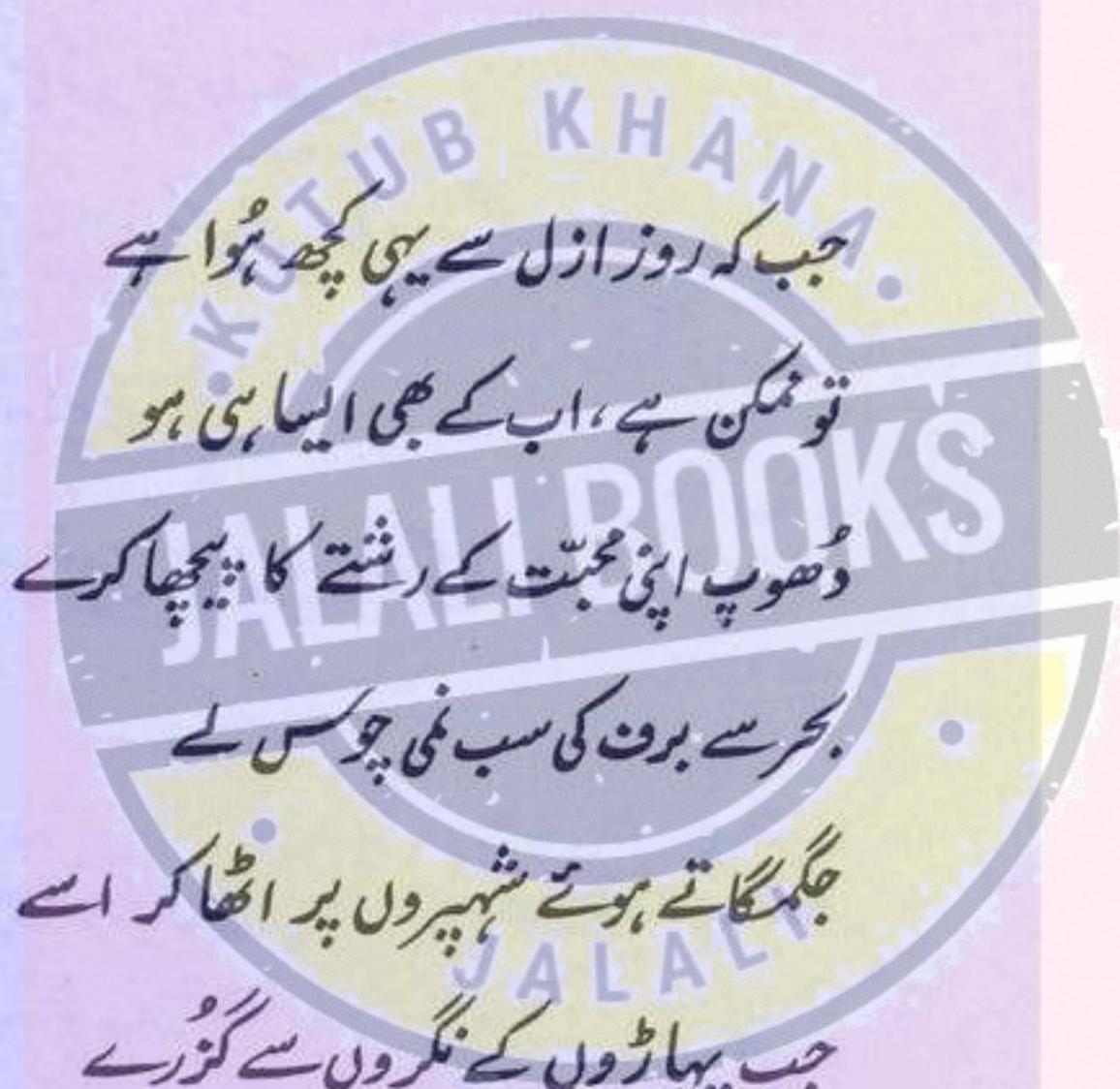
تو برف اس کی مٹھی سے گالوں کی صُورت نکلنے لگے

اور پہاڑوں کی قسمت بدلنے لگے

اِک نہایت سے ایک اور رشتہ چلے

دُھوپ سے ٹوٹ کر، برف کا جیسے پانی سے رشتہ چلا!

برف پانی میں زندہ ہے

اور دُھوپ میں زندہ رہتا ہے پانی

یہ سب اپنی اپنی اکائی کے باوصف، اِک دُوسرے کی اکائی

میں زندہ ہیں

میں تجھ میں زندہ ہُوں

تُو مجھ میں زندہ ہے

یوں اک نہایت سے اِک بے نہایت کی جانب سمٹتے ہُوئے،

پھیل جاتے ہُوئے دائروں کی الگ بات ہے

ورنہ اس دہر کا کوئی رشتہ بھی ہو، بے نہایت نہیں

مارچ ۱۹۷۸ء

تغیّر
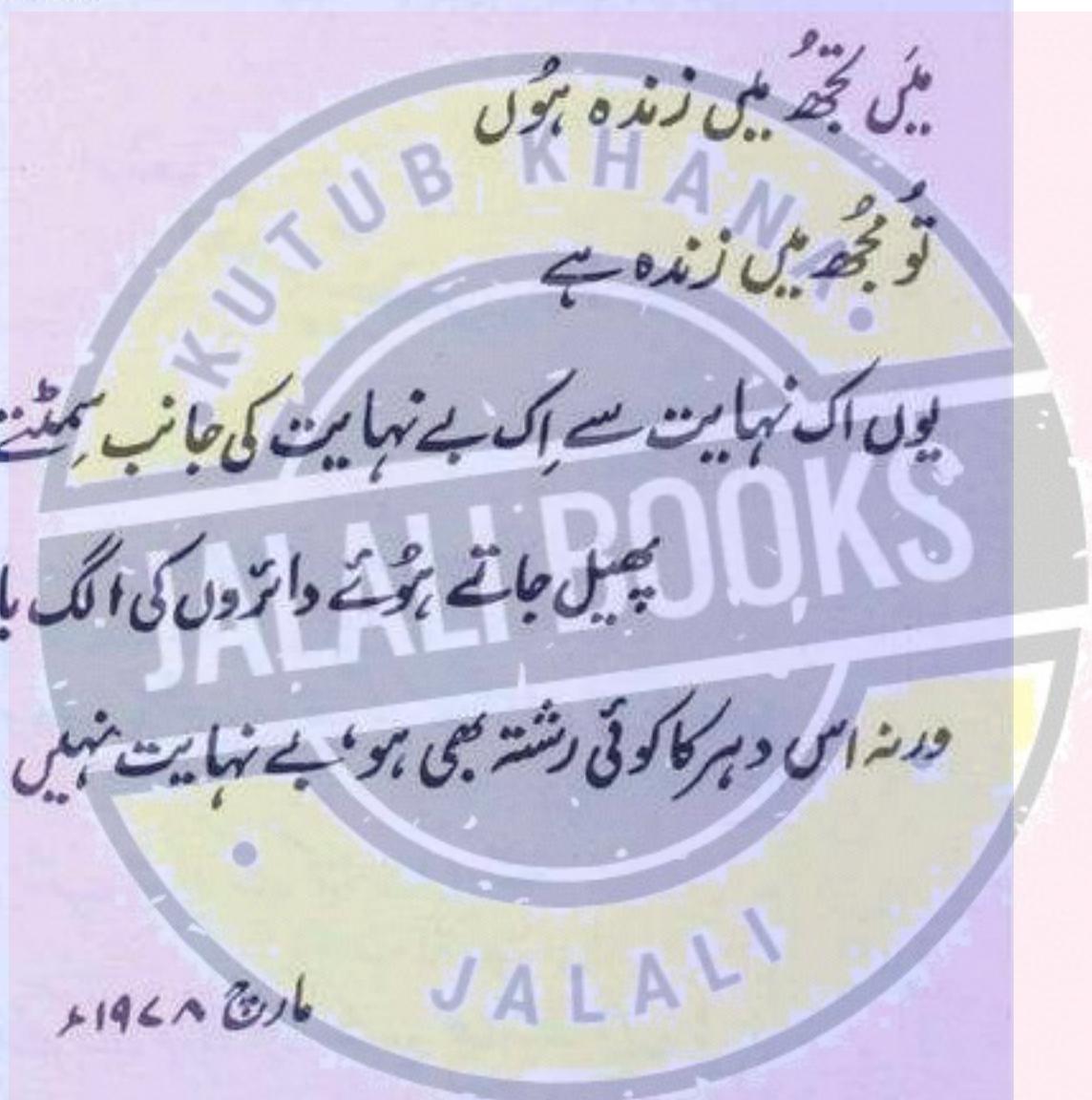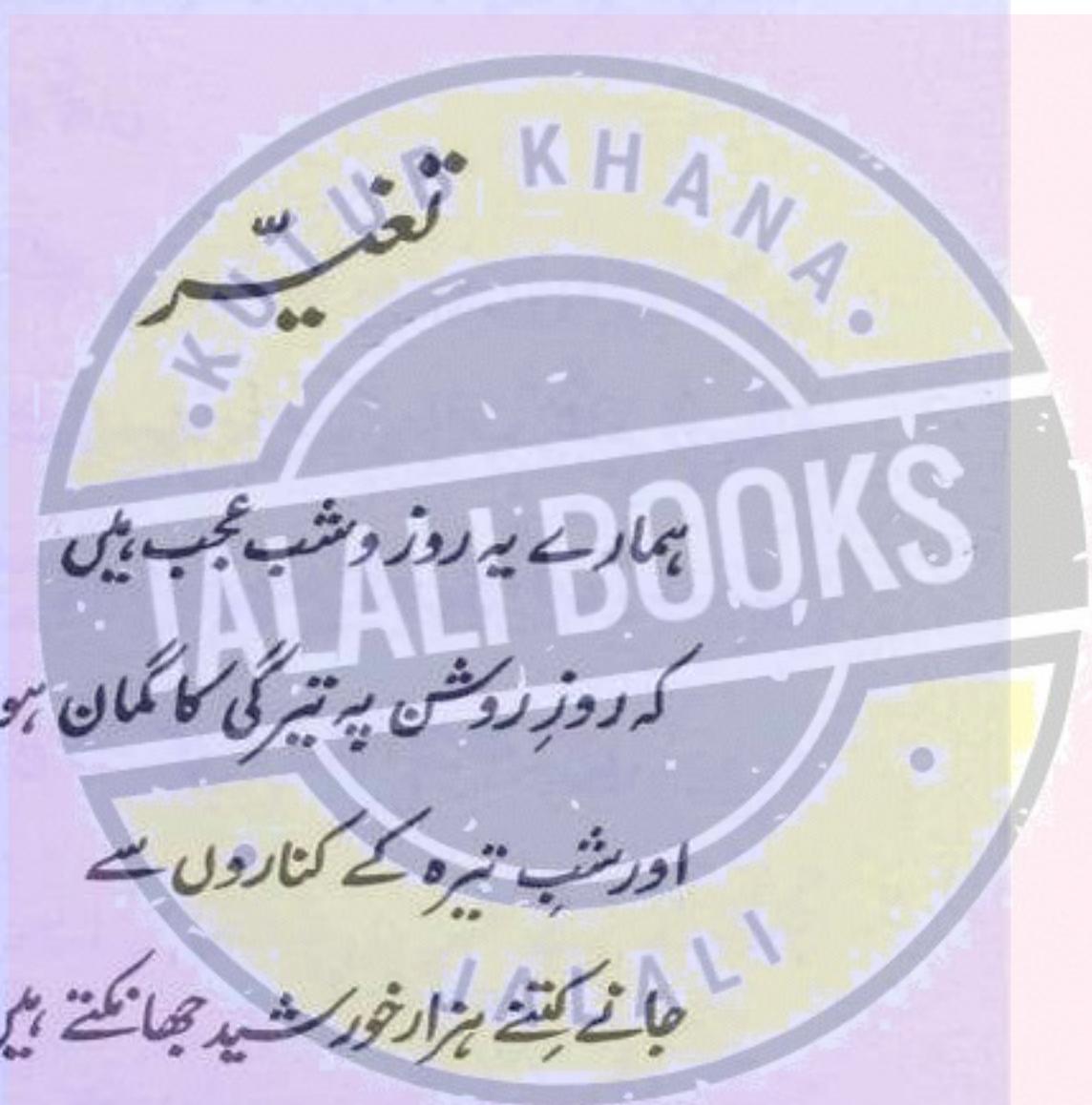
ہمارے یہ روز و شب عجب ہیں
کہ روزِ روشن پہ تیرگی کا گمان ہوتا ہے
اور شبِ تیرہ کے کناروں سے
جانے کتنے ہزار خورشید جھانکتے ہیں!
طلوع کے سارے منظروں پر
غروب کے سائے چھا رہے ہیں!
غروب کی سب شکستگی
اِک طلوع کے انتظار میں سانس روکے بیٹھی ہے!

ساری تقویم کو تغیّر کا سامنا ہے

تمام اقدار

سب روایات

اپنے سانچوں کو توڑ دینے کے ایک آشوبِ مستقل

میں اسیر ہیں!

اور جتنے انسان زندہ ہیں — دم بخود کھڑے ہیں

جو مر چکے ہیں

وہ ریگ زارِ عدم کے ٹیلوں پہ گڑ گئے ہیں

وہ منتظر ہیں

کہ پتّھروں سے گلاب پھُوٹیں

ہواؤں میں روشنی بہے

بارشوں میں موتی گریں

خزاں خوشبوئیں لٹائے!

وہ منتظر ہیں

کہ آسمانوں کے در کھلیں

اَن گنت فرشتے امڈ پڑیں

اور زمین پر سجدہ ریز ہوتے ہی

آسمانوں کو لوٹ جانا ہی بھول جائیں !

تمام موسم بدل رہے ہیں

تمام معیار مٹ رہے ہیں

تمام افکار منقلب ہیں

جو سر برآوردہ تھے

وہ سر در گریباں بیٹھے ہیں

اور وہ جو کہ خاک بر سر تھے

اس قدر سر بلند ہیں
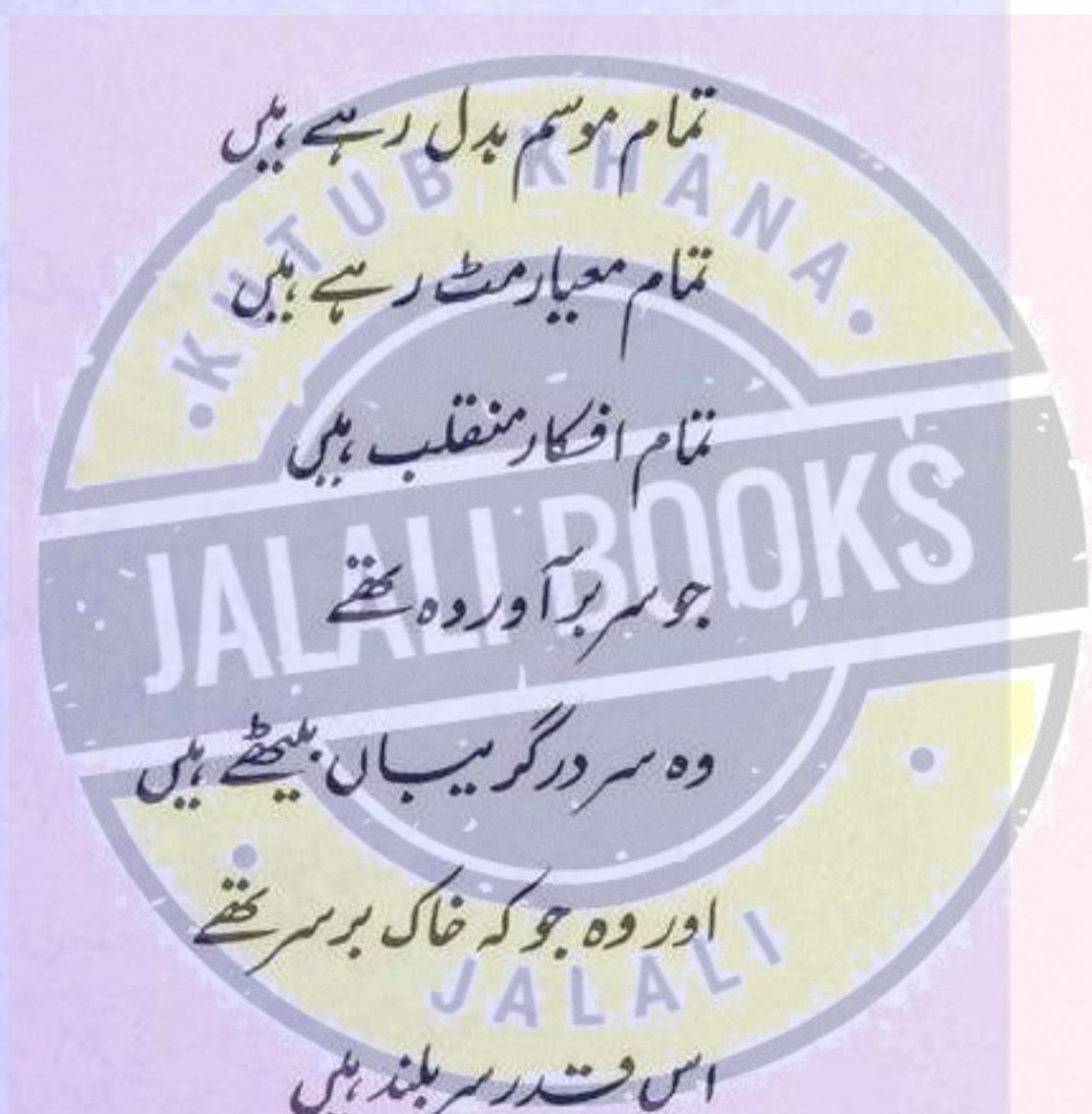
جیسے اپنے قد سے

زمین اور آسماں کے مابین کی مُسافت کو

ناپتے ہیں !

وہ آہنی در

جو نصب تھا فرش و عرش کے درمیان
آخر پگھل رہا ہے!

تقدّس اور احترام کے مرکزوں سے پہرہ
ہٹا ہُوا ہے!

خدا سے انساں کا ربط
سجدے سے آگے بڑھ کر
معانقے میں بدل رہا ہے!

دسمبر ۱۹۷۷ء

بامعنی
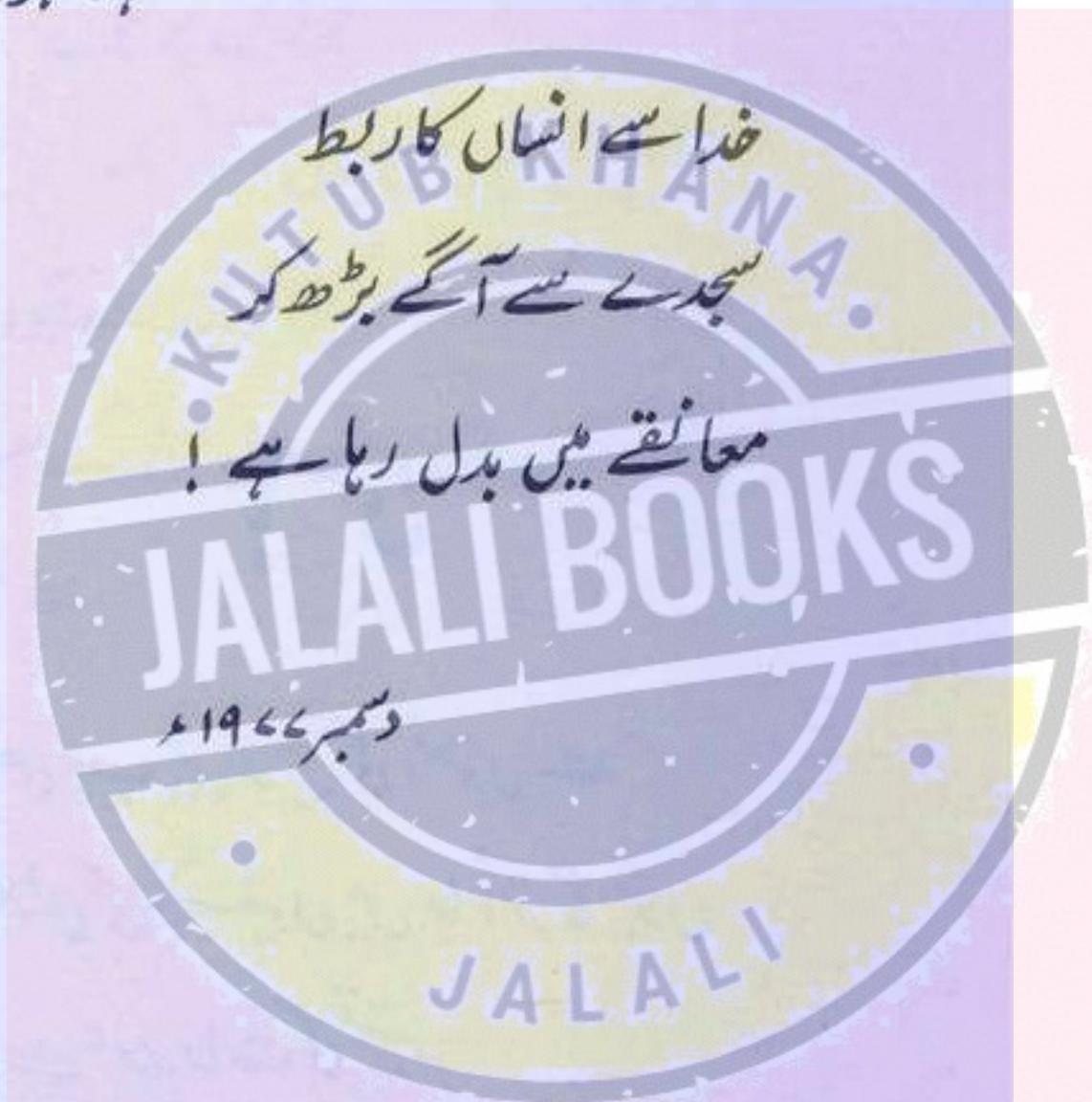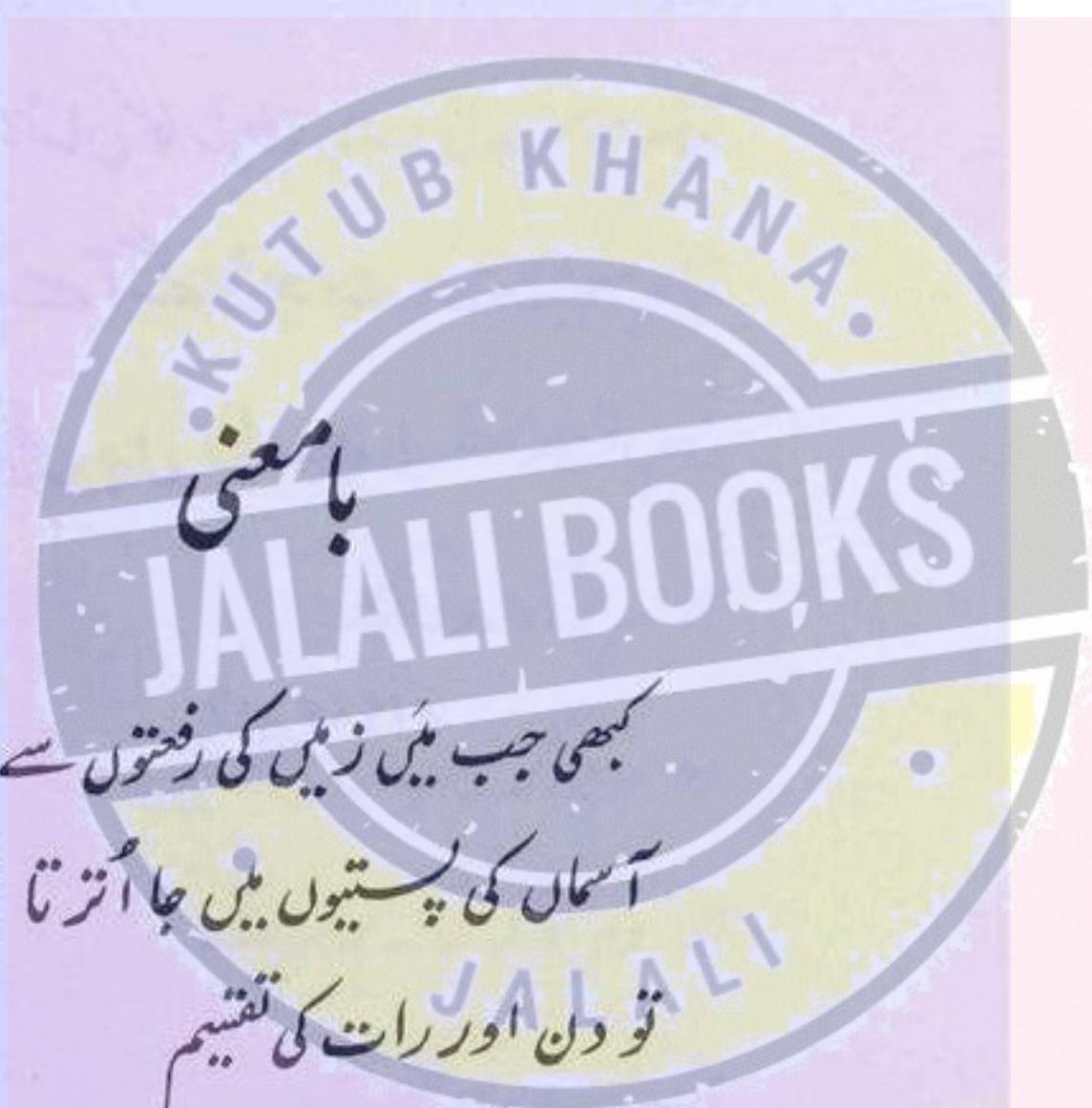
کبھی جب مَیں زمیں کی رفعتوں سے
آسماں کی پستیوں میں جا اُترتا ہُوں
تو دن اور رات کی تقسیم
ماہ وسال کی تقویم
اور اسرار کی تفہیم
یُوں ایک ایک کر کے میرے کیسۂ حکمت سے
گرتی ہیں !

شجر سے جیسے پتّے ٹوٹنے لگتے ہیں
پت جھڑ میں !

اگر میں آسماں پر وہ نہیں ہوں،
جو زمیں پر ہوں
تو میں جو کچھ بھی ہوں،
اپنی زمیں سے ہوں
اگر انسان ہوں، تو اپنی مٹی کے یقیں
سے ہوں !

ستمبر ۱۹۷۷ء
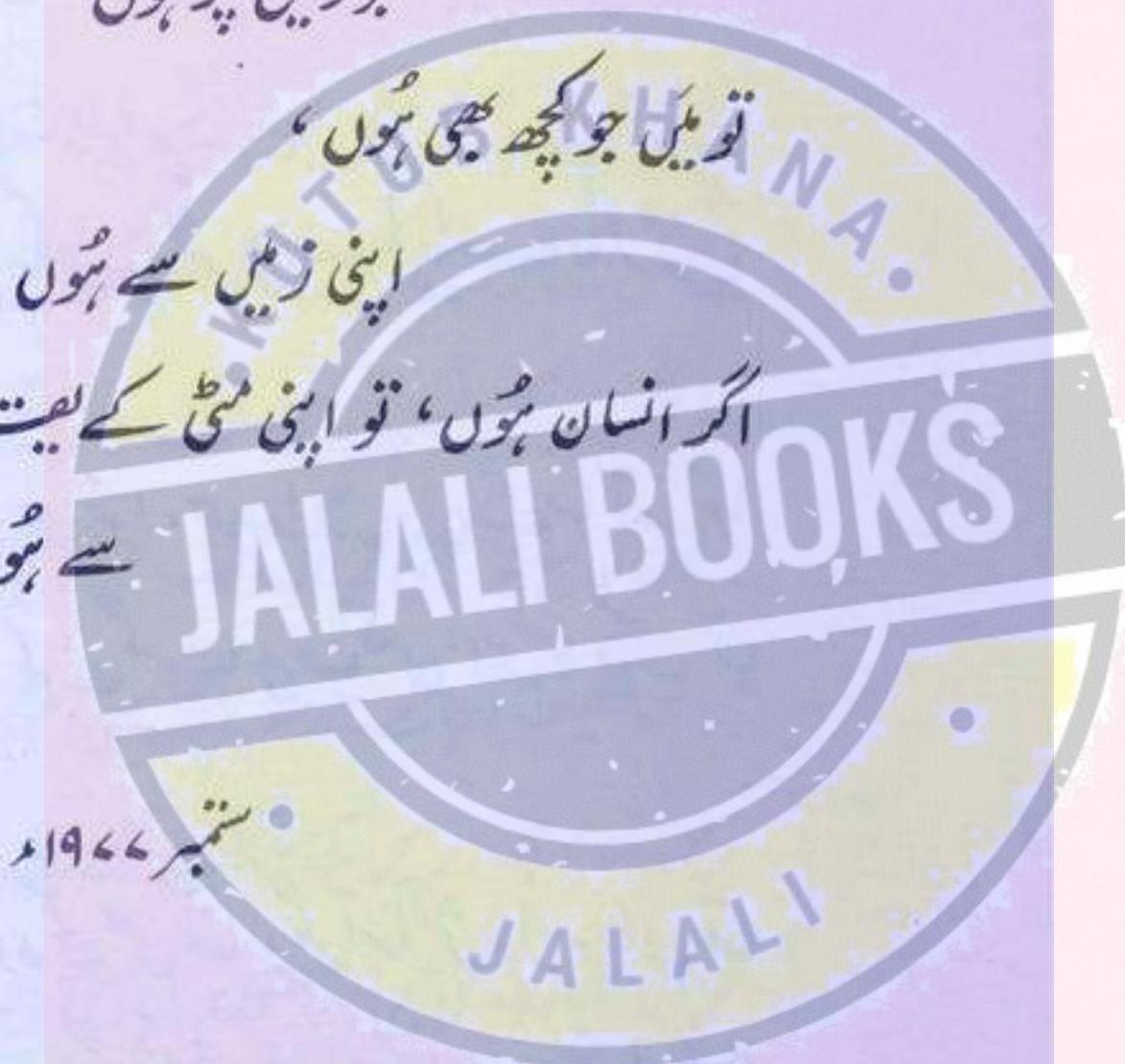
ایک فرد — ایک تاریخ

وہی ہُوا، جو سدا اہلِ دل کے ساتھ ہُوا
کہ بن گیا ہدفِ طعن، اس کا چاکِ قبا

وہ کچھ بھی تھا، مگر آسائشِ دل و جاں تھا
صدا کی شاخ پہ جب اس کا حرف پھول کھِلا
وہ دشت بھی، کہ جو بنجر تھے کتنی صدیوں سے
نمو کی آنچ جو پہنچی تو سبزہ زار ہوئے
وہ کوہسار جو یخ بستگی کے حبس میں تھے
جب اس کے لمس سے چٹخے تو گلعذار ہوئے

وہ کچھ بھی تھا مگر اس وقت اِک وہی تو تھا
کہ جس نے بڑھ کے مقفل دہن کو کھولا تھا

مرا جوان وطن، میرا بے زبان وطن
رکھا گیا تھا جسے گنگ عہدِ طفلی سے
پھٹے پھٹے ہوئے زخمی لبوں سے بولا تھا

یہ اس کے حرف کا اعجاز تھا کہ اس کے طفیل
وہ لوگ جو کئی نسلوں سے خاک بر سر تھے
اٹھے تو سینۂ گیتی میں اک دھمک سی اُٹھی
بہت لطیف اُجالے سے شب چمک سی اُٹھی
زمیں کے بوجھ، زمیں کے سنگار بن کے چلے
خزاں سے روندی ہوئی وسعتوں میں پہلی بار
خرامِ ابر، ہوائے بہار بن کے چلے

وہ کچھ بھی تھا مگر اُس دورِ نو کا بانی تھا
کہ جس میں، سنگِ سرِ راہ، باوقار ہوا

وہ ایک فرد جو امڈا تو ایک فرد نہ تھا
وہ ایک شخص جو برسا تو بے شمار ہُوا
فرازِ عصر سے جھرنا سا ایک پھُوٹا تھا
جو بے حسی کے خم و پیچ سے گزرتا ہُوا
دل و دماغ میں اُترا تو بے کنار ہُوا

ستمبر ۷۷ء

جی چاہتا ہے کہ مسکراؤں

جی چاہتا ہے کہ مسکراؤں
لیکن وہ لہو کہاں چھپاؤں
جو میرے بھینچے ہوئے لبوں میں
رسنے کے لیے رکا ہوا ہے
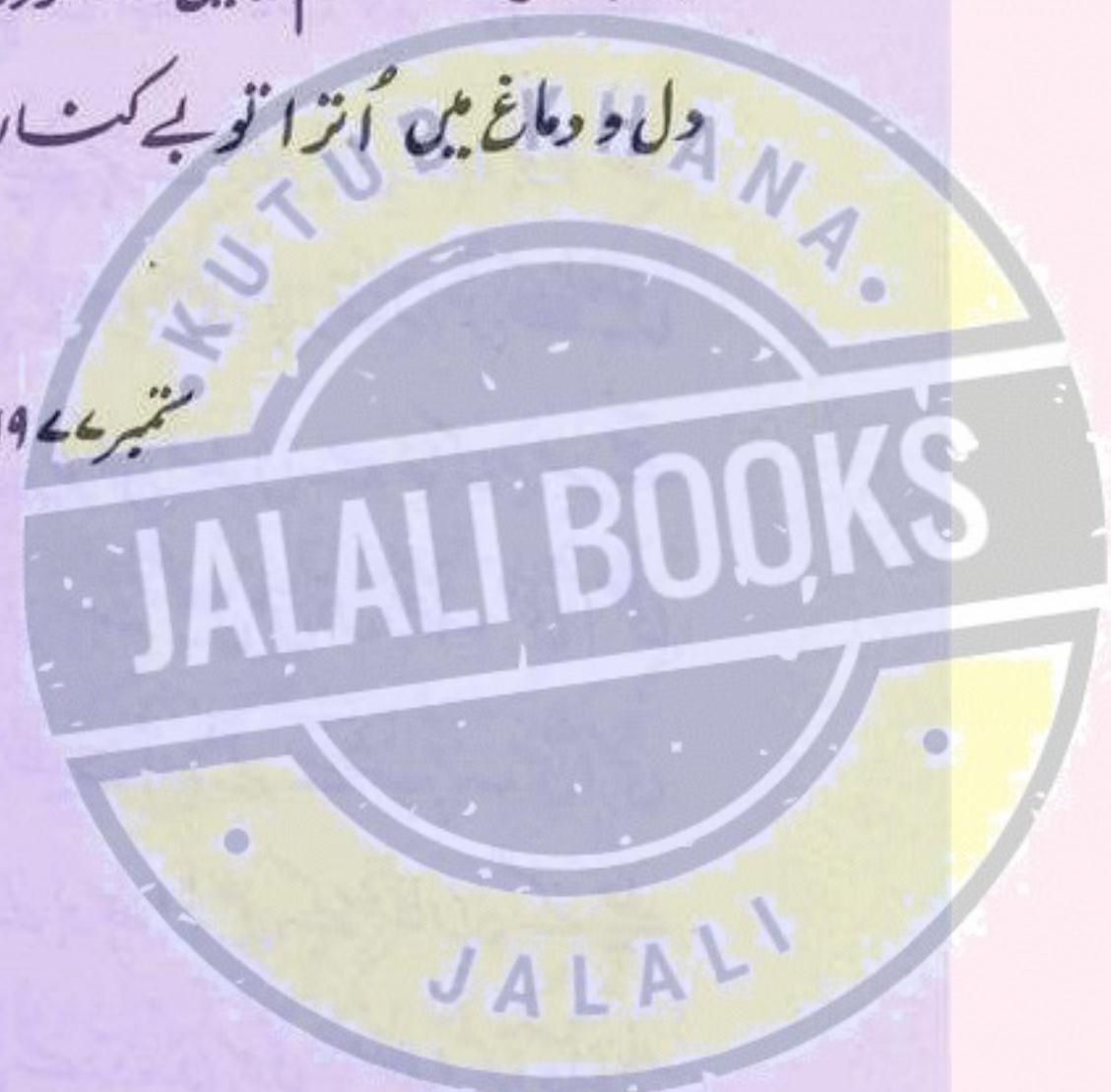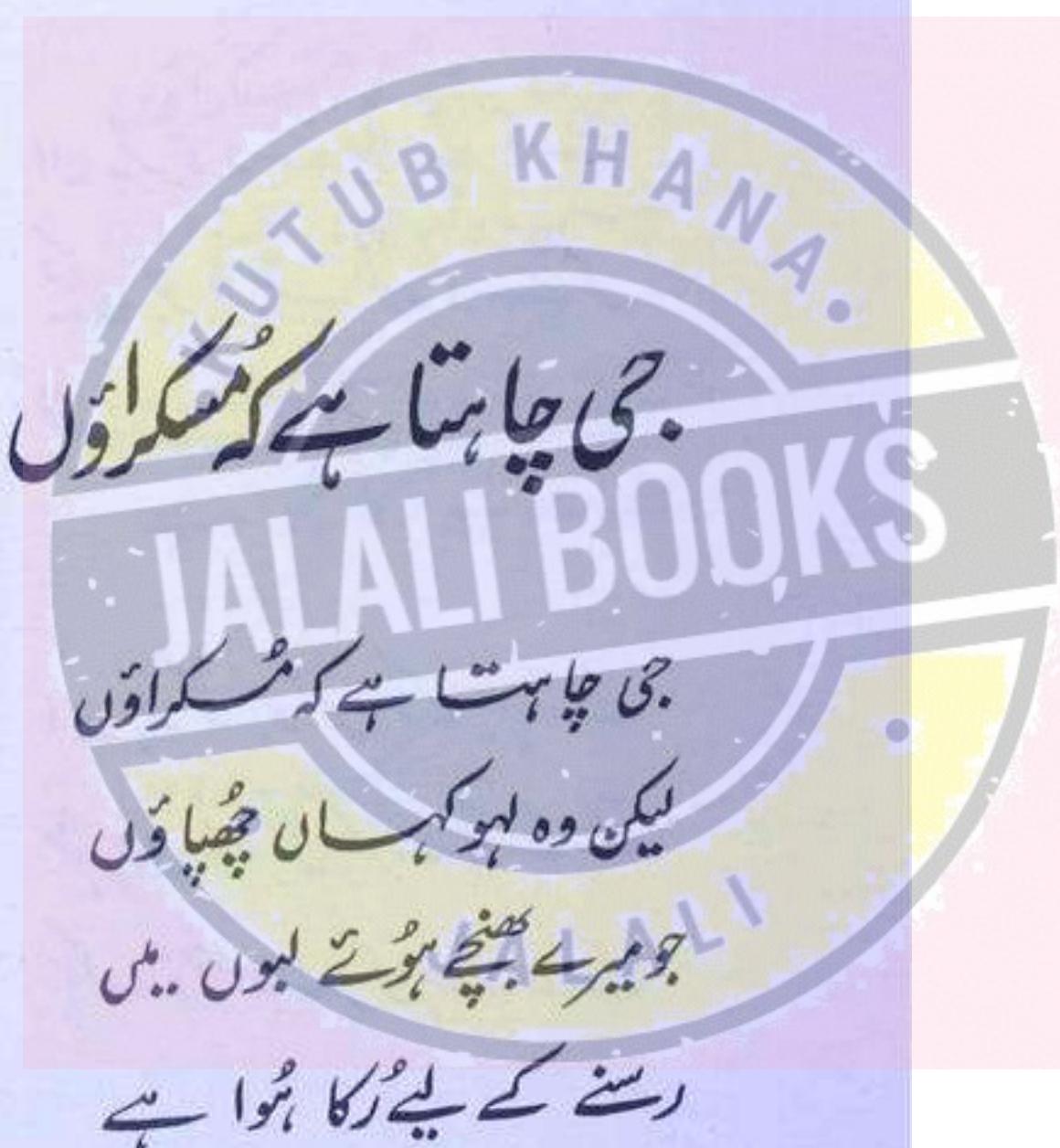
ان پر کہ جو میرے راہبر تھے
اور جن کا کمالِ رہنمائی
جلتے ہوئے گھر، لٹے نگر تھے

ان پر کہ جو شبر بن کے گرجے
غرائے، دہاڑے، دندنائے
اور کھال محل میں بھول آئے

ان پر جو دیئے جلانے آئے
لیکن جو فریبِ نور دے کر
ظلمات کا رس نچوڑ لائے

ان پر کہ جو عشق کے بہانے
شہروں سے نکل کھڑے ہوئے تھے
اِک دخترِ کوہسار لانے
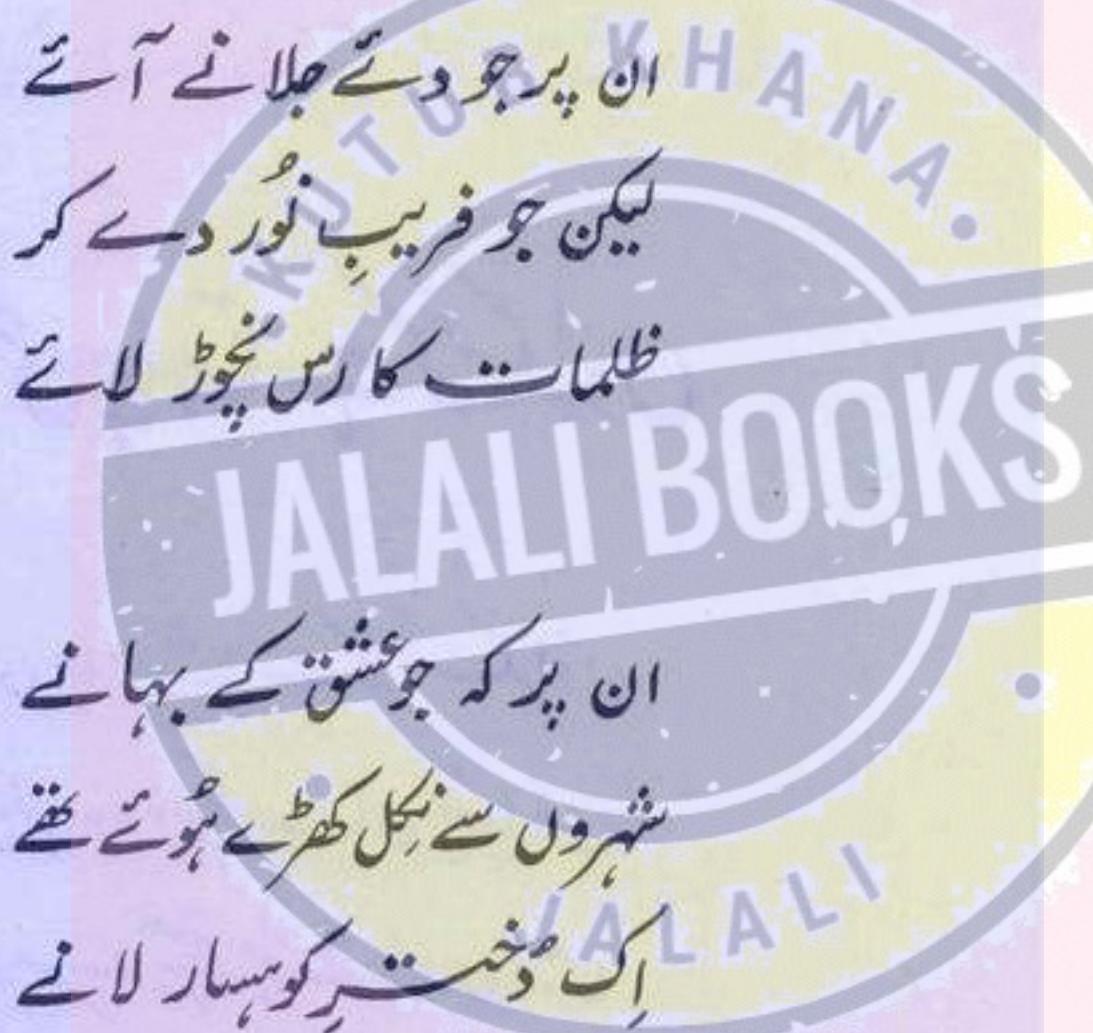
ان پر کہ جو حفظِ فن کی دھن میں
فن کو زنجیر کرنے نکلے
خوشبو کو اسیر کرنے نکلے

ان پر کہ جو دیکھتے تھے سب کچھ
پر چیخ بھی سر نہ کر سکے وہ
جی بھی نہ سکے ، نہ مر سکے وہ

جی چاہتا ہے کہ مسکراؤں
لیکن وہ لہو کہاں چھپاؤں
جو میرے بھنچے ہوئے لبوں میں
رسنے کے لیے رکا ہوا ہے

اگست ۱۹۷۷ء

ایک بیل سے

کھال بہت موٹی ہے تمھاری !

سُن سُن کرتے کوڑے کھاؤ

کان ہلاتے جاؤ !
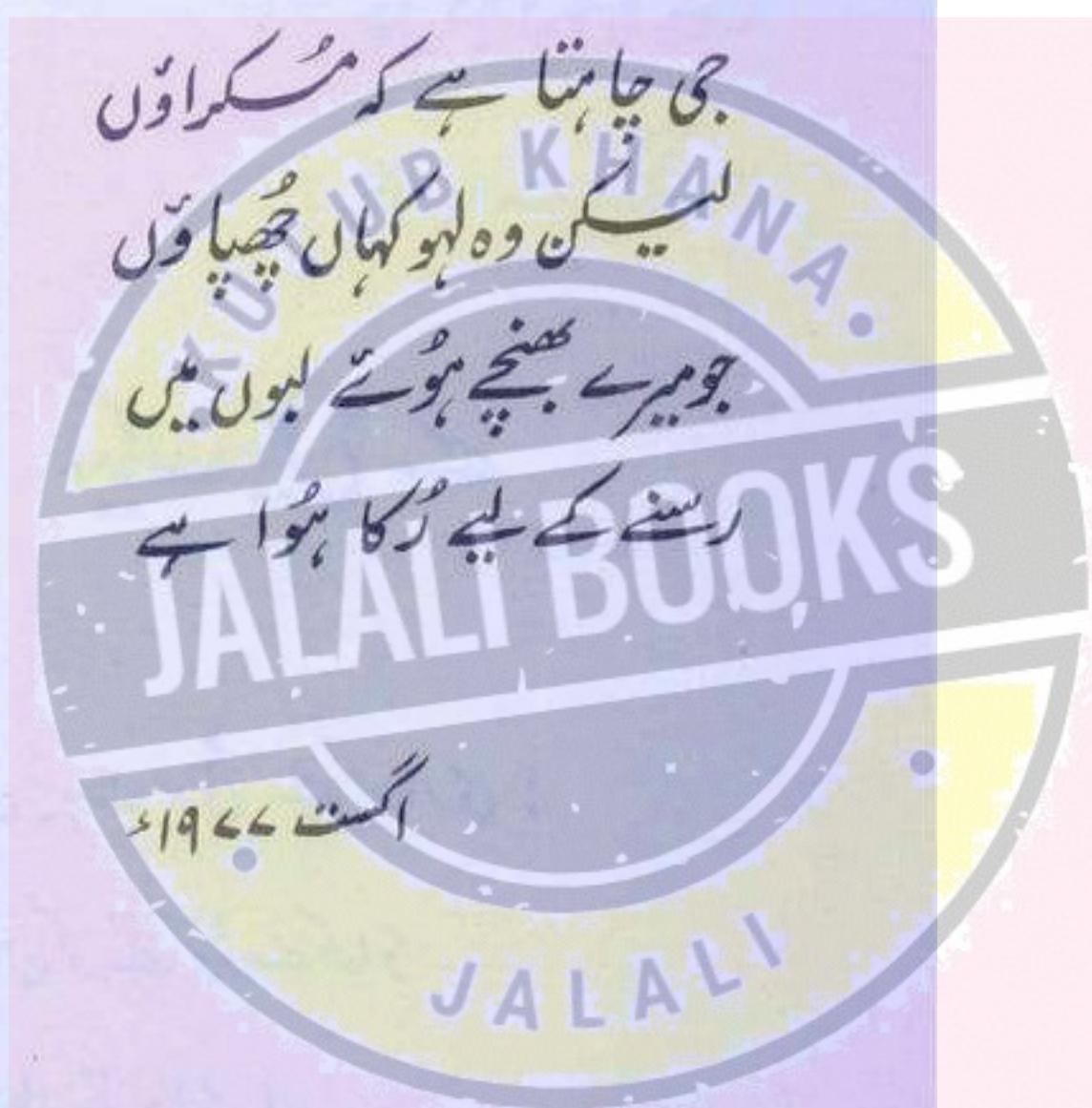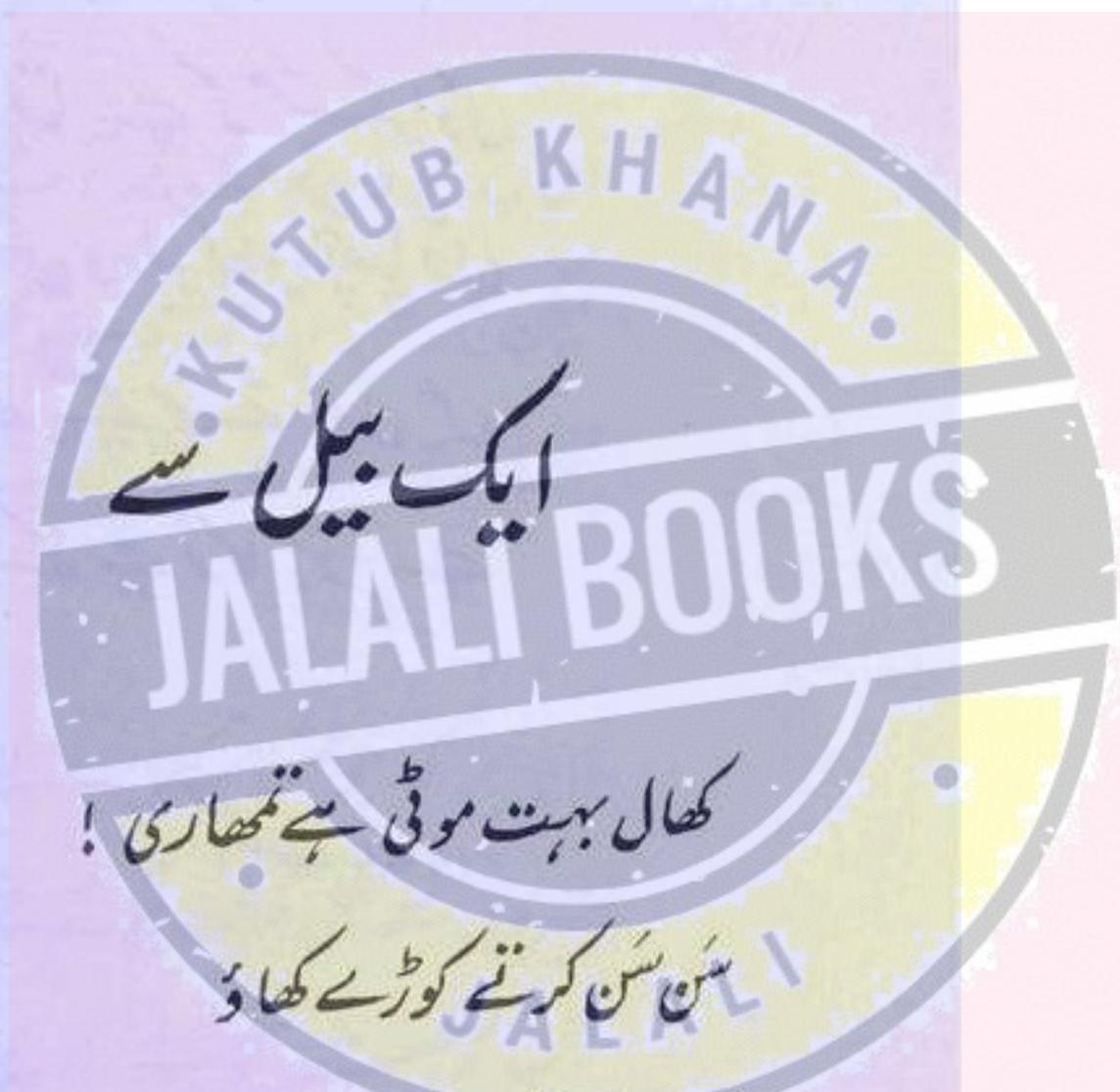
درد اگر ہڈی میں اُترے

سینگ نہ کام میں لاؤ !

دُم کو کس کس کر خود اپنی پیٹھ پہ مارو

اور نئے کوڑے کی موسیقی سُننے کو

سَر نیہوڑاؤ !

کھُر سے مٹی کھود کھود کر تال ملاؤ !

اور جب ساری کھال اُڑ جائے

صرف ذرا سا ڈکراؤ

پھر چُپکے سے مر جاؤ !

اگست ۱۹۷۷ء

نامکمّل
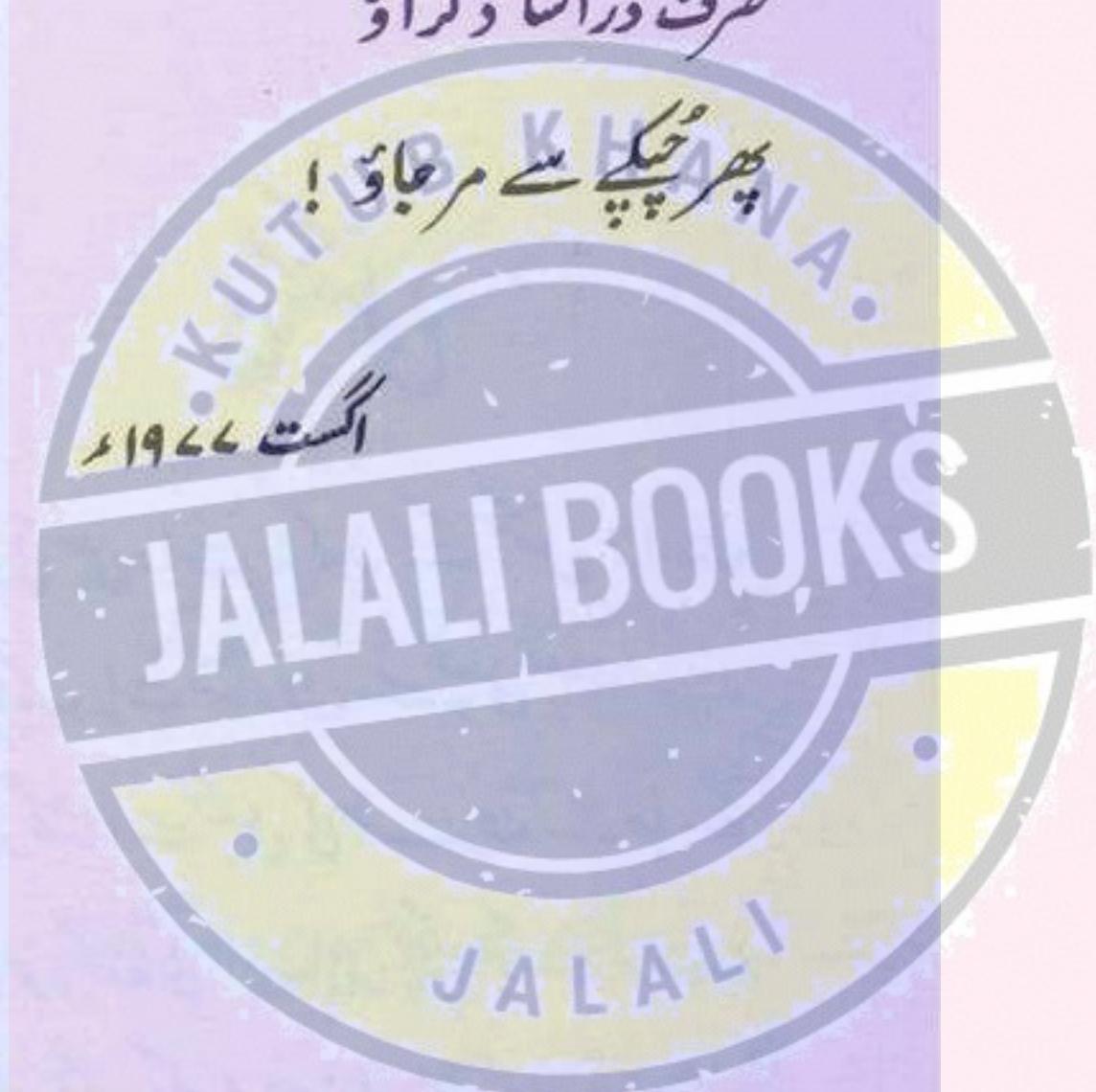
کوئی بھی رات نہ کہلا سکے مکمّل رات
ہر ایک رات ستاروں سے چھلنی چھلنی ہے
اگر گھٹا اسے تکمیل کی طرف لے جائے
تو خود گھٹا کی عبا میں چھپے ہوئے کوندے
لپک لپک کے اسے تار تار کرتے ہیں
دریدہ دامنیٔ تیرگی ہے شب کا نصیب
اِسی لیے تو فقط روشنی ہے سب کا نصیب

جولائی ۱۹۷۷ء

معکوس

سربرآوردہ لوگوں کی محفل میں

اِک شخص نے

(اپنے حُلیے سے جو نیم دیوانہ لگتا تھا

لیکن جو فن کار تھا)
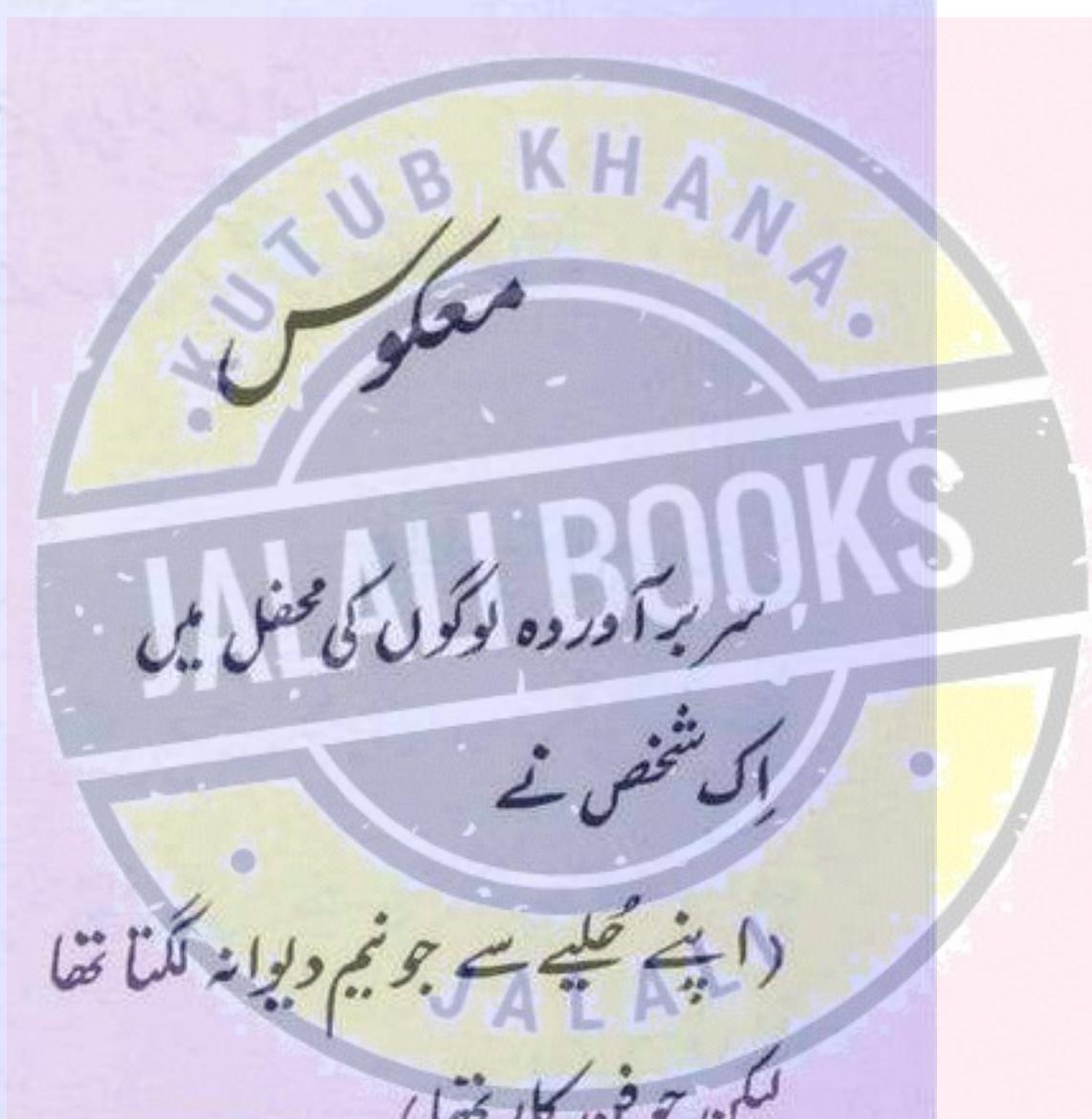
اِک عجب بات کہہ دی!

وہ بولا :

"زمیں، آسماں ہے کئی آسمانوں کا

اور آسماں درحقیقت زمینیں ہیں

جو آسماں لگ رہی ہیں زمیں سے !"

یکایک سبھی سر برآوردہ اصحاب یوں ڈر کے اُٹھے

کہ جیسے وہ فن کار

(جو نیم دیوانہ لگتا تھا)

ان کے سروں پر کھڑا ہو گیا تھا !

جولائی ۱۹۷۷ء

ثبوتِ حق

بہت حسین تھی !

مجھے خدا کی قسم، وہ لڑکی بہت حسین تھی !

وہ اپنے باطن کے حسن سے اِس قدر منوّر تھی

اتنی روشن تھی

اور پھر اتنی باخبر تھی

کہ اپنے ذہن وضمیر کے اس جمال کو

اپنے سیدھے سادے سے، بھولے بھالے سے، قدسیوں کے سے

خال و خد میں چھپائے رکھتی تھی !

لیکن اس کی جمیل سوچوں سے جب شعاعیں سی

پھُوٹتی تھیں!

تو اس کی آنکھوں میں تارے سے جھلملانے لگتے تھے

اور سارے نقوش یوں جگمگانے لگتے تھے

جیسے سُورج کے نُورِ باطن سے

کائناتِ حیات زرپوش ہو رہی ہو!

خدا، جو تخلیقِ حُسن کی انتہا پہ قادر ہے

وہ جو اِس انتہا پہ قادر ہے

وہ جو باطن کا عکس ظاہر پہ ڈالتا ہے تو معجزوں

کی نمود ہوتی ہے!

حُسن کارِ ازل بھی ہے

اور حُسن کارِ ابد بھی ہے

حُسن — اس کی جملہ صفات کا ایک ایسا عنواں ہے

جس کے ایک ایک حرف سے

وہ حسین —

وہ بے حساب حد تک حسین

وہ حسنِ جذبہ و آرزو کا اِک شاہکار لڑکی

ثبوتِ حق بن کے جھانکتی تھی!

جولائی ۷۷ء

۱۹۷۷ء
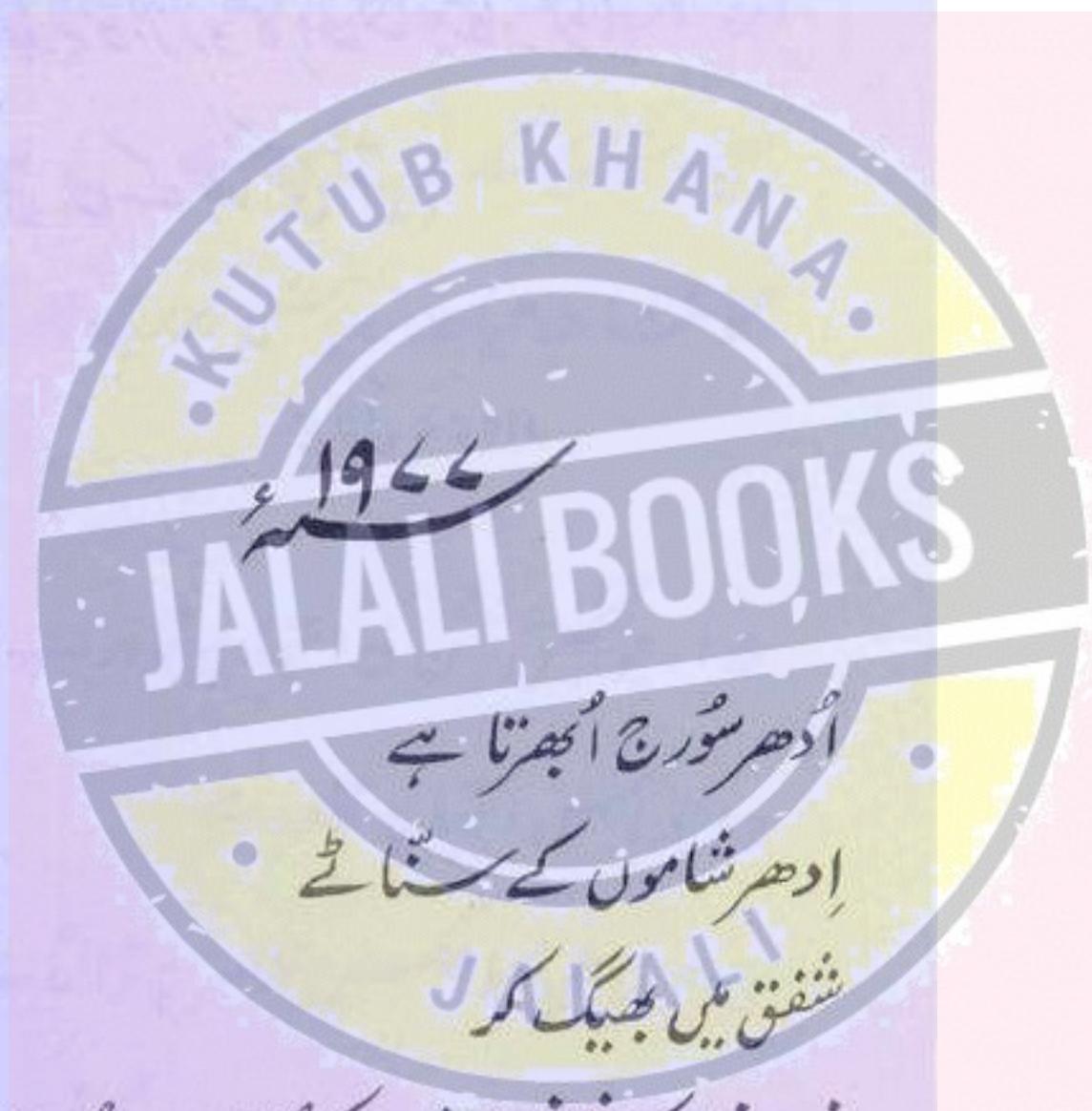
اُدھر سورج اُبھرتا ہے
اِدھر شاموں کے سنّاٹے
شفق میں بھیگ کر
نور و نوا کے منتظر ذہنوں کے صحنوں میں اُترتے ہیں

اُدھر مشرق سے سیلابِ تجلّی جب اُفق کے ساحلوں کو پھاند جاتا ہے
اِدھر مغرب سے تاریکی کے فوارے، اُبل کر
روشنی کی سب لوؤں کو چاٹ لیتے ہیں

اُدھر موسم بدلتا ہے
اِدھر گُل تو نہیں کھِلتے مگر پتھّر، جو یخ بستہ،
تڑپنے لگتے ہیں!

اُدھر پتّوں پہ شبنم آئنے بن کر اُترتی ہے
اِدھر ٹوٹے ہوئے ذرّے کا جوہر
اپنے دانتوں میں لیے شہ رگ زمیں کی
دندناتا پھر رہا ہے
جیسے اب جو کچھ بھی ہوگا، صرف اس کے حکم سے ہوگا!

اُدھر کے اور اِدھر کے پاٹ میں انسان دب کر رہ گیا ہے
اور چکّی چلنے والی ہے!

جولائی ۱۹۷۷ء

تعارف

ابھی جو ایک ہیولیٰ یہاں سے گزرا تھا
وہ کتنے سال سے
ہر روز
عین اُس لمحے
یہیں سے — ٹھیک اِسی موڑ سے گزرتا ہے!
مَیں کل برائے تعارف جب اُس کی سمت گیا
تو وہ یہ کہتا ہُوا میرے پاس سے گزرا:
ہے وقت نام مرا
اور گزرنا کام مرا!

جولائی ۱۹۷۷ء

یہ رہبر

یہ رہبر ہیں کسی کو باخبر ہونے نہیں دیں گے
گزر جائے گی شب، لیکن سحر ہونے نہیں دیں گے

مجھے محبوس رکھیں گے وہ وعدوں کی فصیلوں میں
کسی دیوار میں تعمیر در ہونے نہیں دیں گے
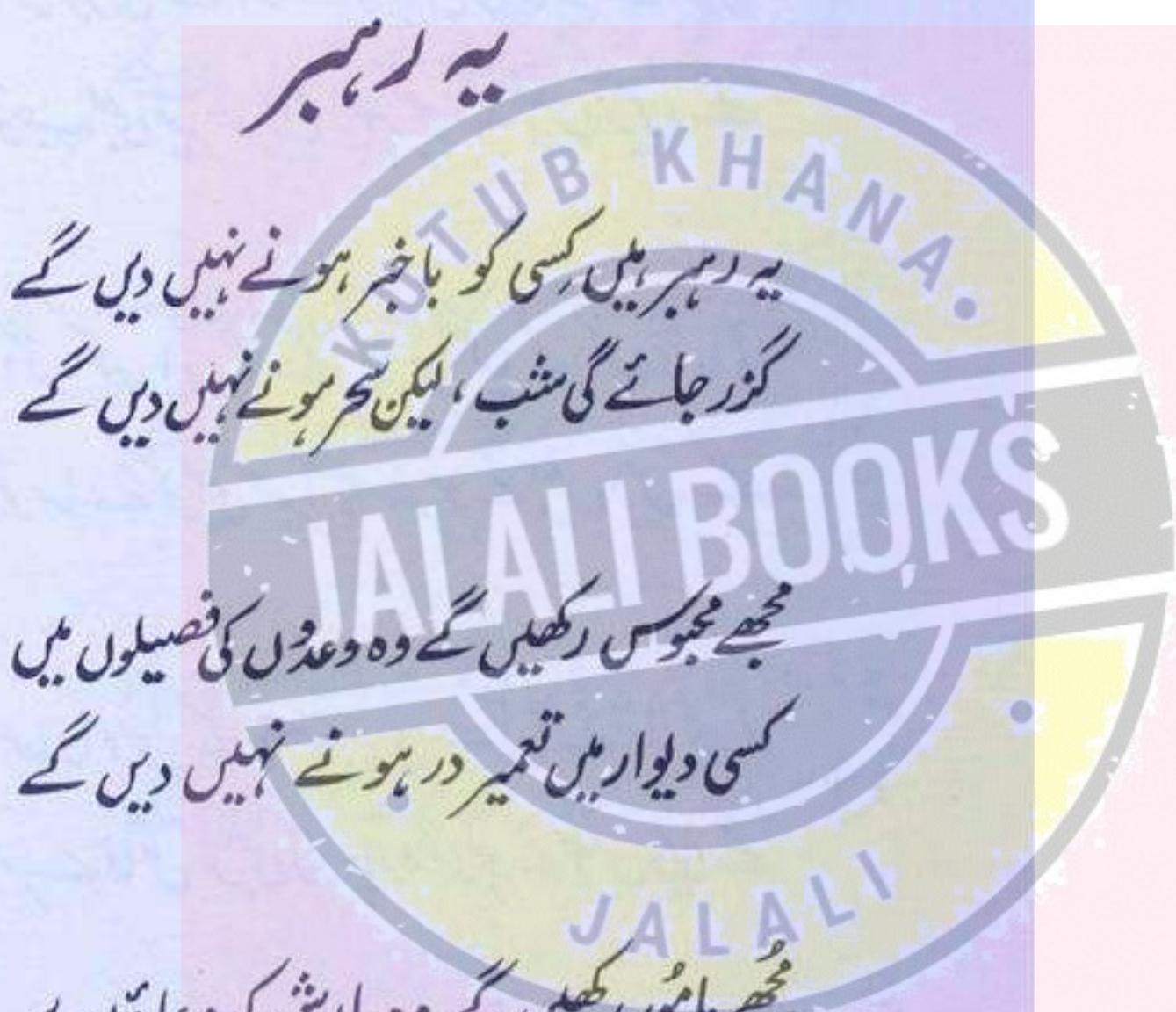
مجھے مامور رکھیں گے وہ بارش کی دعاؤں پر
مگر بوندوں سے میرا حلق تر ہونے نہیں دیں گے

مجھے محصور رکھیں گے عجب برزخ کے عالم میں
سفر کرنے نہیں دیں گے، بسر ہونے نہیں دیں گے

وہ مجھ سے کام لیں گے دشت کو گلشن بنانے کا
مگر اک گُل بھی میرے زیبِ سر ہونے نہیں دیں گے

اگر سورج نے آدھے آسماں کی راہ طے کر لی
تو جب بھی میرے گھر میں دوپہر ہونے نہیں دیں گے

اگر کچھ اور آگے بڑھ گیا اور اک انسانی
تو سائے کو بھی میرا ہمسفر ہونے نہیں دیں گے

مبادا اس کے ہاتھوں ہی سے مل جائے شفا مجھ کو
مرے قاتل کو بھی وہ چارہ گر ہونے نہیں دیں گے

مُجھے تکفیر کی آلودگی سے لاد ڈالیں گے
وہ میری اِک دعا بھی کارگر ہونے نہیں دیں گے

زمیں کی قوّتِ روئیدگی برحق سہی، لیکن
کِسی بھی شاخ کو وہ بارور ہونے نہیں دیں گے

نکالیں گے قفس سے طائروں کو، زیرِ مجبوری
مگر جسموں میں پیدا بال و پر ہونے نہیں دیں گے

سُنیں گے نو بہ نو نغمے، مگر جب جی نہ چاہے گا
ہوا کو بھی چمن میں نغمہ گر ہونے نہیں دیں گے

نظر رکھیں گے وہ اہلِ وطن پر اس مہارت سے
کوئی بھی مسئلہ زیرِ نظر ہونے نہیں دیں گے

یہ مانا آج ہر انساں کی قوّت ہے شعور اس کا
مگر اس رسم کو عام اس قدر ہونے نہیں دیں گے

ندیمؔ اپنے ہُنر سے دست کش ہونا ہی بہتر ہے
کہ یہ پتھّر مجھے آئنہ گر ہونے نہیں دیں گے

مئی ۱۹۷۷ء

برفانی چوٹی پر

برف کے مینار پر بیٹھے ہوئے ہیں رہنما
اور بنیادوں میں جاری ہے پگھلنے کا عمل

اس بلندی پر بھی ہیں سورج سے کتنے بے نیاز
ڈالتا ہے برف کے پیکر میں جو سوزِ خلل

ان بزرگوں کو یہ منظر کیوں نظر آتا نہیں
ایک سیلِ آب میں محصور ہیں دشت و جبل

کھا گئی جب دھوپ، بنیادوں کی برفانی سلیں
کون ان کو تھامنے آئے گا، جز دستِ اجل

مئی ۱۹۷۷ء

مرا طرزِ مسلمانی
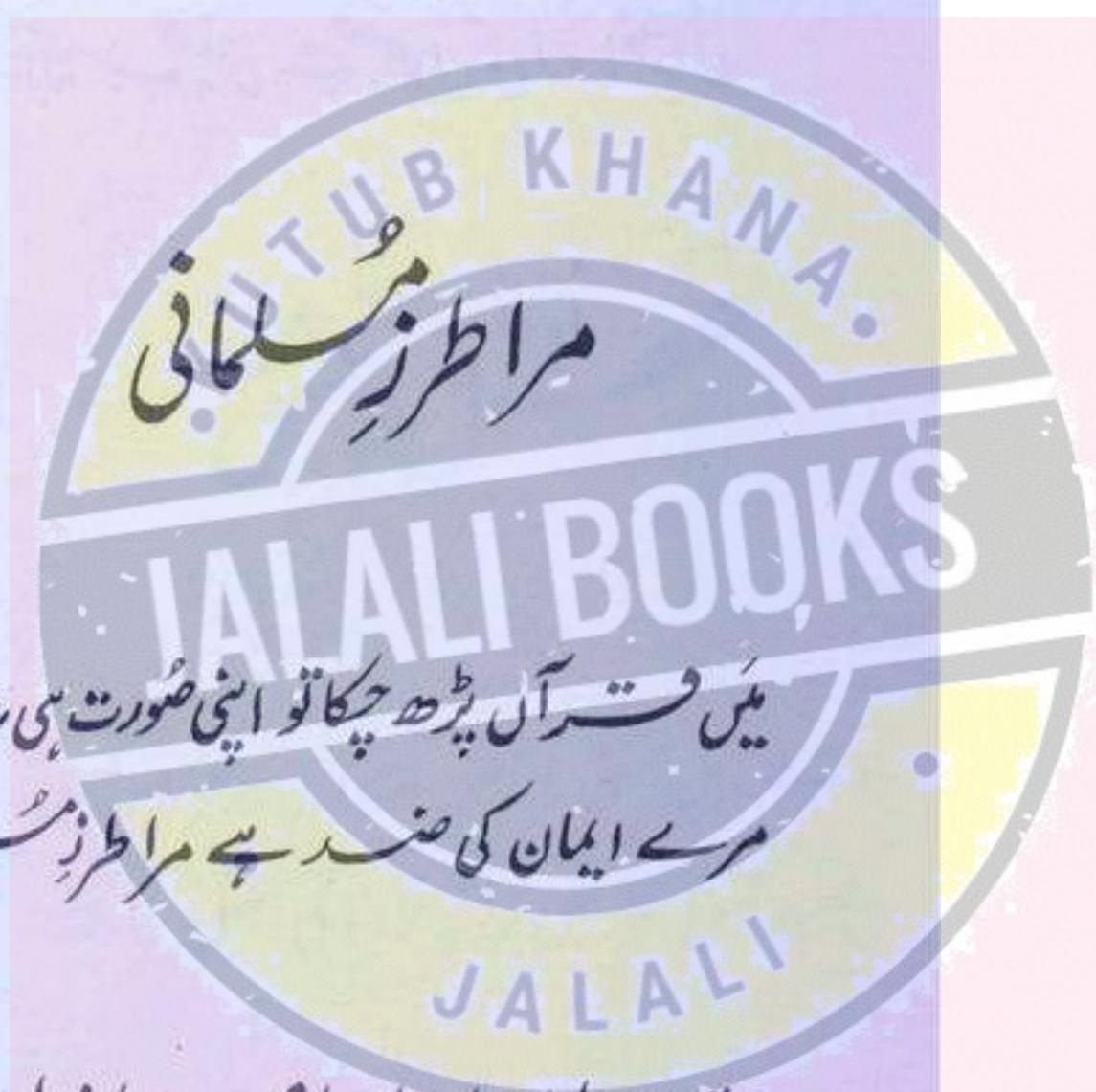
میں قرآں پڑھ چکا تو اپنی صورت ہی نہ پہچانی
مرے ایماں کی ضد ہے مرا طرزِ مسلمانی

ہے صدیوں سے بسیرا مسندِ اضداد پر میرا
مرے اعمال جامد ہیں ، مرے اقوال طوفانی

ارادے منفعل ہیں ، آرزوئیں مضمحل میری
عدوئے ارتقا ہے میرے روز و شب کی یکسانی

عجب کیا ہے، مجھے میرے مقاصد ہی سے اکتا دے
مرا ذوقِ خود آرائی، مرا شوقِ تن آسانی

خدا اس پر بھی، جانے کیوں، اُفق پر مسکراتا ہے
قبائے شب سے جب چھنتی ہے صُبحوں کی زر افشانی

مئی ۱۹۷۷ء

عقل و عشق

اے اہلِ عشق! عقل سے اس درجہ بیر کیوں
جب عشق کا بھی رازِ توانائی عقل ہے
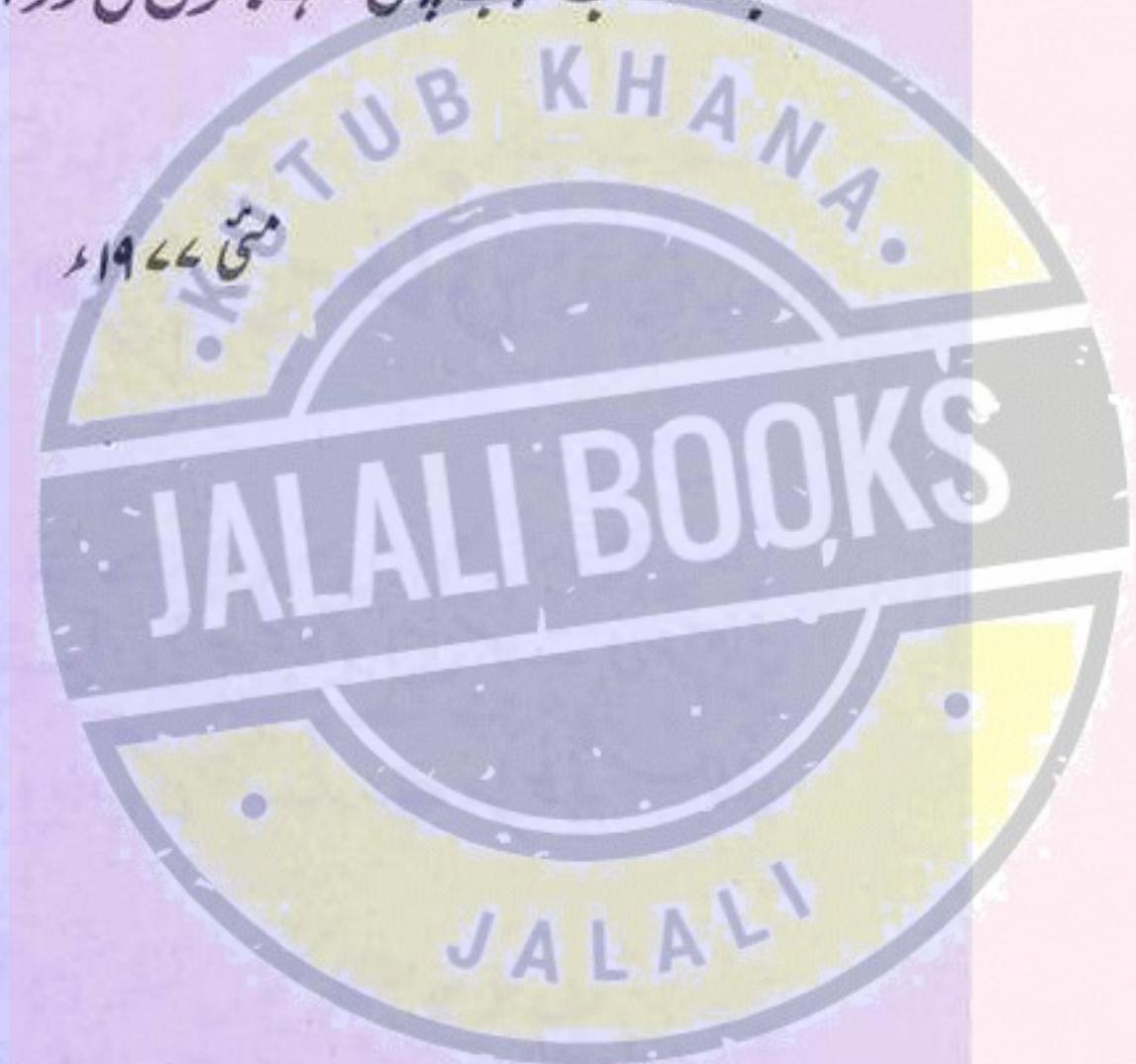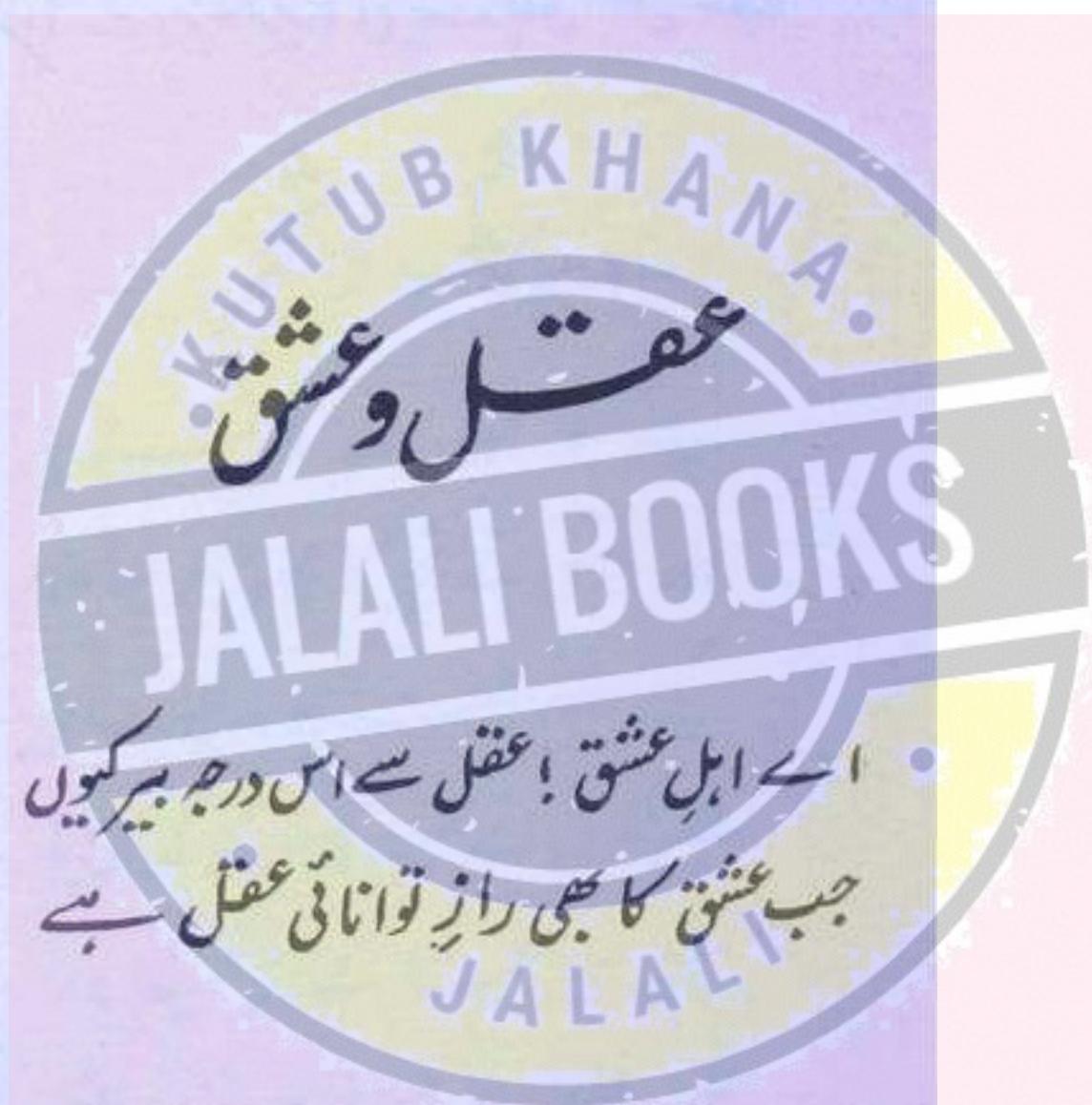
تم ماوراء کی دُھند میں سرشارِ جستجو
اسرارِ کائنات کی شیدائی عقل ہے

ہے منتہائے عشق تو سچائی سر بسر
سچائی کے وجود کی زیبائی عقل ہے

تعمیرِ شخصیت کے لیے دونوں کیمیا
تنہائیٔ عشق، انجمن آرائیٔ عقل ہے

تخلیقِ عرش و فرش کی بُنیاد عشق تھی
اجزائے ریزہ ریزہ کی یک جائیٔ عقل ہے

مئی ۱۹۷۷ء

برگ و شجر

پتّے کو ہوا نے ورغلایا
اور اس نے شجر کا چھوڑ کر ساتھ
کچھ اور بلند ہونا چاہا
جھونکوں نے جب اس کو گدگدایا
تالی سی بجا کے اُڑ گیا وہ
جب نقطۂ اوج چھو کے پلٹا
چکراتا ہوا زمیں پہ آیا
اب ڈھونڈ رہا ہے خار و خس میں
اپنے بچھڑے شجر کا سایا

مئی ۱۹۷۷ء

ماضی و حال

وہ دن بھی عجب بہار دن تھے
جب تیرے جمال کی مہک سے
سرشار شبیں، خمار دن تھے

یہ دن بھی عجب غبار دن ہیں
جب تیرے خیال کے جلو میں
دیوار شبیں، حصار دن ہیں

مئی ۱۹۷۷ء

ایک نظارہ

شہراہِ حیات پر کھڑا ہوں
اور دیکھ رہا ہوں یہ نظارہ

عورت کو جھٹک کے بازوؤں سے
اِک شخص نے کار سے اُتارا

عورت نے طویل چیخ ماری
اور کار نے بھر لیا طرارا

اِک سنسنی چارسُو رواں تھی
ٹُوٹا ہو فلک سے جیسے تارا

ناگاہ مرے قریب آ کر
خود میرے وجود نے پکارا

کب ہوتا ہے چار آنسوؤں سے
پورا اک نسل کا خسارا

کیا تیرے ضمیر میں نہیں ہے
غیرت کا بچا کھچا شرارہ

اشکوں سے نظام کیسے بدلیں
اے شعر و سخن کے بزم آرا

فائرنگ
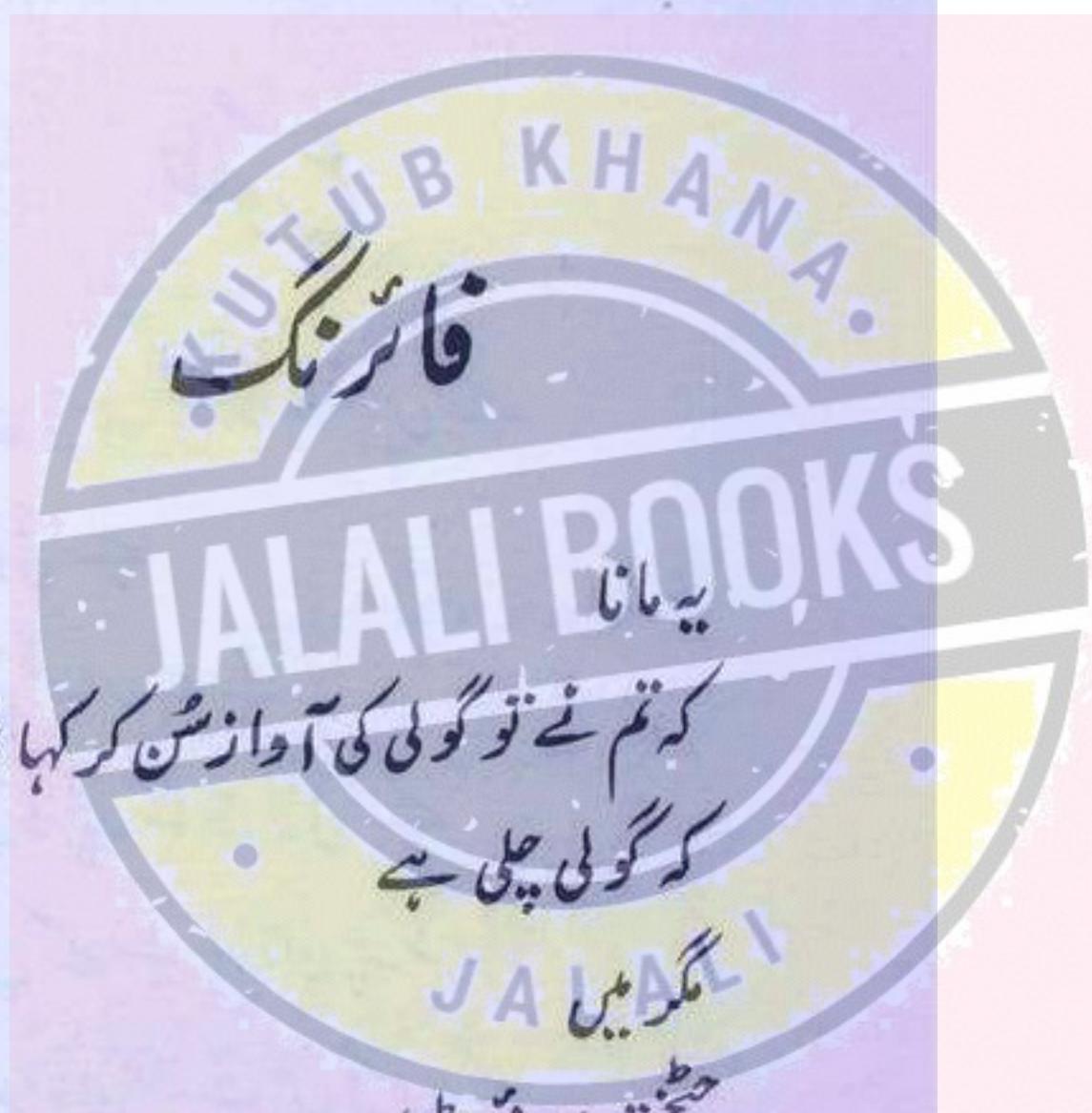
یہ مانا
کہ تم نے تو گولی کی آواز سُن کر کہا تھا
کہ گولی چلی ہے
مگر میں
چٹختی ہوئی ہڈیوں
اور اُبلتے ہوئے خون کے شور میں
گولی چلنے کی آواز سُننے سے پہلے ہی
اپنی سماعت کی میّت کو دفنا چکا تھا

اپریل ۱۹۷۷ء

طلوع
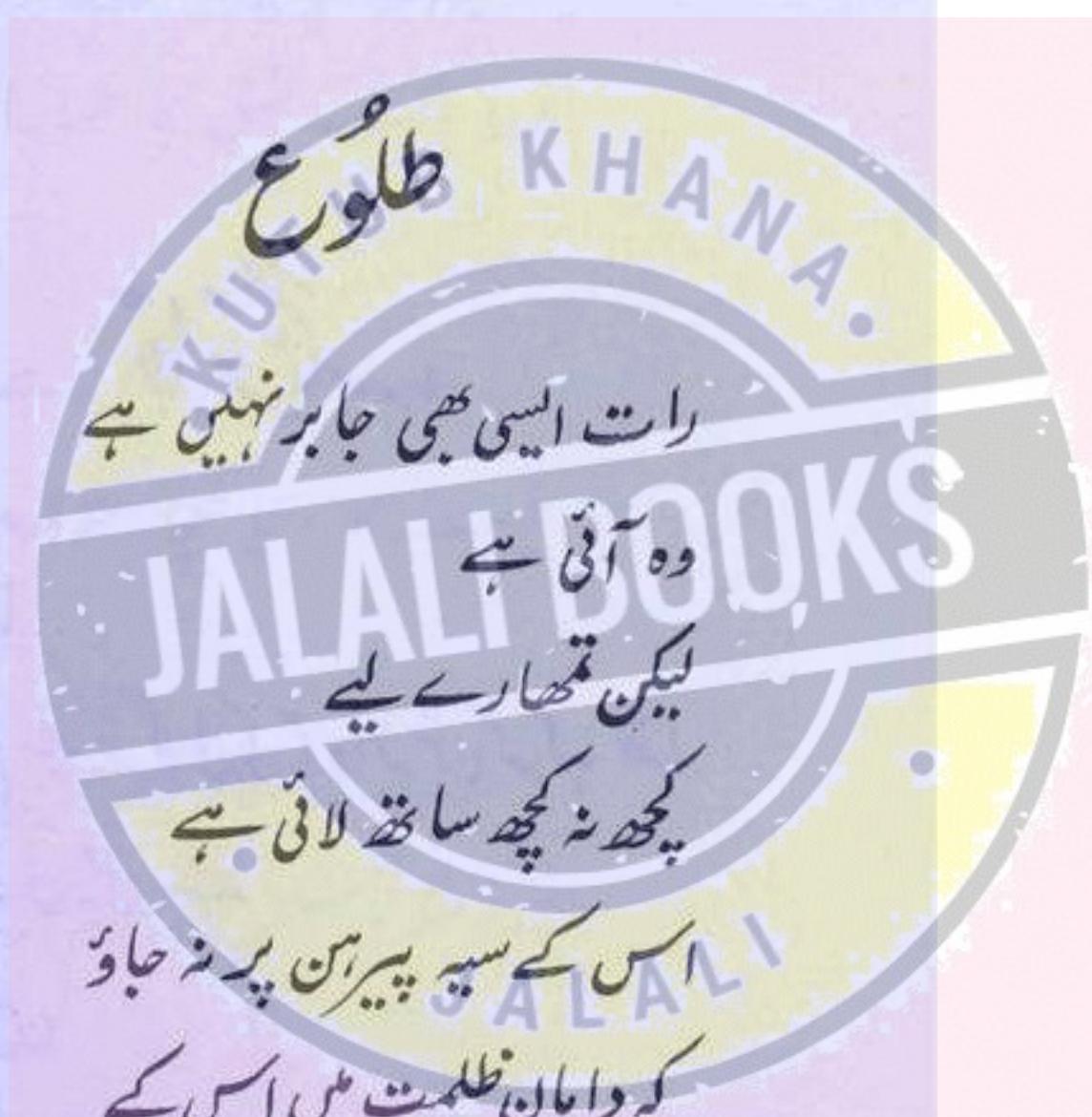
رات ایسی بھی جابر نہیں ہے
وہ آتی ہے
لیکن تمھارے لیے
کچھ نہ کچھ ساتھ لائی ہے
اس کے سبب پیرہن پر نہ جاؤ
کہ دامانِ ظلمت میں اس کے
ستارے بھی ہیں
صبحِ نو کے اشارے بھی ہیں

اپریل ۱۹۷۷ء

حُسن و عشق
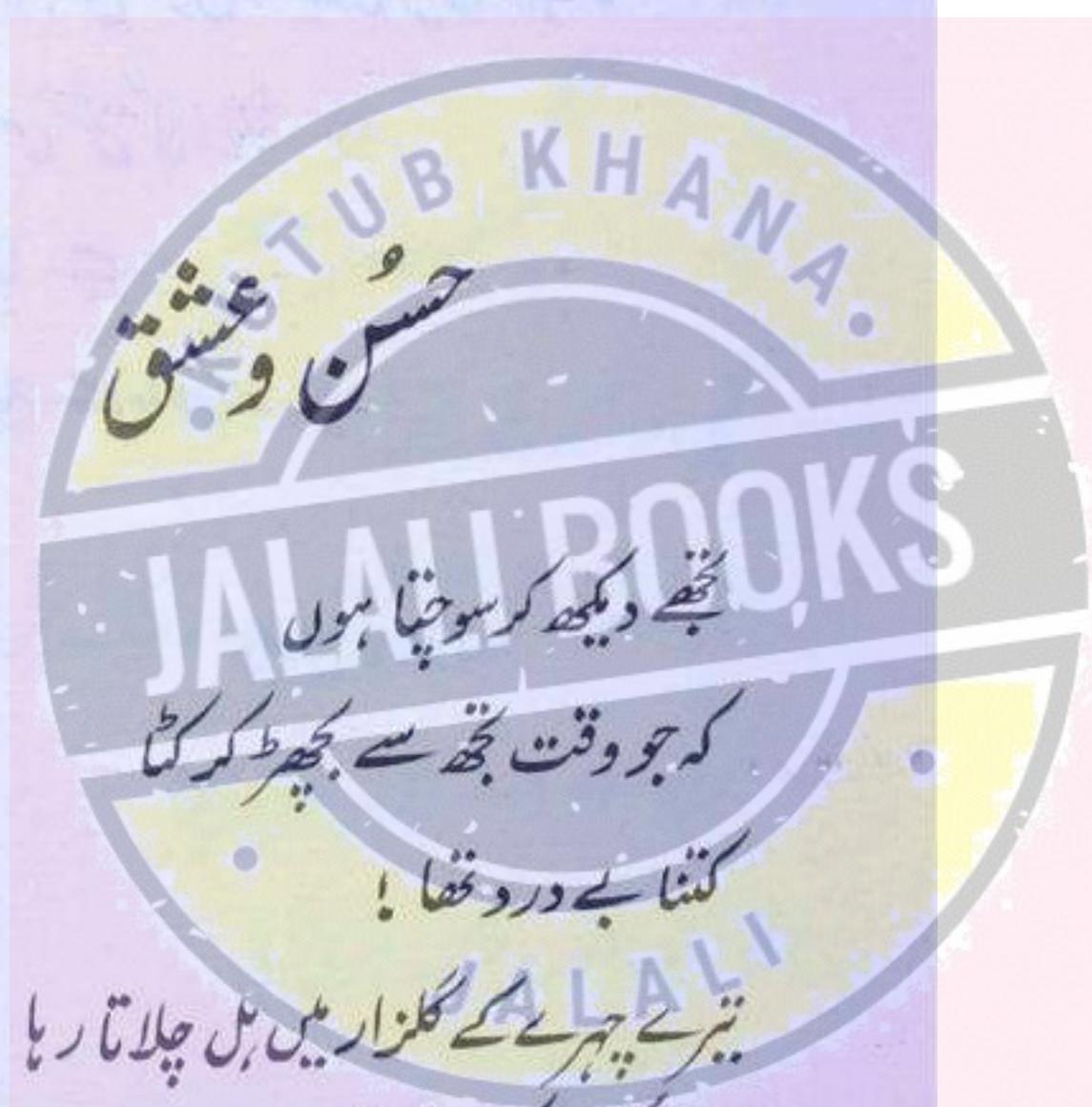
تجھے دیکھ کر سوچتا ہوں
کہ جو وقت تجھ سے بچھڑ کر کٹا
کتنا بے درد تھا!
تیرے چہرے کے گلزار میں ہل چلاتا رہا
تیری چکنی چمکتی ہُوئی جلد سے
اپنی مشعل جلاتا رہا
سوچتا ہُوں
اگر اب اُسی وقت کا سامنا ہو
تو مَیں تجھ کو باہوں میں لے لوں

میں چہرے پہ تیرے، محبّت کی مہروں کے غنچے کھلاؤں
تری جِلد کو چُوم کر آئنے کی طرح جگمگاؤں
میں گزُرے ہُوئے وقت کو یہ بتاؤں
کہ انسان کا عِشق لمحوں کا قیدی نہیں ہے!

اگر جسم اِس عشق کی ابتدا ہے
تو جو انتہا ہے
وہ ہر سوچ سے ماورا ہے!

اپریل ۱۹۷۷ء

گجردم

گجر دم کے لمحے تھے

جب بند کھڑکی کے شیشے پہ دستک ہوئی !

کون ہے ؟ — مَیں نے پُوچھا

تو ایک اور دستک ہوئی !

نیند کچی تھی
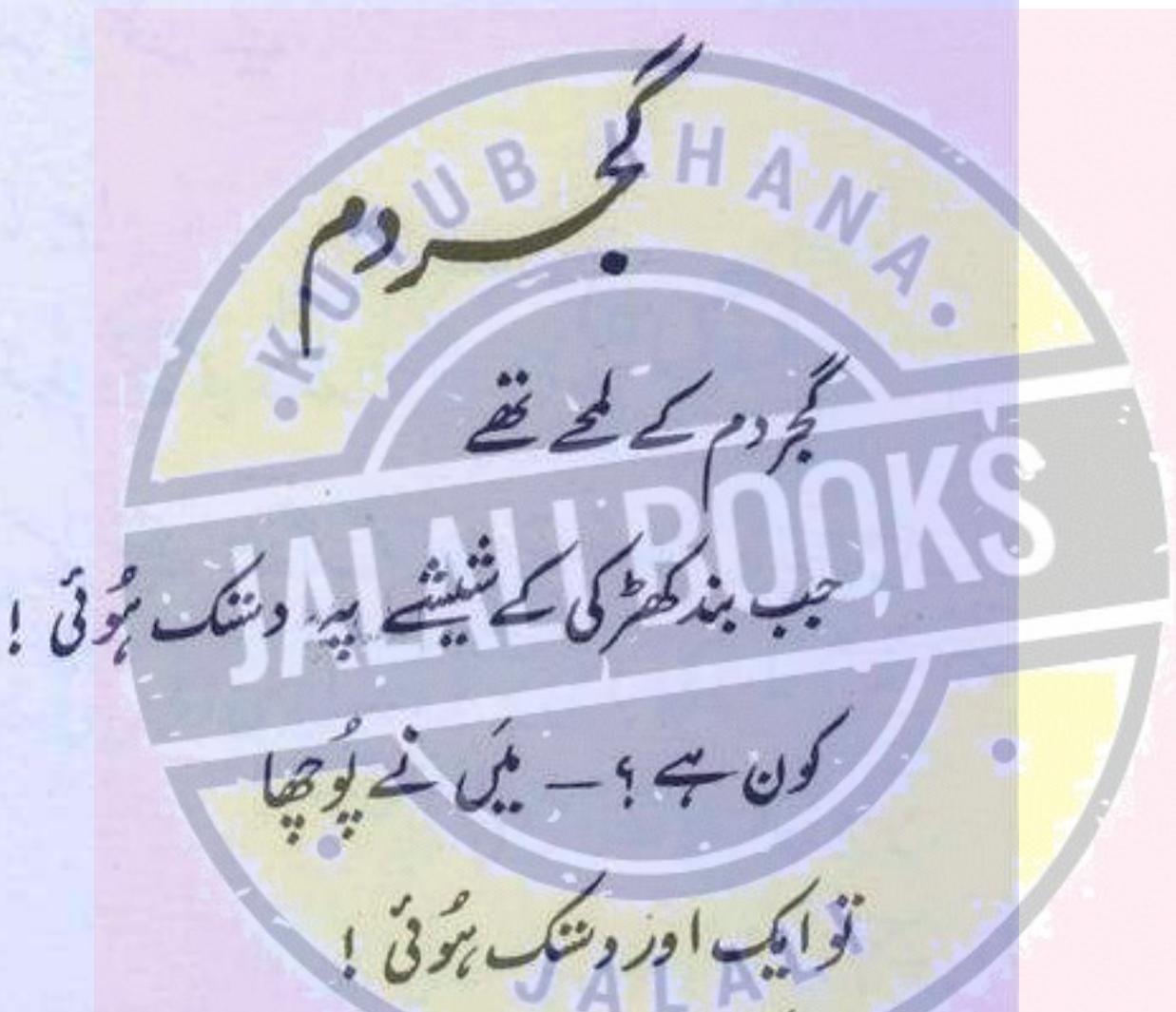
آنکھوں میں خوابوں کا نم تھا

مَیں کروٹ بدلنے کو تھا

جب یہ دستک تسلسل سے ہونے لگی !

کون گستاخ ہے ؟ — مَیں نے پُوچھا

پلٹ کر جو دیکھا

تو وہ پھُول تھا موتیے کا

جو خوشبو کا تحفہ لیے

مُسکراتا ہُوا

ایک معصُوم بچّے کی مانند

کھڑکی کے شیشے سے لگ کر کھڑا تھا !
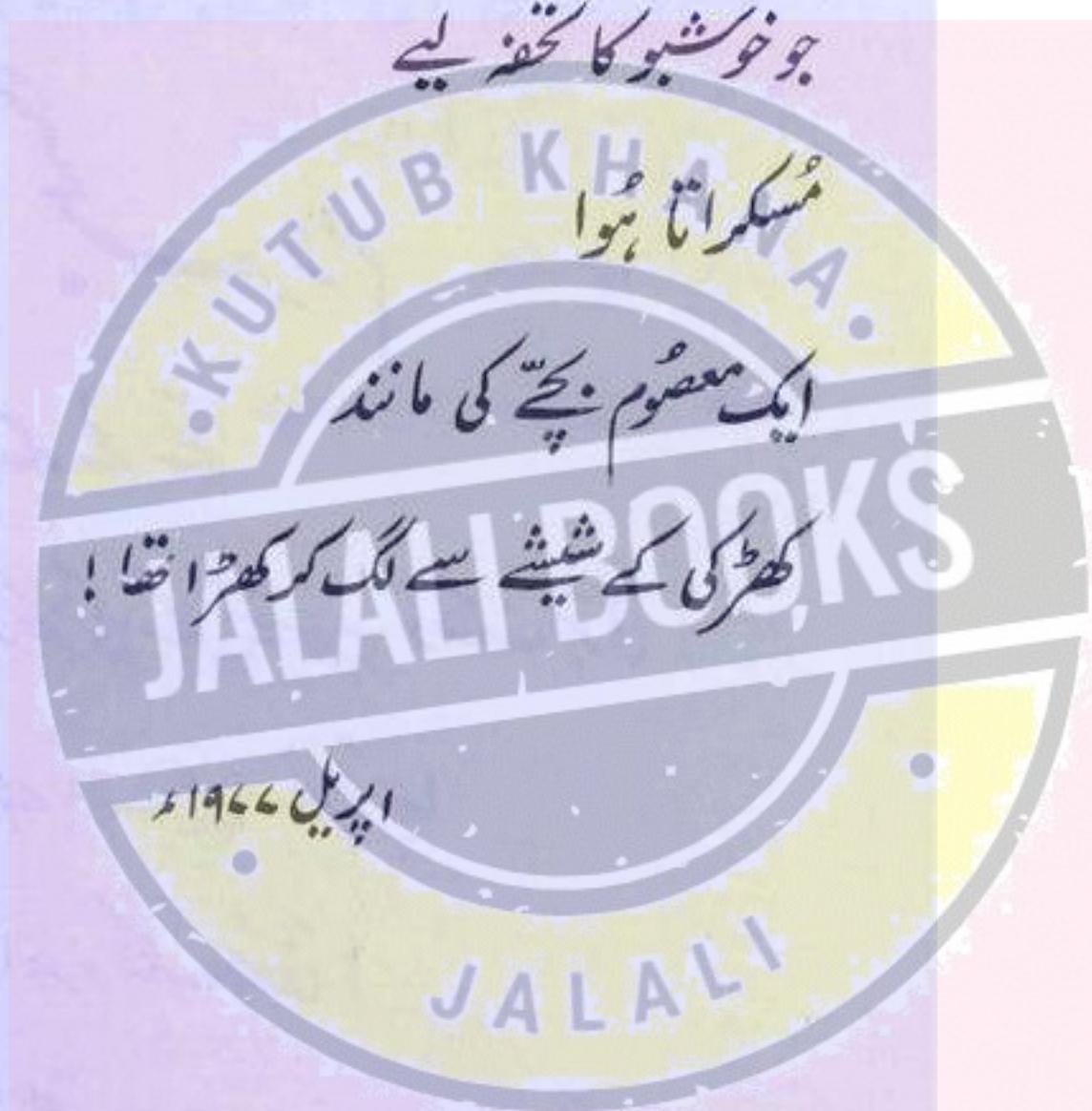
اپریل ۱۹۷۷ء

ابھی چاند نکلا نہیں ہے!

ابھی چاند نکلا نہیں ہے
مگر آسماں کی سیاہی پہ جو دُھول سی اُڑ رہی ہے
ہر اول کرن نے اُڑائی ہے
پیشِ نظر آسماں کی صفائی ہے!
آخر یہیں چاندنی اپنے خیمے لگائے گی
اور رات کی ظلمتیں اس کے پہرے پہ مامور ہوں گی!

اپریل ۱۹۷۷ء

آنے والا زمانہ

میں جو کچھ کہوں گا

وہی آنے والا زمانہ کہے گا

کہ یہ آنے والا زمانہ

مرے ماضی و حال کی نسل ہے

فرق اتنا سا ہے

آنے والے زمانے میں

جو کچھ بھی ہوگا
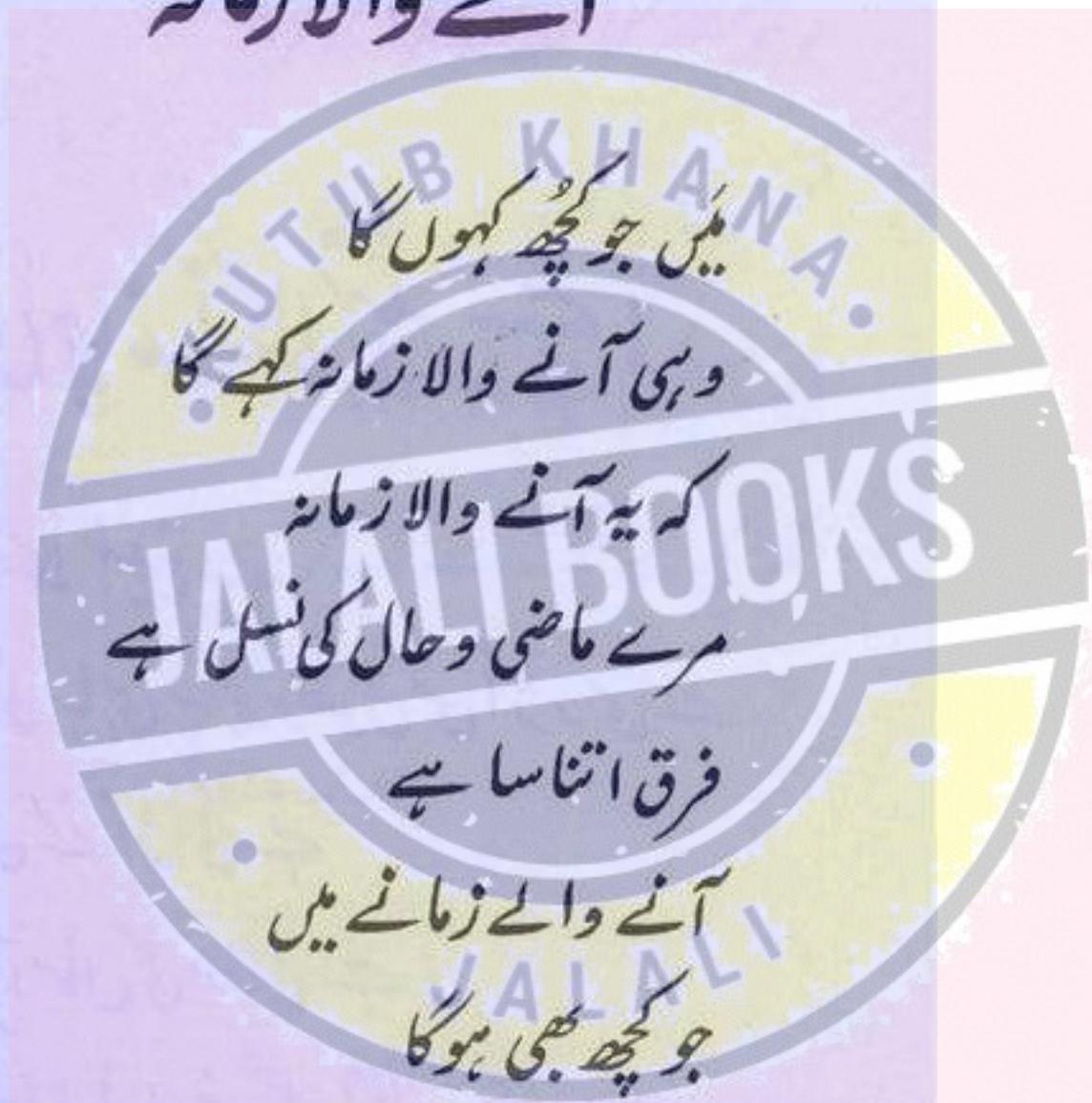
مرے حکم سے

میری تائید سے

اور میری حمایت سے ہوگا

اپریل ۱۹۷۷ء

برف جب پگھلی

برف جب پگھلی تو نکلے کوہ پیماؤں کے جسم
بستیاں جیسے ابھر آتی ہیں سیلابوں کے بعد
جیسے آسیبِ حقیقت، خلد کے خوابوں کے بعد
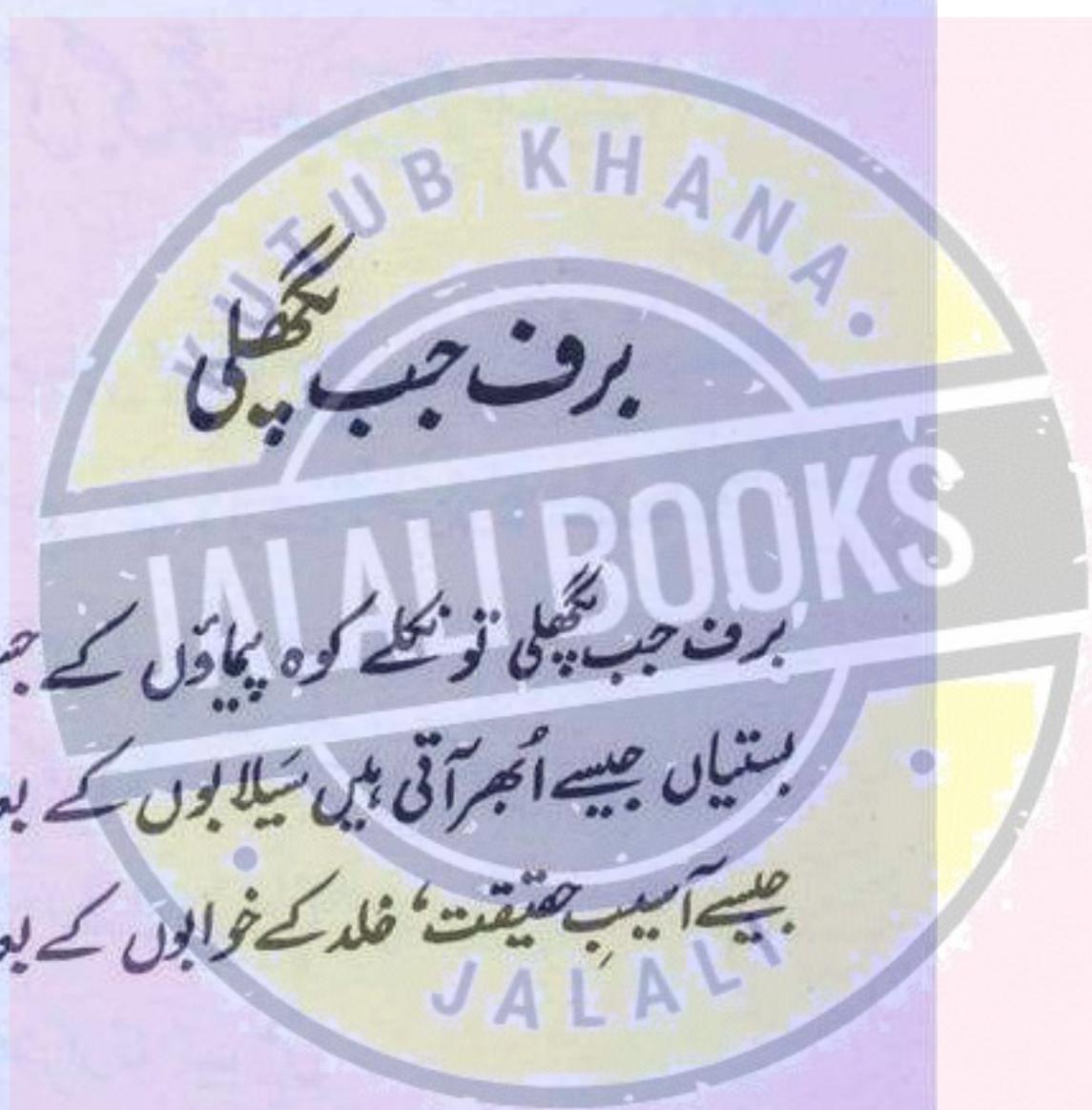
اپریل ۱۹۷۷ء

آدمی بھی عجیب چیز ہے

آدمی بھی عجیب چیز ہے
جو نہیں ہے، اسے ڈھونڈتا ہے
مگر جس کو پاتا ہے
اس کو وہ جب تک کہیں کھو نہ دے
کتنا بے چین رہتا ہے
حاضر کو غائب میں
غائب کو حاضر میں
یوں کھوجتا ہے
کہ جیسے وہ خود کھو گیا ہے

اپریل ۱۹۷۷ء

ذرا آسماں تک

فلک پہ آئینے انساں سجانے آئے ہیں
کسی کی پردہ دری کے زمانے آئے ہیں

ہم آپ اپنا مقدّر بنانے آئے ہیں
ہم آسماں کو زمیں سے ملانے آئے ہیں

ہمارے پیشِ نظر تھی خدا کی دربدری
سفر میں یوں تو ہزاروں ٹھکانے آئے ہیں

ہماری زندہ دلی دیکھنے کے لائق ہے
لہو لہو ہیں مگر سینہ تانے آئے ہیں

فرشتے راستہ دیں، اور یہ گماں نہ کریں
ہم اپنے رُوٹھے خدا کو منانے آئے ہیں

بہشت دیکھنا ہے جس سے ہم نے ہجرت کی
نہ حق جتانے، نہ جھگڑا چکانے آئے ہیں

شجر اُگا کے یہ کہنا، شجر سے دُور رہو
ہم اس تضاد کے کچھ بھید پانے آئے ہیں

زمین، روزِ ازل کی طرح اُجڑ جائے
ہم اپنے فن کی اگر داد پانے آئے ہیں

جنوری ۱۹۷۷ء

منطقۂ داخلی

شعاعیں

جو جاتے ہوئے اِک تھکے ہارے سُورج نے

چنگاریوں کی طرح چُن کے دامن میں بھر لی تھیں

اب برف کے نرم گالوں کے فرغل پہن کر پلٹ آئی ہیں

اب دہکتے ہُوئے فرش پر پاؤں ٹھٹھرے ہُوئے رینگتے ہیں!

ہَوائیں
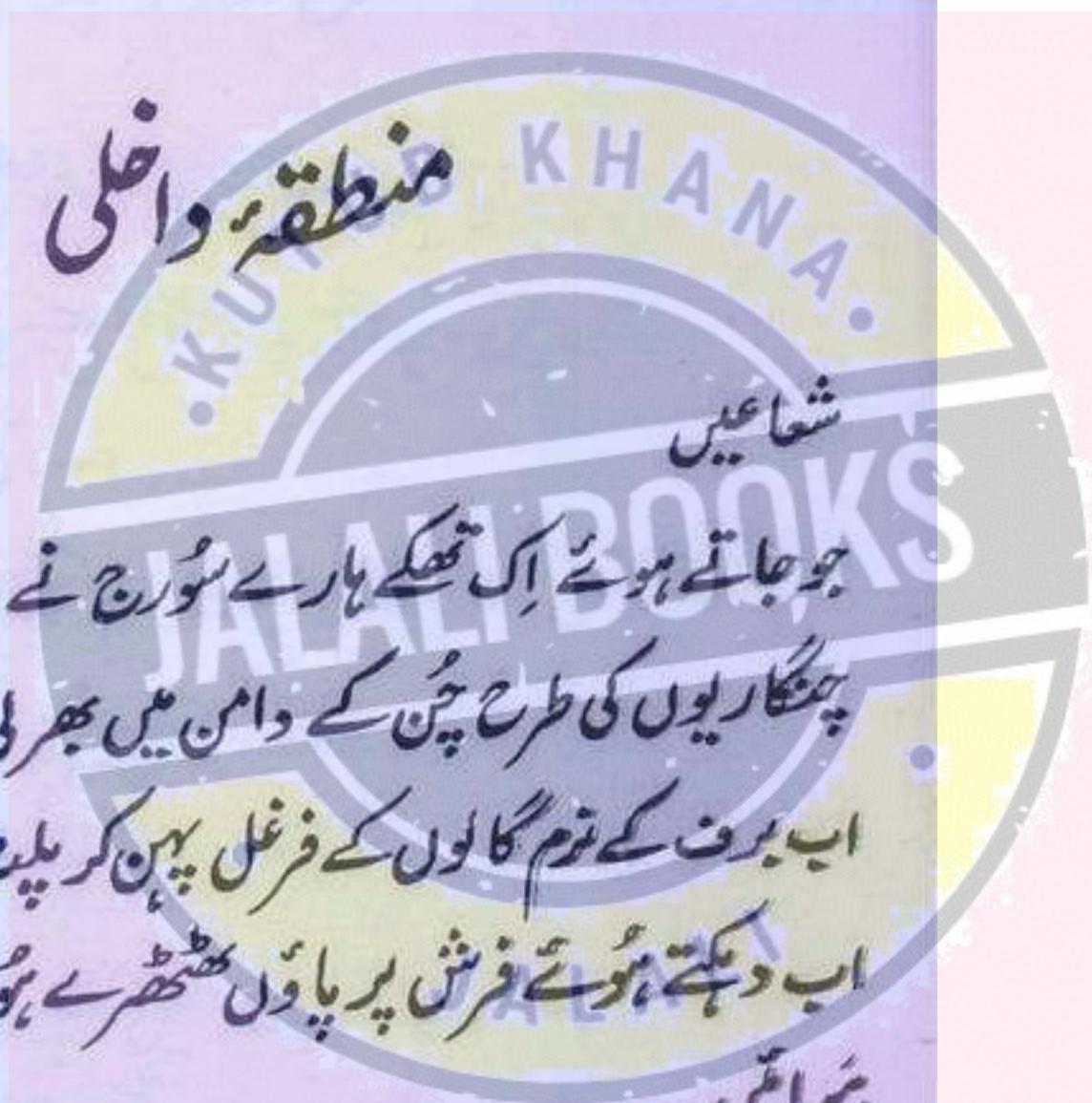
جو لُوبن کے پُوری صدی تک جلی اور چلی تھیں

اپاہج بنی، گر پڑی ہیں!

زمیں کی زباں گنگ ہے

آنکھ پتھرائی ہے

ہونٹ نیلے ہیں

بازو لٹکتے ہوئے، ڈھیلے ڈھیلے ہیں
چاروں طرف اِک بھیانک سفیدی کا ویرانہ ہے
جس میں انسان چیخے
تو الفاظ اولوں کی مانند جم جائیں!

اب زندگی کے پگھلنے کا امکان
اِک ایسے سورج سے وابستہ ہے
جو کہیں سے بھی آئے
وہ مشرق سے نکلے کہ مغرب سے اُبھرے
وہ افلاک سے گر پڑے
یا زمیں سے نکل آئے —
بس ایک سورج ہو
جو انجمادِ مسلسل کا دشمن ہو
اور ڈوبنا جس کو آتا نہ ہو

جنوری ۱۹۷۷ء

عقل اور وجدان

ایسی دنیا سے ہمیں کوئی توقع کیا ہو
جس میں وجدان پہ ہو عقل کی ضد کا الزام

عقل انسان کے پیکر میں تو محبوس نہیں
اور وجدان ہے اِس عقل کی پرواز کا نام

سوچتے سوچتے آجاتے ہیں ایسے پل بھی
جب پگھل جاتا ہے یہ عالمِ اشیا کا نظام

اور ہم لوگ خلا تا بہ خلا دیکھتے ہیں
جس طرف دیکھتے ہیں، صرف خدا دیکھتے ہیں

جنوری ۱۹۷۷ء

اضافی

کشیدہ قامتیِ سرو پر نہیں موقوف
خمیدہ پشت درختوں پہ بھی، سحر کے قریب
طیور، نغمہ سرائی کی دُھن میں اُتریں گے!

جنوری ۱۹۷۷ء

آشوب

خدا کو بلاؤ

کہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھے

مَیں مٹی کا انساں ہُوں

مَیں آسماں کا فرشتہ نہیں

اس لیے معتبر بھی نہیں ہوں
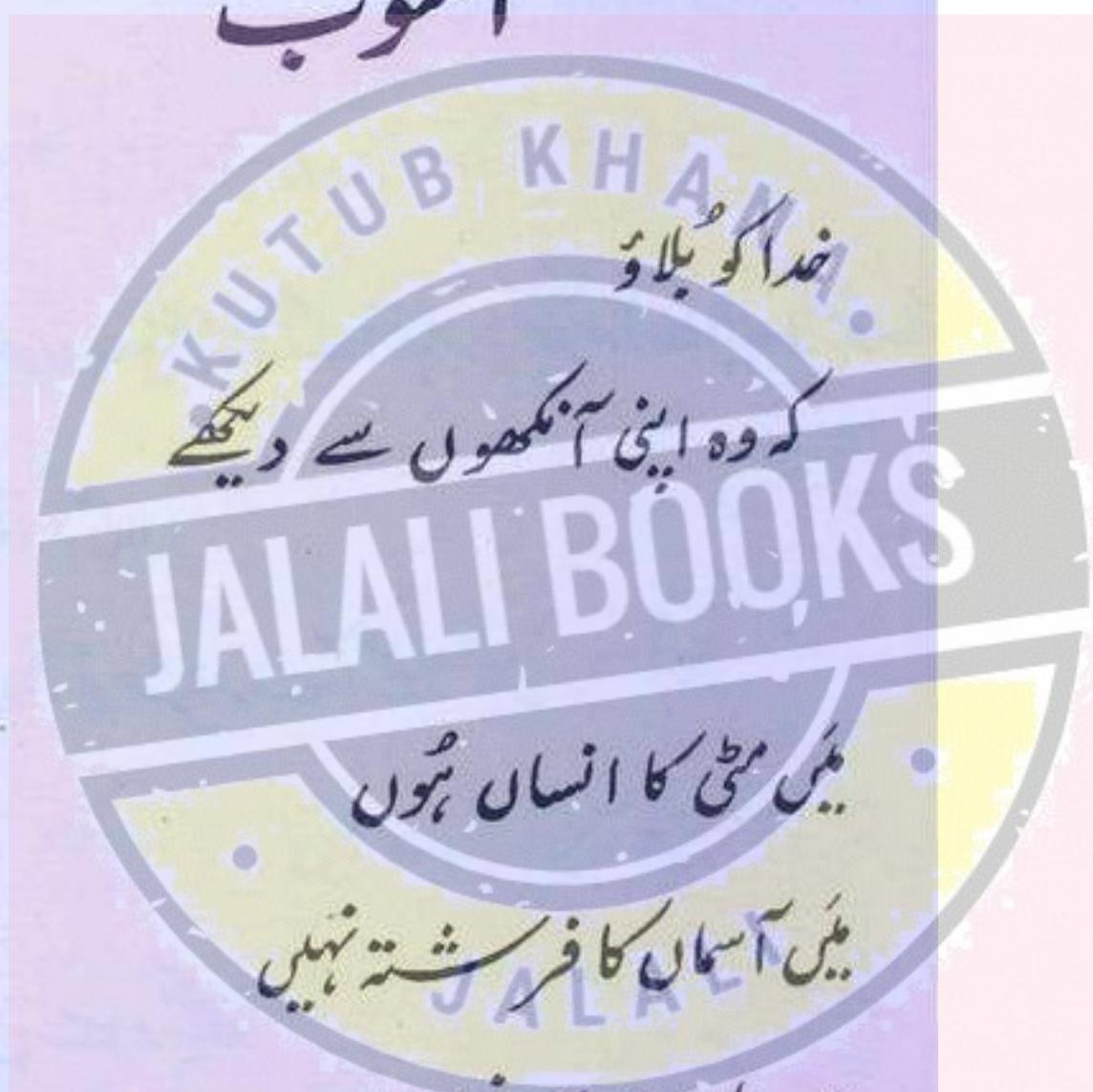
خدا اپنی آنکھوں سے دیکھے

کہ وہ سر جو صدیوں کے سجدوں سے زخمی ہیں

اب آسماں کی طرف اُٹھ رہے ہیں

وہ دیکھے

کہ آنکھوں میں اب حُسن دریافت کرنے کی ساری چمک بُجھ چکی ہے

کھنڈر کے دریچوں سے آخر کھنڈر کے سوا کیا نظر آ سکے گا!

وہ دیکھے

کہ جو لب فقط ذکرِ رب یا محبّت کے اظہار یا پھر غنا کے لیے وا ہُوئے

آج اوّل تو کھُلتے نہیں

اور کھلتے ہیں جب، تو شرارے اُگلتے ہیں

وہ اپنی آنکھوں سے دیکھے
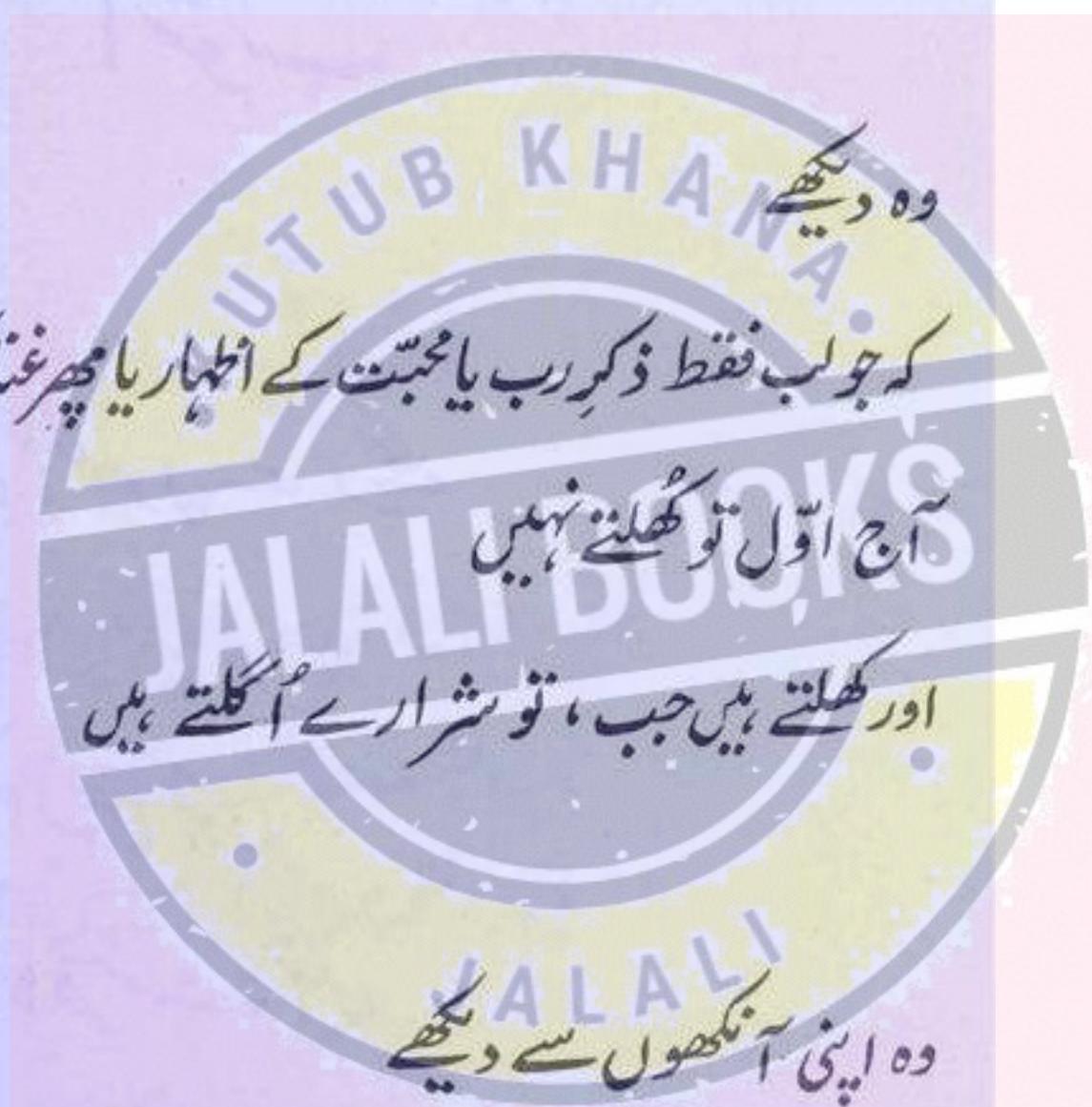
کہ سینے ۔۔۔ دفینے جو تھے کبریائی کے اسرار کے

اب وہاں وہم کے اژدہے

کینچلی پر بدلتے ہُوئے کینچلی

ہسہساتے ہیں، پھُنکارتے ہیں

حسین جسم، رُوحوں کے تاریک بنجر میں

حدِ نظر سے پرے اِک دِیے کی طرف بڑھ رہے ہیں

مگر ہر قدم پر یہ حدِّ نظر اک قدم اور ہٹتی چلی جا رہی ہے

جو انسان کے ذہن کی شاہراہیں تھیں

ان پر یقینوں کے کشتوں کے پشتے لگے ہیں

جو اس کے تصوّر کے فردوس تھے

ریزہ ریزہ پڑے ہیں
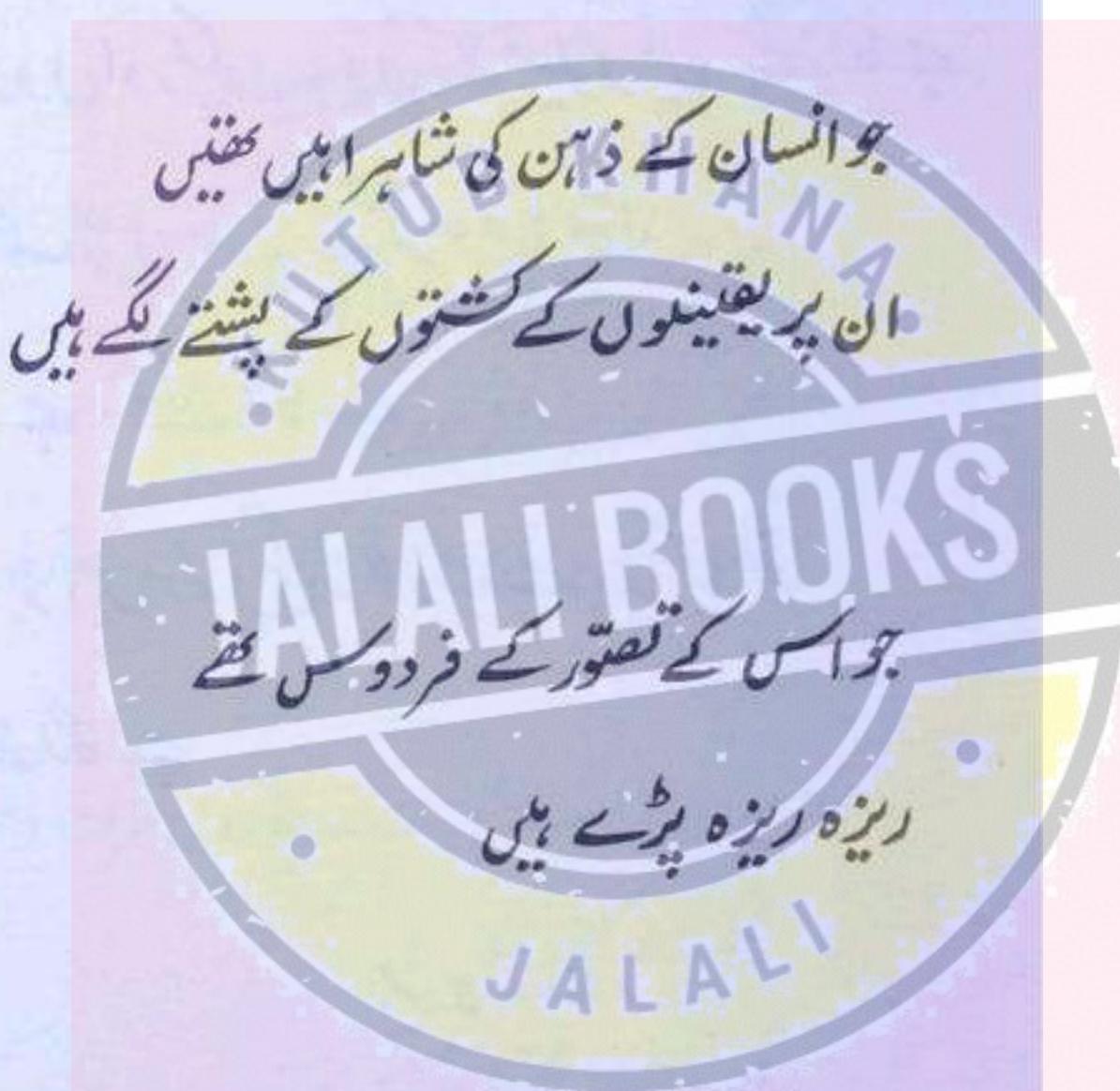
جو اس کی پرستش کے معیار تھے

نوکِ خنجر کی مانند ان راستوں پر گڑے ہیں

جو یادش بخیر، اک زمانے میں سیدھی خدا کی طرف جا رہی تھیں

مگر اب فقط دائروں میں بھٹکتی ہُوئی رہ گئی ہیں

خدا کو بلاؤ

کہ اُس کا یہ شہکارِ فن

اپنے محور سے ہٹنے لگا ہے

وہ چھوٹوں بڑوں اور نیکوں بدوں کے قبیلوں میں بٹنے لگا ہے

وہ جو عرش تک پھیل جانے کے گُر سوچتا تھا

سکڑنے لگا ہے، سمٹنے لگا ہے

وہ آشوب، جو اس نے اپنی ذکاوت سے پیدا کیا تھا

اسی سے نمٹنے لگا ہے

جنوری ۱۹۷۷ء

مہذّب

مجھے کل مرا ایک ساتھی ملا

جس نے یہ راز کھولا

کہ— ”اب جذبہ و شوق کی وحشتوں کے زمانے گئے!“

پھر وہ آہستہ آہستہ— چاروں طرف دیکھتا

مجھ سے کہنے لگا:

”اب بساطِ محبت لپیٹو

جہاں سے بھی مل جائے دولت— سمیٹو

غرض کچھ تو تہذیب سیکھو!“

ستمبر ۱۹۷۶ء

شبِ معصوم

تیرے رخسار پر یہ جو اچٹا ہوا ایک تِل ہے

جوازِ شبِ تار ہے

اور یہ شب

چار جانب سے اُمڈی ہوئی روشنی اور شفق میں گھِری

اِتنی معصوم لگتی ہے

جیسے سیہ آسماں کے سمندر میں چاند اِک جزیرہ بنا

اپنے انجام سے بے خبر

تیرتا ہے

ستمبر ۱۹۷۶ء

میلاد

بہت زرد پتّوں کے جھرمٹ میں
اِک سبز پتّہ اُگا
اور شجر
انکشافِ توانائی کے جوش میں تن گیا
ایک جھونکا جو گزرا
تو لے کر اسے اپنی آغوش میں
جھومنے، گنگنانے لگا

ستمبر ۱۹۷۶ء

آنے والے منظروں کی نذر

سنہرے — ڈوبتے سورج نے

قرطاسِ فلک پر

اِک عجب تصویر کھینچی ہے !
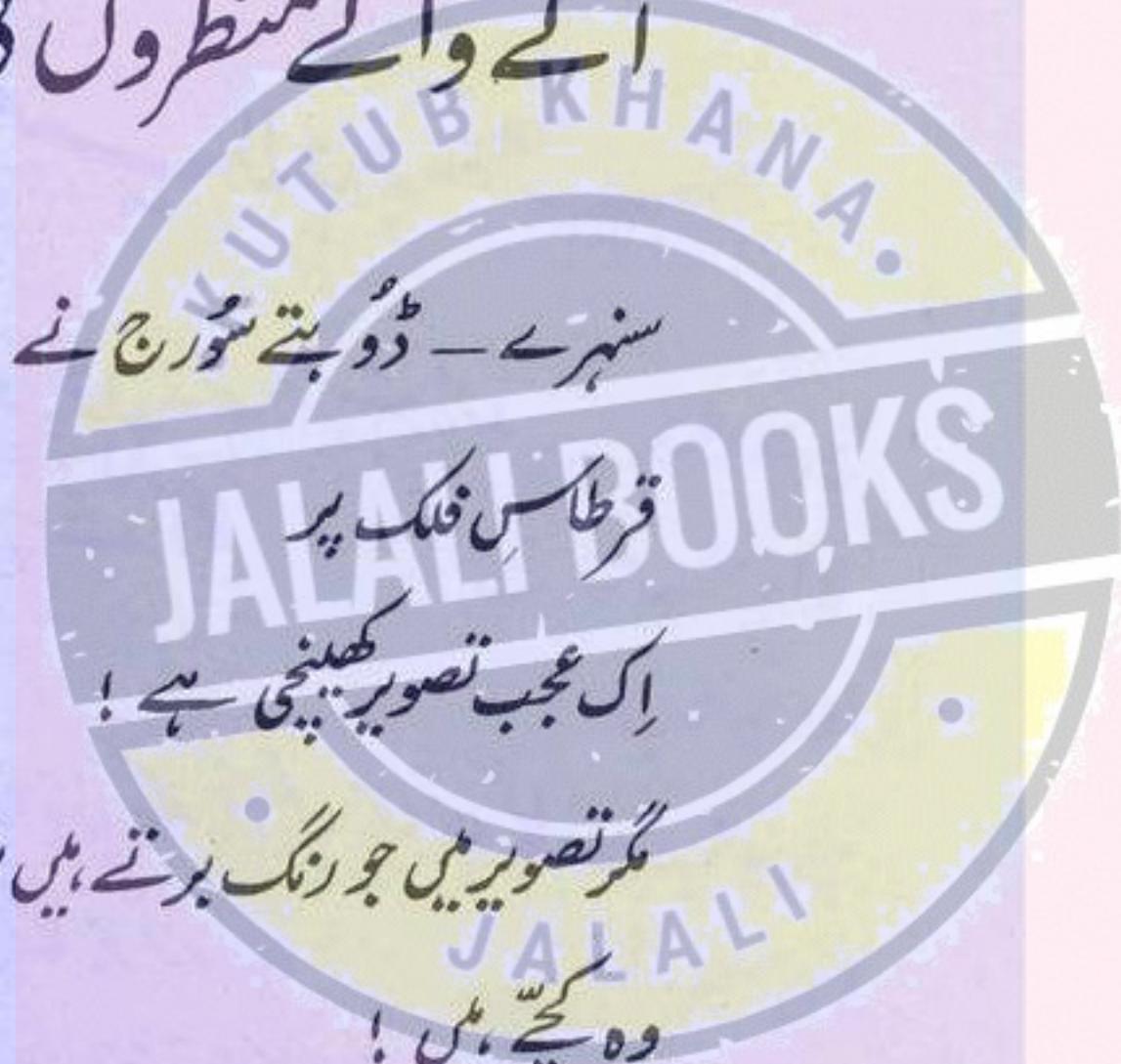
مگر تصویر میں جو رنگ برتے ہیں شعاعوں نے

وہ کچے ہیں !

انھیں الفاظ میں محفوظ کر کے

آنے والے منظروں کی نذر کرنا

انتہائے فن پرستی بھی ہے

خلّاقی بھی

اور فن کی دیانت بھی

عبادت بھی

جو بادل دُور ہیں

لاکھوں کروڑ کوس پر ہیں

اور جو نزدیک ہیں

ان کو اگر چھُو لو

تو پوریں رنگ جائیں سات رنگوں میں !

قریب و دُور میں جو فاصلہ ہے
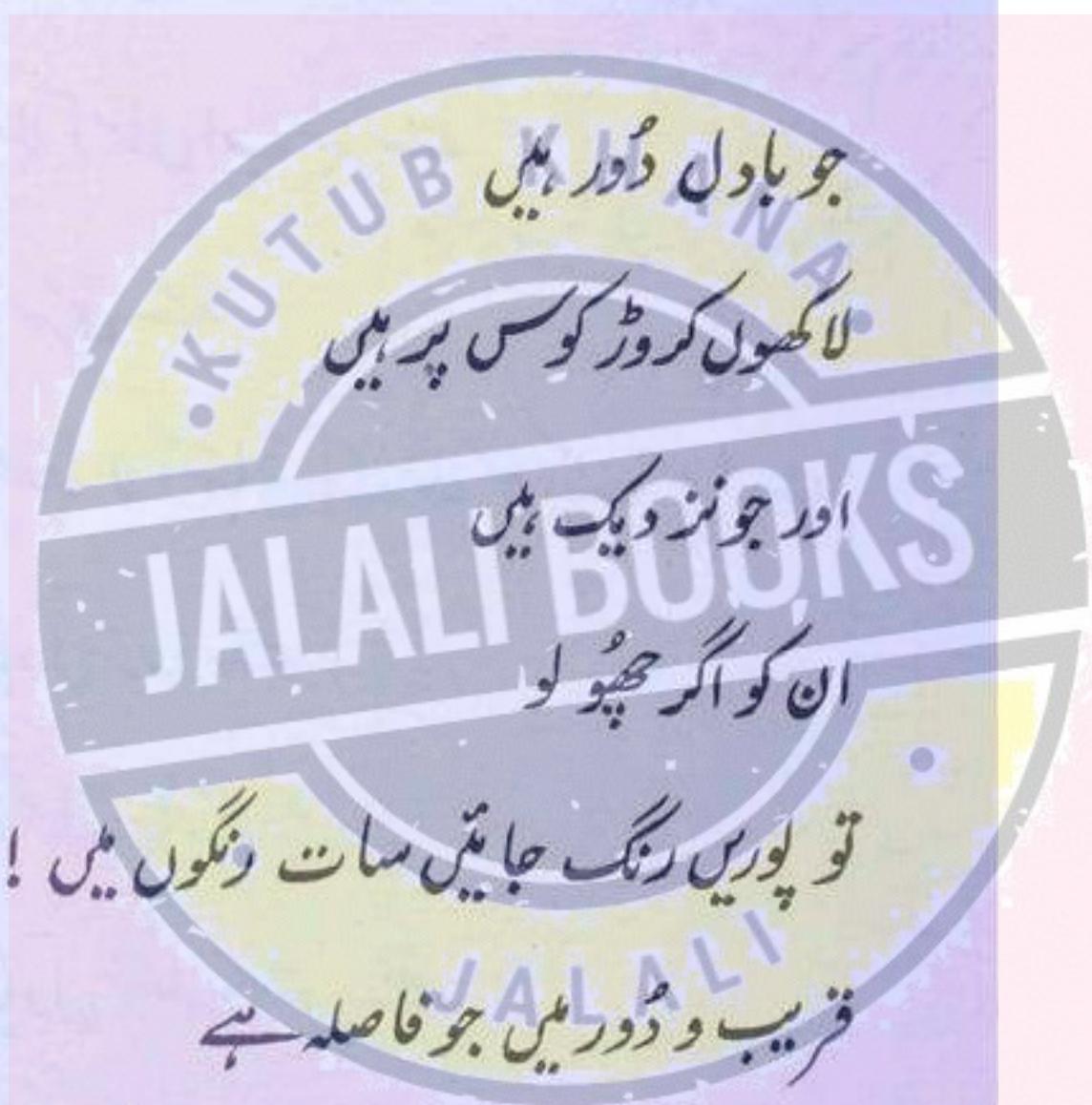
اس میں گہرا اور نیلا اور چمکیلا فلک یوں پُرسکوں ہے

جیسے تاحدِ نظر پھیلے سمندر پر سے جب کشتی گزر جائے

تو وہ آسودگی کی سانس لیتا ہے !

جو بادل دُور ہیں

اب تک طلائی تھے مگر اب زرد ہیں

اور جو نزدیک ہیں

اب تک گلابی تھے مگر اب شعلہ وش ہیں

اور نیلا آسماں اب سبز ہے

اب سرمئی ہے

اب فقط لا انتہائی کے خلا کا ایک صحرا ہے

جو بادل زرد تھے

اب گھلتے جاتے ہیں

جو بادل شعلہ وش تھے

بجھتے جاتے ہیں

اِدھر مشرق سے جو سیلابِ شب اُمڈا ہے

سناٹے کی لہروں کی زبانوں سے

گئے خورشید کی اقلیمِ فن کو چاٹ لیتا ہے

مگر طغیانِ تاریکی کے اس آشوب میں،

پہلا ستارہ آسماں پر جب چمکتا ہے

تو وہ اپنی ہنسی پر ضبط کرتا —

نرم سرگوشی میں کہتا ہے

کہ سُورج ڈوبتا کب ہے!

ستمبر ۱۹۷۶ء

سخن ناشناس

مَیں جب شعر کہتا ہُوں
دیوارِ فردا پہ
میرا قلم
خون کے رنگ میں
پھُول سے لفظ لکھتا ہے
لیکن کوئی یہ زباں پڑھنے والا نہیں !

ستمبر ۱۹۷۶ء

گناہ و ثواب
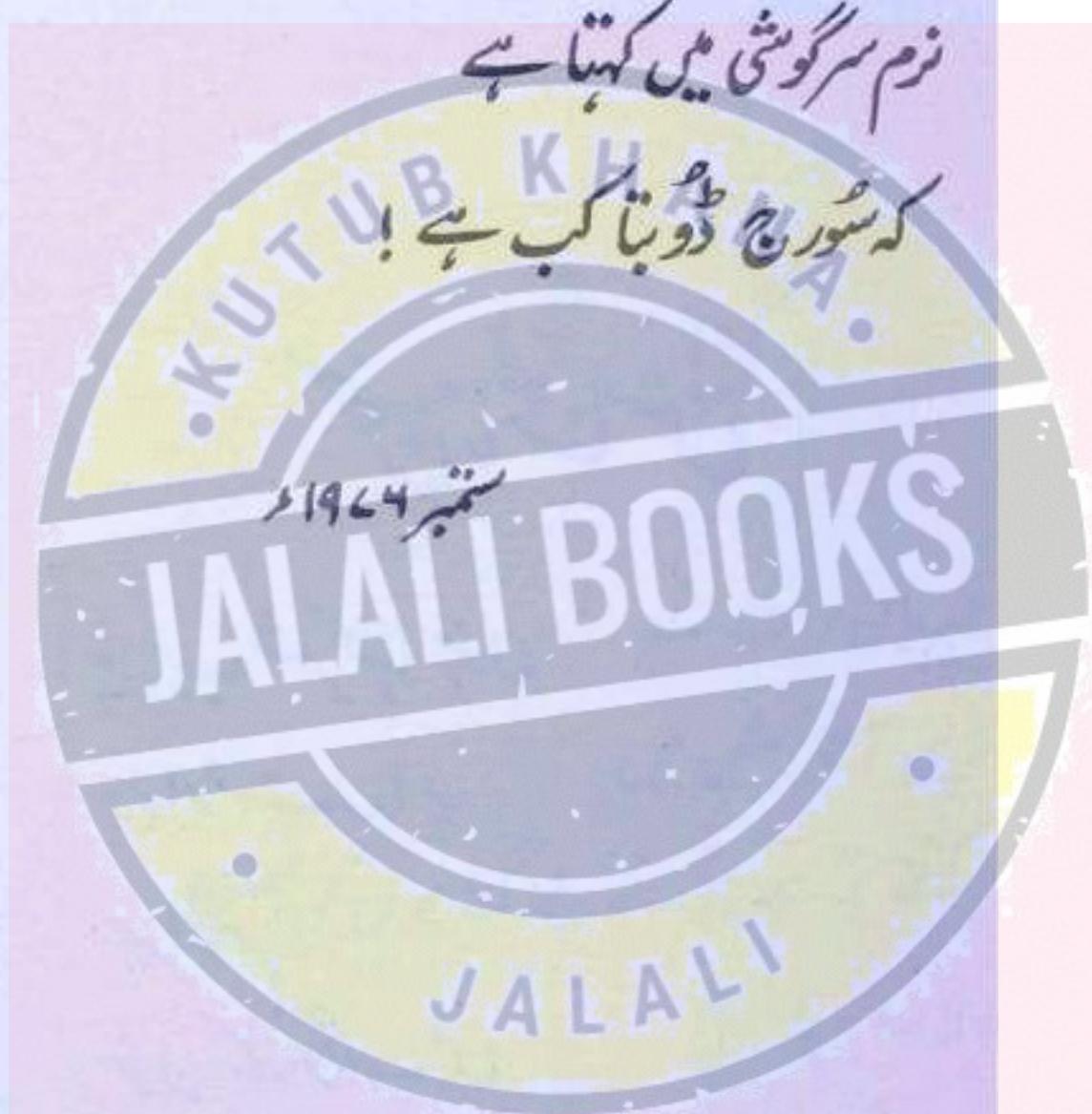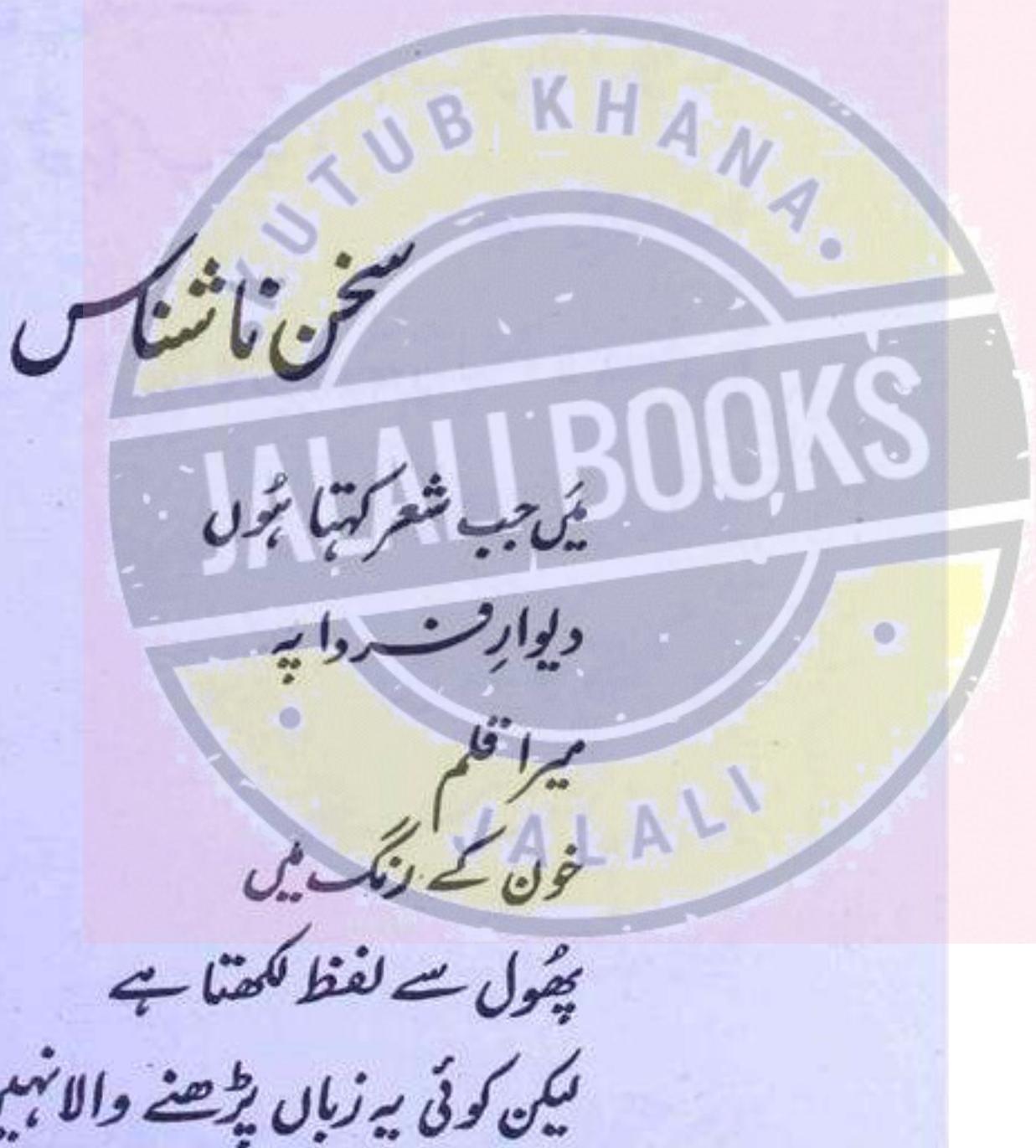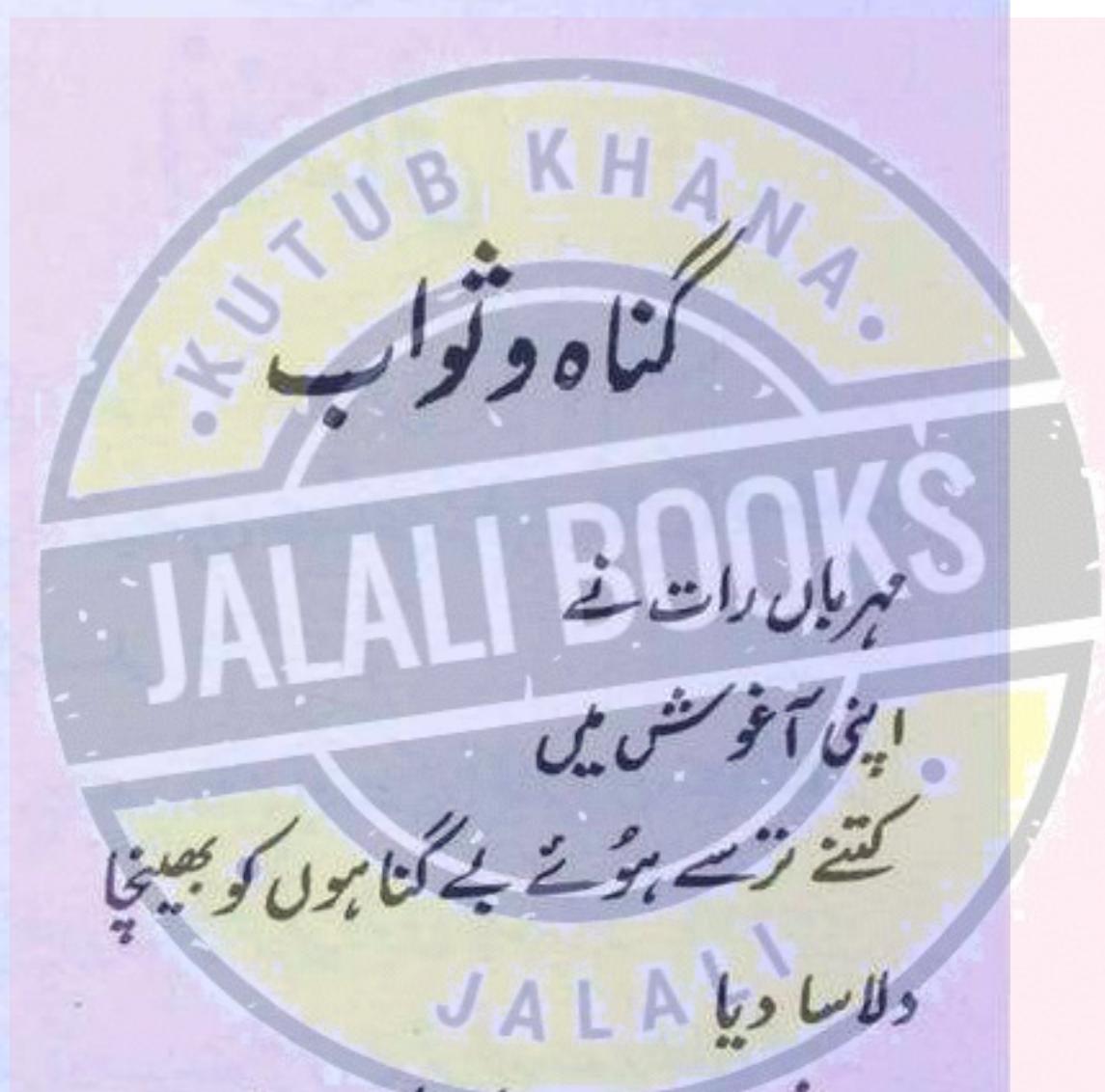
مہرباں رات نے
اپنی آغوش میں
کتنے ترسے ہوئے بے گناہوں کو بھینچا
دلاسا دیا
اور انھیں اس طرح کے گناہوں کی ترغیب دی
جس طرح کے گناہوں سے میلادِ آدم ہوا تھا

ستمبر ۱۹۷۶ء

انفصال

دوستو!

تم تو کندھوں سے اُوپر نظر ہی نہیں آرہے ہو

چلو
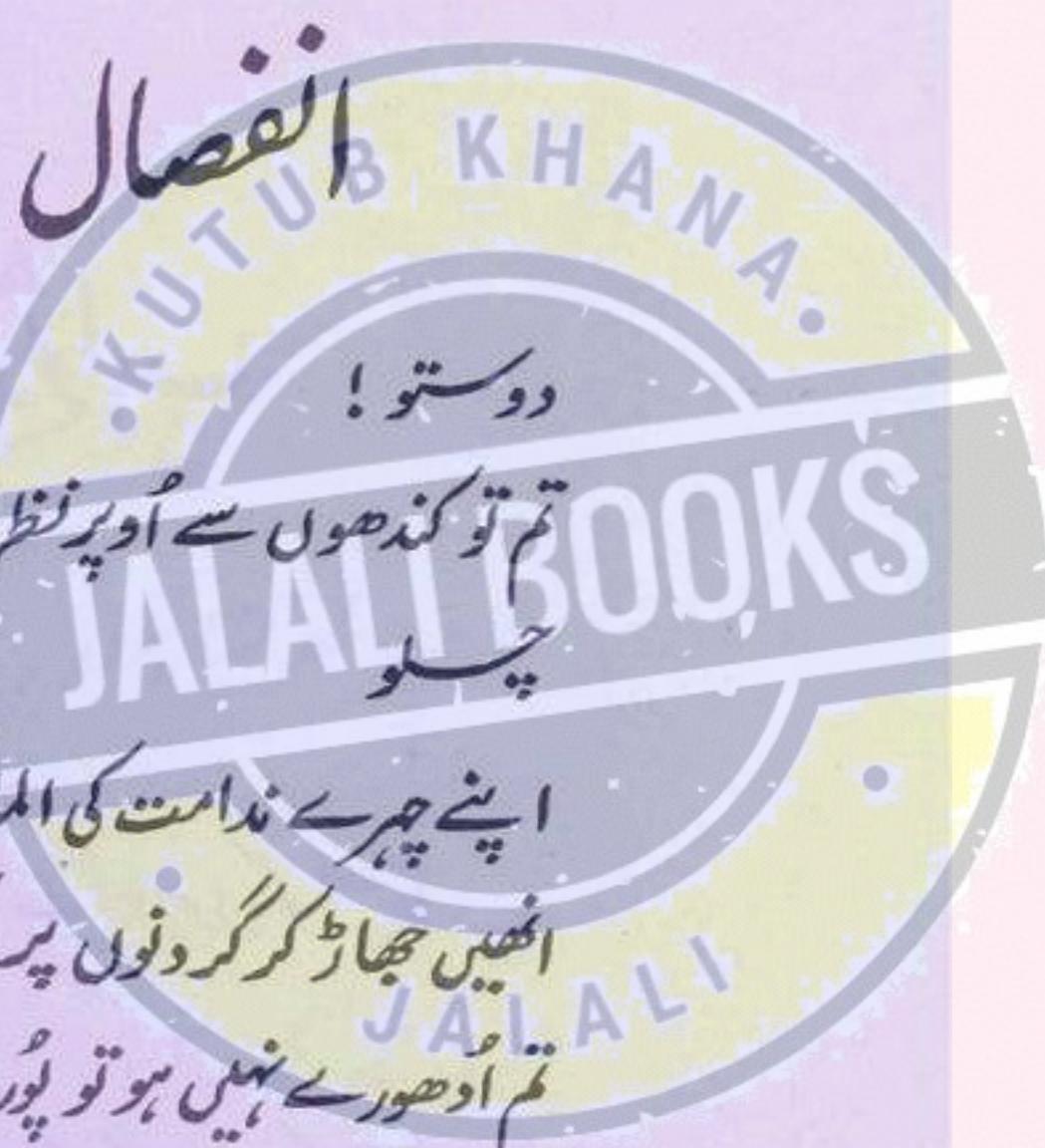
اپنے چہرے ندامت کی الماریوں سے نکالو

انھیں جھاڑ کر گردنوں پر رکھو

تم اُدھورے نہیں ہو تو پُورے دکھائی تو دو

ستمبر ۱۹۷۶ء

نئی تعبیر

غم کو تسخیر کریں، درد کو زنجیر کریں
آؤ حالات کی کچھ اور ہی تعبیر کریں

جب کبھی اہلِ قلم صدق کی تفسیر کریں
وہ جو تکفیر پہ مامور ہیں، تکفیر کریں
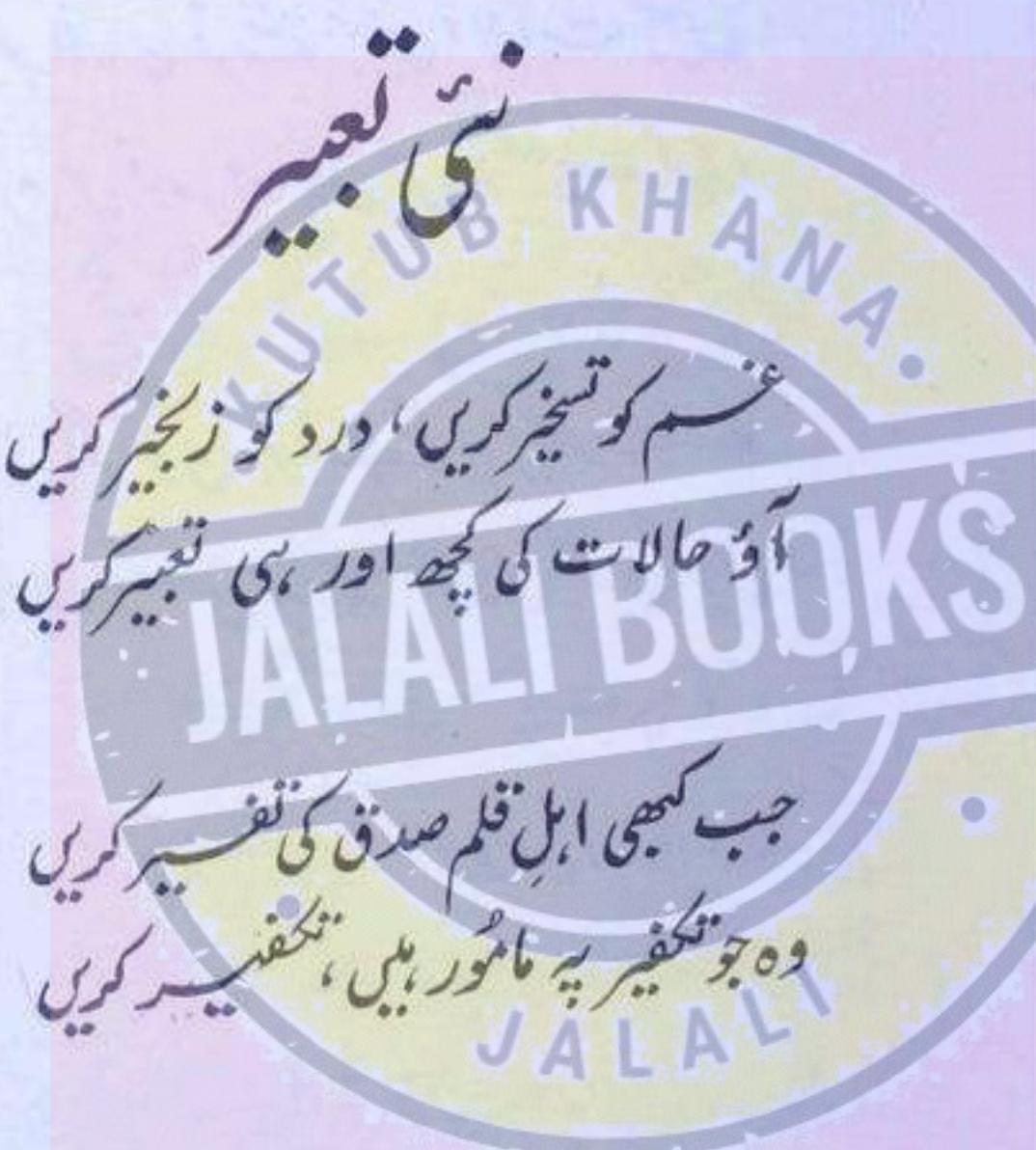
اے خدا، کفر ہمارا ہے بس اتنا سا، کہ ہم
تیری تکریم تو انسان کی توقیر کریں

جن کے اعمال کا شر محورِ آشوبِ حیات
آج کل فلسفۂ خیر پہ تقریر کریں

کیوں دکھائیں کسی بے کس کو اسی کی تصویر
ایک دلگیر کو کیوں اور بھی دلگیر کریں

اگر انسان فرشتے نہیں، جنّات نہیں
ہر مرے قصر ہواؤں میں نہ تعمیر کریں

دل اگر خوُن ہُوا ہے تو یہ بیکار نہ جائے
اپنے اس عہد کا منشور ہی تحریر کریں

جولائی ۱۹۷۶ء

"رُوح و بدن کے خم و پیچ"

کتنا شفّاف ہے بدن تیرا
کل جو تو میرے پاس سے گُزری
مَیں نے دیکھا، کہ تیرے چہرے پر
جھیل کا سا سکُون چھایا ہے
اور ترے دل پہ جب نظر ڈالی
مَیں نے وہ حشر سا بپا دیکھا
جس طرح زلزلہ سا آیا ہے

جون ۱۹۷۶ء

قریۂ محبّت

بہت شدید تشنّج میں مبتلا لوگو!
یہیں قریب، محبّت کا ایک قریہ ہے

یہاں دھوئیں نے مناظر چھپا رکھے ہیں، مگر
افق بقا کا وہاں سے دکھائی دیتا ہے
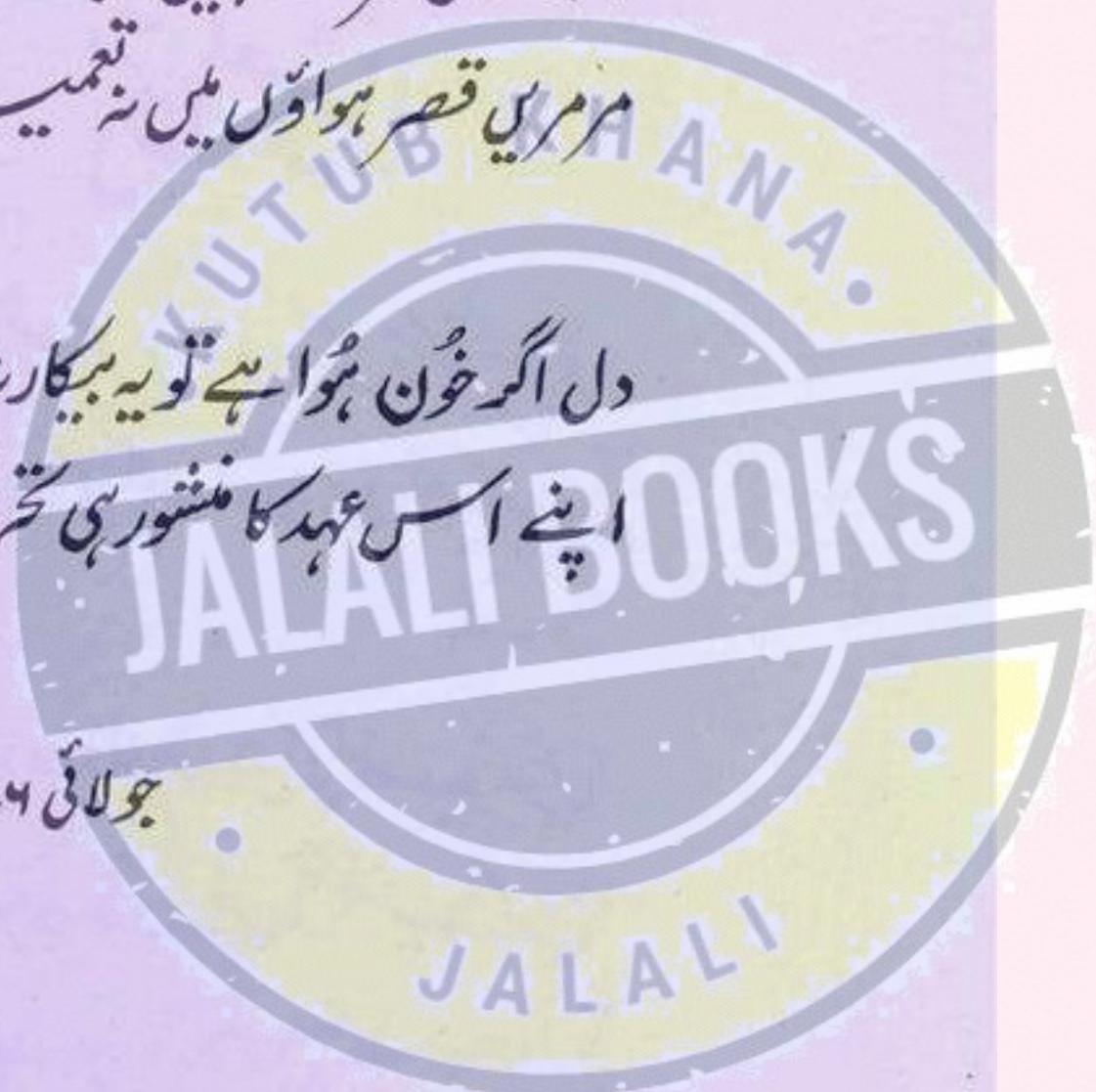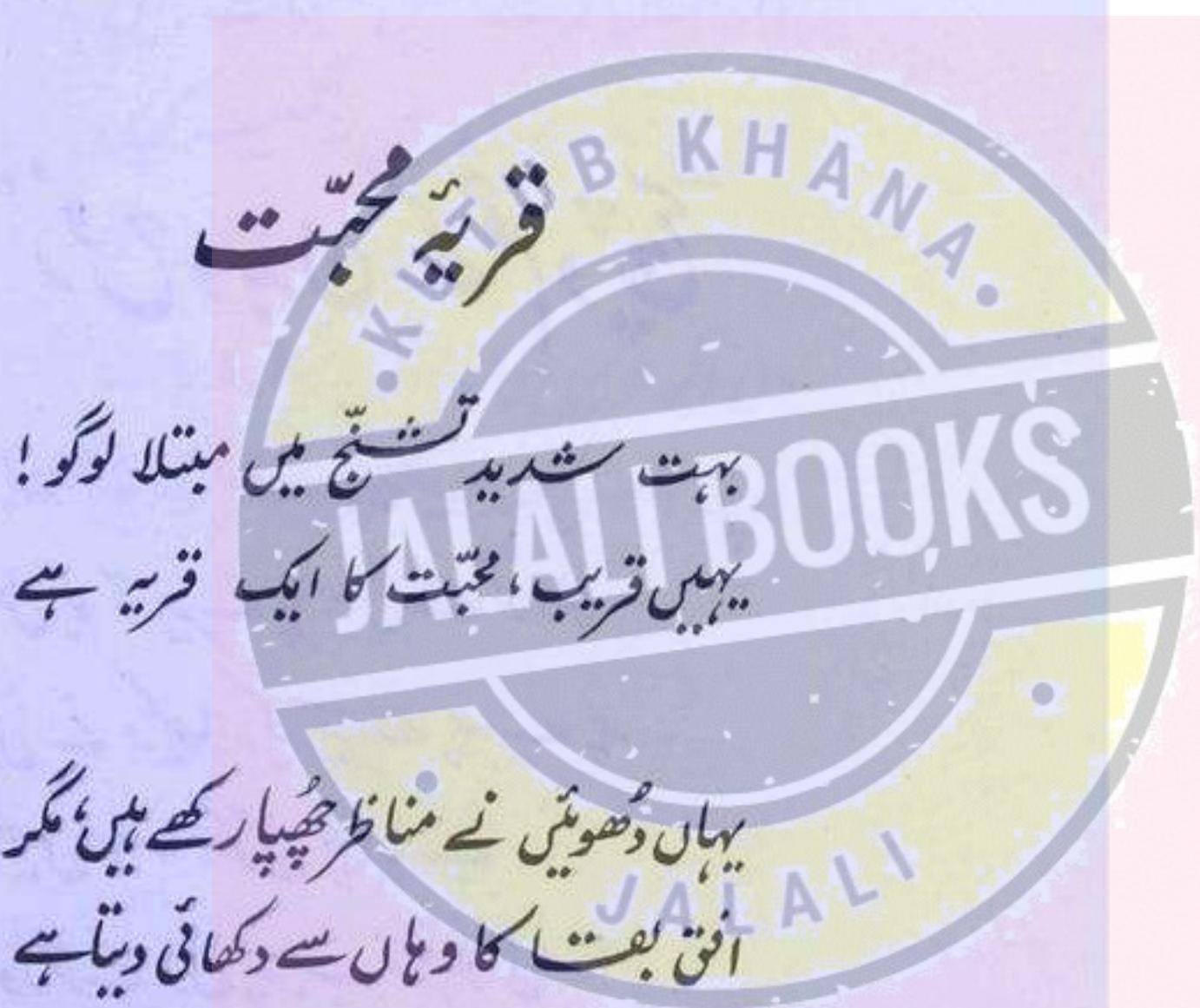
یہاں تو اپنی صدا کان میں نہیں پڑتی
وہاں خدا کا تنفّس سنائی دیتا ہے

مئی ۱۹۷۶ء

تھکن کا ایک لمحہ

سڑک کس قدر سخت، سفّاک اور کھُردری ہے

وہ جُوتوں کے چمڑے

نئے ٹائروں کے ربر

رہروؤں کے ارادوں کو

یُوں چاٹ جاتی ہے

جیسے کوئی اژدہا ہے

جو صدیوں کا بھوکا ہے

اور زندگی کو نِگلتا چلا جا رہا ہے!

مئی ۱۹۷۶ء

جبر

ہوا کے ڈر سے گلوں نے قبائیں سی لی ہیں
اگر نمود ہو شبنم کی، کس اُمید پہ ہو
کہاں گئے وہ گلابی ہتھیلیوں سے برگ
کہاں گئیں وہ جبینیں، کہاں گئے وہ لب
جو دُھوپ شاخ سے چھن کر کرن کرن ٹپکی
کسے لگائے گی سینے سے، کس کو چُومے گی
مُسافروں نے اگر اس جگہ قیام کیا
تو میزبان کی آمد کے انتظار کے بعد
اُٹھیں گے، اور کس صحرا میں جا کے دم لیں گے
کہ ان کو دشت سے جو نکہتیں بلاتی رہیں
وہ اب گلوں کی قباؤں میں سر بزانو ہیں

مارچ ۱۹۷۶ء

ترقی یافتہ

بستی بستی شور اُٹھتا ہے :

"مہنگائی! مہنگائی!"

مغرب والے

سونے کے انبار پہ چڑھ کر

کتنی اُداس آواز میں فرماتے ہیں :

"دیکھو!
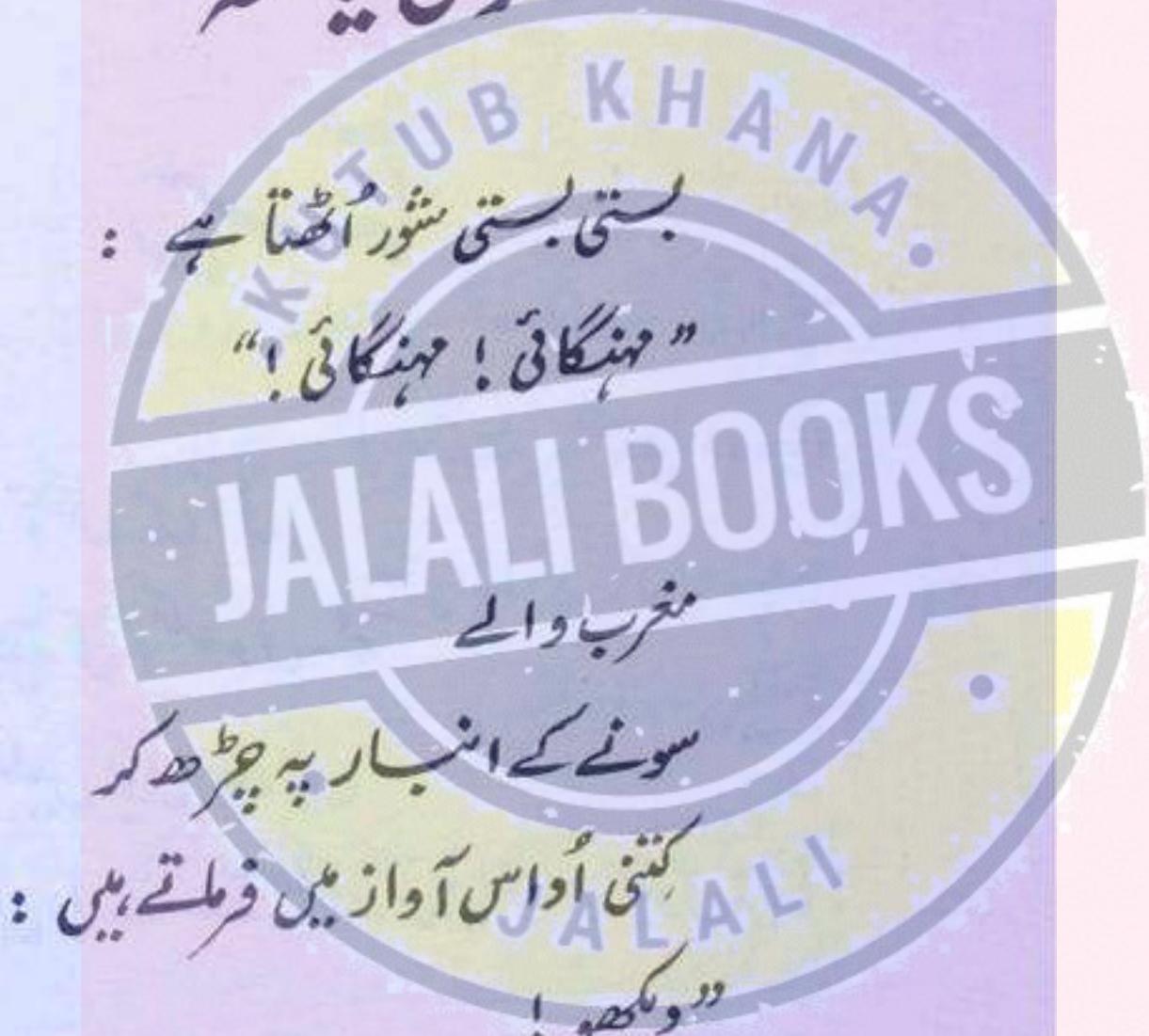
مشرق کو خود اس کی ترقّی راس نہ آئی!"

فروری ۱۹۷۶ء

رہنما

رات جنگل میں آئی
تو چیتے کی آنکھوں نے
دو مشعلیں یُوں جلائیں
کہ مَیں راستے سے بھٹکنے کی عیّاشیاں بھُول بیٹھا!

فروری ۱۹۷۶ء

خواب

چاندنی نے رنگِ شب جب زرد کر ڈالا — تو میں
ایک ایسے شہر سے گزرا — جہاں
صرف دیواریں نمایاں تھیں
چھتیں معدوم تھیں
اور گلیوں میں فقط سائے رواں تھے
جسم غائب تھے!

فروری ۱۹۷۶ء

پت جھڑ کی تنہائی
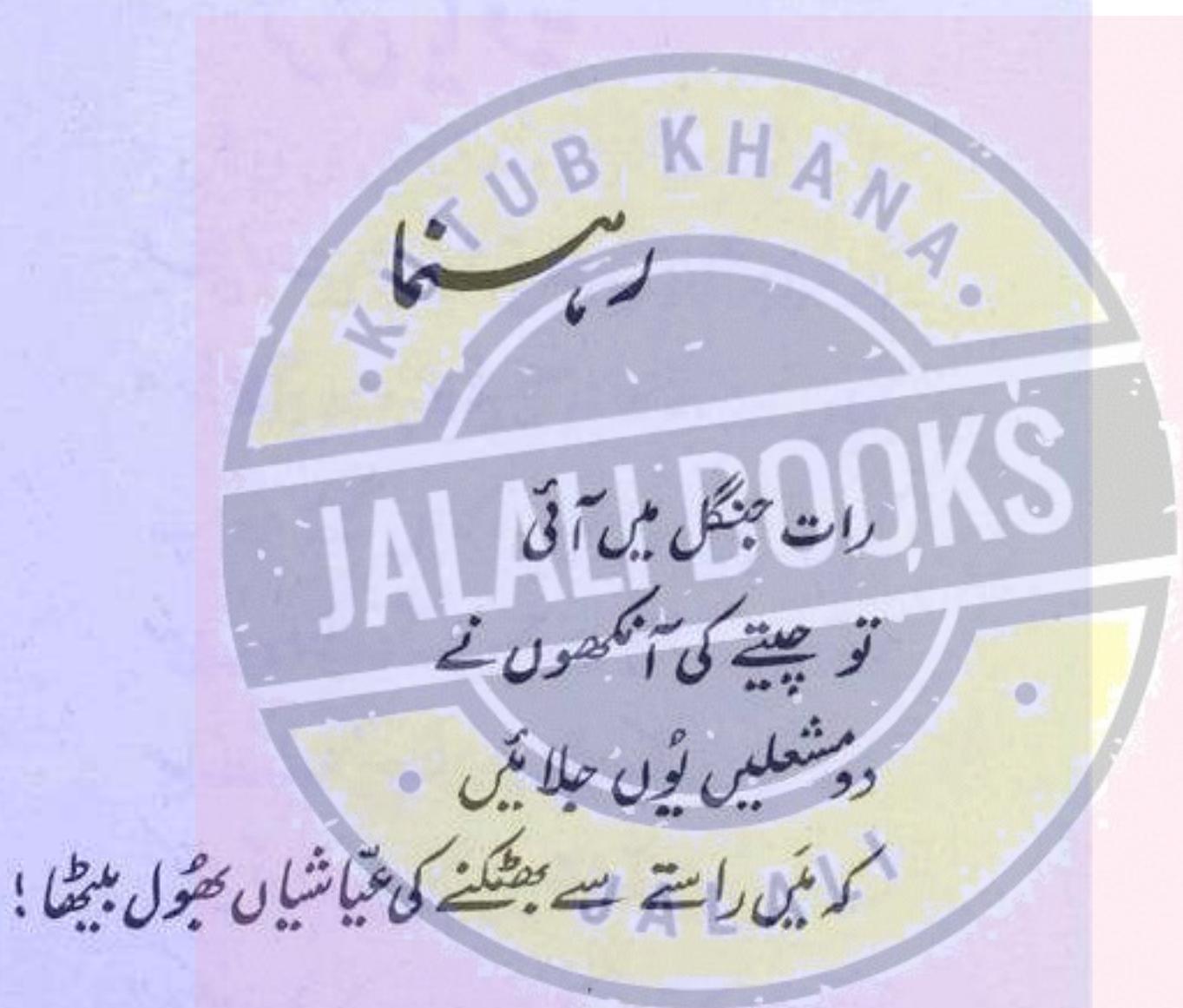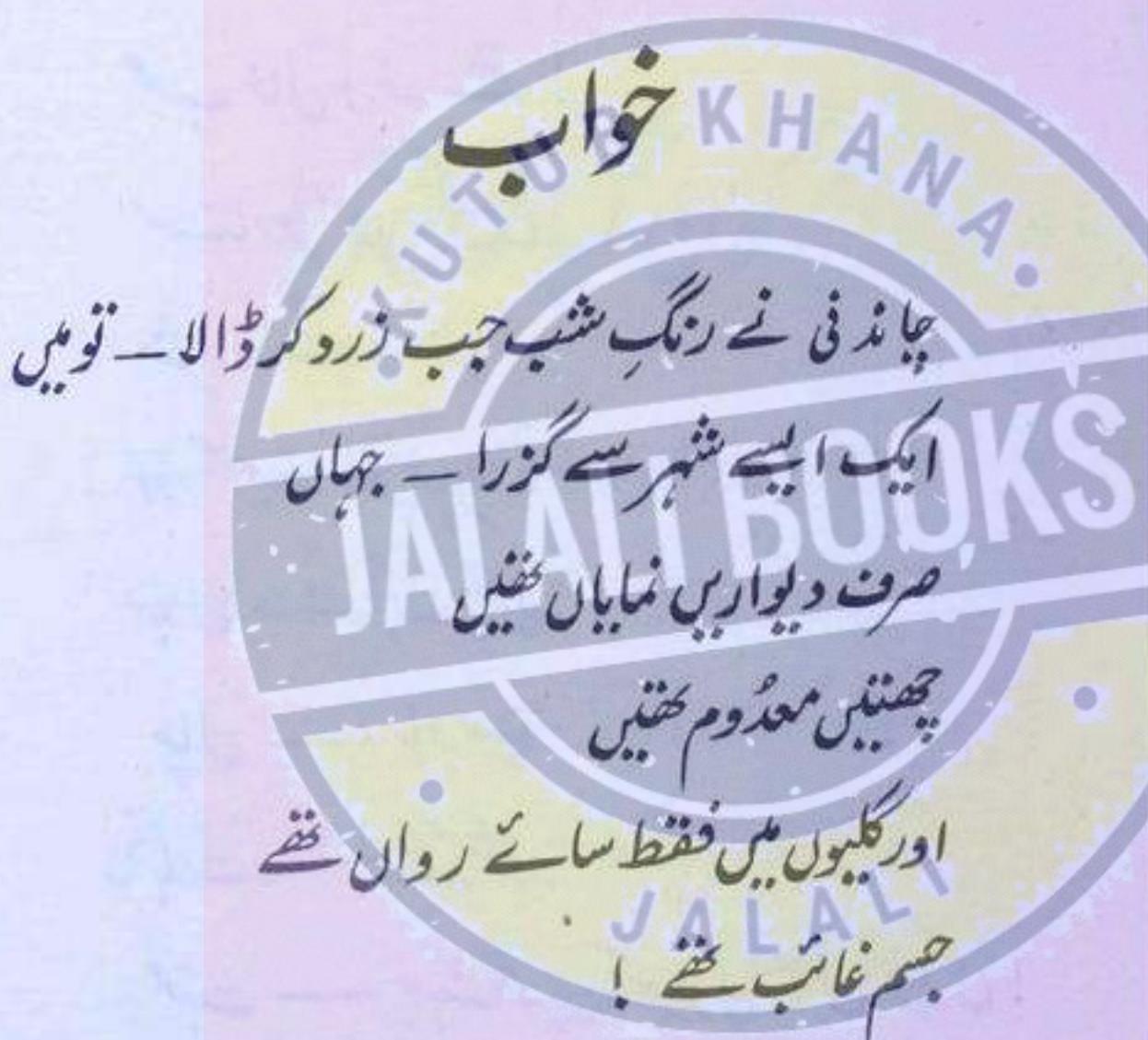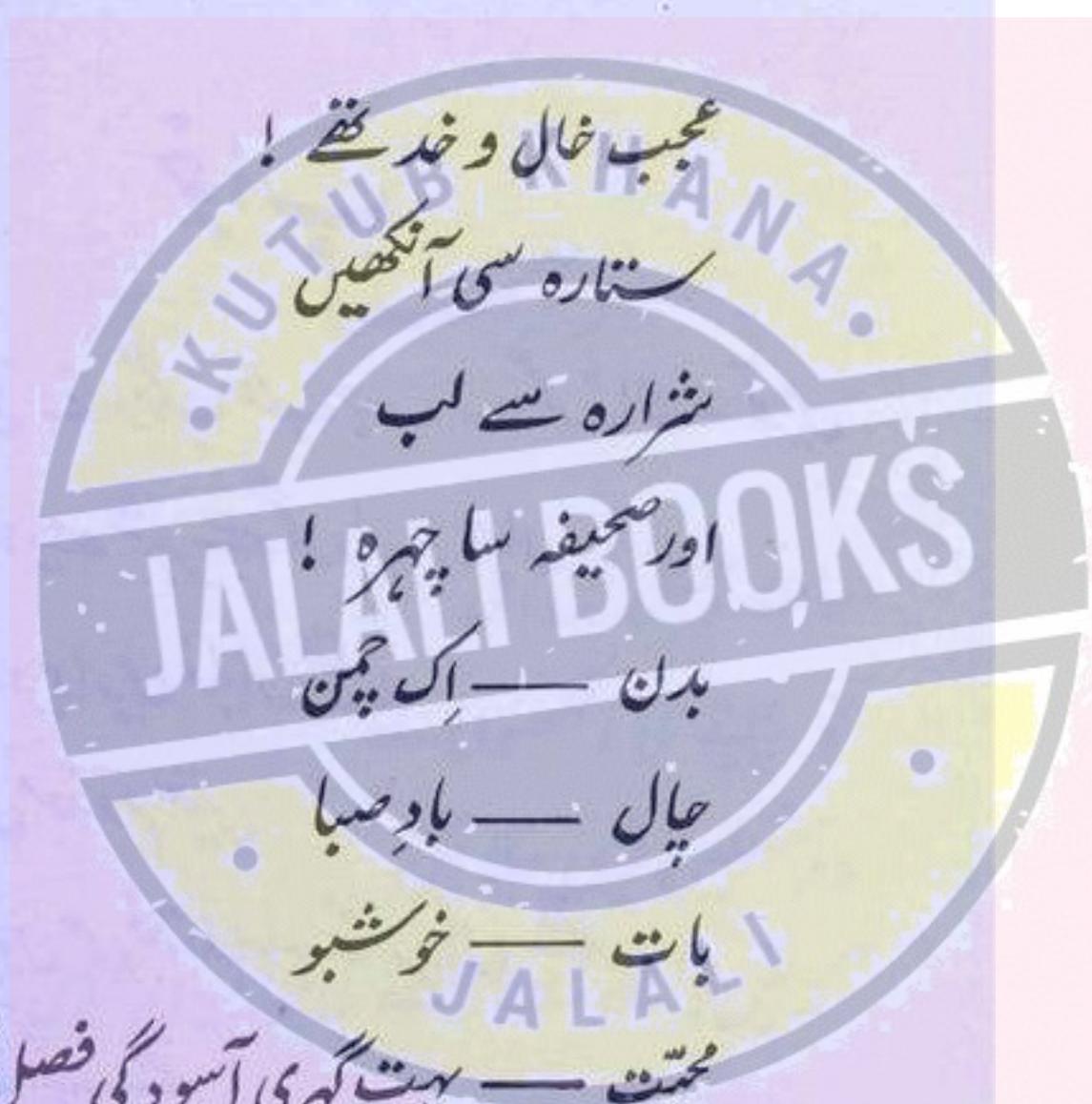
عجیب خال و خد تھے!
ستارہ سی آنکھیں
شرارہ سے لب
اور صحیفہ سا چہرہ!
بدن — اِک چمن
چال — بادِ صبا
بات — خوشبو
محبت — بہت گہری آسودگی فصلِ گل کی!
مگر آج وہ خال و خد دیکھ کر سوچتا ہوں
کہ میری بصارت کو پت جھڑ کی تنہائی نے کھا لیا ہے

جنوری ۷۶ ۱۹ء

کون گیا کون آیا

نہ جانے سیڑھیوں سے کون اُترا جا رہا ہے !

اس کی ہر ہر چاپ میں میلوں کی دُوری ہے !

مجھے محسوس ہوتا ہے

کہ جیسے عالمِ سکرات میں جو سانس آئی تھی

وہ واپس جا رہی ہے !

جنوری ۱۹۷۶ء

قبر پہ پھول
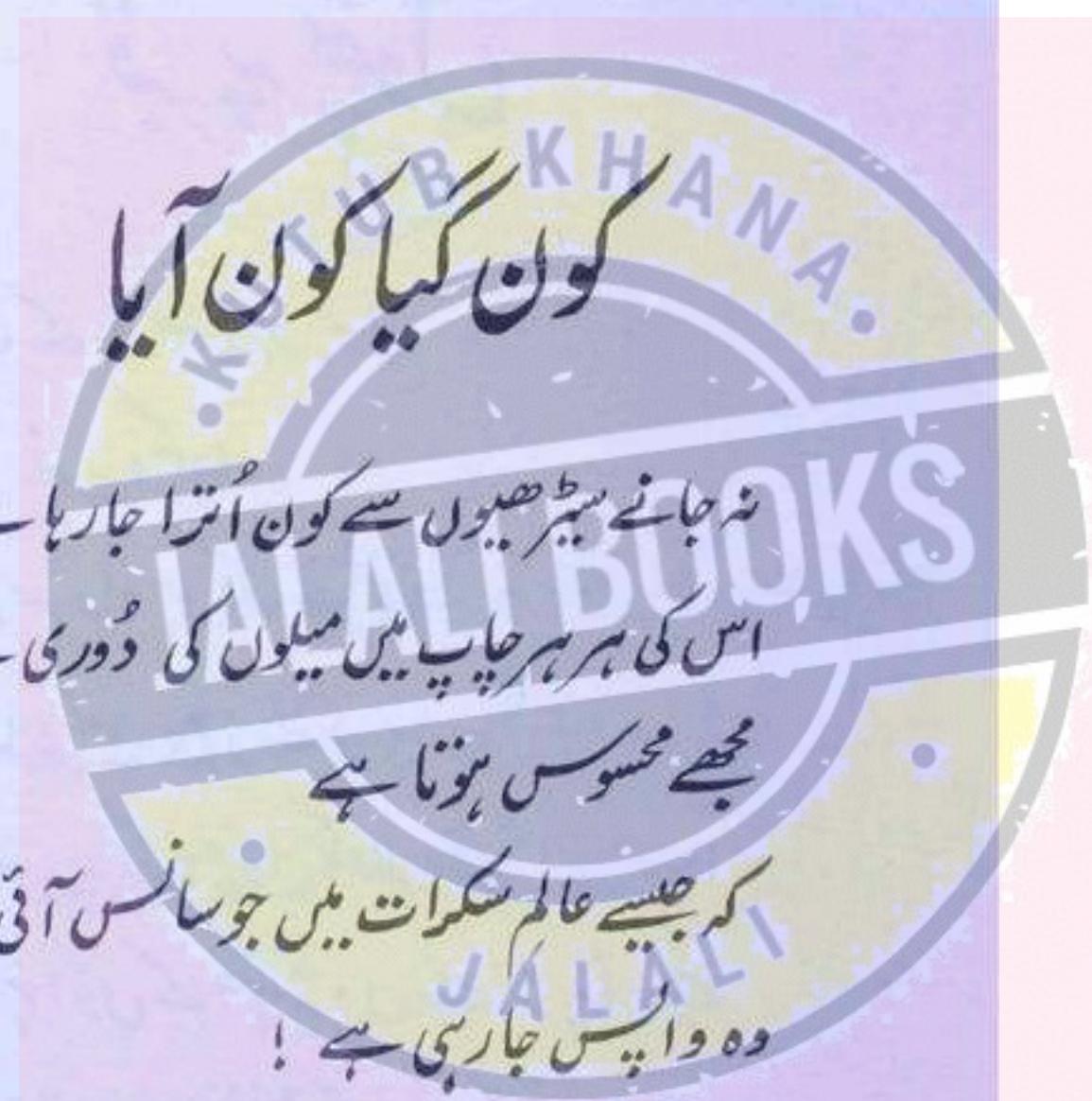
اب کے بارش جو ہوئی
مَیں نے یہ دیکھا
کہ سرِ راہ جو اک قبر تھی
(شاید کسی دیوانے کی)
اس پہ اک پھول کھِلا ہے
جو ہواؤں کے تھپیڑوں سے تڑپتا ہے
تو پاتال سے ہنسنے کی صدا آتی ہے

جنوری ۱۹۷۶ء

فشار

پھول جب کھل چکا تو کہنے لگا:

اب مرا حسن میرے بس میں نہیں

اب میں اپنی بھی دسترس میں نہیں

جنوری ۱۹۷۶ء

منفیّت کا منشور

چلو کچھ اور سوچیں
ہم نے اب تک جو بھی سوچا ہے
وہ صدیوں کی پُرانی سوچ ہے
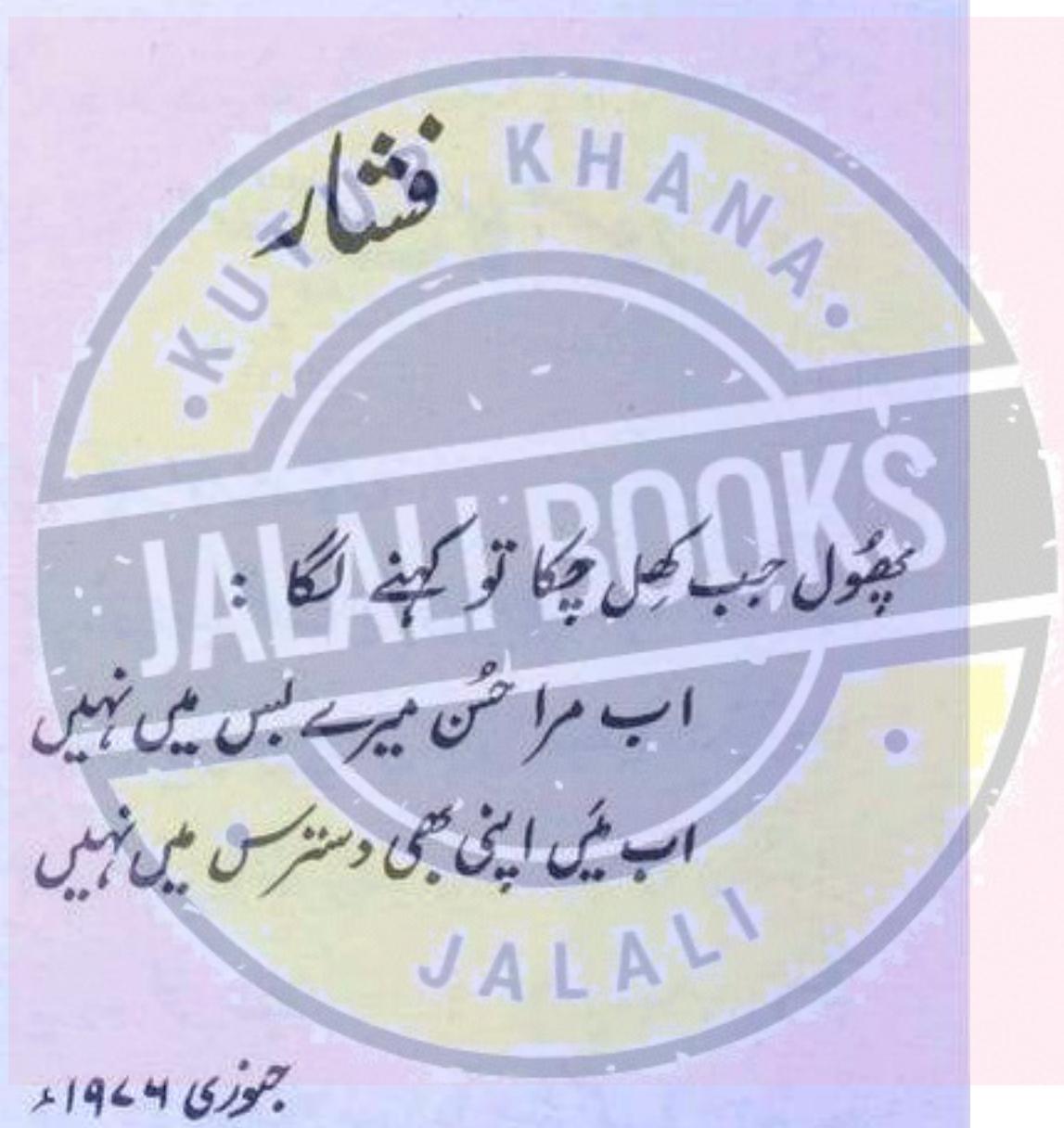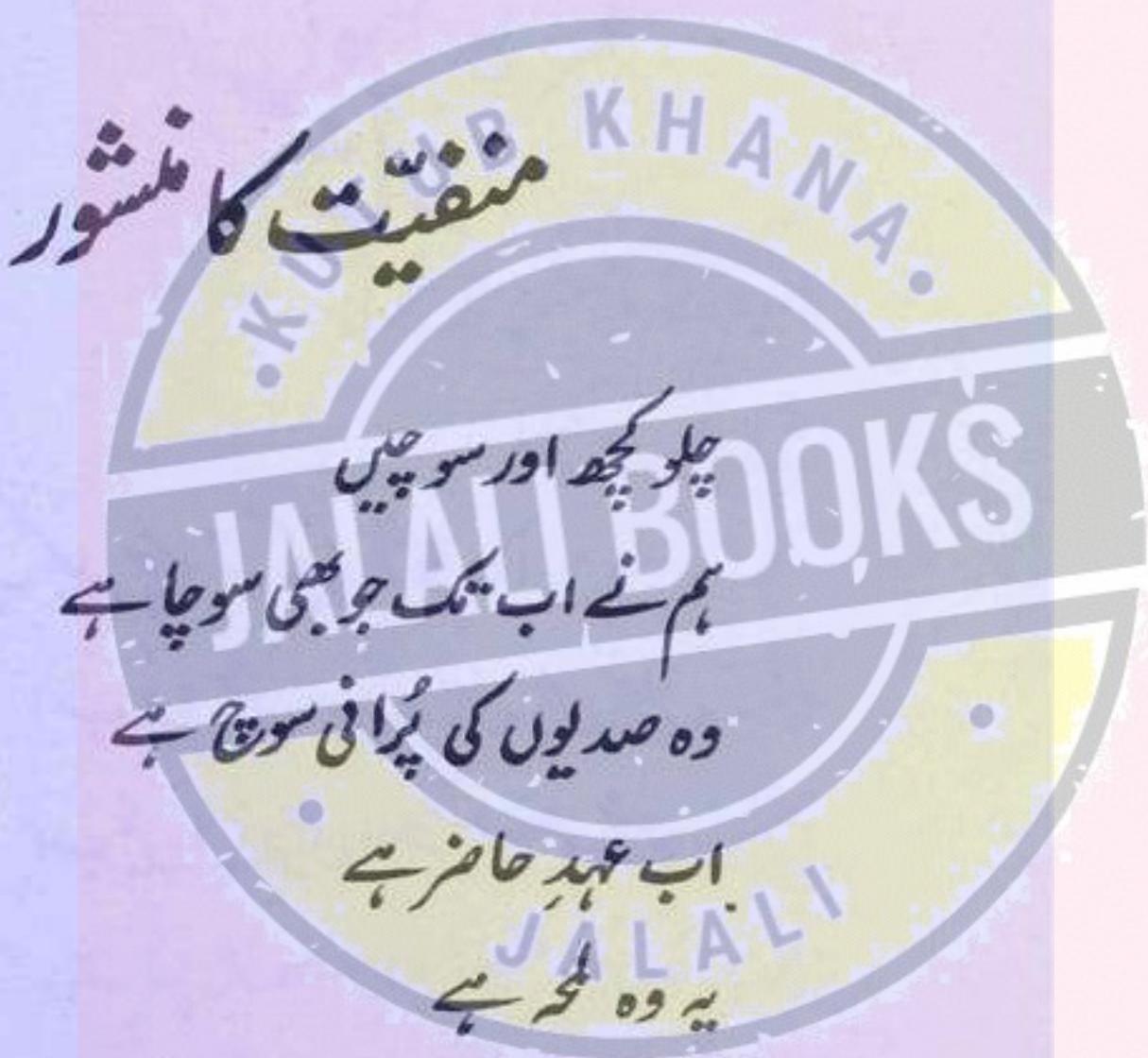
اب عہدِ حاضر ہے
یہ وہ لمحہ ہے
جس کے شہپروں پر بیٹھ کر
ہم کو زمیں سے اپنا ناتا توڑنا اور آسماں
سے جوڑ لینا ہے

چلو کچھ اور سوچیں
اب یہ دُنیا
اور انساں
اور اس کے دُکھ
پُرانے، کرم خوردہ، بھُر بھُرے، بدرنگ،
بے لذّت فسانے ہیں
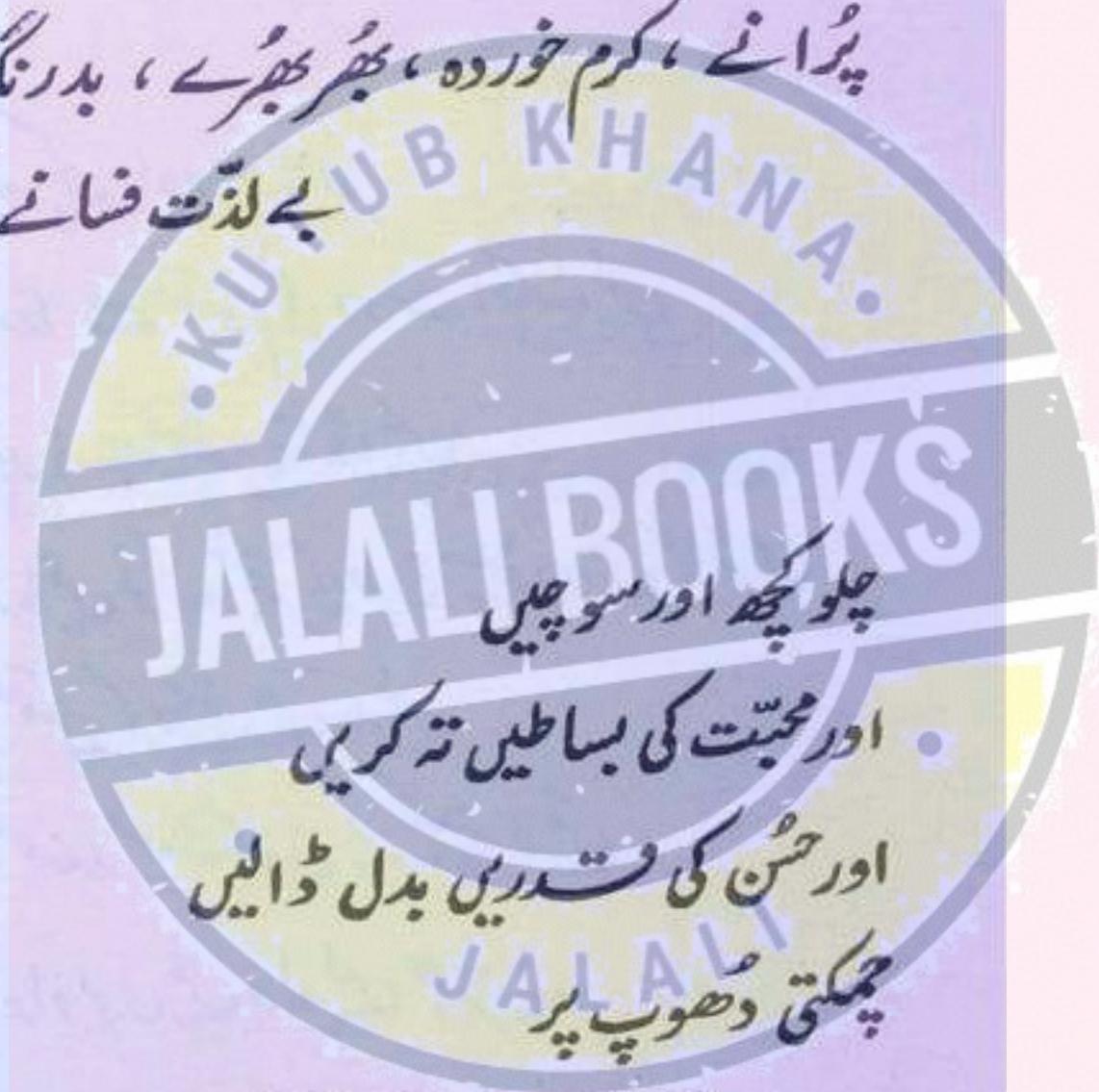
چلو کچھ اور سوچیں
اور محبّت کی بساطیں تہ کریں
اور حسُن کی قدریں بدل ڈالیں
چمکتی دھوپ پر
اور چاندنی راتوں پہ لعنت بھیج کر
پھُولوں پہ تھوکیں
ندیوں کو پتھّروں سے پاٹ دیں
رشتوں کو کاٹیں

رابطوں کو روند ڈالیں
سولیاں گاڑیں

چلو کچھ اور سوچیں
لفظ سے مفہوم کی دولت اچک لیں
اور اسے پتھر بنا ڈالیں
زبانیں نوکِ خنجر کی طرح سینوں میں گاڑیں
نغمگی کو چیخ میں بدلیں
سمندر خشکیوں پر کھینچ لائیں
وادیوں میں دلدلیں بھر دیں
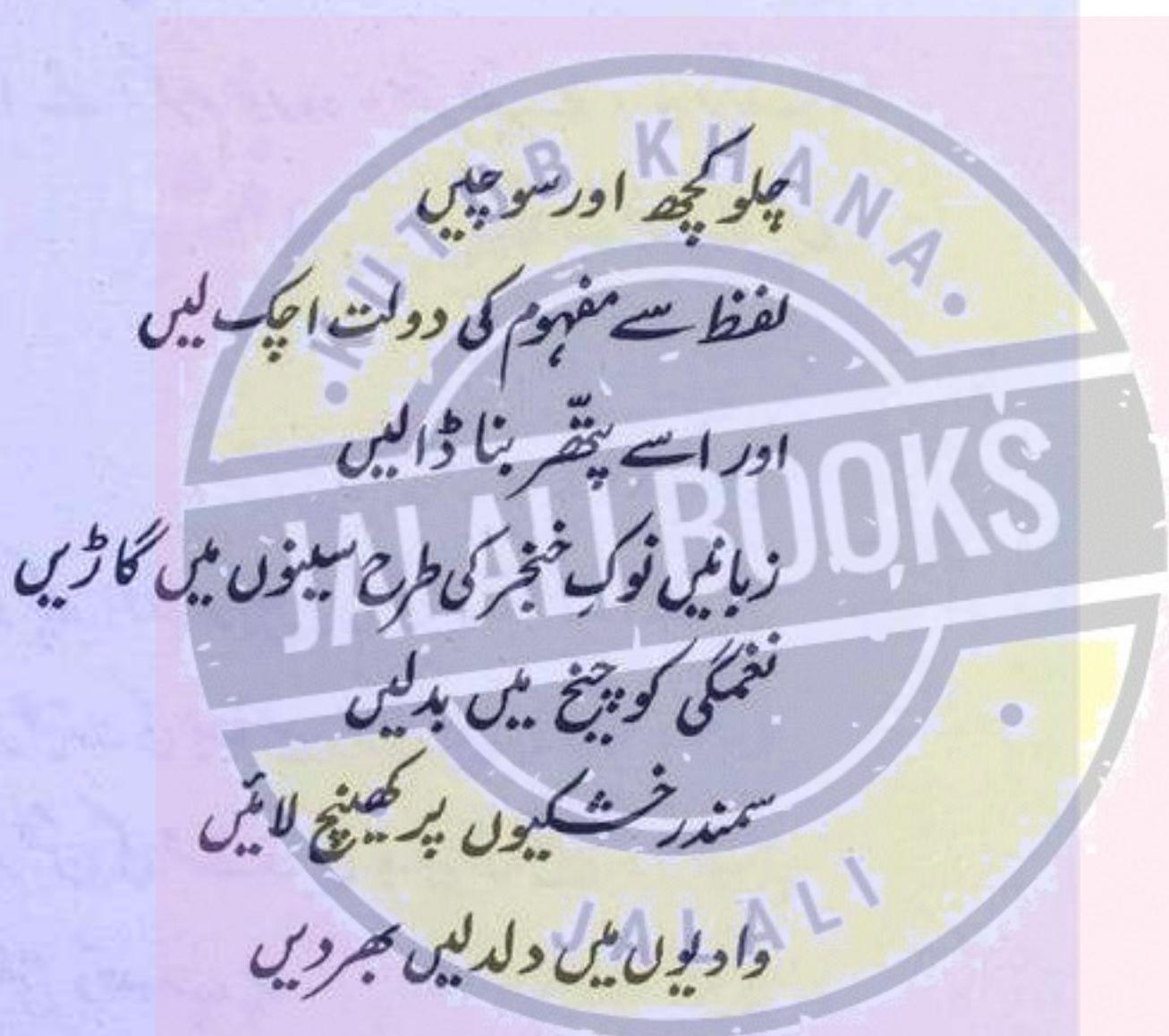
چلو کچھ اور سوچیں
اب یہی سوچیں
کہ جو کچھ آدمی نے آج تک سوچا ہے

وہ سب کفر ہے
اور حق فقط یہ ہے
کہ جو کچھ ہے
نہیں ہے
کچھ نہیں ہے
واہمہ ہے
خواب ہے
اور خواب سوچوں کی ندامت کا نتیجہ ہیں !

جنوری ۱۹۷۶ء

چاند

اسے مَیں نے دیکھا

تو سوچا

کہ اب چاند نے

اپنے سُورج سے

لَو مانگنا چھوڑ دی ہے !

جنوری ۱۹۷۶ء

ہنستے کھیلتے

خشک پتّے
ہوا کے ہمجولی
کودتے، پھاندتے، گٹکتے ہوئے
دامنِ موجۂ صبا تھامے
مملکتِ زندگی کی طے کر کے
سرحدِ نیستی پہ جا پہنچے
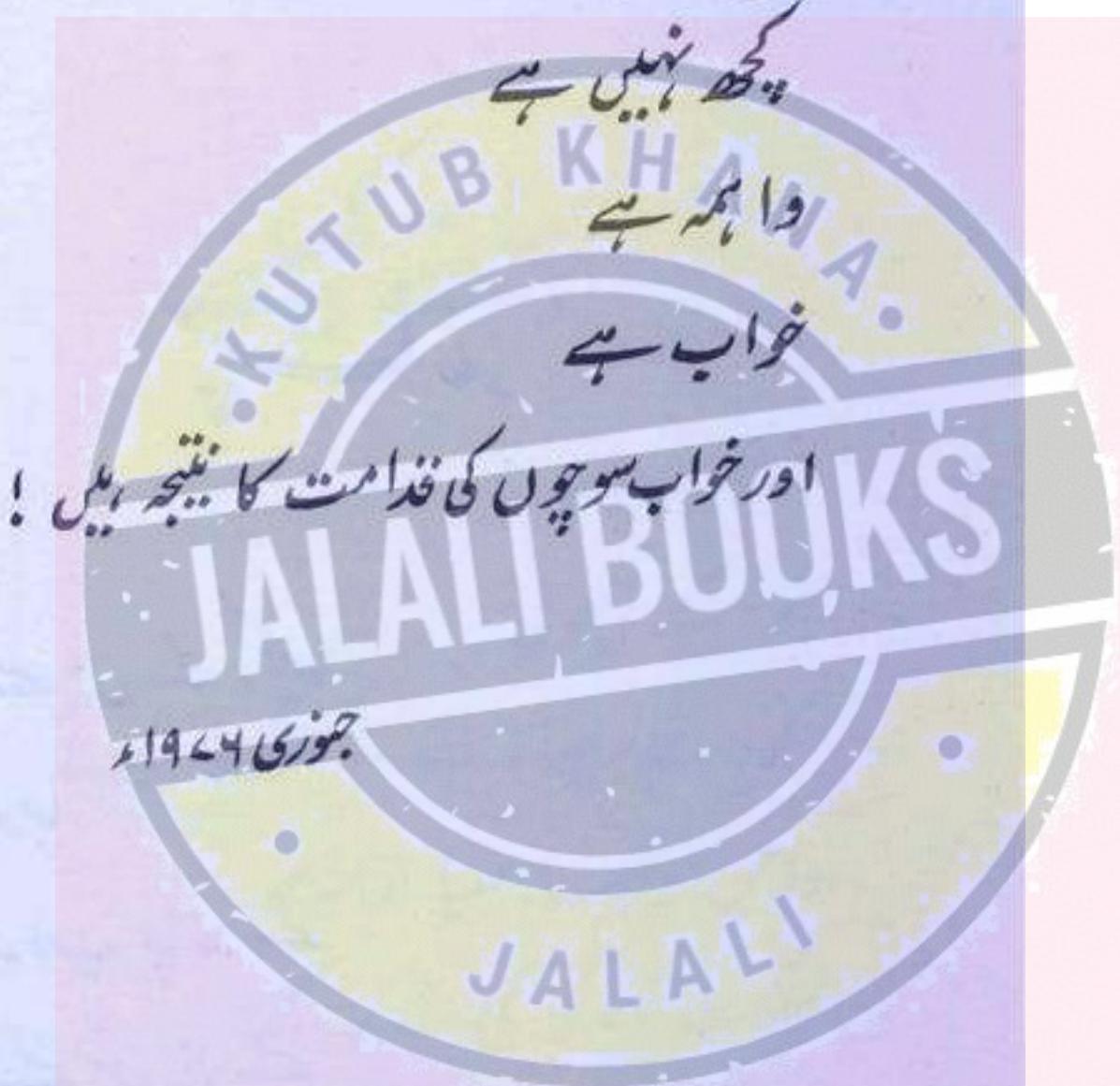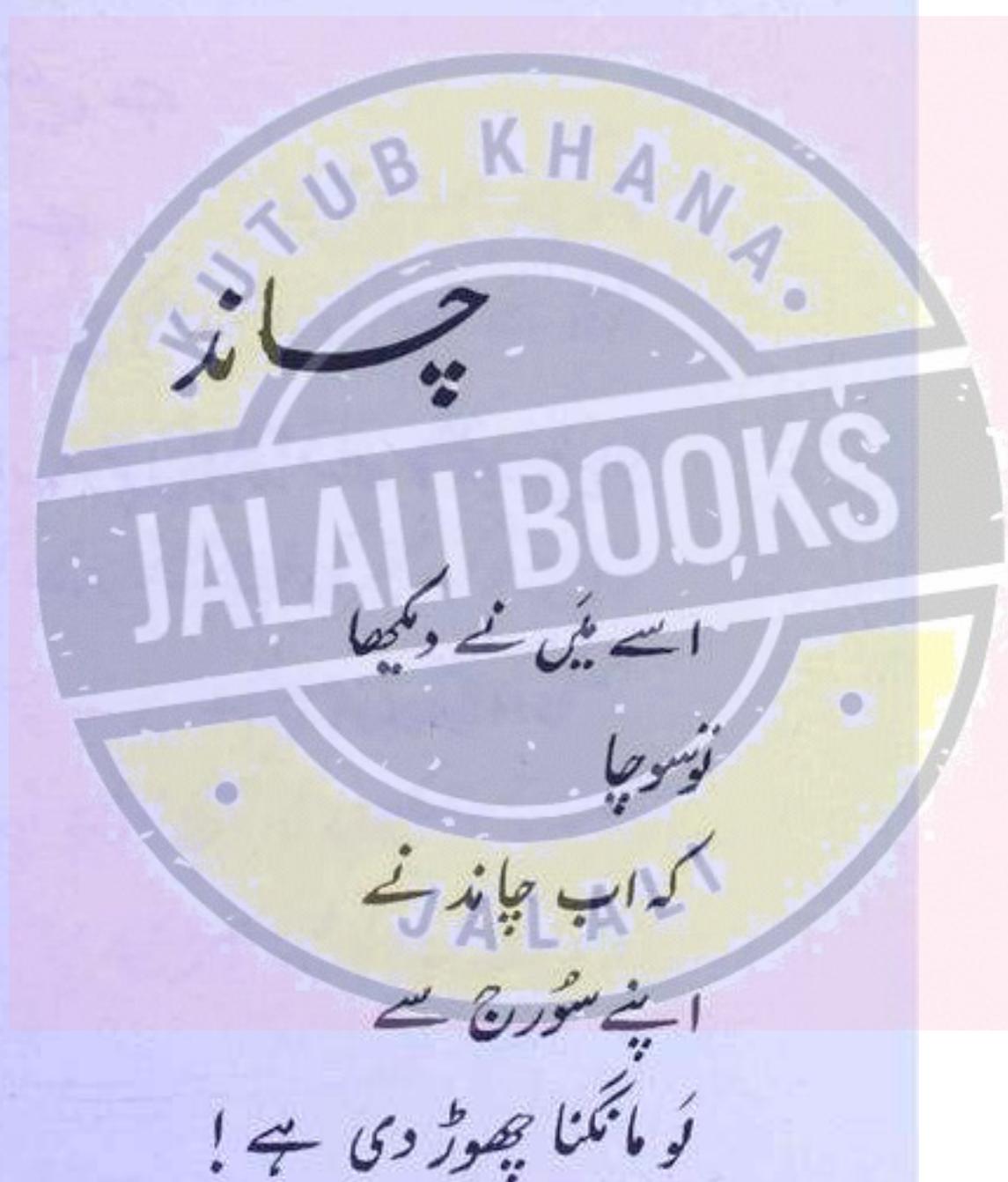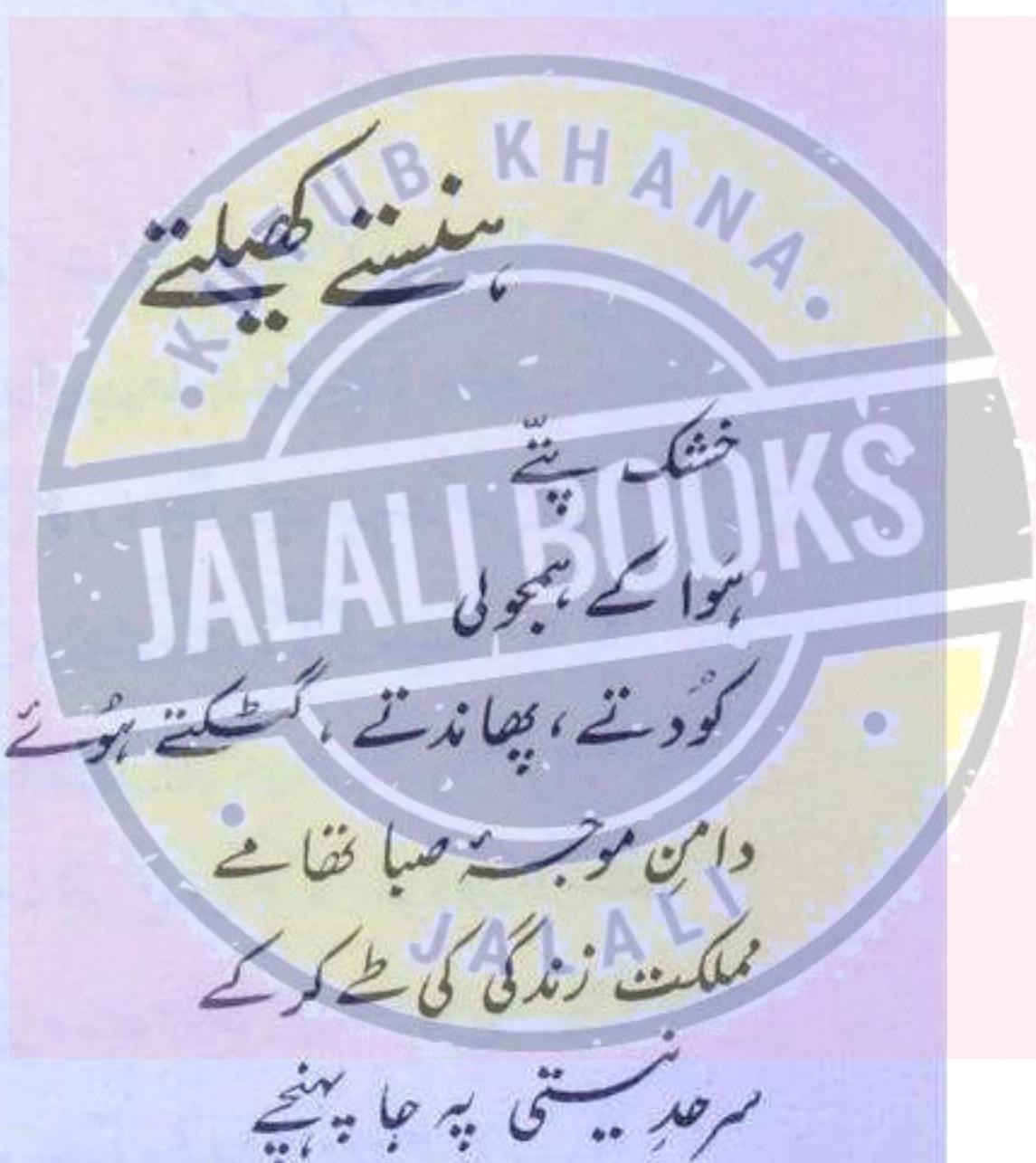
جنوری ۱۹۷۶ء

ہم سفر

چاند کی سمت جب اُڑتا ہوں
تو ہر بار عجب حادثہ ہو جاتا ہے
وہ جو مٹی کا دیا جلتا ہے میرے گھر میں
اپنی لَو سر پہ رکھے، آتا ہے
اور کہتا ہے :
ترے ساتھ چلوں گا کہ سفر دُور کا ہے
اور تو راہ سے بھٹکا
تو مَیں بے آسرا رہ جاؤں گا !

جنوری ۱۹۷۶ء

دعا

مجھے نہ مژدۂ کیفیتِ دوامی دے
مرے خدا! مجھے اعزازِ ناتمامی دے

مَیں تیرے چشمۂ رحمت سے شادکام تو ہُوں
کبھی کبھی مجھے احساسِ تشنہ کامی دے

مجھے کسی بھی معزّز کا ہم رکاب نہ کر
مَیں خود کماؤں جسے، بس وہ نیک نامی دے

وہ لوگ جو کئی صدیوں سے ہیں نشیب نشیں
بلند ہوں، تو مجھے بھی بلند بامی دے

تری زمین پہ تیرے چمن رہیں آباد
جو دشتِ دل ہے، اسے بھی تو لالہ فامی دے

بڑا سرور سہی تجھ سے ہمکلامی میں!
بس ایک بار مگر ذوقِ خود کلامی دے

مَیں دوستوں کی طرح خاک اڑا نہیں سکتا
مَیں گردِ راہ سہی، مجھ کو نرم گامی دے

عدوئے نم ہوں، تو کر آندھیوں کی نذر، مگر
رفیقِ گل ہوں تو مجھ کو صبا خرامی دے

اگر گروں تو کچھ اس طرح سربلند گروں
کہ مار کر، مرا دشمن مجھے سلامی دے

مارچ ۱۹۷۶ء

محیط

ستارہ شام کا

ستارہ شام کا نکلا

تو پھولوں نے

اُمڈتی تیرگی میں سر اُٹھا کر اس کو دیکھا

اور پھر سرگوشیاں کیں — :

یہ ہماری نسل سے ہے!
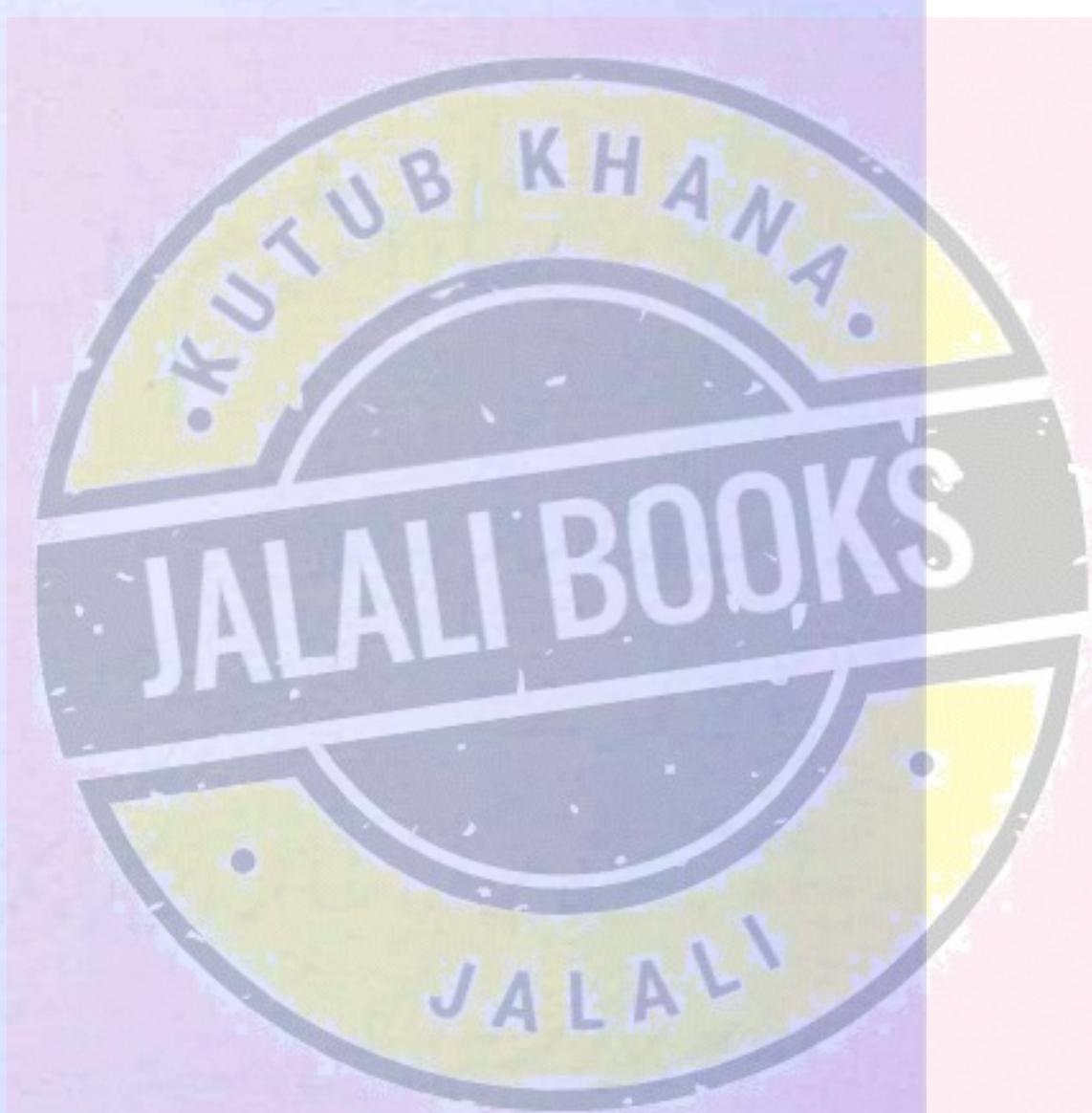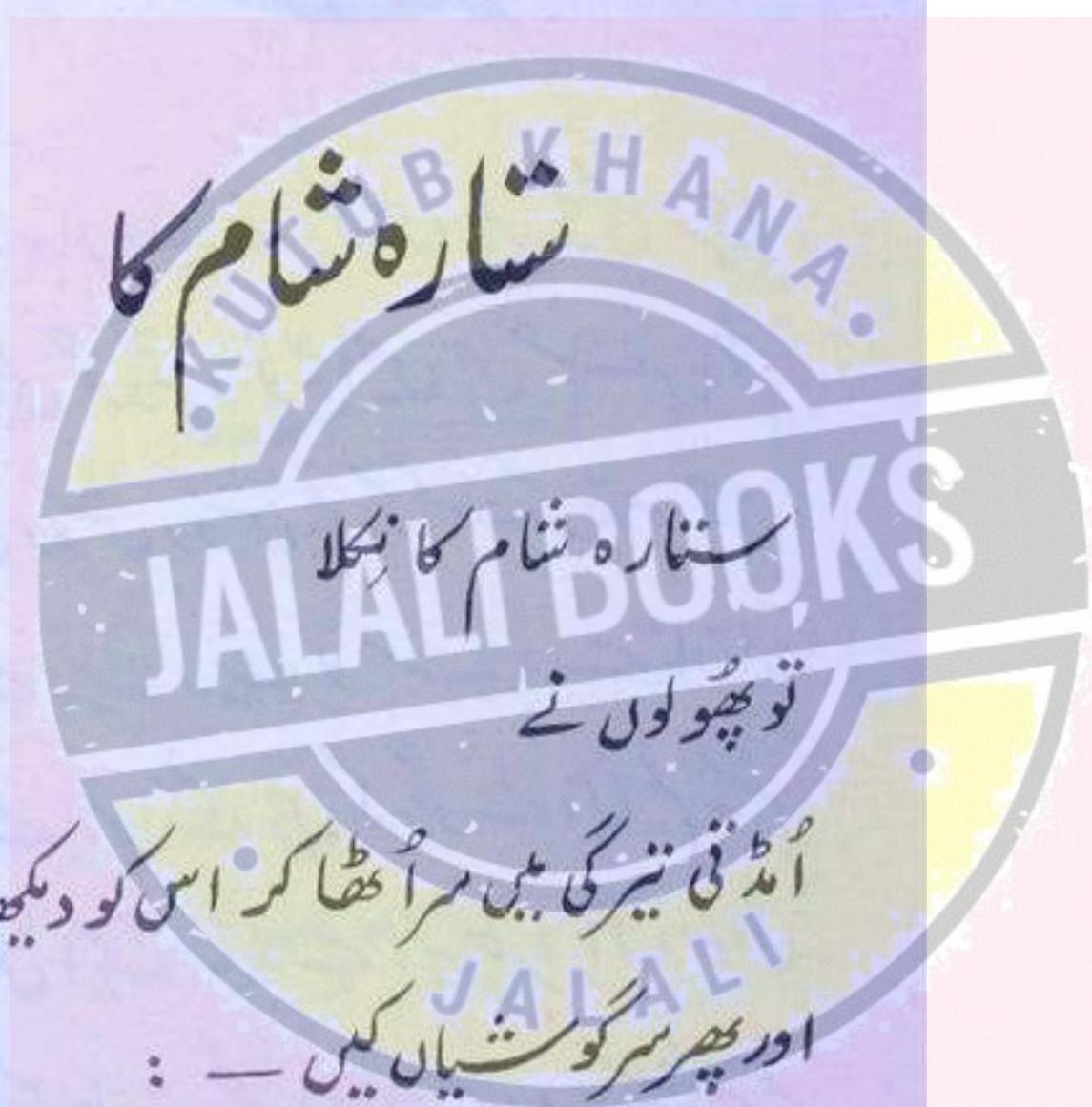
آسماں پر موسمِ گُل کا ہراول ہے!

۳۱۔ دسمبر ۱۹۷۵ء

سنہ ۱۹۷۵

اب کے بہار، جانے کہاں پر رُکی رہی
پتّے ہیں گرد گرد تو ڈالیں ہیں خم بہ خم
کلیاں روش روش ہیں کہ کنکر قدم قدم
مٹی ہے ریت ریت تو سبزہ ہے تار تار
جھونکے ہوا کے ہیں کہ بگولے ہیں بیم بہ بیم
ہر شخص ایک سایہ ہے، ہر چہرہ اک سوال
بچوں کی طرح لمحے رواں ہیں، بہ چشمِ نم
ہر تازہ پھول میں ہے پھپھوندی لگی ہوئی
اس موسمِ بہار سے پت جھڑ بری نہ تھی

دسمبر ۱۹۷۵ء

ا ـــ ب

ذہین بچّو!
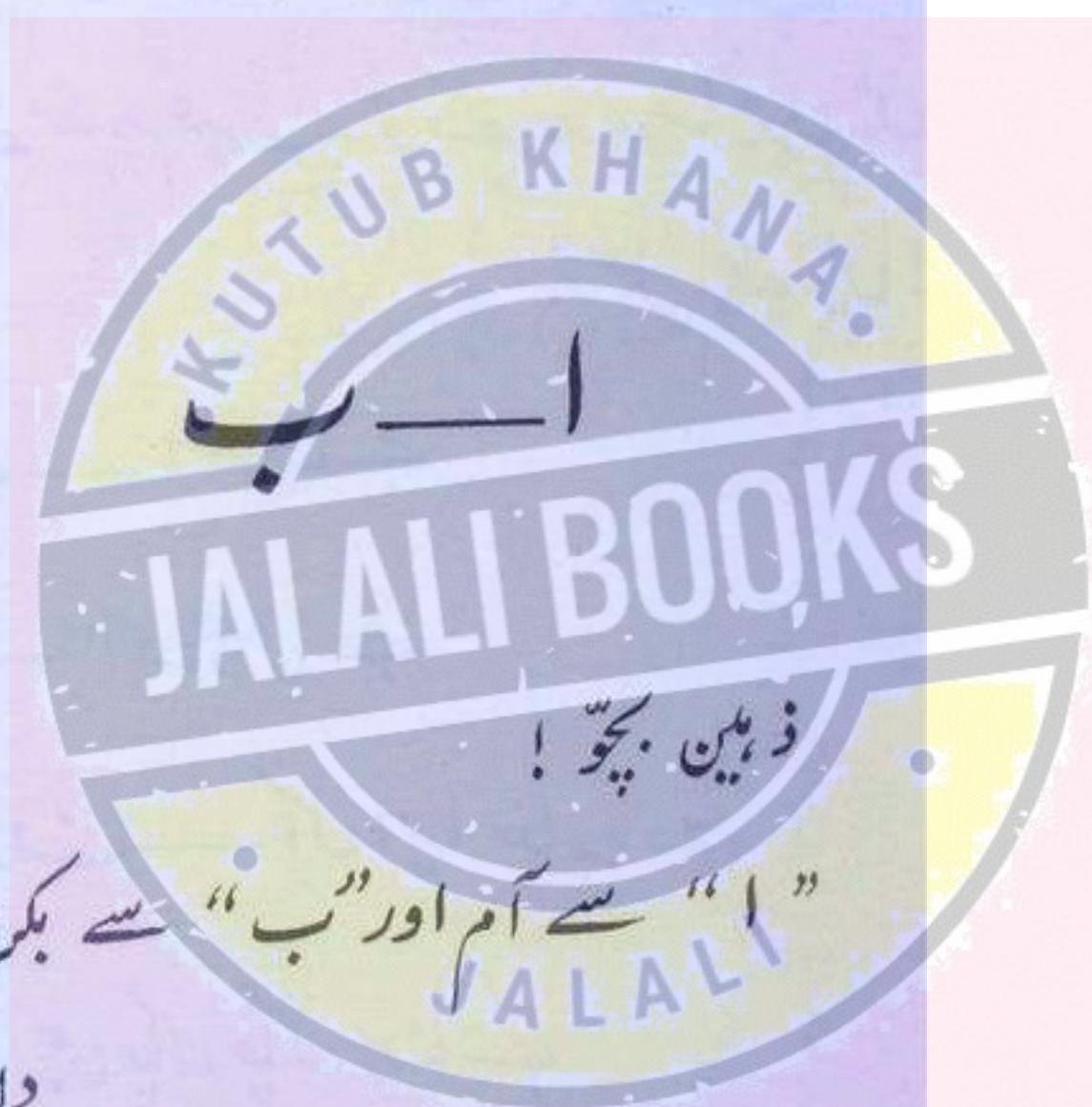
"ا" سے آم اور "ب" سے بکری کے

دن گئے

اب "ا" سے ایٹم پڑھو، کہ ایٹم اٹل ہے

اب "ب" سے بم بنے گا

کہ بم ہی آج اور بم ہی کل ہے

حروف جیسے بھی تھے ، وہی ہیں
مگر جو رشتے تھے ان میں —— یکسر بدل چکے ہیں ،
حروف کے اتحاد سے وہ جو لفظ بنتے تھے
ان کے مفہوم عہدِ نو کے جدید سانچوں میں ڈھل چکے ہیں !

محبّت — اسلوب ہے
جمال — ایک جنس ہے
اور وفا — اِک ایسا معاہدہ ہے
جسے ابھی چاک چاک ہونا ہے

حروف روتے ہیں
اپنی بے حرمتی پہ روتے ہیں — چیختے ہیں
مگر سماعت سے ماوراء ہیں

کہ نیک استاد کی صدا گونجتی ہے ہر سُو :

ذہین بچّو !

"ا" سے ایٹم ہے

"ب" سے بم ہے

پڑھو — کہ ایٹم اٹل ہے

بم کائنات کا آج اور کل ہے

دسمبر ۱۹۷۵ء

بارشوں کے موسموں میں

مجھے کچی چھتوں پر
بارشوں کے موسموں میں
پیار آتا ہے
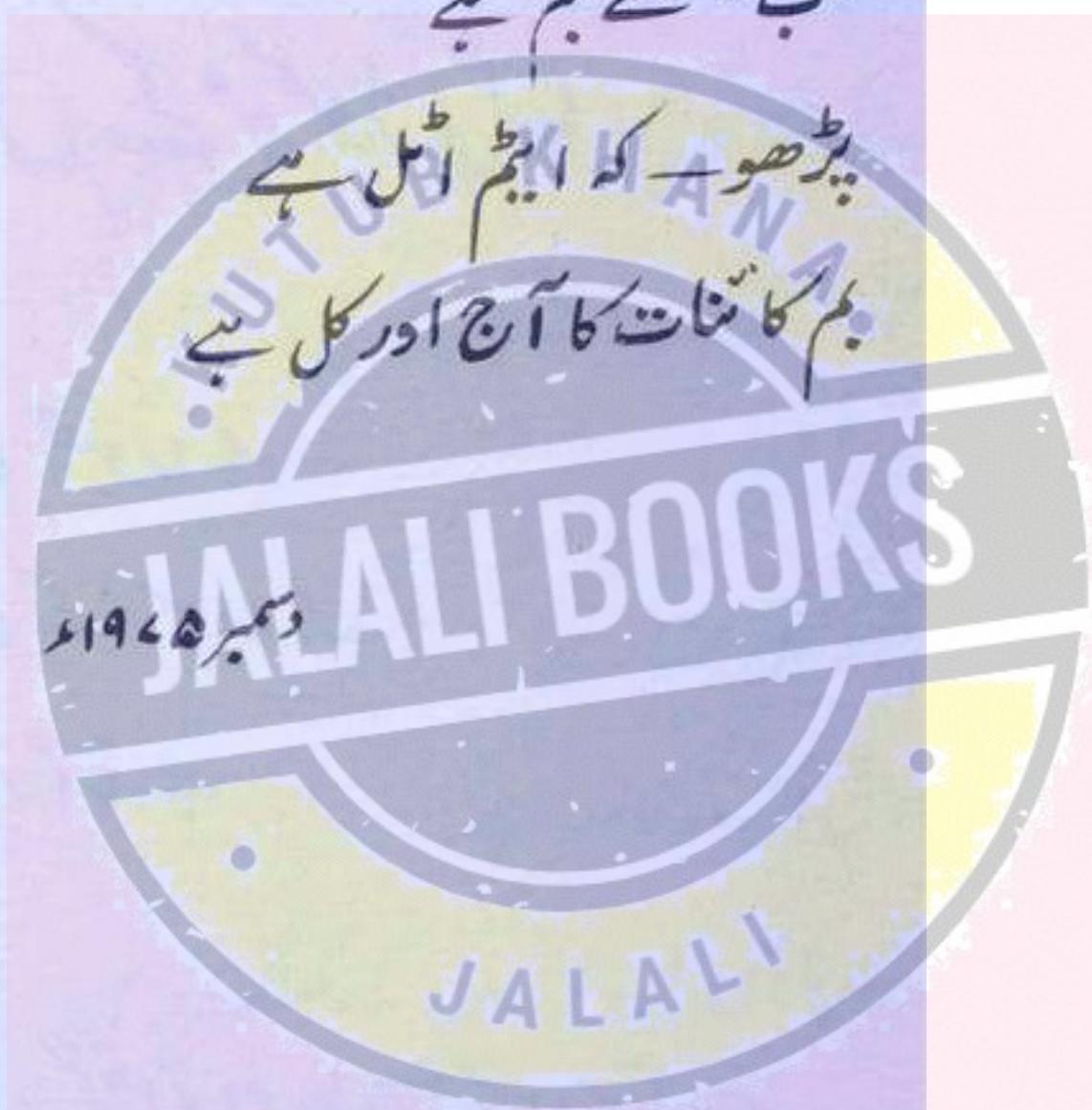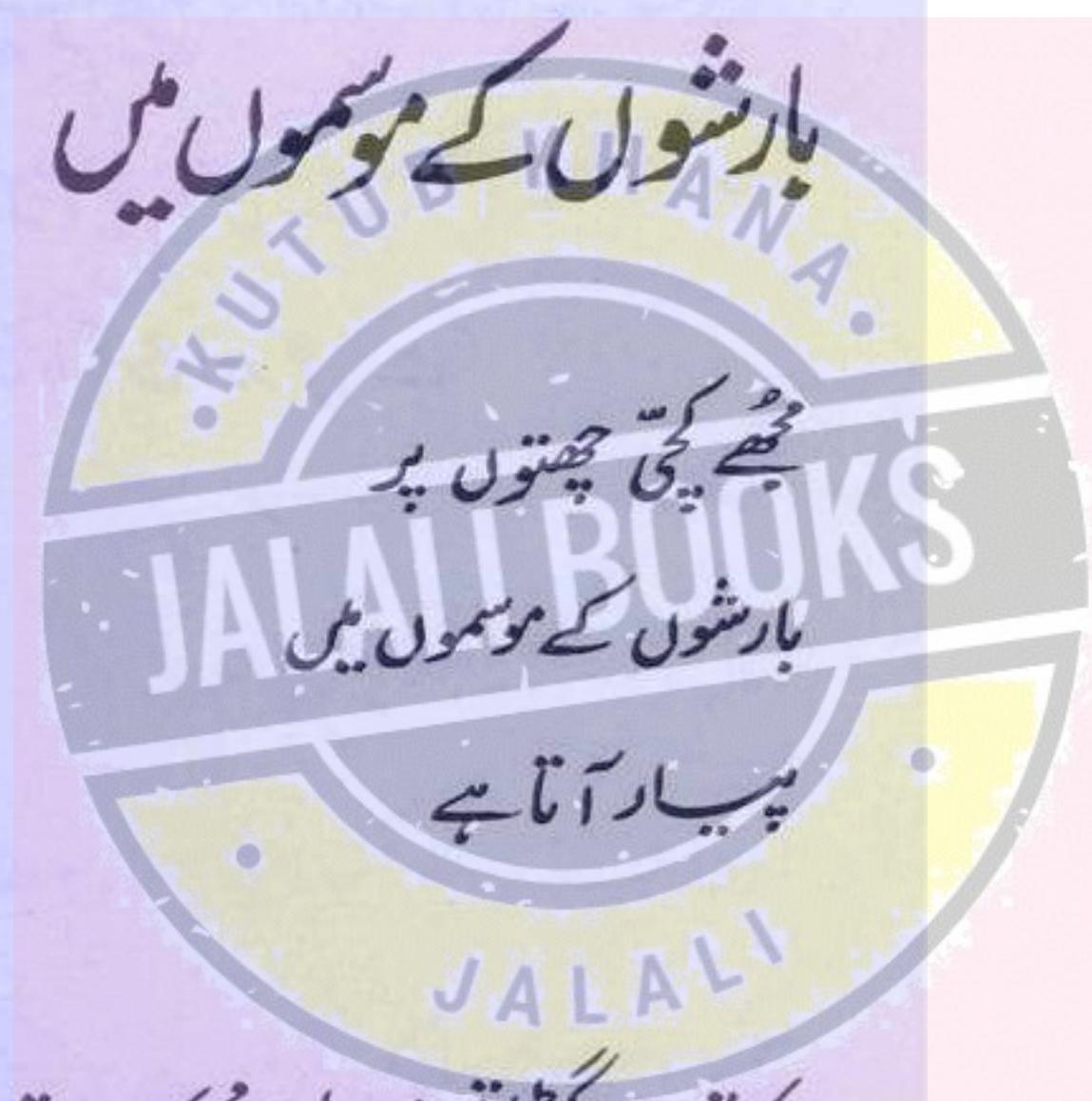
برستی ہے گھٹا تو اس طرح محسوس ہوتا ہے
عناصر — آدمی کے سامنے ہتھیار ڈالے
ہاتھ باندھے
زیرِ لب ___ شاید ___ رفاقت کے ترانے
گنگناتے ہیں!

مجھے اُس وقت یوں محسوس ہوتا ہے
کہ جیسے آسماں سے
میری چھت پر
زندگی کا درس لینے کے لیے
کمسن فرشتے اَن گنت تعداد میں اُترے ہیں
اور کل کا سبق دہراتے پھرتے ہیں

مجھے محسوس ہوتا ہے
کہ بارش ایک رقاصہ ہے
جس کے پاؤں میں بُوندوں کے گھنگھرو ہیں
وہ چھت پر
پُوری چھت پر
ناچتی پھرتی ہے
اور اُس چھت کی کڑیاں بج رہی ہیں تال دینے کو

مگر جب بارشیں، کچّی چھتوں کے ناتواں جسموں میں
اپنا زہر پھیلاتی ہیں
اور اُس آسمانی بوجھ سے شیرازۂ تعمیر کو مقراض
بن کر کاٹتی ہیں!

میں نے دیکھا ہے
کہ اُس پَل بھی
مجھے کچّی چھتوں پر پیار آتا ہے

اکتوبر ۱۹۷۵ء

تاریخ کا موڑ
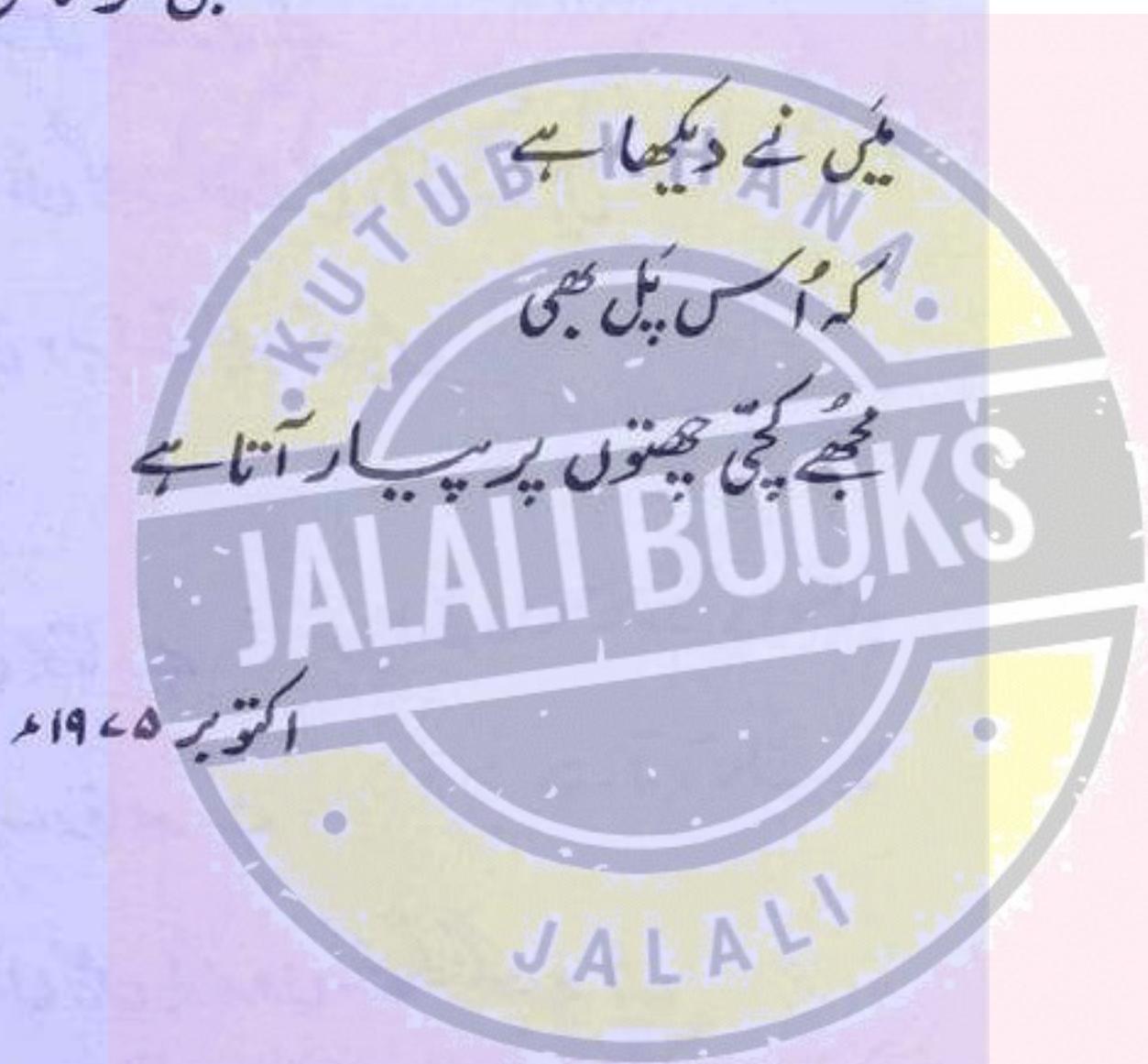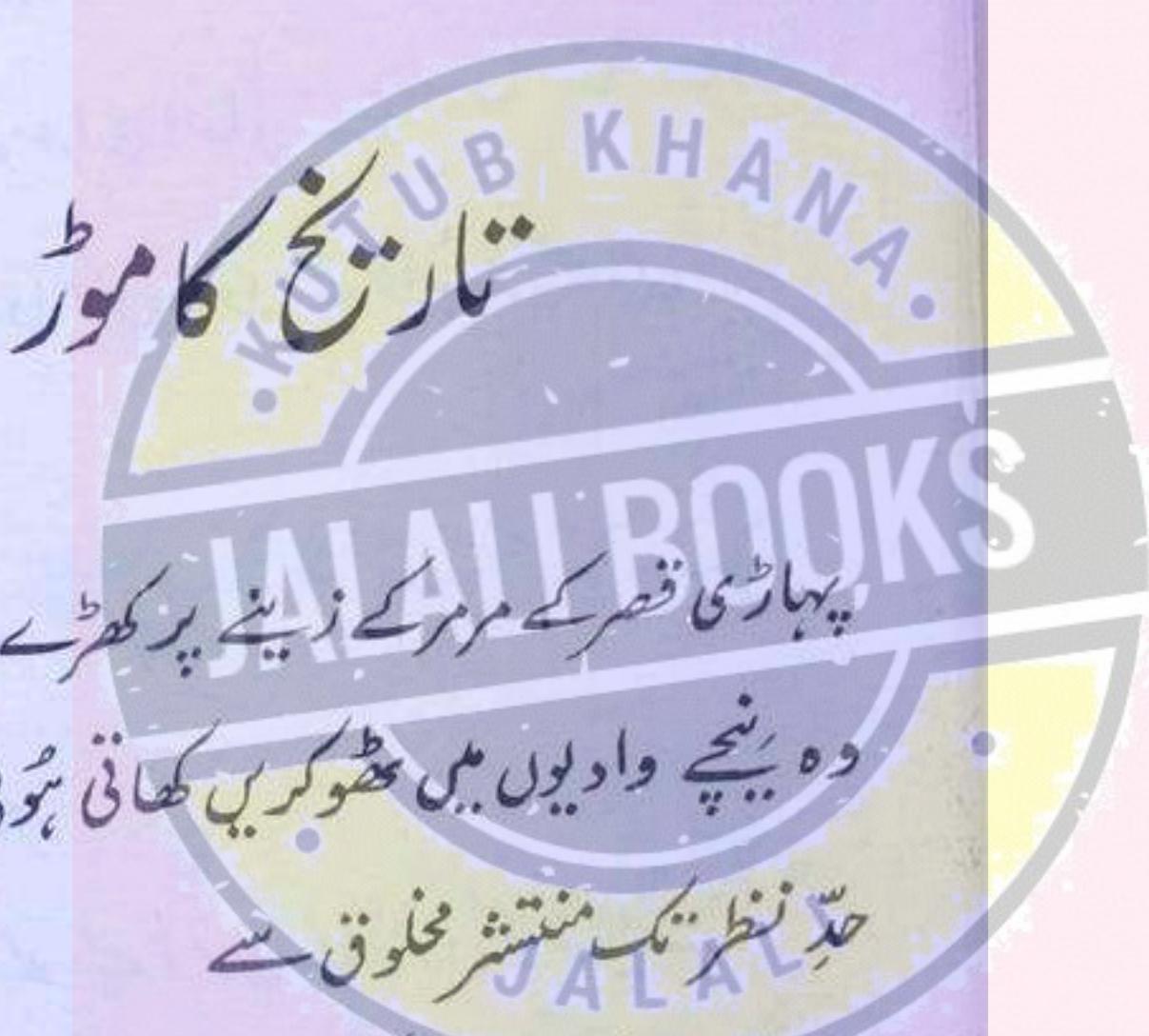
پہاڑی قصر کے مرمر کے زینے پر کھڑے ہو کر
وہ نیچے وادیوں میں ٹھوکریں کھاتی ہوئی
حدِّ نظر تک منتشر مخلوق سے
اپنی رُندھی آواز میں کہنے لگا :
"اب مملکت میں ہر طرف تہذیب کا سکّہ چلے گا
آج سے ہر آدمی اِک دیوتا ہے
محترم ہے
اور مقدّس ہے

ہماری مملکت کے پاسبانو!

قصرِ شاہی کے سنتو!

دوستو!

اِک دُوسرے کو پُوجنا سیکھو

اِسی پُوجا میں وہ معراجِ انسانی ہے

جس کے ان گنت دانش وروں نے خواب دیکھے ہیں

یہی پُوجا

یہی اِک دُوسرے سے پیار

وہ تہذیب ہے

جس کے تحفّظ کے لیے قوموں نے قوموں کو مٹایا ہے

زمیں پر ٹُوٹے پھُوٹے استخواں کا اِک عجائب گھر سجایا ہے

لہو کا

جیتے جیتے، گرم اور روشن لہو کا

مشرق و مغرب میں وہ سیلاب آیا ہے

جسے تہذیب کے الفاظ میں تاریخ کہتے ہیں

ہمارے عہدِ زرّیں میں

کئی صدیوں کی یہ قربانیاں وہ رنگ لائی ہیں

کہ اب ہر آدمی اِک دیوتا ہے

محترم ہے

اور مقدّس ہے ــــ"
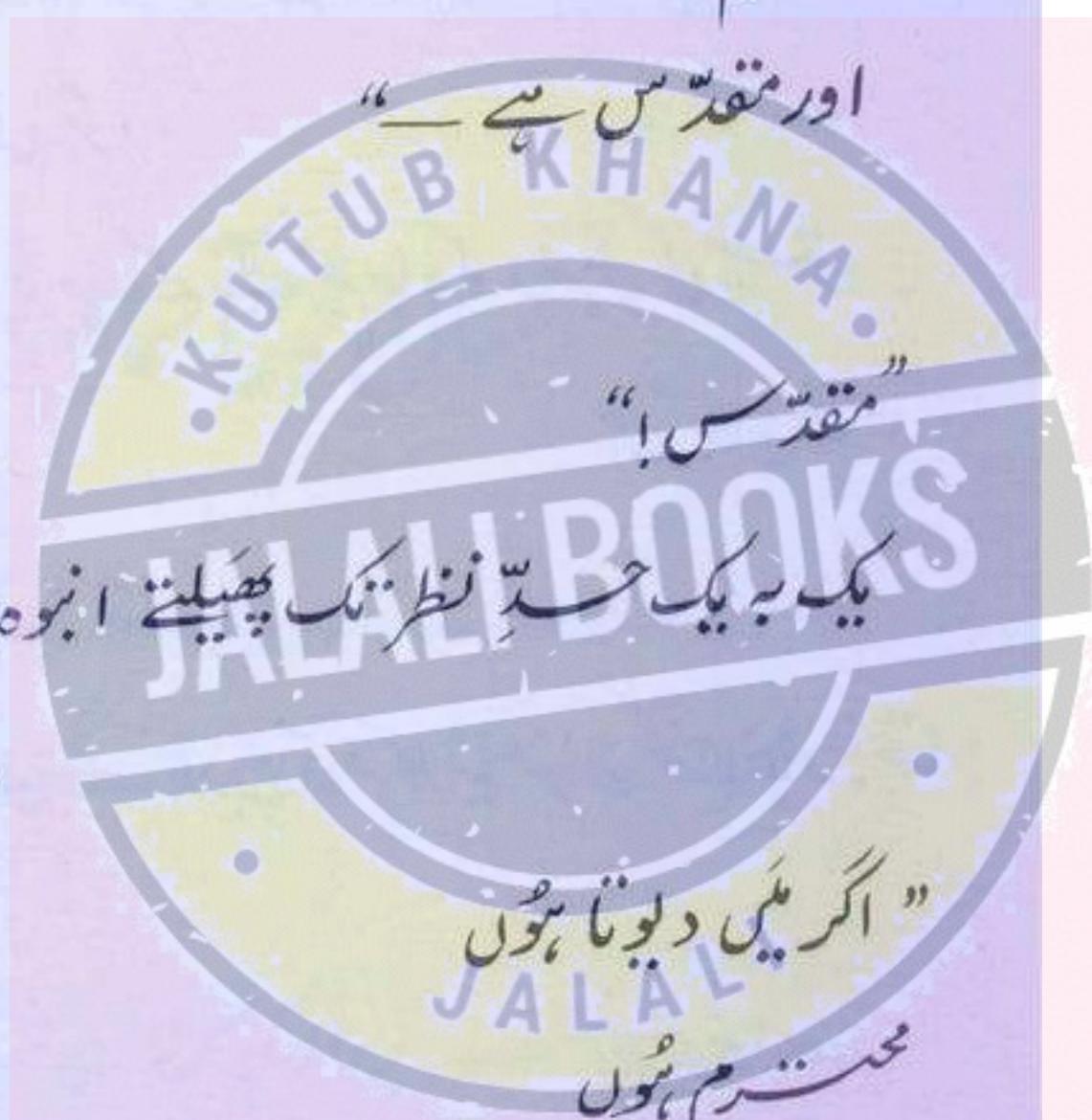
"مقدّس!"

یک بہ یک حدِّ نظر تک پھیلتے انبوہ میں سے اِک صدا آئی :

"اگر مَیں دیوتا ہُوں

محترم ہُوں

اور مقدّس ہُوں

تو اے مرمر کے زینے پر کھڑے جم جاہ!

اے تہذیب کے ماتھے کے تارے!

اے مری تاریخ کے عنواں!

بلندی سے اُتر کر مجھ کو مٹّی سے اُٹھا

اور میری پُوجا کر !"

مورّخ متّفق ہیں اور کہتے ہیں

کہ پھر کچھ یُوں ہُوا

وُہ، جس نے پُوجا کے لیے جم جاہ کو دھرتی کی پستی

میں بُلایا تھا

تڑپتا جا رہا تھا

اور اپنے خُون سے تاریخِ آدم کا نیا عنوان لکھتا جا رہا تھا !

اکتوبر ۱۹۷۵ء

اِنسان اور آسمان

کوئی ارض و سما کے راز مجھ سے کہنے لگتا ہے
سحر کا نُور جب پگڈنڈیوں پر بہنے لگتا ہے

مرا ذوقِ نظر پرواز کی کرتا ہے تیاری
اُبھرتی ہے اُفق پر جب اُفق کی نقرئی دھاری
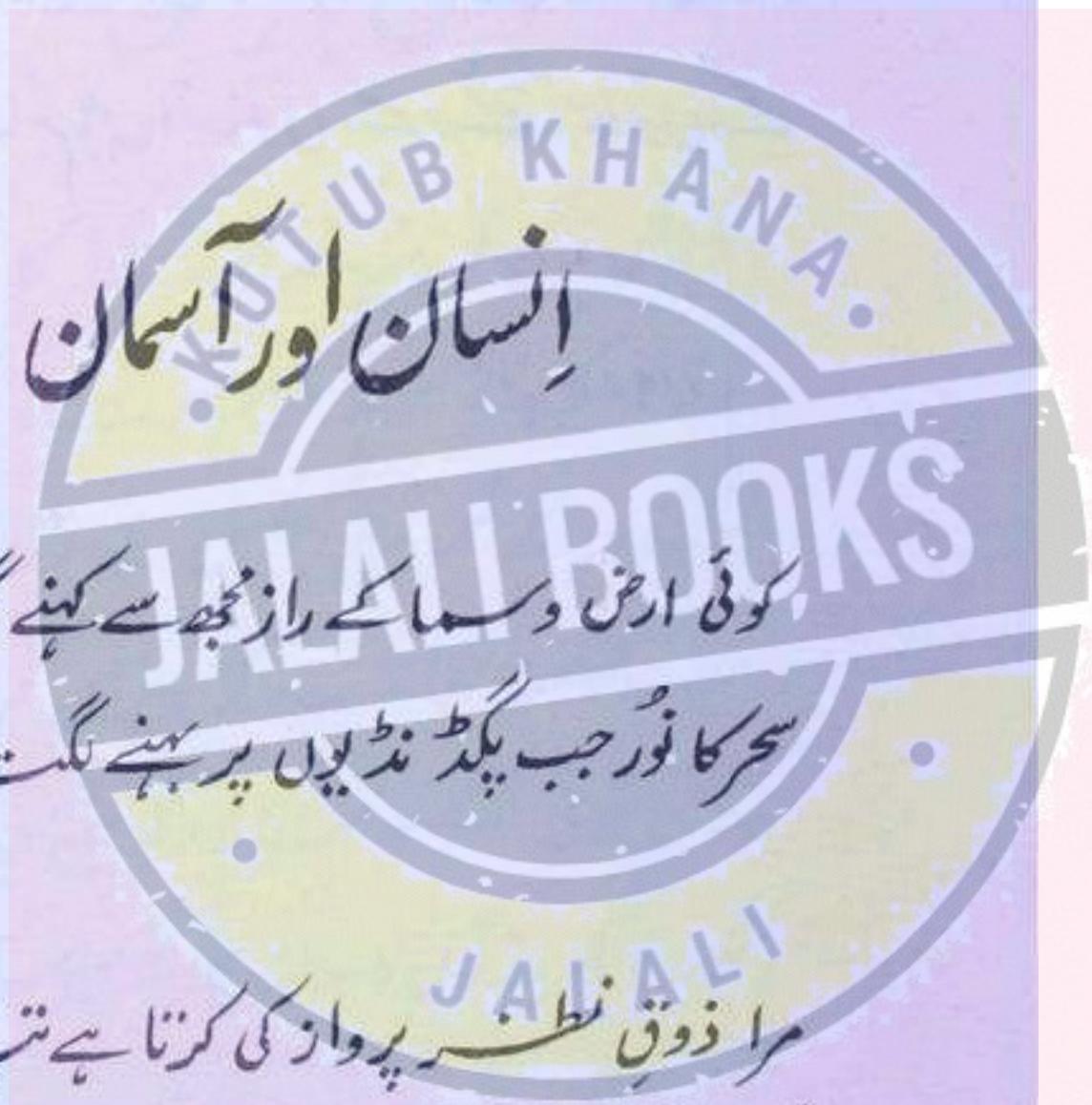
کئی یادوں کی کتنی دُلہنیں سج بن کے آتی ہیں
گھنے اشجار میں جب چھُپ کے چڑیاں چہچہاتی ہیں

رسائی حدِ امکاں سے نکل کر گنگناتی ہے
اذاں جب صحنِ مسجد سے سوئے آفاق جاتی ہے

اگرچہ درمیاں ہیں فاصلے لاکھوں زمانوں کے
ابھی قائم ہیں انسانوں سے رشتے آسمانوں کے

ستمبر ۱۹۷۵ء
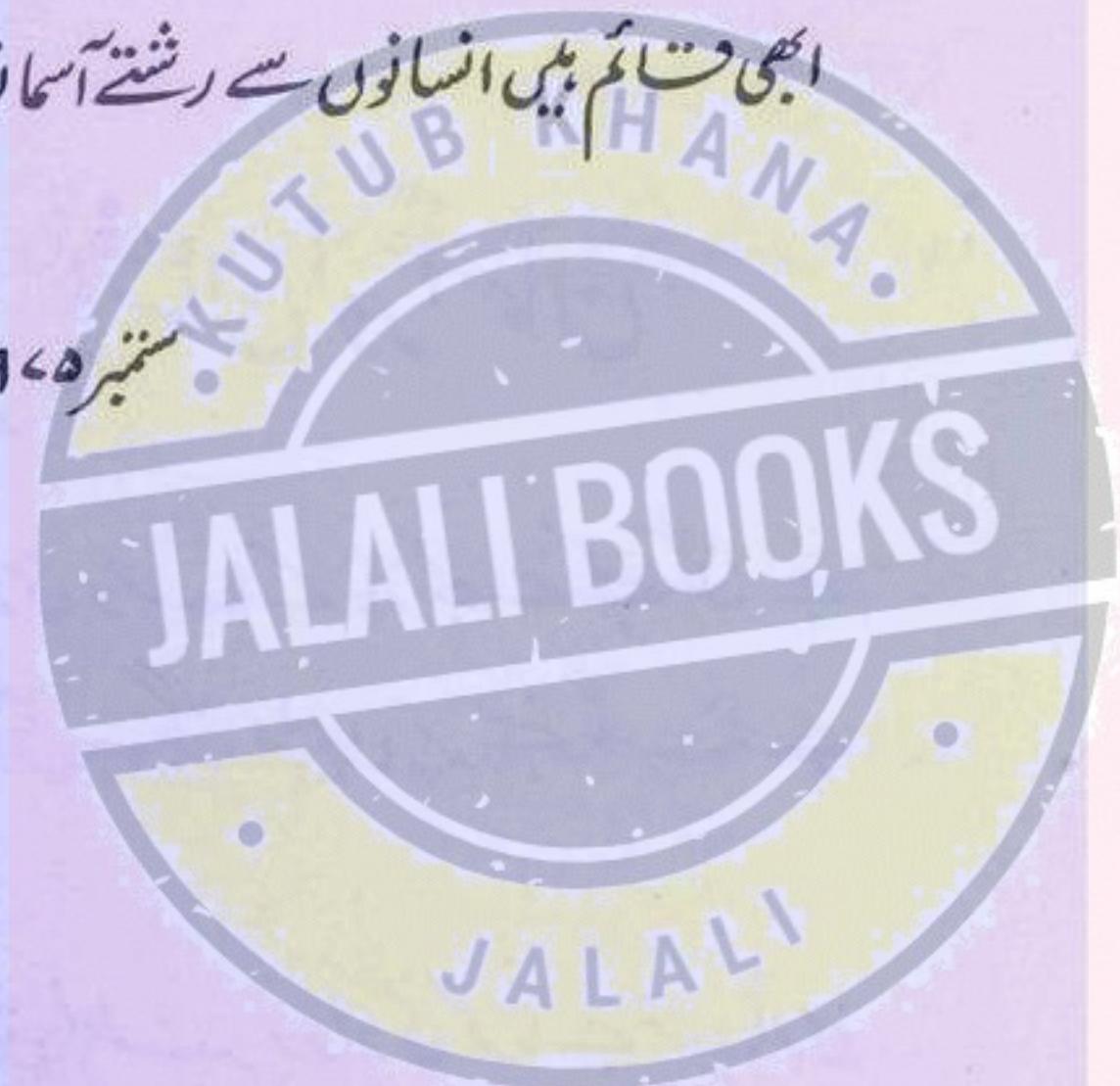
نئی بارش

بارش رُکی تو پیڑ نے تھاما ہَوا کا ہاتھ
بولا — کہ اے حسینۂ تجسیمِ صوت و رقص
بُوندوں کے نغمہ ریز تسلسل نے ٹوٹ کر
میرے شگفتہ خواب کو ویران کر دیا
رُوٹھی ہُوئی گھٹا کو منا لا، کہ مَیں غریب
سُورج کی حِدّتوں کا ہدف پھر نہ بن سکوں

کہنے لگی ہَوا — مرے ہمدم، ترا وجود
احساس ہو تجھے تو گھٹاؤں سے کم نہیں
پہروں تک ابر تجھ پہ برستا رہا، مگر
اب اس میں ایک بُوند برسنے کا دم نہیں

آئینۂ فضا میں ذرا اپنا عکس دیکھ
پتّہ وہ کون سا ہے جو اس وقت نم نہیں

یہ کہہ کے اس طرح سے چھڑایا ہوا نے ہاتھ
پیڑ ایک بُت کی طرح سے پتھرا کے رہ گیا
پھر بے بسی سے سُوئے فلک دیکھنے لگا
ناگاہ اِک لطیف سے جھونکے سے، برگ برگ
خود اپنے پیڑ کی بشریّت پہ ہنس پڑا
بُوندوں کا اِک ہجوم زمیں پر برس پڑا

اگست ۱۹۷۵ء

شاعری

کِتنے انوکھے شاعر ہو
ماں سے بھی نفرت کرتے ہو
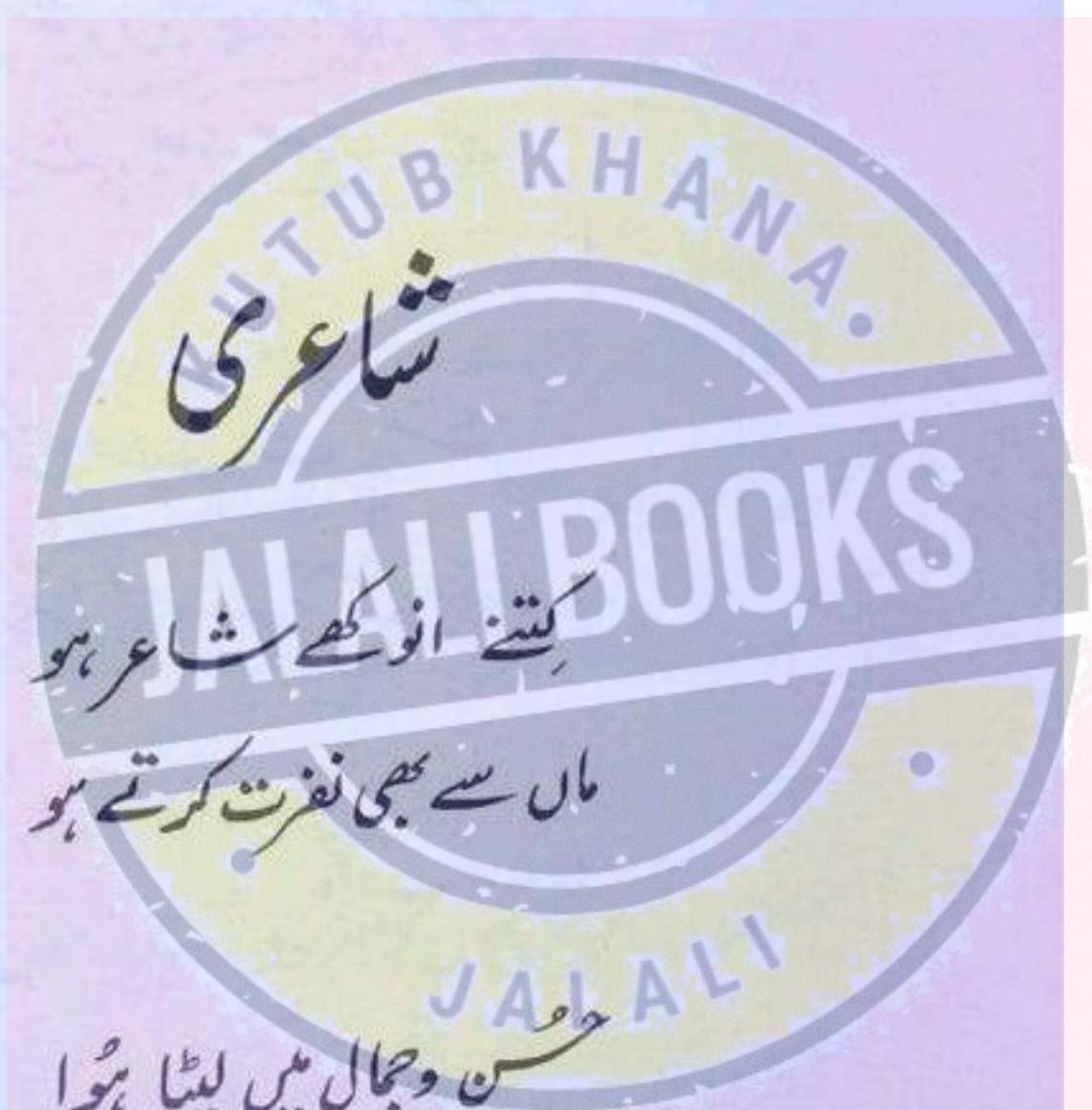
حُسن و جمال میں لپٹا ہُوا
جب کوئی منظر دیکھتے ہو

کِتنی عجیب رعونت سے
اپنے شعر میں کہتے ہو:

سبزہ ، پھول ، ندی ، بادل
سب کچھ غیر یقینی ہے

خوشبو روشن روشن ہے
روشنی بھینی بھینی ہے

کتنا لطیف ہے یہ منظر
کتنا غیر زمینی ہے

اگست ۱۹۷۵ء
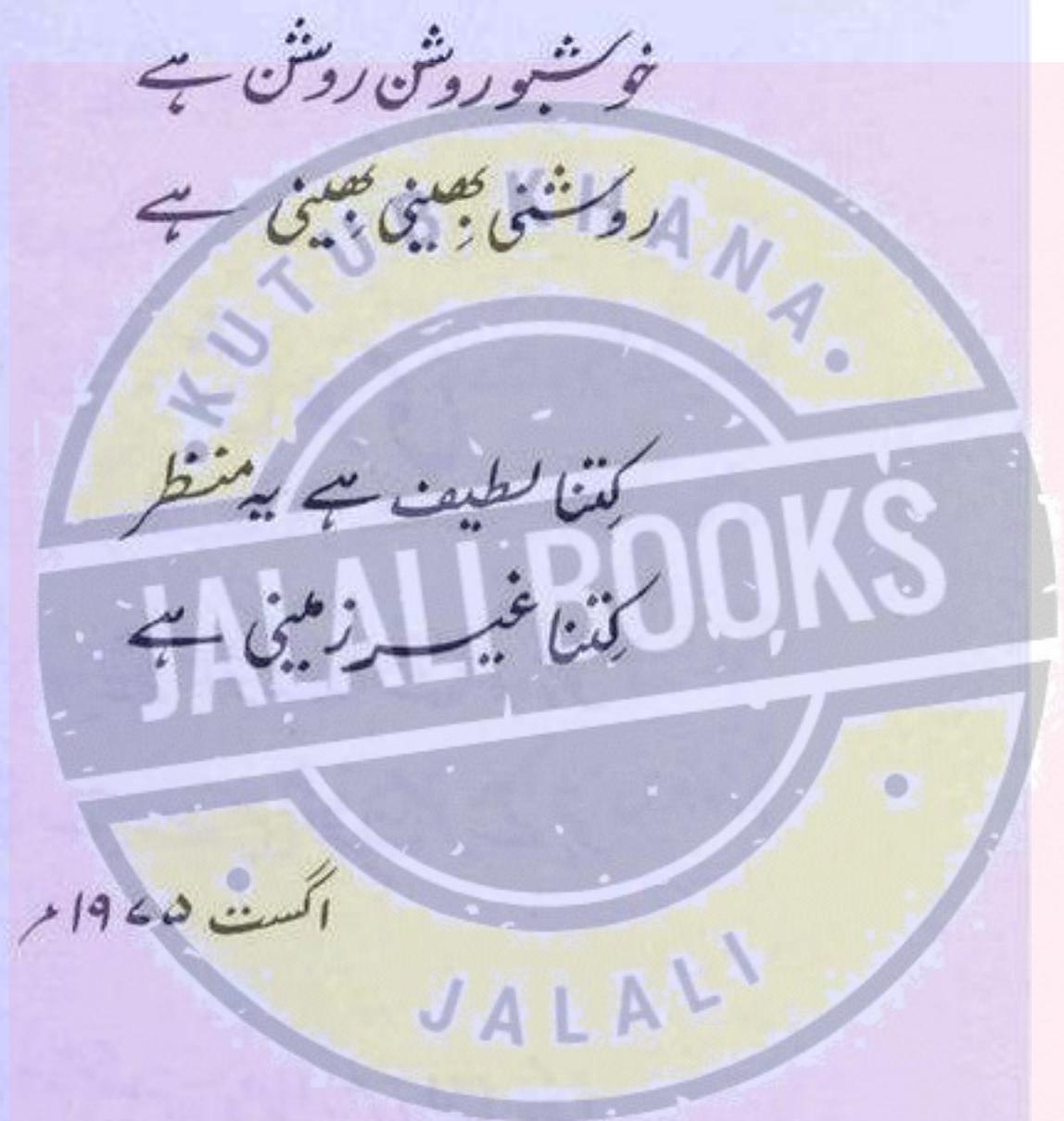
کیا ہُوا!

اس نے کہا کہ میری طبیعت پہ بوجھ ہے
مَیں سوچنے لگا کہ خدا جانے کیا ہُوا!

اِتنی سی سوچ سے مری دُنیا بدل گئی
وہ حُسن جو ابھی سرِ راہے نظر پڑا
کیسا لُٹا لُٹا یا کھنڈر سا مجھے لگا

آنکھوں کے نیل ہوں کہ بھنوؤں کے حریم ہوں
گالوں کی روشنی ہو کہ بالوں کی تیرگی
سینے کے عزم ہوں کہ بدن کی امنگ ہو

سب لفظ اپنی دولتِ مفہوم کے بغیر
پانی میں جیسے عکس ابابیل کا پڑے

جولائی
۱۹۷۵ء

محنت کش لڑکیاں

(کھیتوں میں کام کرنے والی چینی لڑکیاں دیکھ کر)

یہ لڑکیاں ہیں، تو خیّاط نے لباس اُن کا
کہیں سے بھی تو دبایا نہیں، اُبھارا نہیں

ڈھنپی ہوئی ہیں کچھ ایسے کہ ناریل جیسے
جسے شجر سے کسی ہاتھ نے اُتارا نہیں،

تمام رس ہے، مگر ذائقے کو کیا معلوم!
کوئی اشارہ نہیں، کوئی استعارہ نہیں

سمندروں کی سی آنکھیں، ستاروں کی سی جبیں،
مگر یہ حُسن تو آئینہ دیکھتا ہی نہیں!

چلیں تو اپنی اَنا کا حصار کھینچتی جائیں
جھکیں تو جیسے زمیں پر فلک کا فرش بچھائیں

لبوں پہ رنگ ہیں کوئی، نہ رُخ پہ غازے ہیں
یہ لڑکیاں ہیں کہ تاریخ کے تقاضے ہیں!

جون ۱۹۷۵ء

خدا سے ایک سوال

تمام عمر، کسی کوزہ گر کے چاک پہ، ہم
بگڑتے بنتے رہے، صُورتیں بدلتے رہے

تمام عمر سرِ راہِ انتظارِ جمال
چراغِ عشق بنے، تیرگی میں جلتے رہے

تمازتوں سے جگر بھُن گئے، مگر ہم لوگ
سروں پہ برف کے تودے اُٹھائے، چلتے رہے

ہماری موت میں بھی جشن کے سے تیور تھے
مثالِ شمع چمکتے رہے، پگھلتے رہے

تمام عمر محبّت کا احترام کیا
تمام عمر بہشتوں سے ہم نکلتے رہے

الٰہی! یہ تری حکمت بھی، تیرا راز بھی ہے
مجھے بس اتنا بتا — اس کا کچھ جواز بھی ہے

مارچ ۱۹۷۵ء

فصیل

مکمل ہو گئی دیوار، تو معمار بولا :

اے مرے ہم قوم لوگو !

یہ فصیلِ شہر ہے
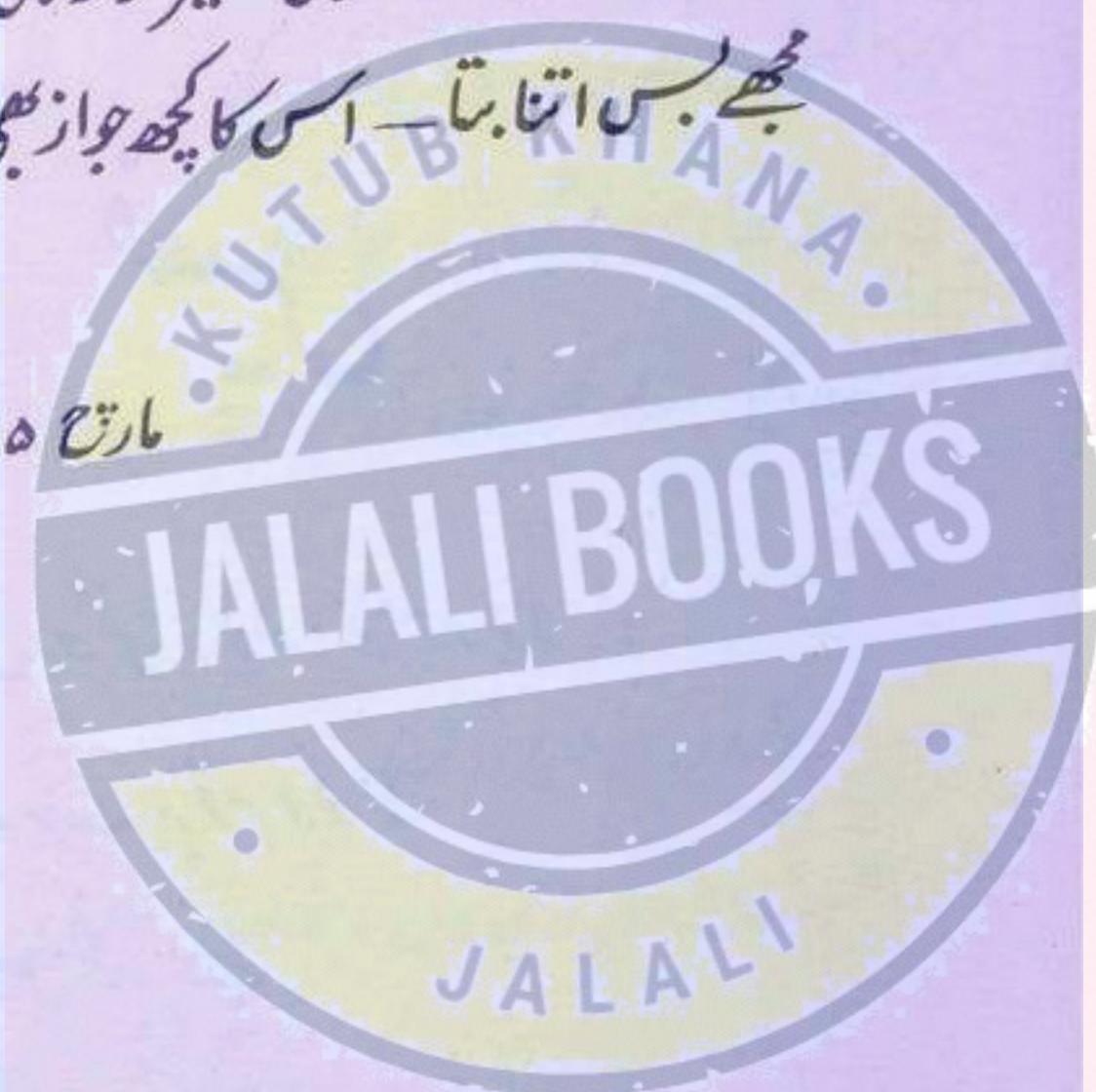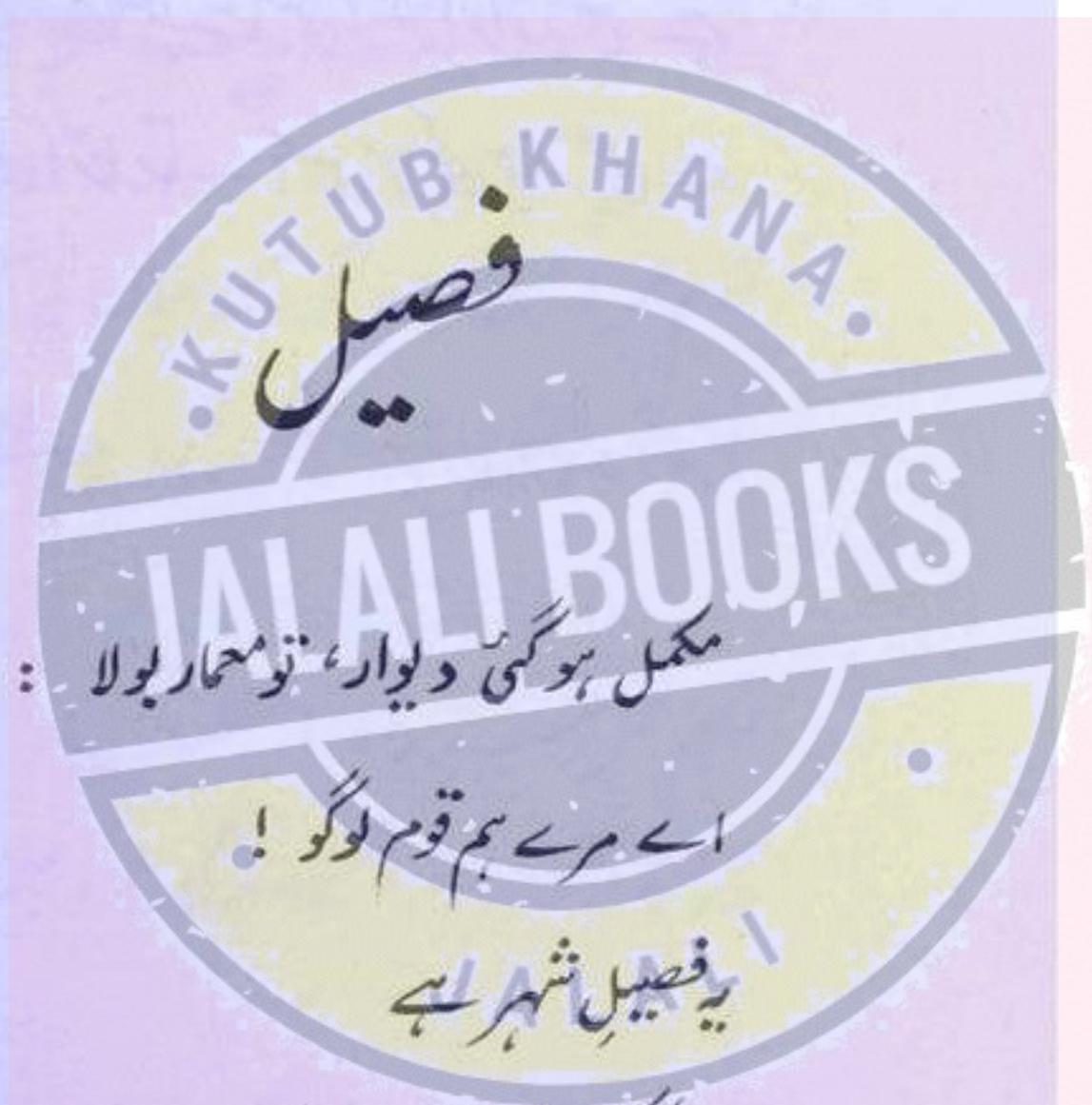
یہ سنگ و آہن سے بنی ہے

اور اس بے لوث خادم کا لہو بھی

اس میں شامل ہے !

مَیں تم سے کچھ نہیں مانگوں گا

صرف اِک چیز مانگوں گا

فقط اِک توپ

جو دیوار پر رکھ کر سُوئے دشمن چلانی ہے

مُجھے اس کے لیے ، تم سے

تمھاری بیویوں کے زیوروں کی

اور تمھاری بیٹیوں کی چادروں کی

اور بچّوں کے کھلونوں کی ضرورت ہے

کروڑوں چادریں اُتریں

ھزاروں زیوروں ، لاکھوں کھلونوں میں

وہ گھِر کر رہ گیا ،

پھر یُوں ہُوا ــــ

اُوپر فضا سے ، ایک چڑیا یک بیک

دیوار پر اُتری ،

توسب کچھ ڈھیر تھا !

اور قوم کے ایثار کے انبار پر معمار چڑھ کر

سوچتا تھا

— جب شکستہ ہو چکی دیوار

پھر دشمن، پسِ دیوار، کیوں محتاج ہے

میرے اشارے کا!

جنوری

۱۹۷۵ء
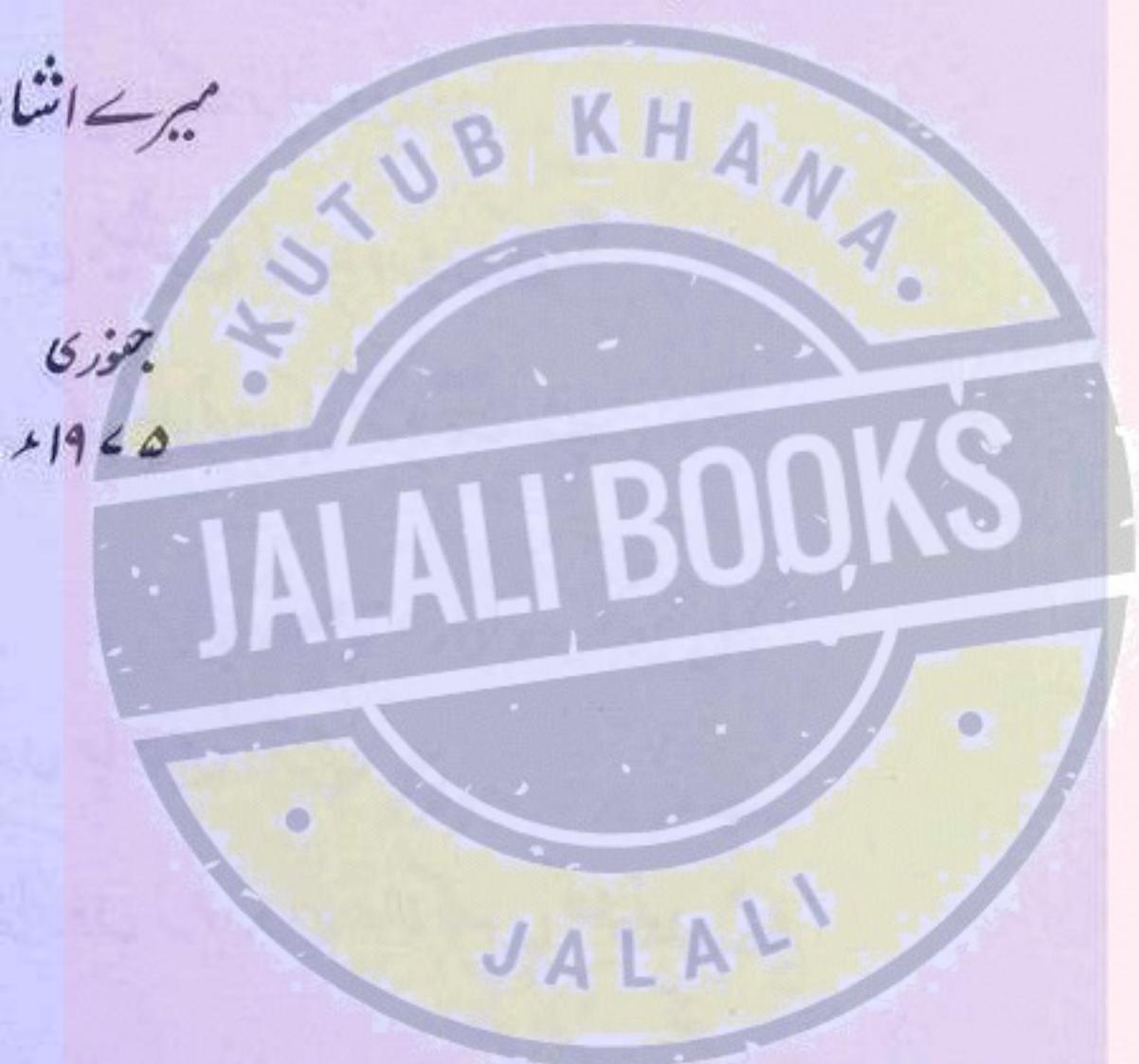
کھیل اور کھلونا

کھلونے سے اگر وہ کھیلتے رہنے کی ضد کرتا ہے
اُس کو کھیلنے دو
کھیلنے کے دن یہی ہوتے ہیں
جب بچے کو صرف اِک پھول مل جائے تو پورے باغ کی تضحیک
کرتا ہے
ذرا سا ایک کانٹا اُس کی نازک جِلد کے خلیے کو مس کر لے
تو وہ اس طرح چِلّاتا ہے
جیسے چھلنی چھلنی ہو چکا ہے
وہ اگر کہتا ہے — دانائی پہ صرف اُس کا اجارہ ہے
تو سچ کہتا ہے

دانائی کا رقبہ مختصر ہو تو اجارے کا کوئی دعویٰ بھی ناجائز نہیں ہوتا

یہ اُس کے کھیلنے کے دن ہیں

اُس کو کھیلنے دو

وقت آئے گا

کبھی کانٹوں پہ ننگے پاؤں چل کر، دشت کے پرلے اُفق پر

کِھلنے والے پھول کی جانب

ابد تک بڑھتا جائے گا!

مگر اس کی جبیں پر بل نہ آئے گا

کبھی تاریخِ آدم کی سبھی دانائیاں سینے میں بھر کر بھی

اُسے اُس کا تجسّس اِک نئی دانائی کا پیکر دکھائے گا

کھلونا خود بخود ہی ٹوٹ جائے گا

دسمبر ۱۹۷۴ء

افریقہ

دھرتی نے بدل لیا ہے محور
صحراؤں پہ برف گر رہی ہے
قطبین پہ ریت اُڑ رہی ہے
یورپ کے اُفق پہ — لڑکھڑاتی
اِک فوج سیاہ سُورجوں کی
گِر گِر کے غروب ہو رہی ہے
شب رنگ جبینِ افریقہ سے
اِک صُبح طلوع ہو رہی ہے
حبشی نے زمیں کی باگ تھامی
اعزاز بنی سیاہ فامی

دسمبر ۱۹۷۴ء

دِن آ گئے

دب کے رہنے کے دن جا چکے
کچھ نہ کہنے کے دن جا چکے
وار کرنے کے دن آ گئے
وار سہنے کے دن جا چکے
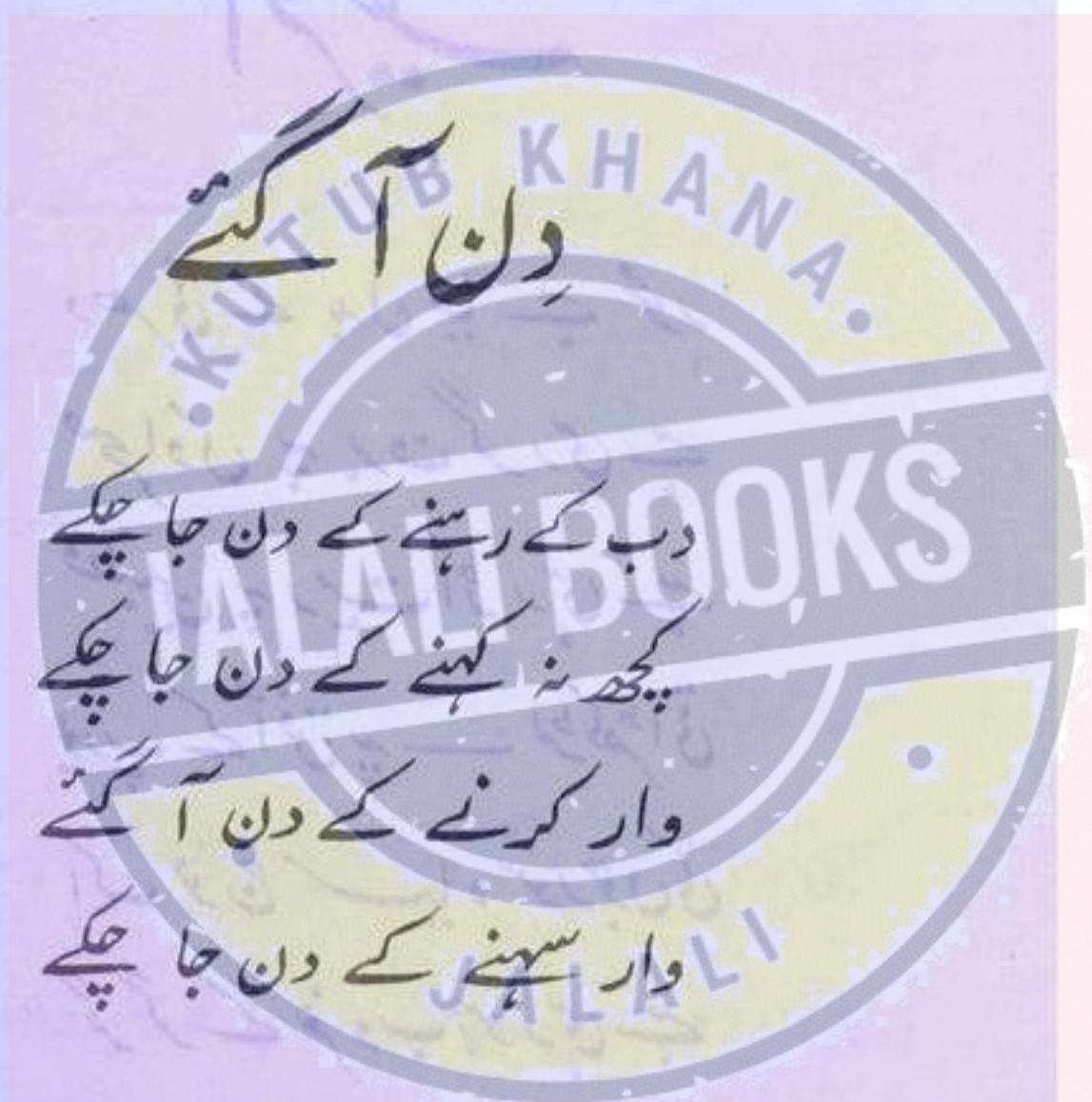
اب تو قدریں پگھلنے لگیں
اور معیار گلنے لگے

جو جواہر لہو سے ڈھلے
مٹھیوں سے پھسلنے لگے

جن کے ہاتھوں میں ہتھیار تھے
اب وہی ہاتھ ملنے لگے

اب تو سورج اُترنے لگا
اور سائے تو ڈھلنے لگے

اب تو پتھّر بھی مُڑنے لگا
اب تو پربت بھی چلنے لگے

گرم صحراؤں کی کوکھ سے
سرد چشمے اُبلنے لگے
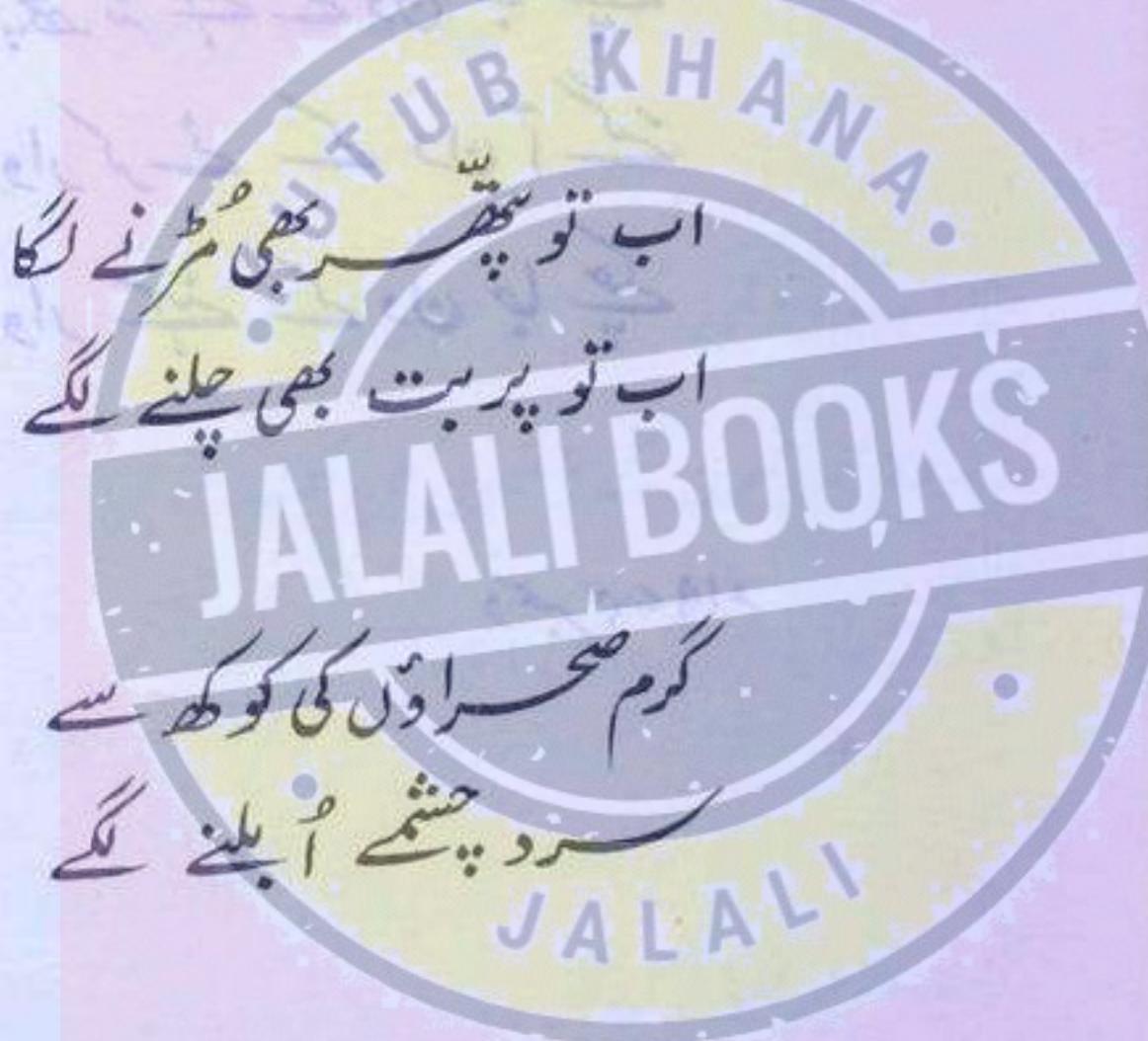
جو دِلوں میں چھُپے تھے دِئے
اب تو آنکھوں میں جلنے لگے

وقت پیچھے کہیں رہ گیا
لوگ آگے نکلنے لگے

اُوپر اُوپر کا کیا تذکرہ
اندر اندر بدلنے لگے

دب کے رہنے کے دن جا چکے
کچھ نہ کہنے کے دن جا چکے
وار کرنے کے دن آگئے
وار سہنے کے دن جا چکے

دسمبر ۱۹۷۴ء

عرفان کا حادثہ
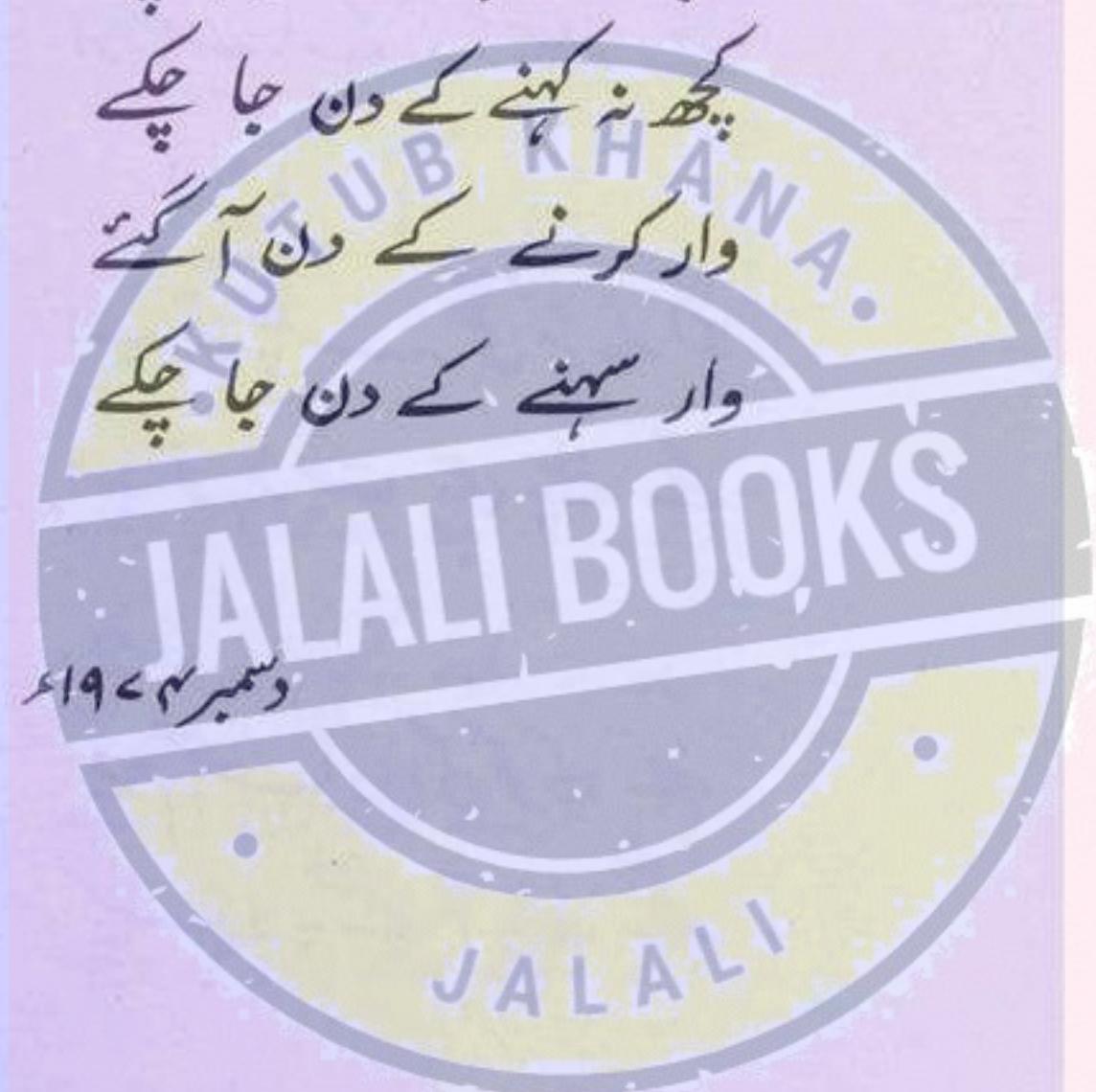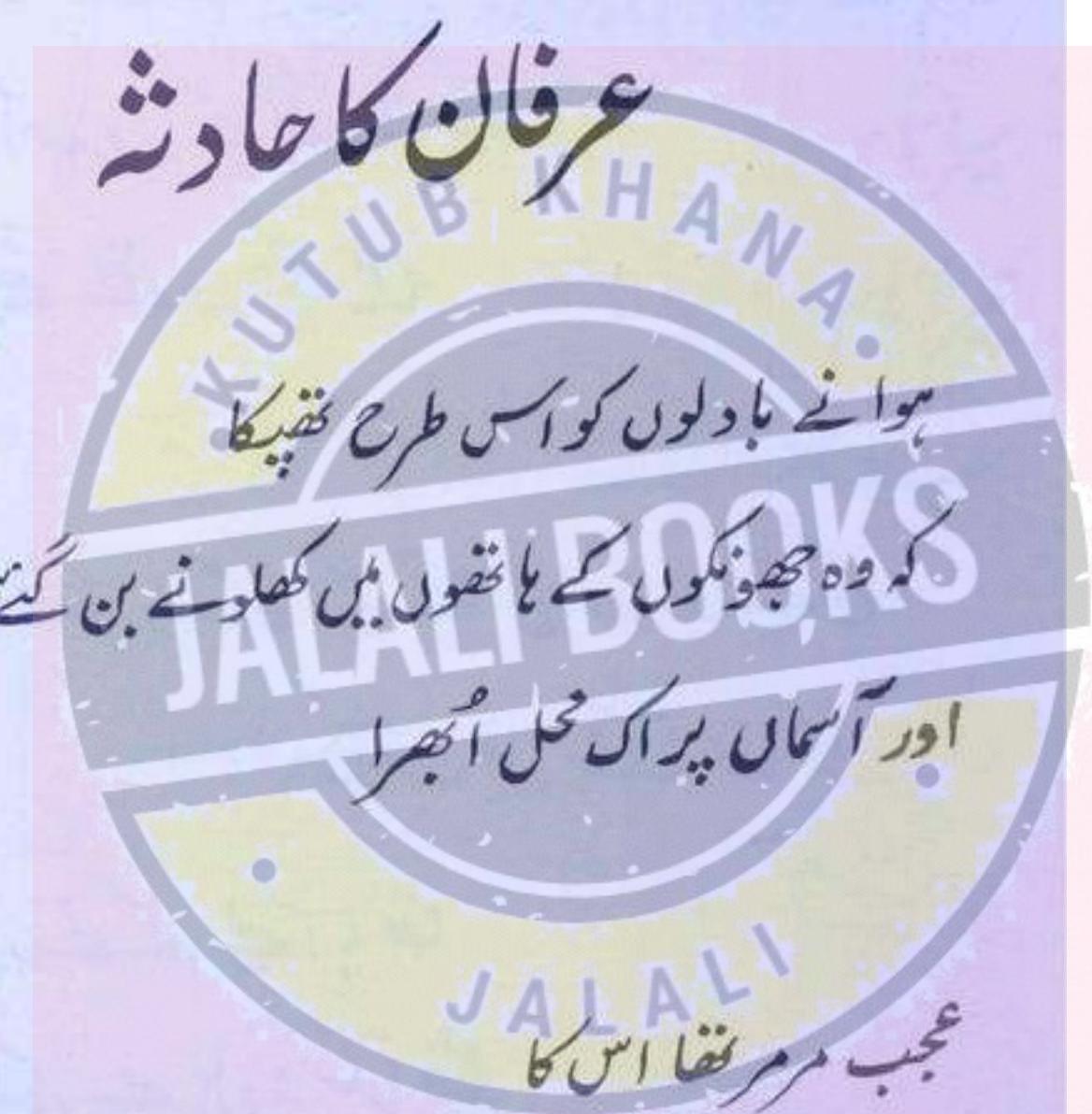
ہوا نے بادلوں کو اس طرح تھپکا
کہ وہ جھونکوں کے ہاتھوں میں کھلونے بن گئے
اور آسماں پر اک محل اُبھرا
عجب مرمر تھا اس کا
جس پہ سُورج کی شعاعوں کی بنت شہکارِ فن تھی
صدر دروازہ مقفّل تھا
محل کی ساتویں منزل پہ لیکن
اِک دریچہ وا نظر آیا

ابھی یہ چوکھٹا تصویر سے محروم تھا

لیکن دریچے سے اُدھر، اِک پیکرِ رنگین کا سایہ سا، ہیولا سا

اِک آئینے میں جیسے محوِ آرائش تھا

لمحے — جن کو مستقبل میں آنا تھا

ابھی سے کتنی اُمیدوں کے گلدستے لیے

سج بن کے بیٹھے تھے دریچے میں

میں اپنی سانس روکے، آئینے کی اور دریچے کی

مسافت میں بھٹکتا تھا!

وہ لمحہ جو گزرنے کے لیے آیا تھا

میری ٹکٹکی سے ہل نہ سکتا تھا

سرِ دیوار اِک بلّی، گلہری پر جو جھپٹی

میں نے دیکھا — اور فقط پل بھر کو دیکھا

پھر پلٹ کر آسماں پر جب نظر ڈالی

تو مرمر کا محل ٹوٹا پڑا تھا

اور ہوا نے ، وا دریچے سے گزر کر، اس کی دیمک خوردہ

دیواروں پہ

ماتم کے لیے اُٹھی ہوئی اُنگلی سے

میرا نام

تیرا نام

سب کا نام لکھا تھا

دسمبر ۱۹۷۴ء
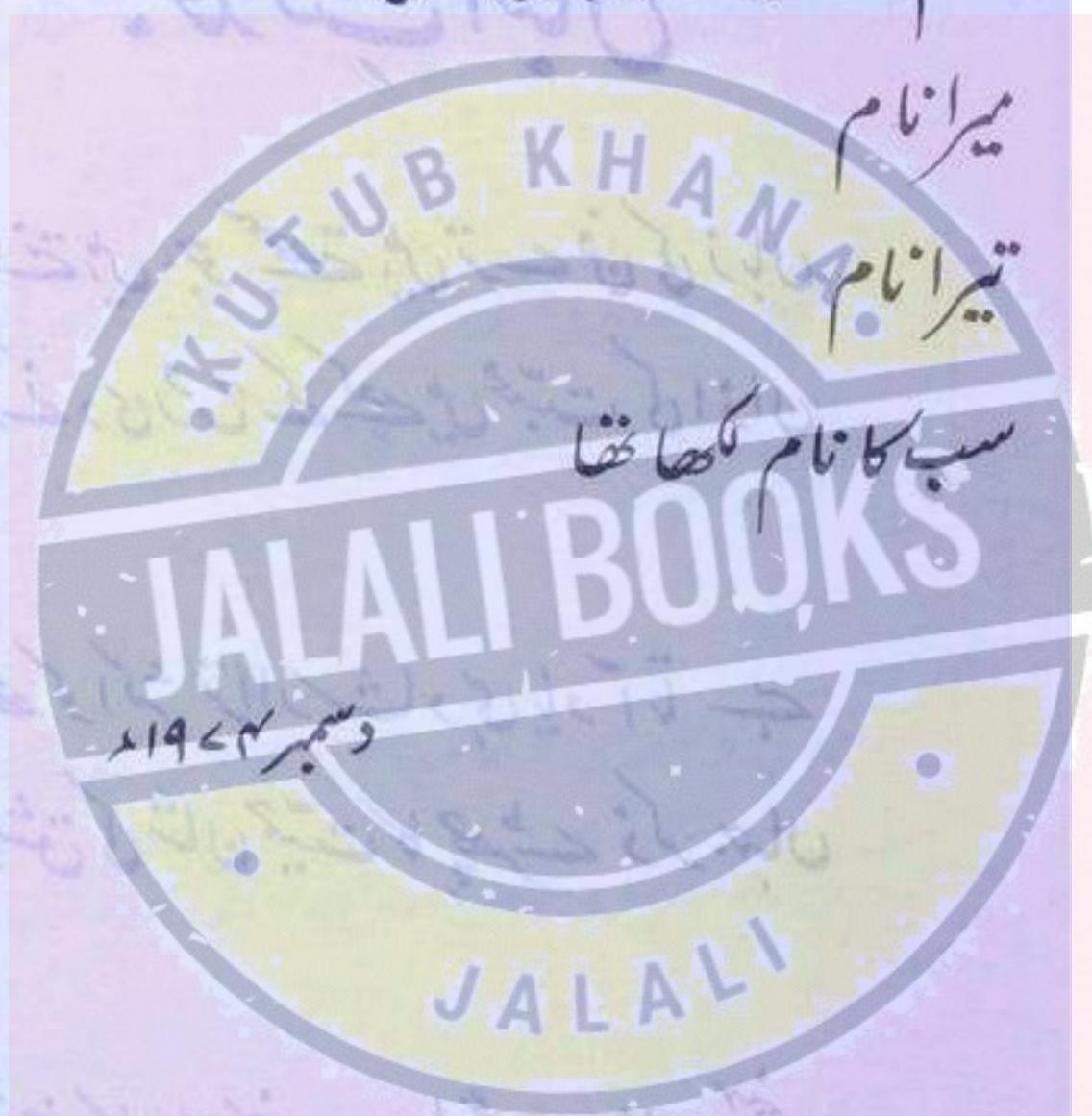
بخدمتِ اقبال

جانتے ہیں، جو سمجھتے ہیں ترے فن کی زباں
تُو نے دی رُوح کے کعبے میں محبّت کی اذاں

مجھ کو اکثر ترا ارشاد ہی یاد آتا ہے
عِشق کی شان، محبّت کا چھِڑے ذکر جہاں

آخرِ کار سرِ منزلِ عرفاں پہنچی
تیری چٹکی میں تھی جس ناقۂ دوراں کی عناں

چمک اُٹھتی ہے بلندی پہ تری پیشانی
جب کبھی پھیلنے لگتا ہے نشیبوں میں دھواں

جیسے شاخوں کا نمو، دھوپ میں گل بنتا ہے
خالقِ حسنِ بہاراں، ترا قلبِ سوزاں

جس قدر اُمّتِ مسلم پہ کرم ہیں تیرے
اتنے ہی ملّتِ آدم پہ ہیں تیرے احساں

عہدِ فردا میں جو تاریخ لکھی جائے گی
تیرے شعروں سے چُنے جائیں گے اس کے عنواں

رومی و سعدی و غالب ہیں تری گونج سی ہے
جیسے صدیاں تجھے پانے میں رہیں سرگرداں

مجھ کو دعوئ ہے، کہ اس دَور کا شاعر ہوں، مگر
شعر کہتا ہوں تو یاد آتا ہے تیرا فرماں

"بر کش آں نغمہ کہ سرمایۂ آب و گلِ تست
اے ز خود رفتہ تہی شو ز نوائے دگراں" (اقبال)

نومبر ۱۹۷۴ء

لڑکیو!

لڑکیوں کے نام تو پیارے ہیں
لیکن صورتوں پر حسرتیں ہیں!

ان کی آنکھوں میں گھنی گہرائی ہے
لیکن یہ گہرائی فقط تنہائی ہے!

اور ان کے ہونٹوں پر جو روغن ہے
وہ پپڑایا ہوا بنجر چھپانے کا جتن ہے

لڑکیو!

تم نوجواں ہو
اور شادابی کی اِک ایسی علامت ہو

جو مٹ جائے تو پوری کائنات اِک ایسے سنّاٹے میں گھِر جائے

فرشتوں کو بھی جس میں اپنا دم گھٹتا ہُوا محسوس ہوتا ہو

تمھیں کیا ہو گیا ہے، لڑکیو!

بے بات کی باتوں پہ ہنس دینے کی دولت کیوں گنوا بیٹھی ہو؟

پھولوں کو ادا سے توڑنے اور بے خیالی میں مَسل دینے کی عادت

کیوں بھلا بیٹھی ہو؟

تم کس سوچ میں گُم ہو؟

مسلسل سوچتی — اور اپنی سوچوں سے ہراساں لڑکیو!

اِک پَل اِدھر آؤ

مری آنکھوں سے دیکھو اپنی دُنیا کو

زمیں بھیگی ہُوئی ہے

آسماں نیلا ہے

سُرخ اور سبز رنگت کے پرندے اُڑ رہے ہیں
جھاڑیاں پھُولوں سے لدکر جھُومتی ہیں
تیز جھونکے، سربلند اشجار کے پتّوں کے پہلو گدگداتے ہیں
تو پتّے ہنستے ہنستے ٹوُٹ جاتے ہیں !

ابھی کچھ وقت ہے
سُورج کے ڈھلنے میں ابھی دو چار پَل ۔۔ دو چار صدیاں
اب بھی باقی ہیں

نومبر ۷۴ ۱۹ء

تحریر

ہوا لہروں پہ لکھتی ہے تو پانی ریت پر تحریر کرتا ہے
کہ ہم فرزندِ آدم کی طرح سب نقش گر ہیں
اہلِ فن ہیں
زندگی تخلیق کرتے ہیں
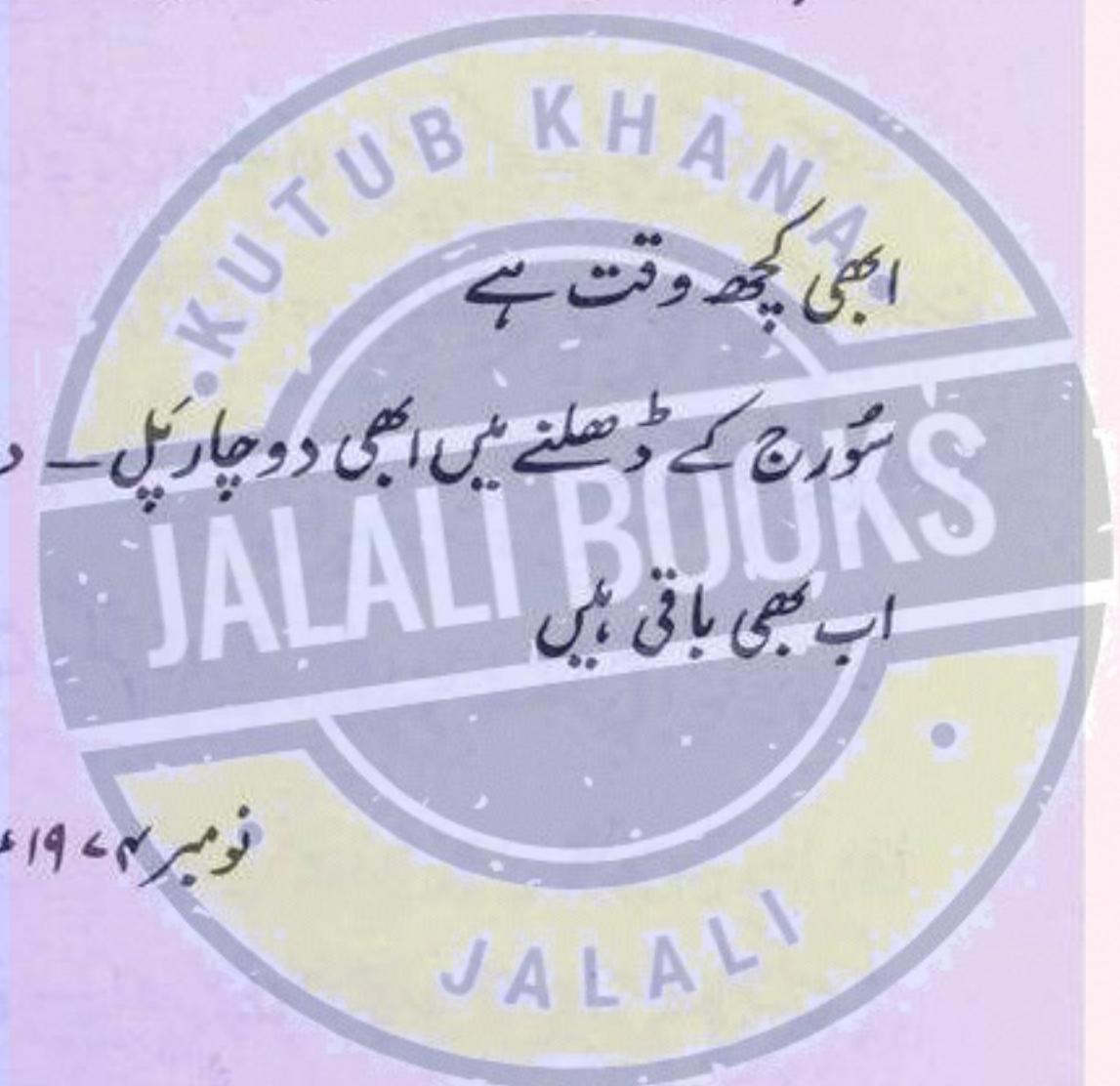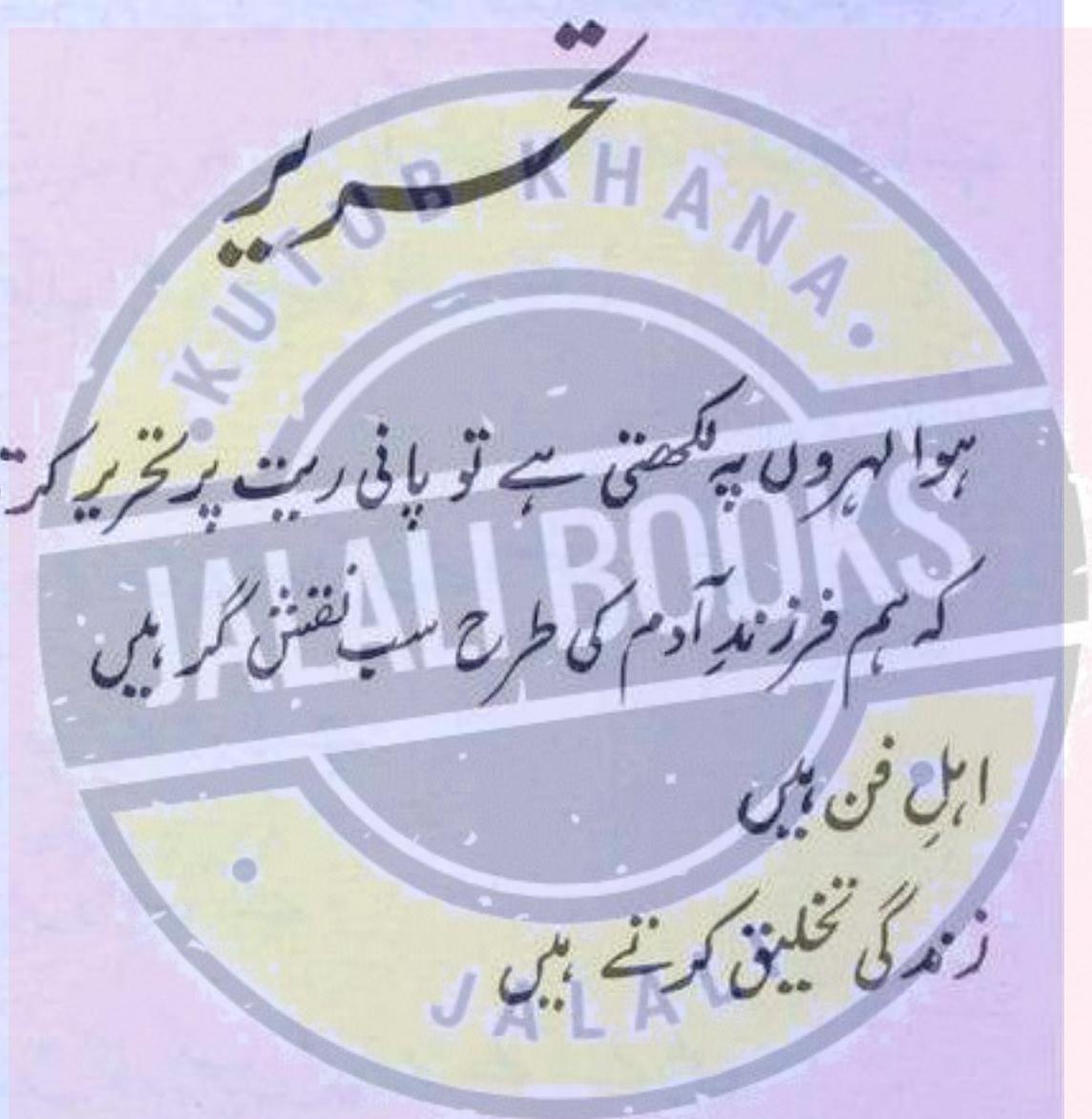
ستارہ ٹوٹ جاتا ہے
مگر بجھنے سے پہلے اپنی اُس جگمگ عبارت سے فنا پر
خندہ زن ہوتا ہے
— میں مٹ کر بھی آنے والے لمحوں میں درخشاں ہوں —

جو پتّہ شاخ سے گرتا ہے

قرطاسِ ہوا پر، دائروں میں لکھتا آتا ہے

کہ شاخوں پر تڑپنے دوستو!

اگلی بہاروں میں مجھے پھر لوٹنا ہے، پھوٹنا ہے،

ٹُوٹنا ہے، خاک ہونا ہے

مگر وہ خاک، جو اشجار کی ماں ہے

وہ کوندا، جو گھٹا پر ثبت کر کے دستخط اپنے

بظاہر جا چکا ہوتا ہے

چھُپ کر دیکھتا ہے

کس طرح تاریکیوں میں زلزلے آتے ہیں

منظر جاگ اُٹھتے ہیں

وہ جالا، جو پسِ در کتنے برسوں سے تنا ہے

اِک صحیفہ ہے

کبھی سُورج کی کرنوں میں اسے دیکھو

تو پوری کائنات اس میں مجسّم پاؤ گے اور جھوم جاؤ گے

کتابیں پڑھنے والے تو نہ مانیں گے

مگر از خاک تا افلاک، جو کچھ بھی ہے، وہ تحریر ہے

الفاظ ہیں، اعراب ہیں، نقطے ہیں، شوشے ہیں،

کششیں ہیں، دائرے ہیں، حرف ہیں

جن میں طلسمِ زندگی

اسرار کا اظہار کرتا ہے

نومبر ۱۹۷۴ء

نند ٭

ایک نوحہ
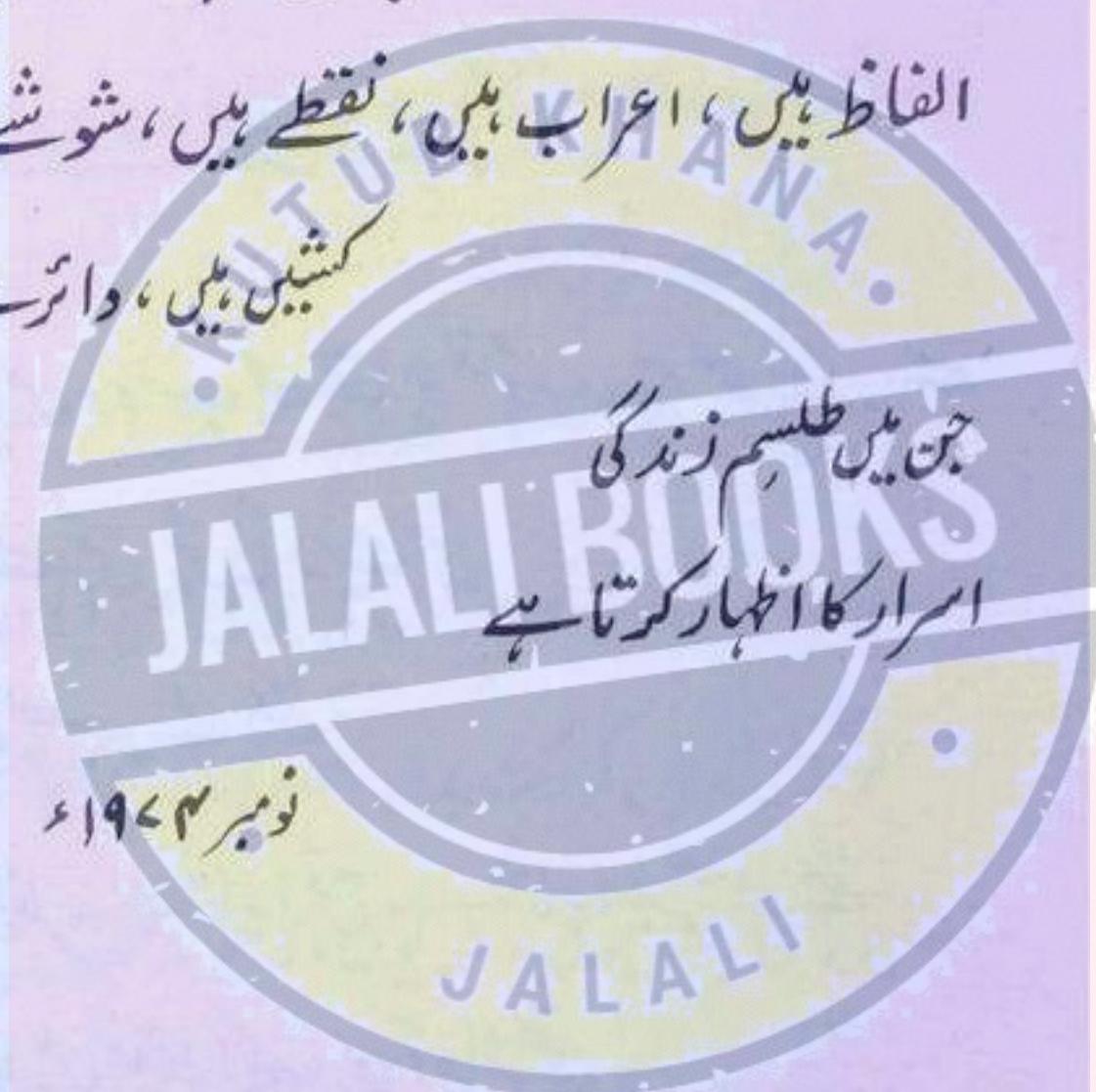
میرے صحرا میں وہ سب کچھ تھا جو منسوب ہے صحراؤں سے

دھوپ سے تپتی ہوئی ریت تھی

ٹیلوں کے پھپھولے تھے

جو تاحدِّ نظر — تابہ افق — تابہ ابد پھیلے تھے

میرے صحرا میں فقط ایک ہی آواز تھی —

سنّاٹے کی

٭ نندلال انیجہ - میرے ایک نہایت عزیز دوست جو ۵- اکتوبر ۱۹۷۴ء کو نئی دہلی میں انتقال کر گئے۔

اس کے باوصف مَیں زندہ تھا کہ تُو زندہ تھا
تو مری روح کے بنجر میں وہ چھتنار تھا
جو پیار کے پھُولوں سے لدا رہتا تھا

آدمیّت سے مرا عشق، تری چھاؤں میں پروان چڑھا
زندگی سے مرا رشتہ
تری خوشبوئے مسلسل سے مہذّب ٹھہرا
رُت بدلتی ہے تو پیڑوں کی جوانی بھی پتا دریں بدل جاتی ہے
لوگ کہتے ہیں کہ رُت بدلی ہے، مُجھ کو بھی بدلنا ہو گا
مَیں بھی بدلا ہُوں، مگر یُوں، کہ جو آنکھوں میں چمک تھی
وہ ستاروں کی طرح ٹوٹ کے دامن کو بھگو دیتی ہے
نند کہ کر جو مرے نطق میں اِک شہد سا گھُل جاتا تھا
بند ہونٹوں میں مقیّد ہے، کہ اب نند کی آواز پہ آواز نہیں آسکتی
اب وہ پُل ٹوٹ چکا ہے جو محبّت کے کڑے فاصلے مربوط
کیسے رکھتا تھا!

نند! تو حسن و محبّت تھا

رفاقت تھا

وہ سب کچھ تھا جو تُو نے مرے فن کو بخشا

کس طرح میں پسِ آفاق اکیلا تجھُے جانے دیتا

میرے الفاظ کا مفہوم ترے ساتھ گیا

نومبر ۱۹۷۴ء

تخلیقی لمحے کی دُعا

خیالو!

مرے ذہن پر جب اُترنا

تو مٹی کی خوشبو بھی ہمراہ لانا

جو تخلیق کا جزوِ اعظم ہے

جس سے پیمبر بھی اُٹھے، مصوّر بھی، شاعر بھی، محبُوب بھی، فلسفی بھی

وہی، جس کے جنگل، سمندر، پہاڑ اور صحرا فقط آدمیّت کی خدمت
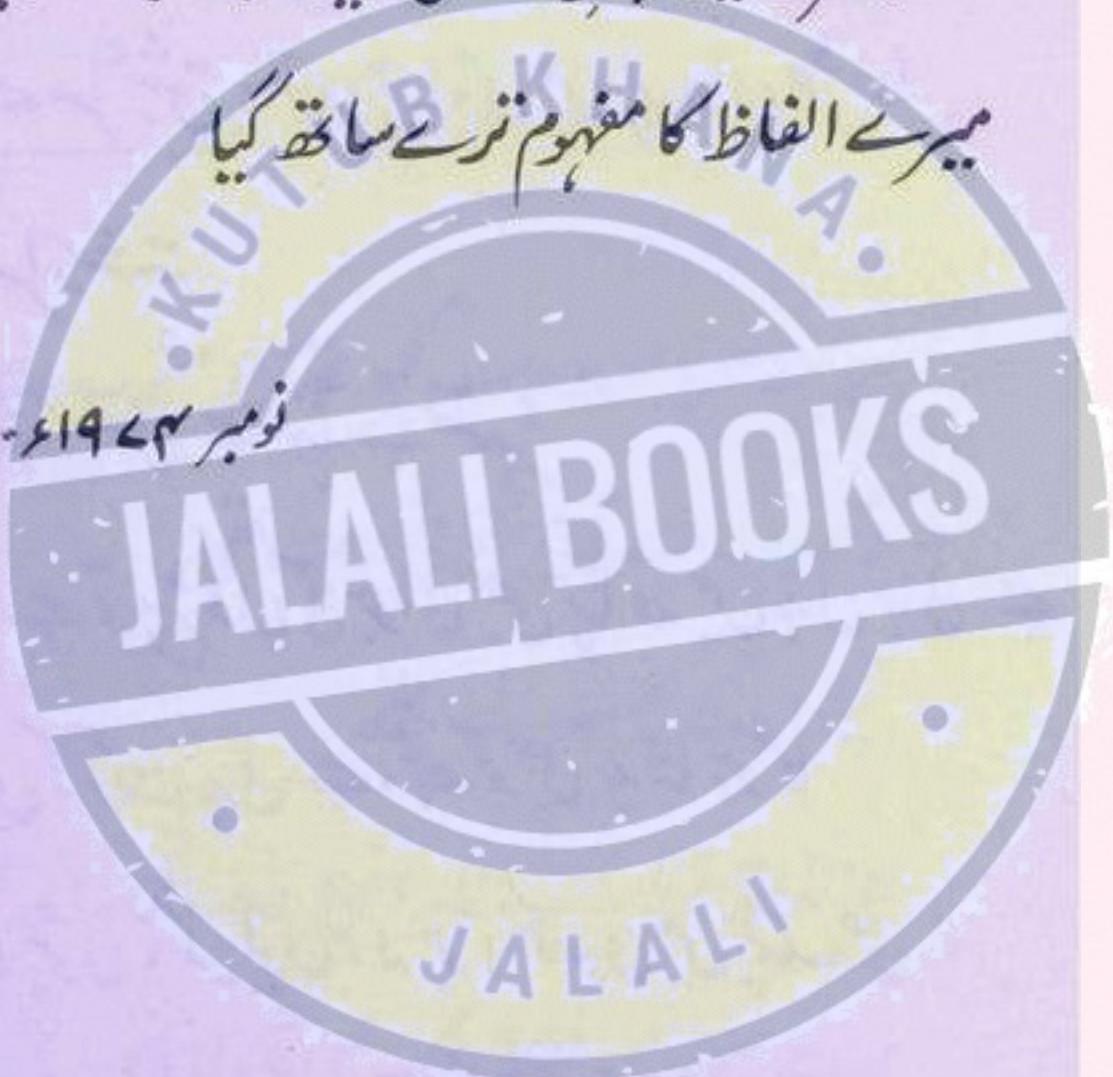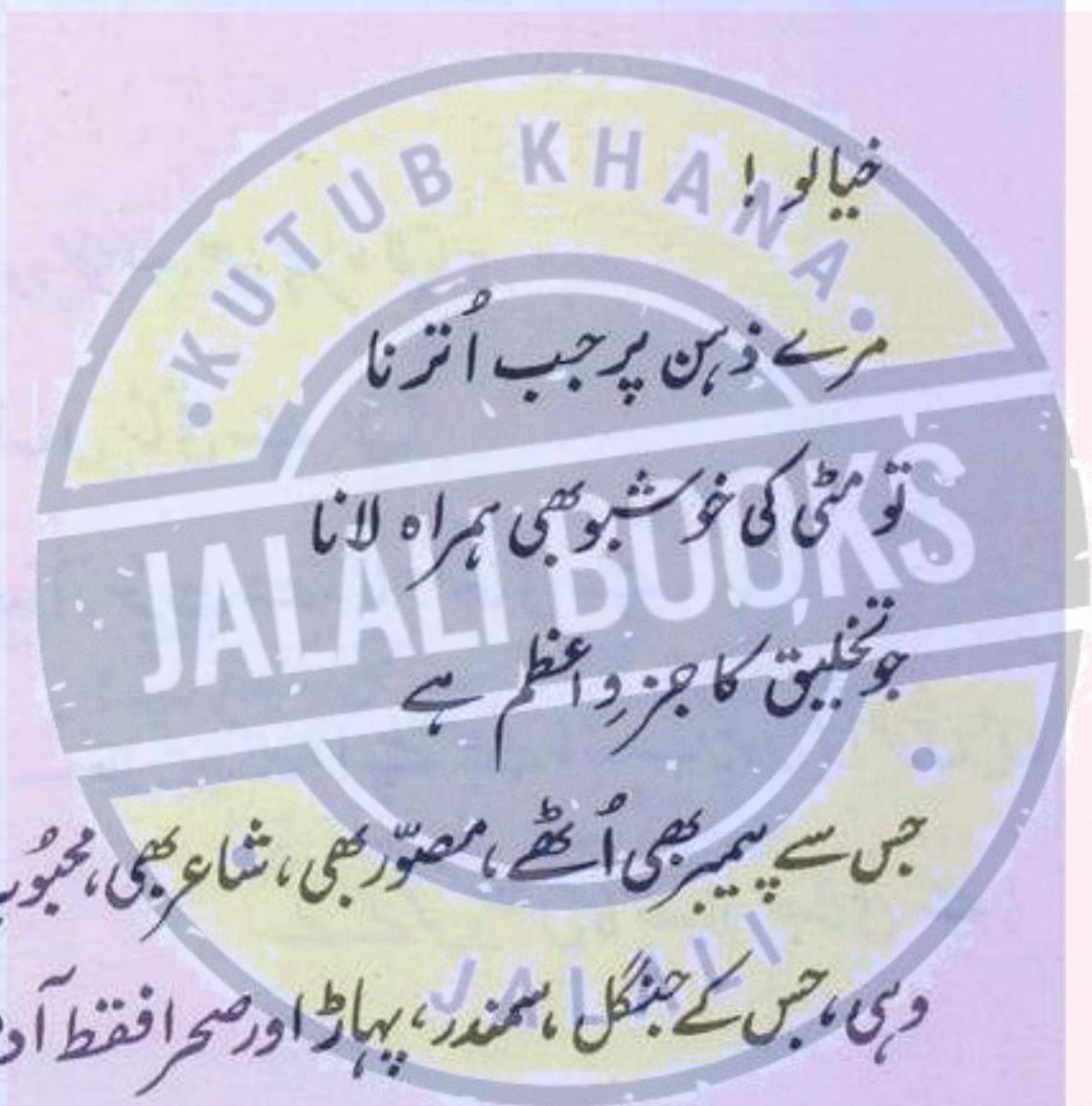
پہ مامُور ہیں!

جس پہ انسان نے اپنی محنت کے شہکار اُگائے ہیں

جن سے تمدّن نے، تہذیب و تاریخ نے

نام پائے ہیں

مَیں اس سے کٹ کر خلا میں گیا تو مرا وزن کھو جائے گا

اور مرا وزن مٹی سے ہے

اور مَیں مٹی سے ہُوں

اور مٹی میں مُجھ کو بدلنا بھی ہے

اے خیالو!

اسی مہرباں کی وہ خوشبو بھی ہمراہ لانا

جو انساں کو انساں بناتی ہے

عزّت سے جینا تو غیرت سے مرنا سکھاتی ہے

اور آخرِ کار — ماں بن کے، اپنے تھکے ماندے بچّوں کو آغوش میں

لے کے گردش کا جھُولا جھلاتی ہے!

نومبر ۱۹۷۴ء

نفی

گُل و گلزار جب مٹی سے اُگتے ہیں
تو ہم مٹی کے پُتلے سوچتے ہیں ـــ
ہم تو بنجر ہیں!
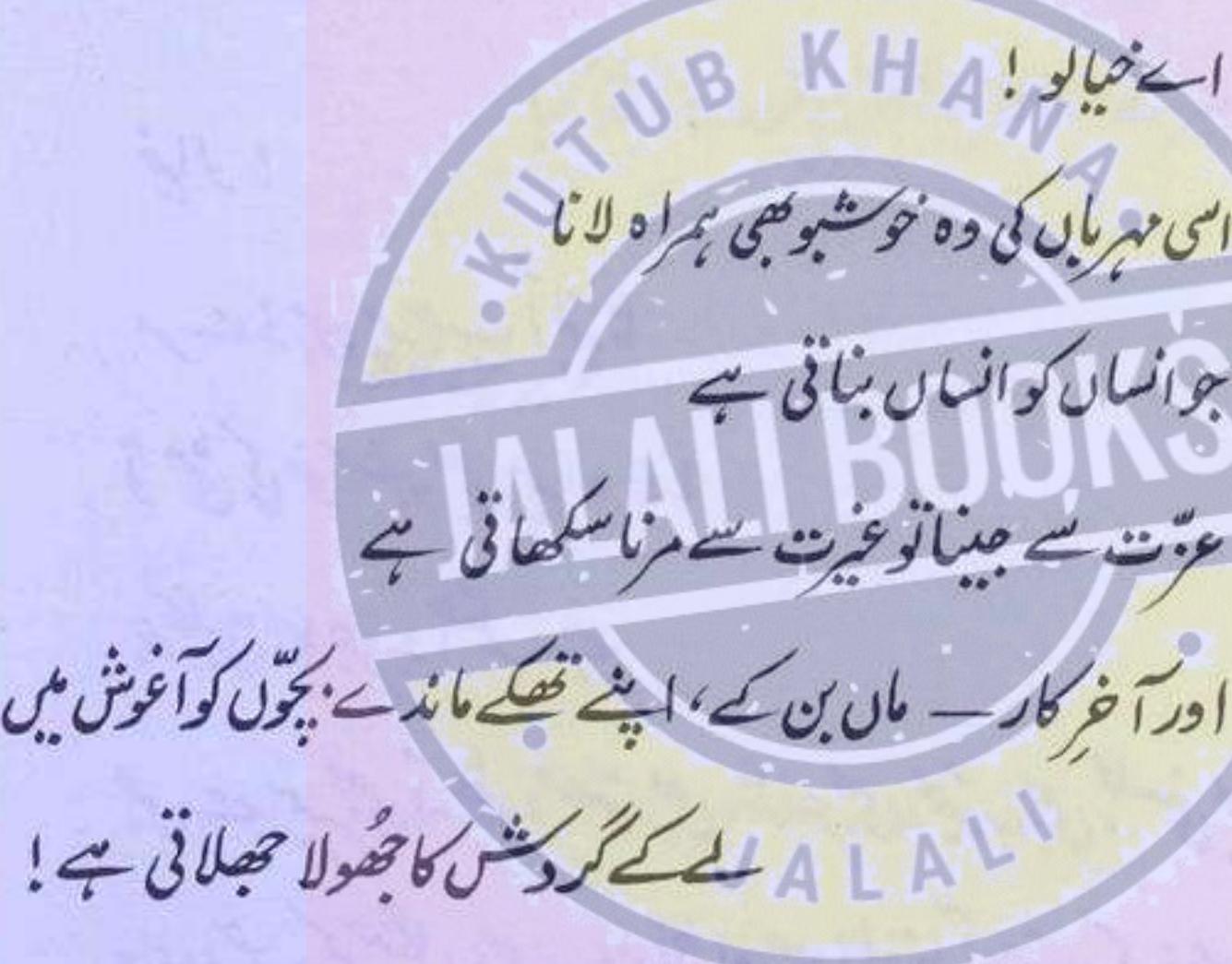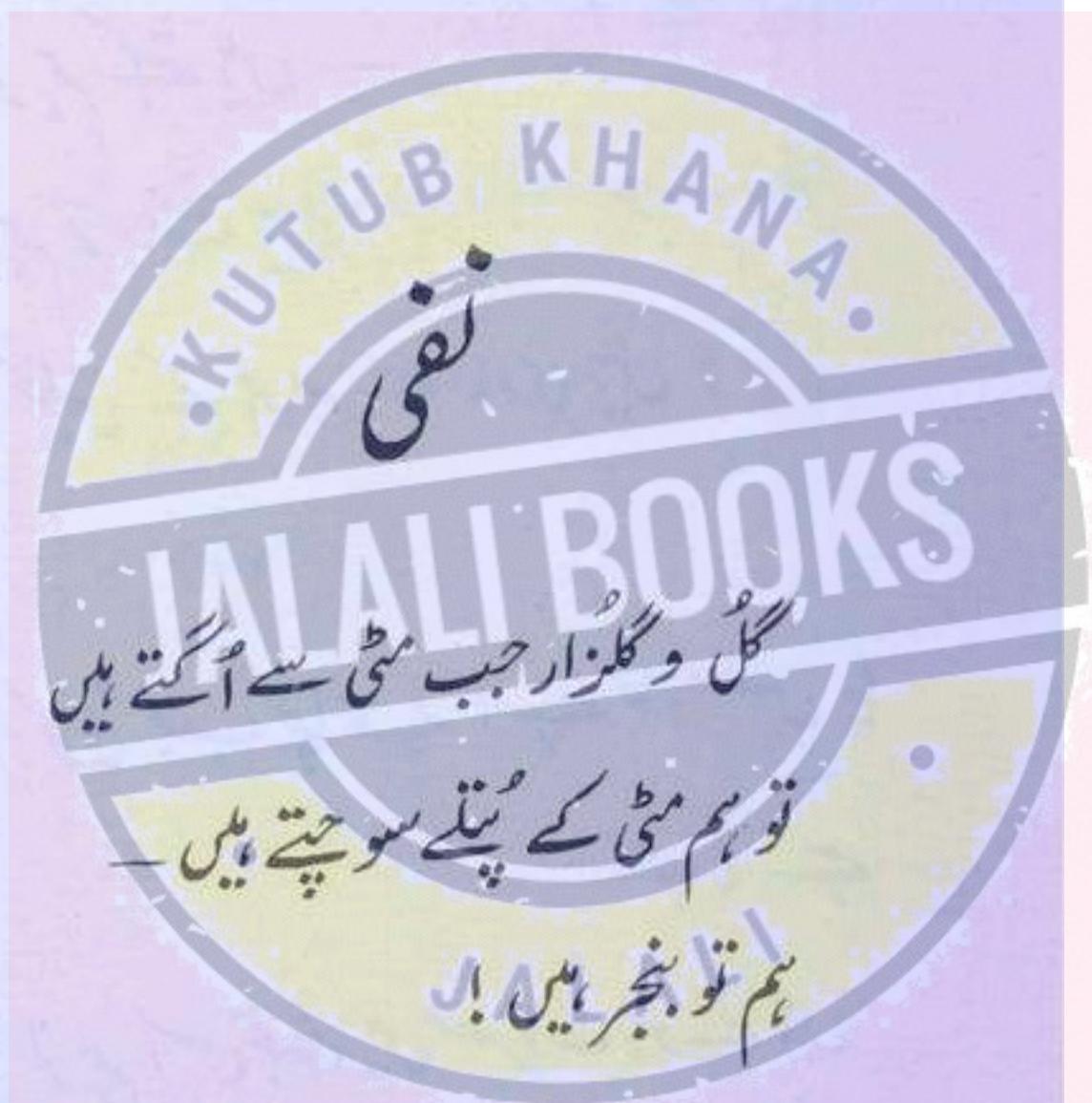
گرفتِ سنگ سے جب بھی رہائی پا کے
نکلا ہے خُدا کوئی
ہمیں اِس وہم میں محصُور پایا ـــ

ہم تو پتھّر ہیں !

کوئی ذرّاتِ زر جب چھانتا ہے
ریگِ ساحل سے

تو ہم کہتے ہیں —
ہم تو ریت ہیں
تخلیق کے جوہر سے عاری ہیں !
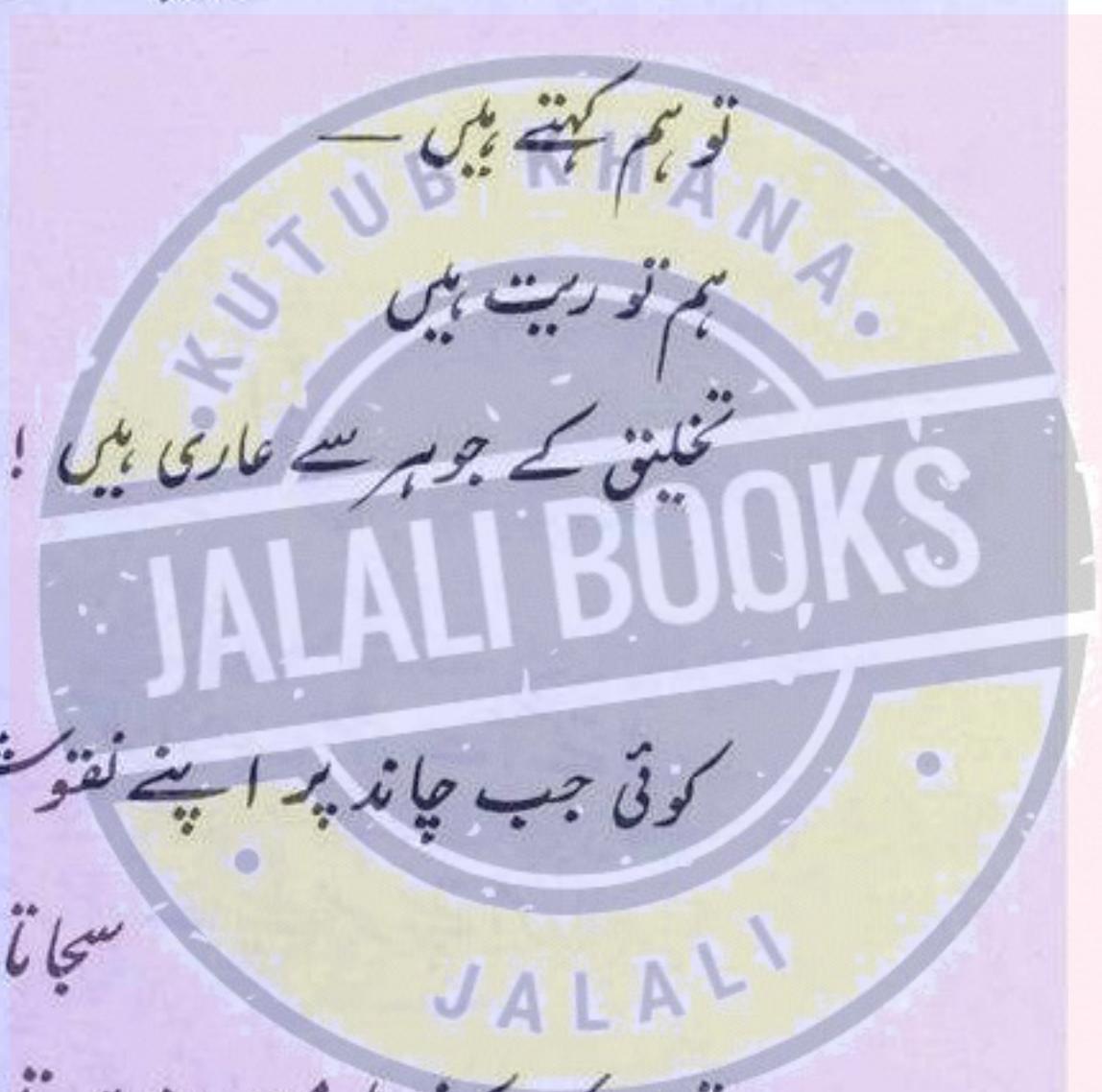
کوئی جب چاند پر اپنے نقوشِ پا
سجاتا ہے
تو ہم اس بحث میں مصروف ہوتے ہیں
کہ ہم تو خاک ہیں
اور اپنی فطرت میں نہ نوری ہیں نہ ناری ہیں !

ہم اپنے آپ کو جھٹلا رہے ہیں

اور سمجھتے ہیں —

ہمارے دم سے سچ کا بول بالا ہے!

سبھی شمعیں بجھاتے جا رہے ہیں

اور کہتے ہیں —

ہمارے بعد اُجالا ہی اُجالا ہے!

جون

۱۹۷۴ء
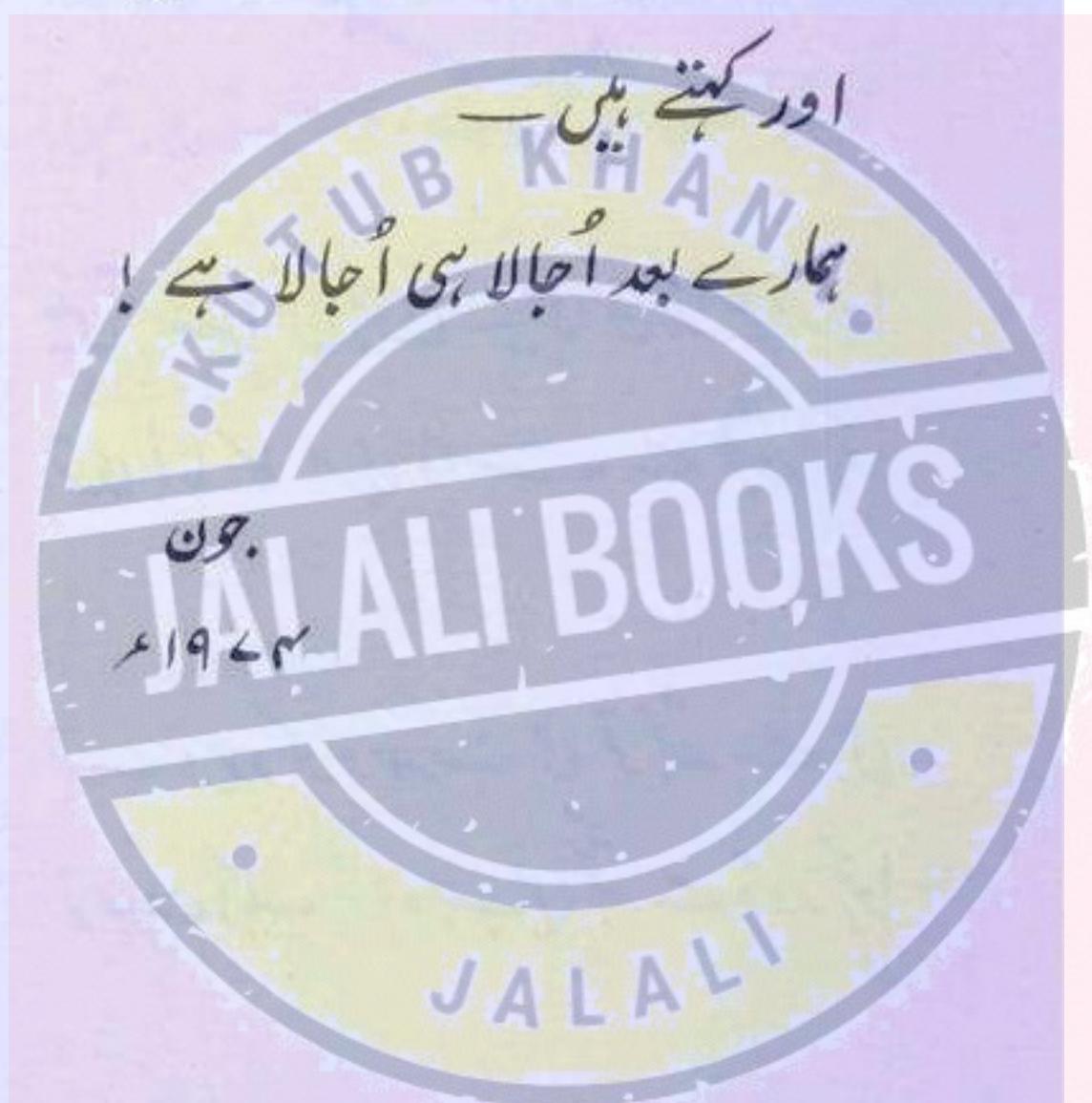
حمد

مَیں تیرا فن ہُوں — یہی فن ترا غرور ہُوا
تری اَنا کا مری ذات سے ظہُور ہُوا

ترے وجود کو وحدت مِلی تو مُجھ سے مِلی
تو صرف ایک ہُوا، جب مَیں تُجھ سے دُور ہُوا

بس ایک حادثۂ کُن سے یہ جُدائی ہُوئی
مَیں ریگِ دشت ہُوا، تو فرازِ طُور ہُوا

ترے جمال کا جوہر مرا رقیب نہ ہو
مَیں تیری سمت جب آیا تو چُور چُور ہُوا

عجیب طرح کی اِک ضد مرے خمیر میں ہے
کہ جب بھی تیرگی اُمڈی، میَں نُور نُور ہُوا

یہ اور بات —— رہا انتظار صدیوں تک
مگر جو سوچ لیا میَں نے، وہ ضرُور ہُوا

جون ۱۹۷۴ء
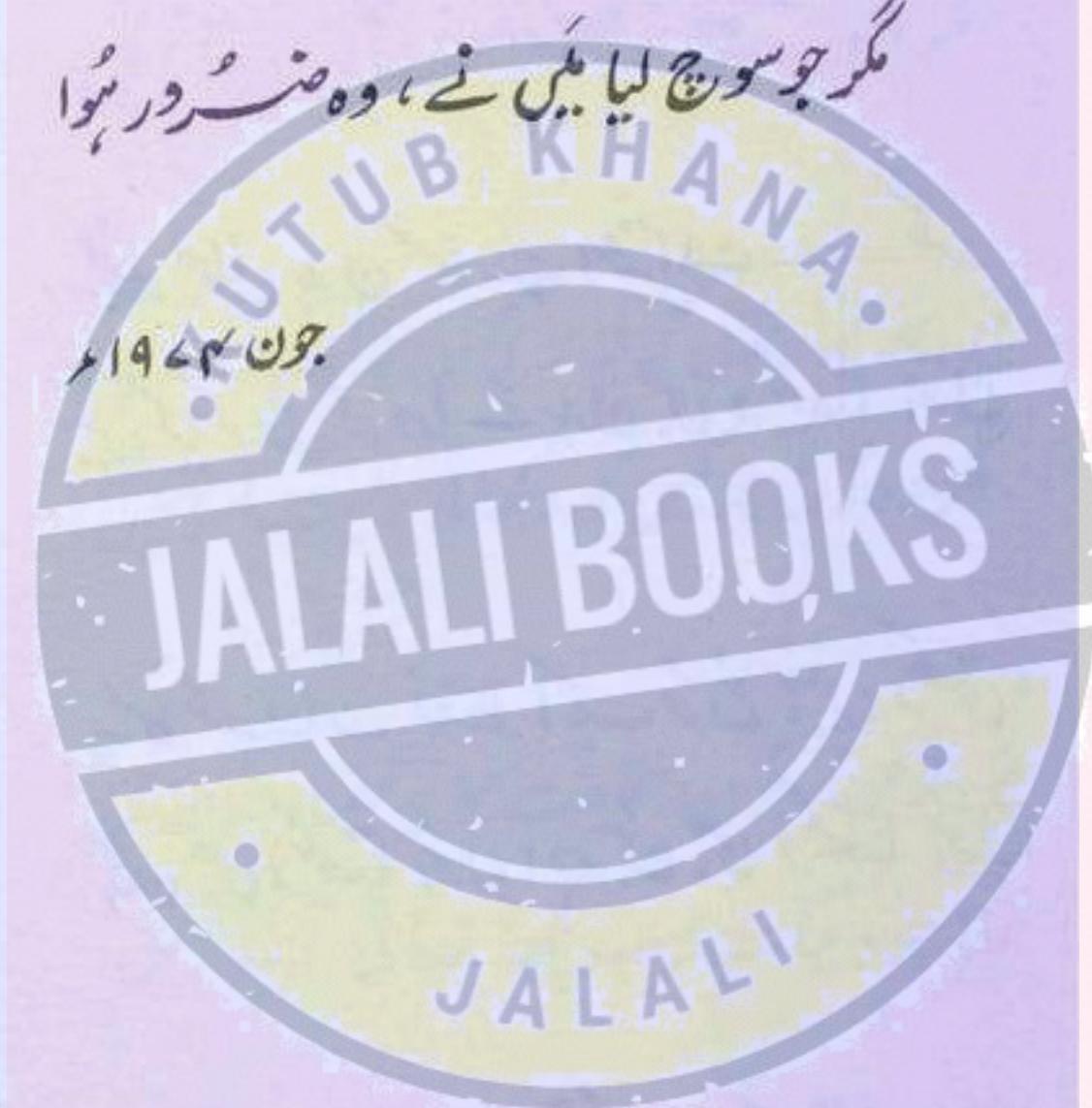
پسِ آئینہ

مجھے جمالِ بدن کا ہے اعتراف ــــــ مگر
میں کیا کروں کہ ورائے بدن بھی دیکھتا ہوں

یہ کائنات فقط ایک رُخ نہیں رکھتی،
چمن بھی دیکھتا ہوں اور بَن بھی دیکھتا ہوں

مری نظر میں ہیں جب حُسن کے تمام انداز
میں فن بھی دیکھتا ہوں، مکر و فن بھی دیکھتا ہوں

نکل گیا ہوں فریبِ نگاہ سے آگے
میں آسماں کو شکن در شکن بھی دیکھتا ہوں

وہ آدمی، کہ سبھی روئے جس کی میت پر
میں اُس کو زیرِ کفن، خندہ زن بھی دیکھتا ہوں

میں جانتا ہوں کہ خورشید ہے جلال مآب،
مگر غروب سے خود کو رہائی دیتا نہیں

میں سوچتا ہوں کہ چاند اِک جمال پارہ ہے
مگر وہ رُخ جو کسی کو دکھائی دیتا نہیں

میں پُوچھتا ہوں، حقیقت کا یہ تضاد ہے کیا
خدا جو دیتا ہے سب کچھ، خدائی دیتا نہیں

وہ لوگ ذوق سے عاری ہیں، جو یہ کہتے ہیں
کہ اشک ٹوٹتا ہے اور سُنائی دیتا نہیں

بدن بھی آگ ہے اور رُوح بھی جہنّم ہے
مرا قصور یہ ہے، میں دُہائی دیتا نہیں

۱۹۷۴ء

مجھے تلاش کرو
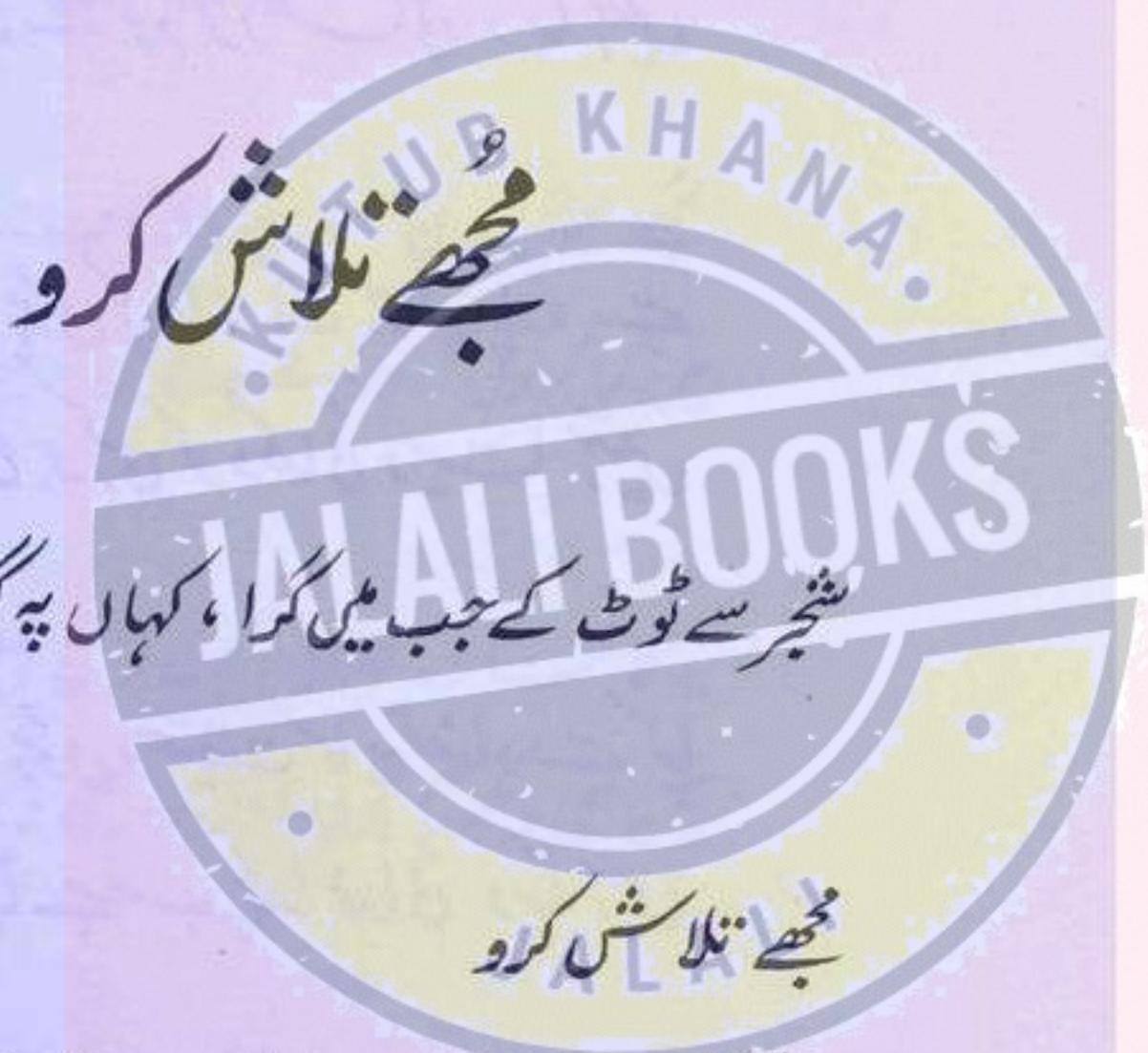
شجر سے ٹوٹ کے جب میں گرا، کہاں پہ گرا !

مجھے تلاش کرو

جن آندھیوں نے مری سرزمیں ادھیڑی تھی

وہ آج مولدِ عیسیٰ میں گرد اُڑاتی ہیں

جو ہو سکے تو انہی سے مرا پتہ پوچھو

مجھے تلاش کرو

چلی جو مشرق و مغرب سے تند و تیز ہوا

مرے شجر نے مجھے پیار سے سمیٹ لیا

مجھے لپیٹ لیا اپنی کتنی باہوں میں

یہ بے لحاظ عناصر مگر بضد ہی رہے
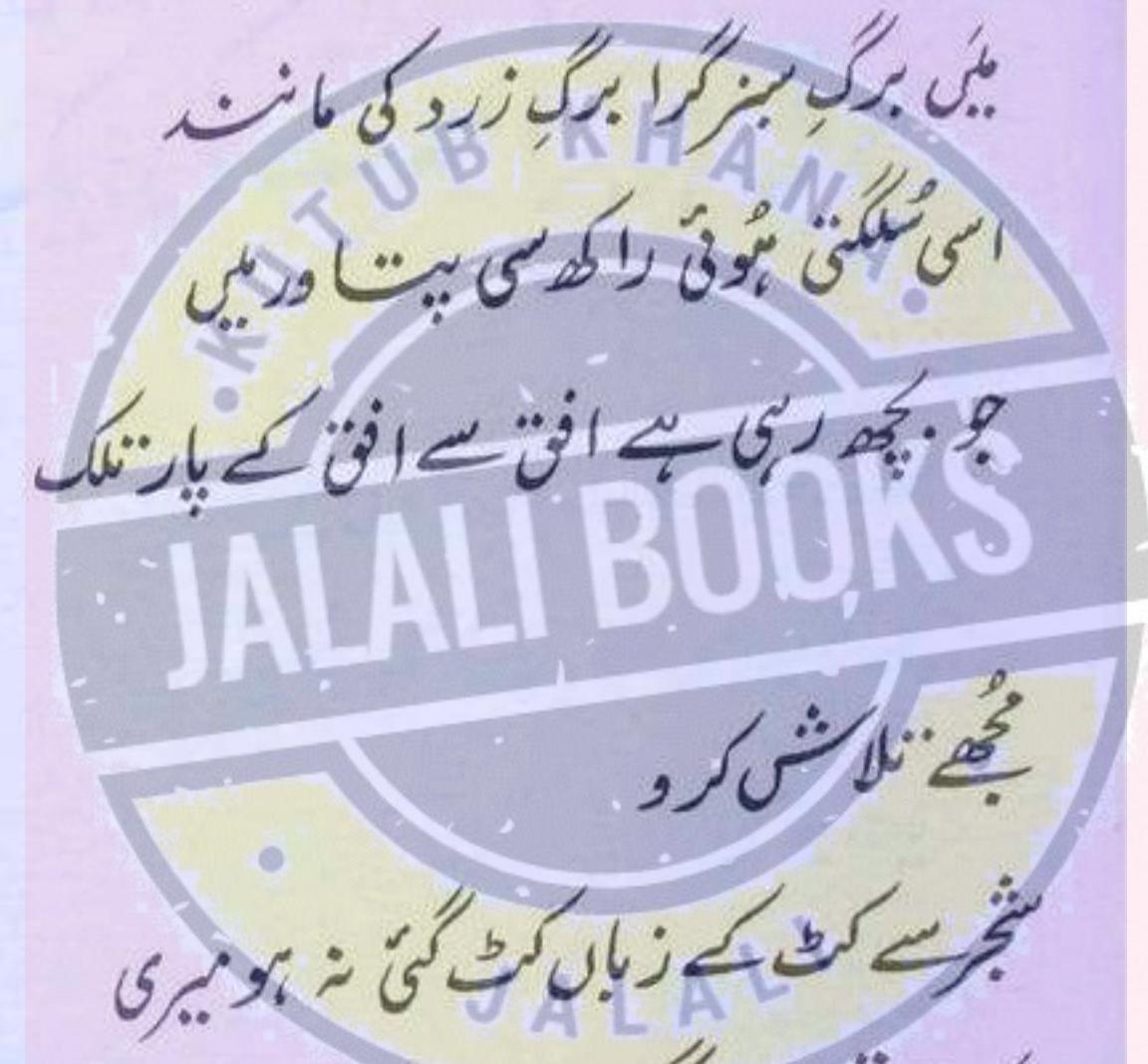
میں برگِ سبز گرا برگِ زرد کی مانند

اسی سلگتی ہوئی راکھ سی بیتا وریں

جو بچھ رہی ہے افق سے افق کے پار تلک

مجھے تلاش کرو

شجر سے کٹ کے زباں کٹ گئی نہ ہو میری

میں چیختا ہوں مگر حرفِ ناشنیدہ ہوں

حیاتِ تازہ ہے میری، شجر سے میرا ملاپ

کہ بس وہی مری بالیدگی کا منبع ہے

جو ریگزار میں چھتنار دیکھتے ہیں تمھیں

مجھے تلاش کرو

فلک کے راز تو کھلتے رہیں گے ہم نفسو !

مرے وجود کا بھی اب تو راز فاش کرو

مجھے تلاش کرو

نومبر ۱۹۷۳ء
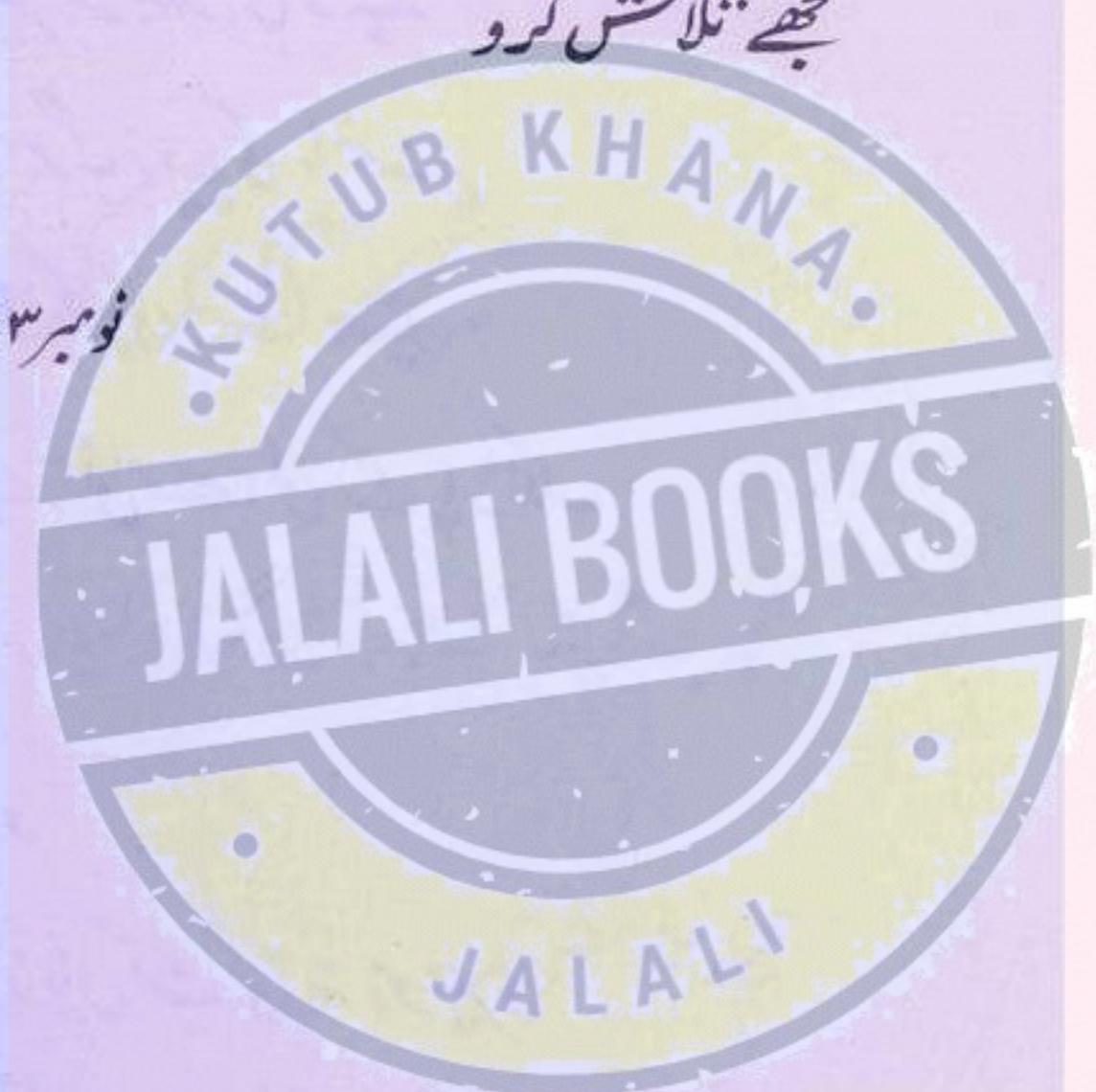
غرق ہو کر اُبھرنے کی ایک کہانی
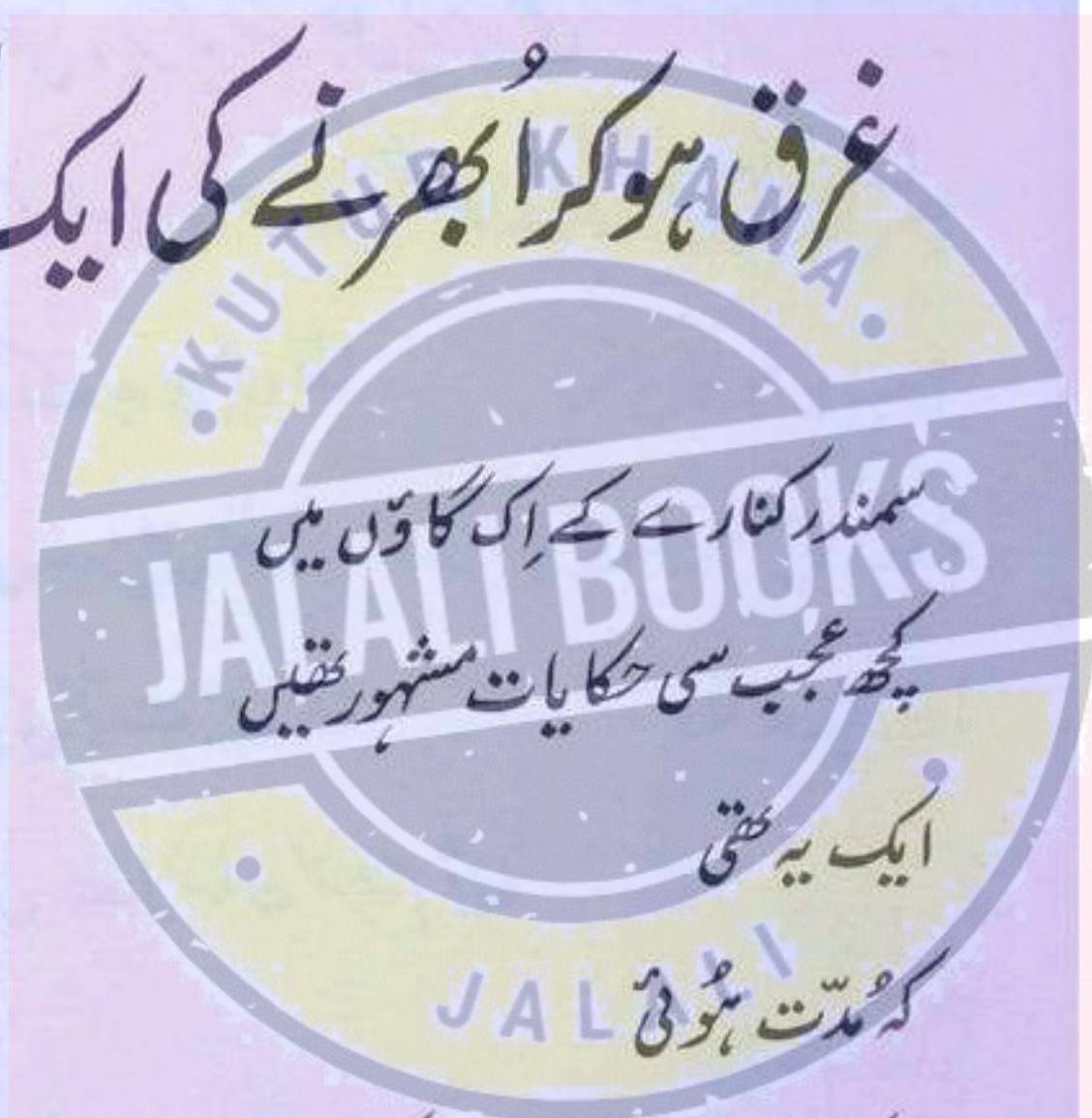
سمندر کنارے کے اِک گاؤں میں
کچھ عجیب سی حکایات مشہور تھیں
ایک یہ تھی
کہ مدّت ہوئی
بط کی صورت کی اِک سُرخ کشتی
ہرے جنگلوں سے لدے اُس جزیرے کے ساحل سے نِکلی
اِدھر زرد پھولوں کے فرغل میں لپٹے ہوئے اِس جزیرے کی
جانب رواں تھی

یہ سب لوگ بارات لے کر گئے تھے

دُلھن لے کے واپس چلے تھے

دُلھن اُس مچھیرے کی بیٹی تھی جو بعد میں کُفر بکتا ہُوا
مر گیا تھا

یہ لڑکی مچھیرن تھی، پر ہُو بہُو جل پری تھی

کہ جو حُسن اس کے لبوں، اس کی آنکھوں میں جھلمل جھلکتا تھا

جو حُسن اس کے بدن میں تھا

جو حُسن اس کی صدا میں تھا

جو حُسن اس کی محبّت میں تھا

آج تک اس سے انسان محروم ہیں

جب یہ کشتی

نفیری کی آواز میں لپٹی لپٹائی چلنے لگی

اور مچھیرن کے سینے میں

دُولھا سے

(اِک جست بھر کر)

لپٹنے کی خواہش مچلنے لگی

تو وہ طوفان آیا

جسے لوگ اب تک عناصر کا شہکار کہتے ہیں

پھر یُوں ہُوا

جب یہ طوفاں تھما

دُور افق تک فقط ہانپتا، ناچتا، موج در موج پانی تھا

اور کچھ نہ تھا

لوگ کہتے ہیں
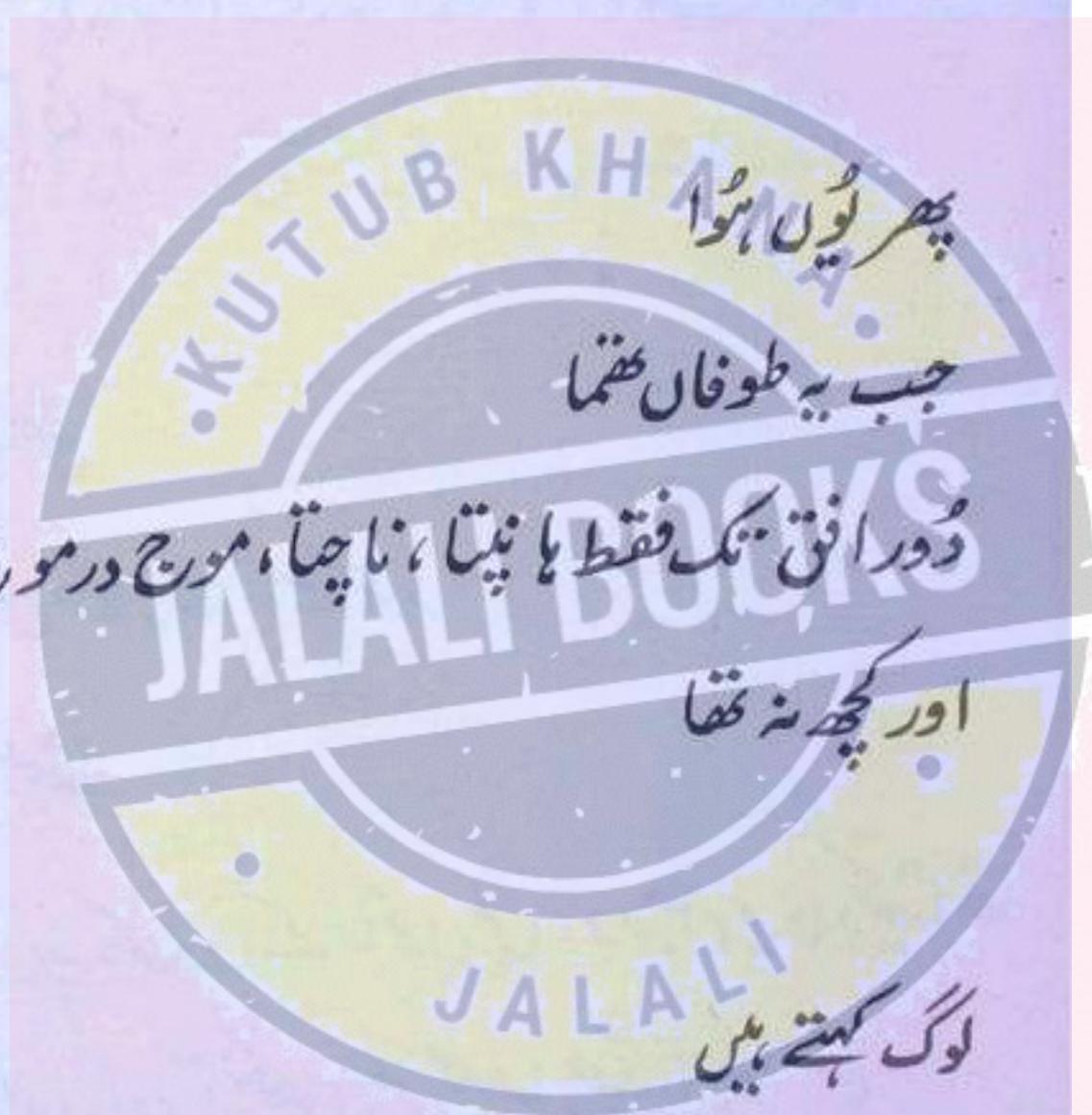
وہ، جس نے طوفان بھیجا ہے

کشتی ڈبوئی ہے

اس پر بھی قادر ہے

اِک روز کشتی ترا دے

سو مدّت ہُوئی

صبح سے شام تک — شام سے صُبح تک — لوگ افق تا افق —

اور کراں تا کراں دیکھتے ہیں !

کہ شاید کسی موج نے اپنی قدرت دکھائی ہو

کشتی اُبھر آئی ہو

چاندنی رات تھی

اور مَیں ، اس حکایت سے مسحور

ساحل پہ بیٹھا
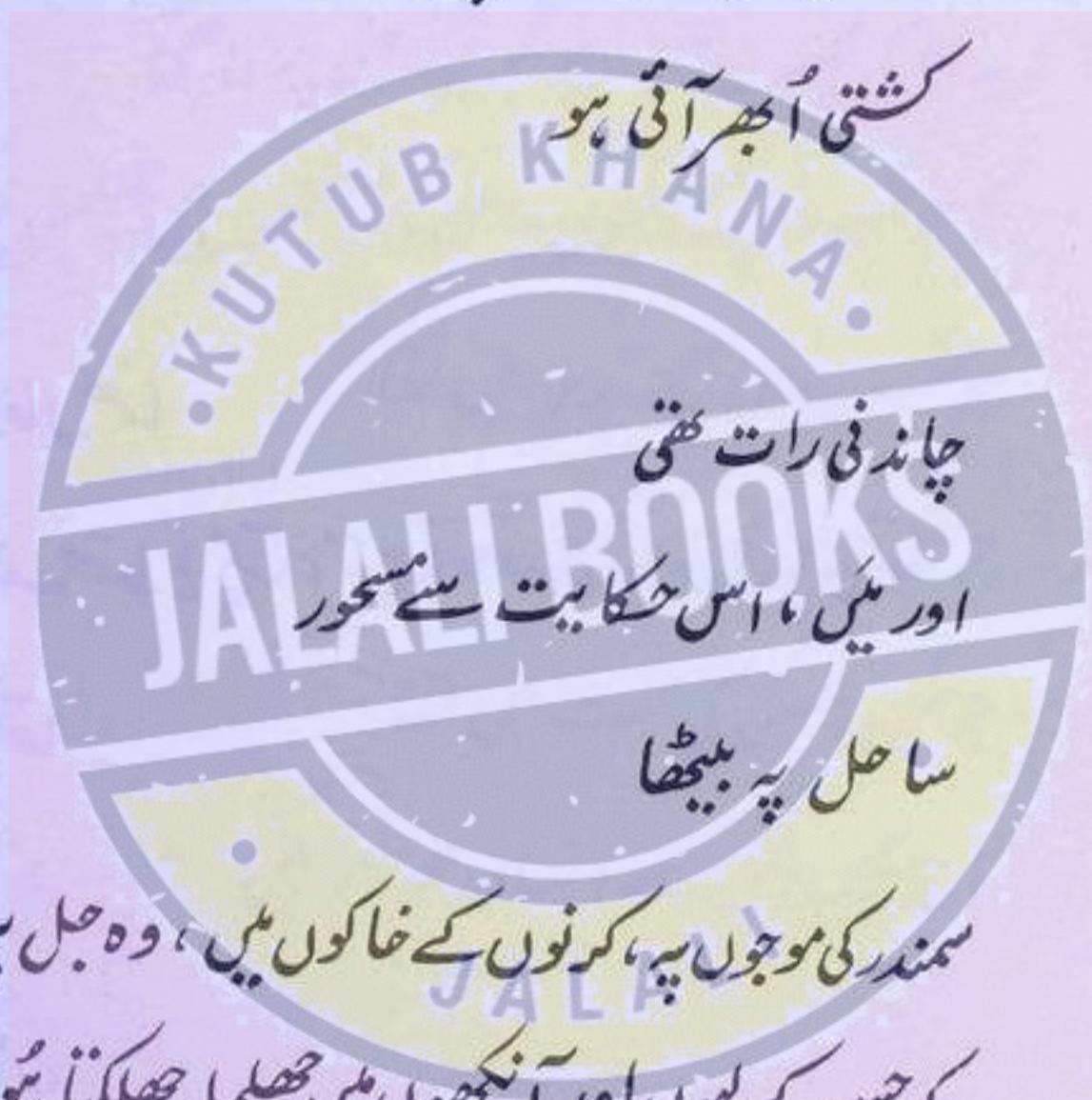
سمندر کی موجوں پہ ، کرنوں کے خاکوں میں ، وہ جل پری دیکھتا تھا

کہ جس کے لبوں اور آنکھوں میں جھلمل جھلکتا ہُوا حُسن

انسان کے حُسن سے مختلف حُسن تھا

اور ابھی مجھ سے اس کے بدن اور اس کی صدا اور اس کی

محبّت کے سب رنگ سمٹے نہیں تھے

جب اِک موج کا کوہسارِ گراں اپنی جانب رواں دیکھ کر مَیں اُٹھا

اور پلٹنے کو تھا

جب یہ کشتی نمایاں ہوئی

(بلط کی صورت کی اِک سُرخ کشتی)

جسے سطح پر، آخر کار، قدرت اُٹھا لائی تھی

یہ الگ بات ہے ۔ اہلِ کشتی کو بھول آئی تھی

اکتوبر ۷۳ ۱۹ء

ابتلا

—— سیلابِ اگست ۱۹۷۳ء ——

یہ کل کا تذکرہ ہے
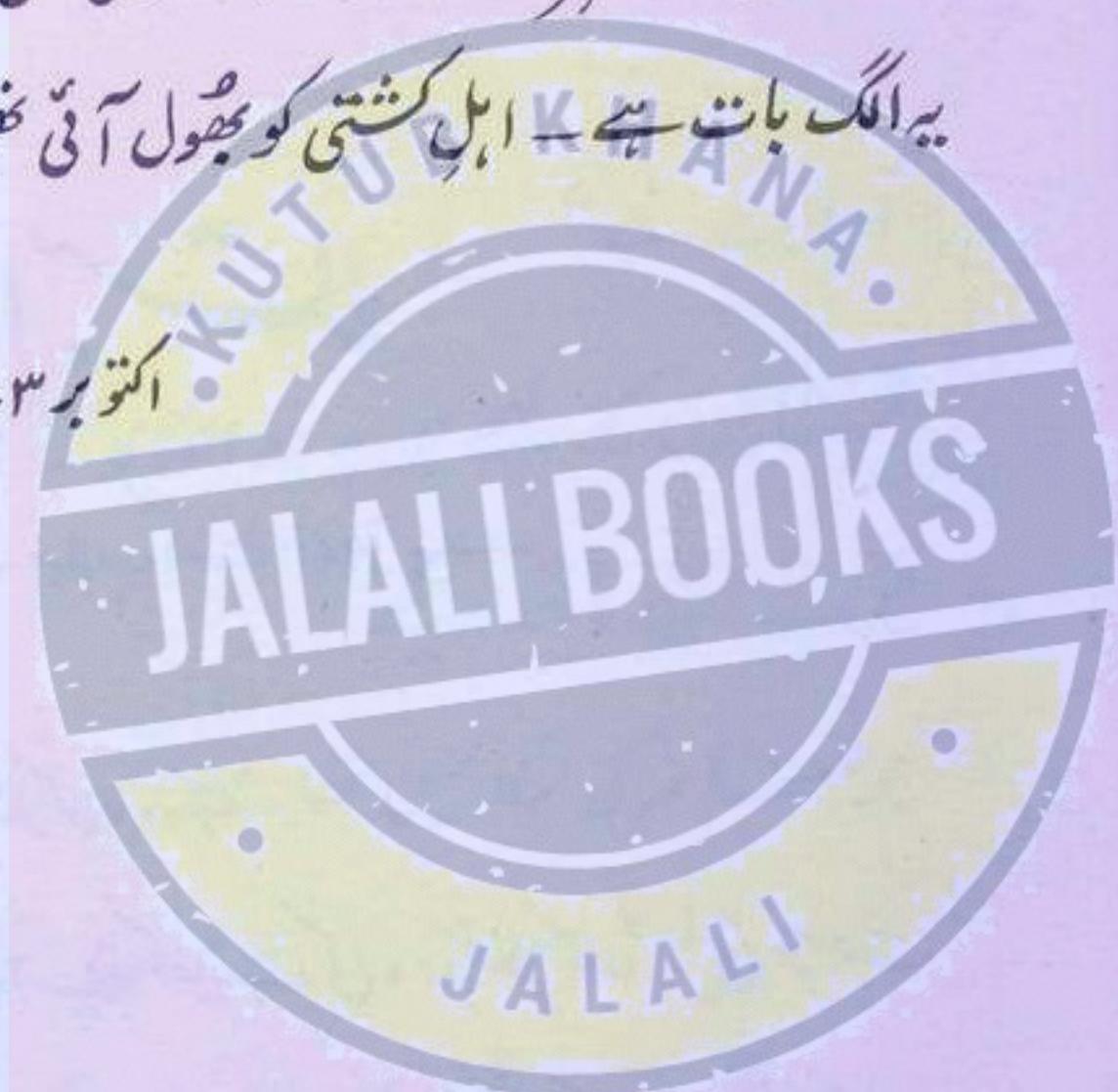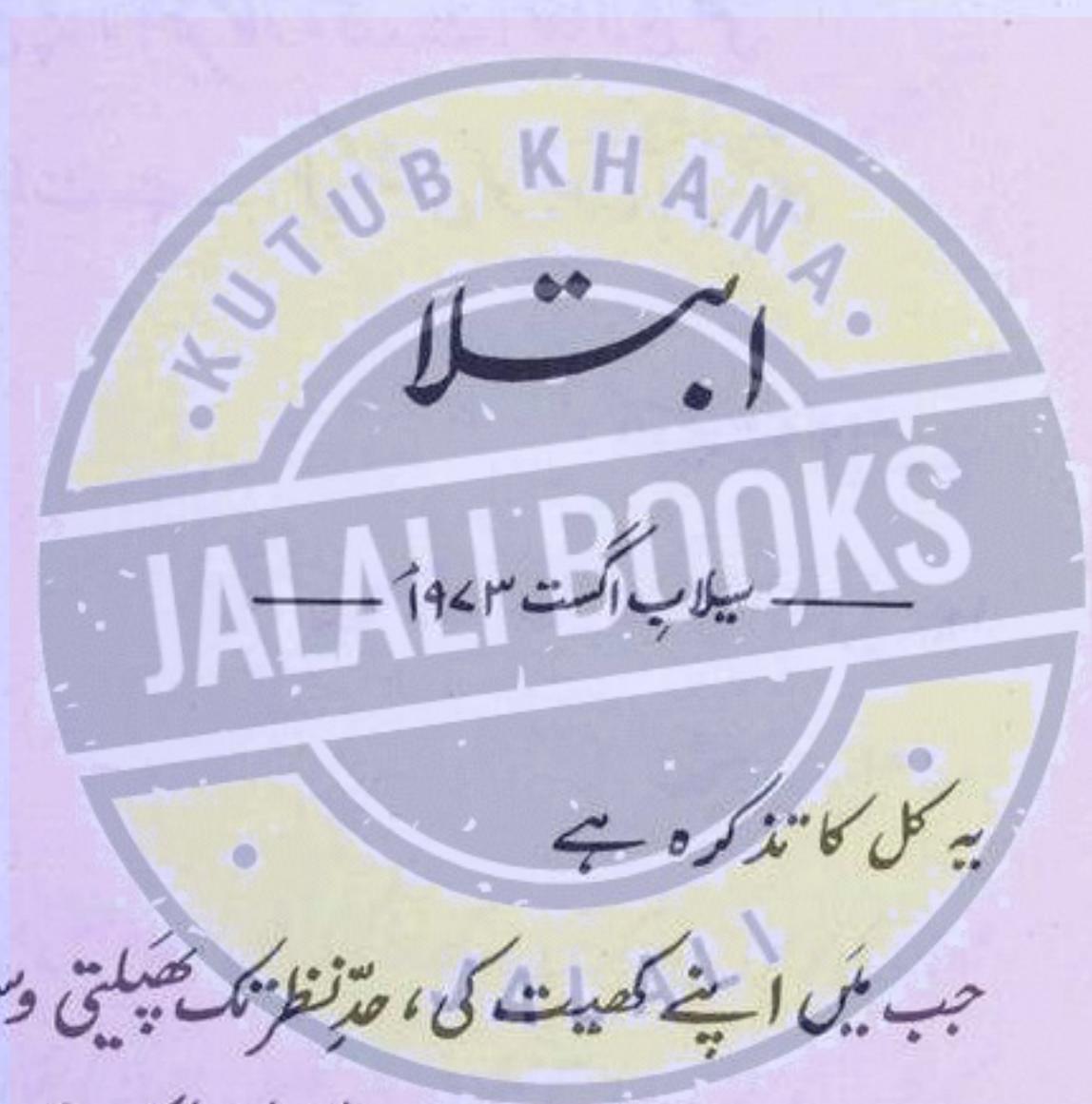
جب میں اپنے کھیت کی، حدِّ نظر تک پھیلتی وسعت

کے اِک گوشے میں

یُوں استادہ تھا

جیسے عناصر میرے خادم ہوں

انھی نے میری خاطر چار جانب مخمل و دیبا

بچھائے ہوں

اور اب یہ دست بستہ عرض کرنے وہ مری
خدمت میں آئے ہوں،
کہ ارشادِ گرامی ہو تو سستا لیں
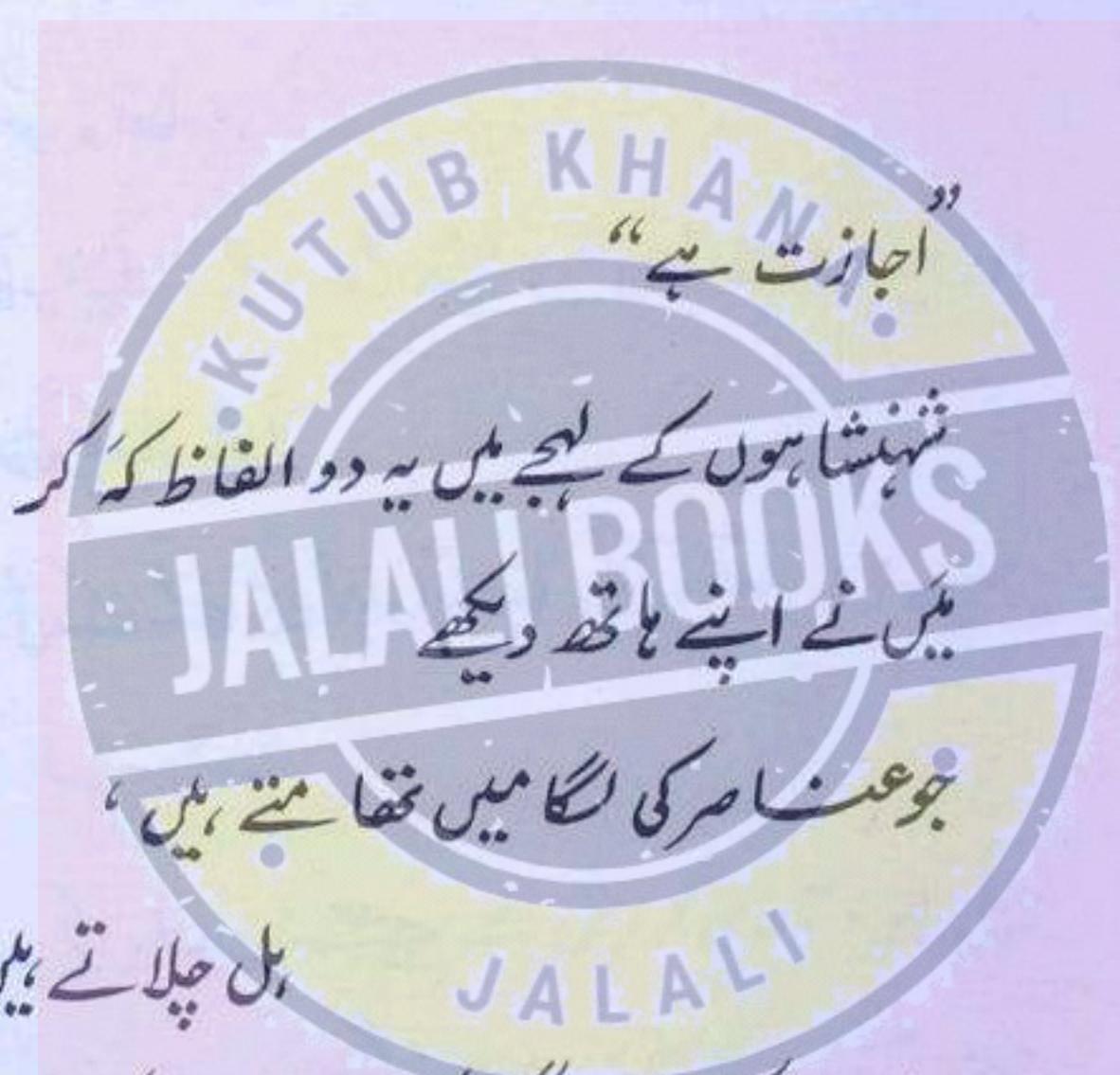
"اجازت ہے"
شہنشاہوں کے لہجے میں یہ دو الفاظ کہہ کر
مَیں نے اپنے ہاتھ دیکھے
جو عناصر کی لگامیں تھامتے ہیں،
ہل چلاتے ہیں
بطونِ خاک سے رنگوں کی، مہکاروں کی جنّت
کھینچ لاتے ہیں!
یہی وہ ہاتھ ہیں جن سے مری تخلیق کاری شعبدوں کی
صف میں شامل ہے
یہ میرے ہاتھ ہیں

جن کی لکیریں میری مُٹھّی میں ہیں
اور تقدیر میری دسترس میں ہے

مَیں اِک خلّاق کی مانند کتنا مطمئن تھا
کِتنا آسُودہ تھا
اور شہکار میرا
دُور تک پھَیلا ہُوا
اپنی جوانی کے نشے میں لہلہاتا تھا، لچکتا تھا
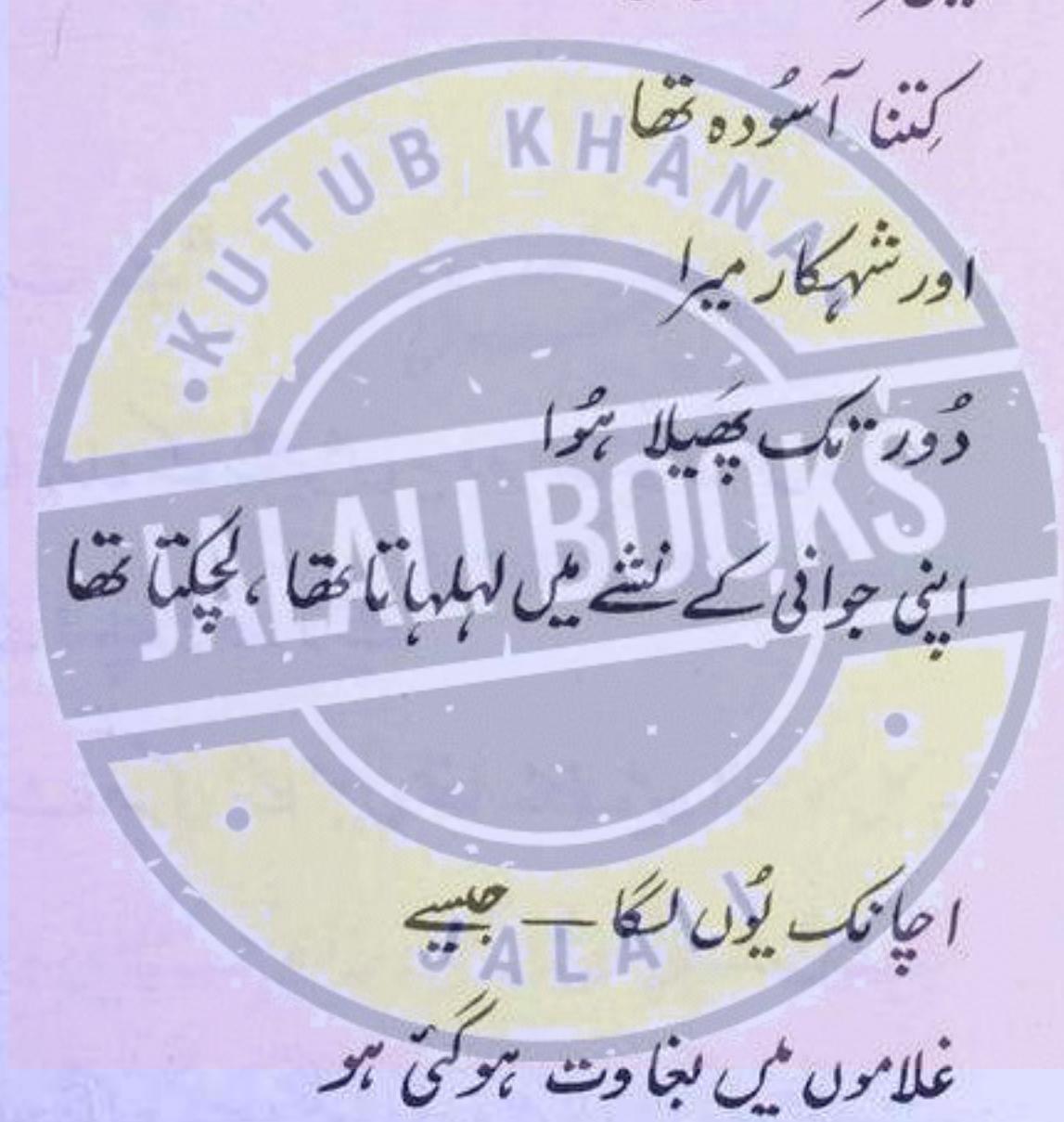
اچانک یُوں لگا — جیسے
غلاموں میں بغاوت ہو گئی ہو
پھر مرے سینے میں تیغِ آب اُتری
اور اتنی دُور تک اُتری
کہ اُس کی نوک میری پسلیوں میں سے گزر کر
ڈُوبتے سُورج کی شہ رگ کاٹتی

حدِّ اُفق سے پار جا نکلی

یہ منظر دیدنی تھا

جب مری ہر یالیاں میرے لہُو سے تر بتر

ہونے لگیں

اور میری مہکاروں میں لپٹے رنگ جڑ سے کٹ کے

یوُں بہنے لگے،

جیسے زمیں روئیدگی اور زندگی کی میّتیں سینے

سے جھٹائے

چلی ہو، آخری گردش کے پردے میں

حضورِ آفتاب اِک آخری سجدہ ادا کرنے

یہ منظر دیدنی تھا

جب مری پتھرائی آنکھوں میں

کپاسی، نقرئی پھُولوں نے گھُس کر

ان عناصر سے یہ پُوچھا تھا ۔
تمھارے عدل کا یہ کون سا معیار ہے
انصاف کے آئین کی یہ کون سی شق ہے

یہ منظر دیدنی تھا
جب میں دلدل میں دھنسا تھا
اور اُوپر آسماں پر، ہر طرف، کالی گھٹائیں
خیمہ زن تھیں
اور بُوندیں جب مری جانب لپکتی تھیں
تو چیلیں سی جھپٹتی تھیں
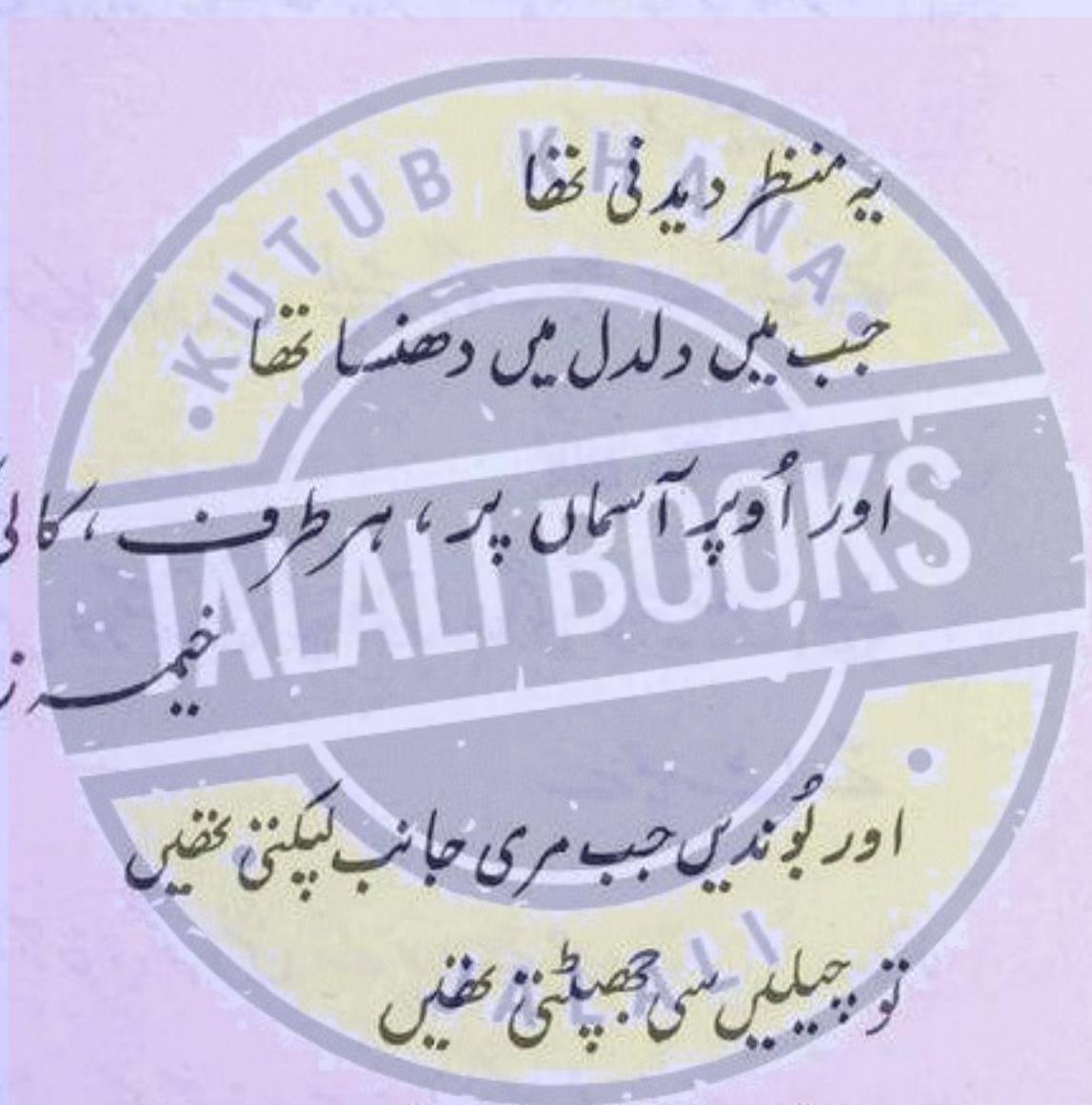
"نہیں!" — میں نے کہا — "مرنے سے میں انکار
کرتا ہوں!"

میں اُبھرا پھڑ پھڑا کر
اور ہزاروں دھجیاں میری اَنا کی
رہ گئیں دلدل کے پنجوں میں

یہ منظر دیدنی تھا

جب ادھورا جسم میرا

اُجڑے پُجڑے راستوں پر ٹھوکریں کھاتا چلا جاتا تھا

دُنیا کہ رہی تھی ــــ

یہ عجب انسان ہے، جو سر بریدہ ہے

مگر اس حشر میں بھی سرکشیدہ ہے!

اگست ۱۹۷۳ء

چوگا

باجرے کا اِک دانہ اپنی چونچ میں رکھے

چڑیا اماں چوگا دینے آئی ہے

بچّے اِتنے ننھے مُنّے سے ہیں
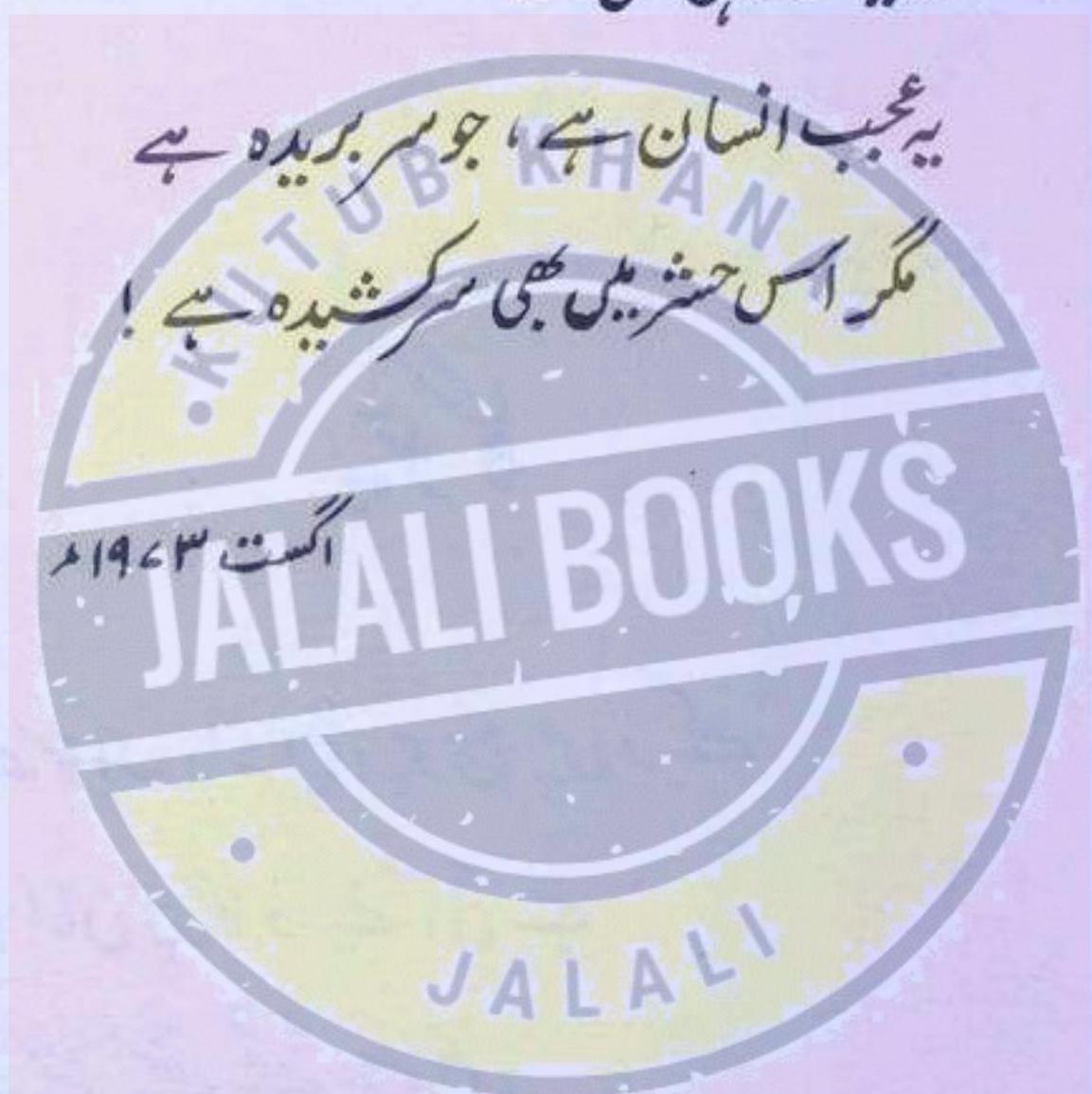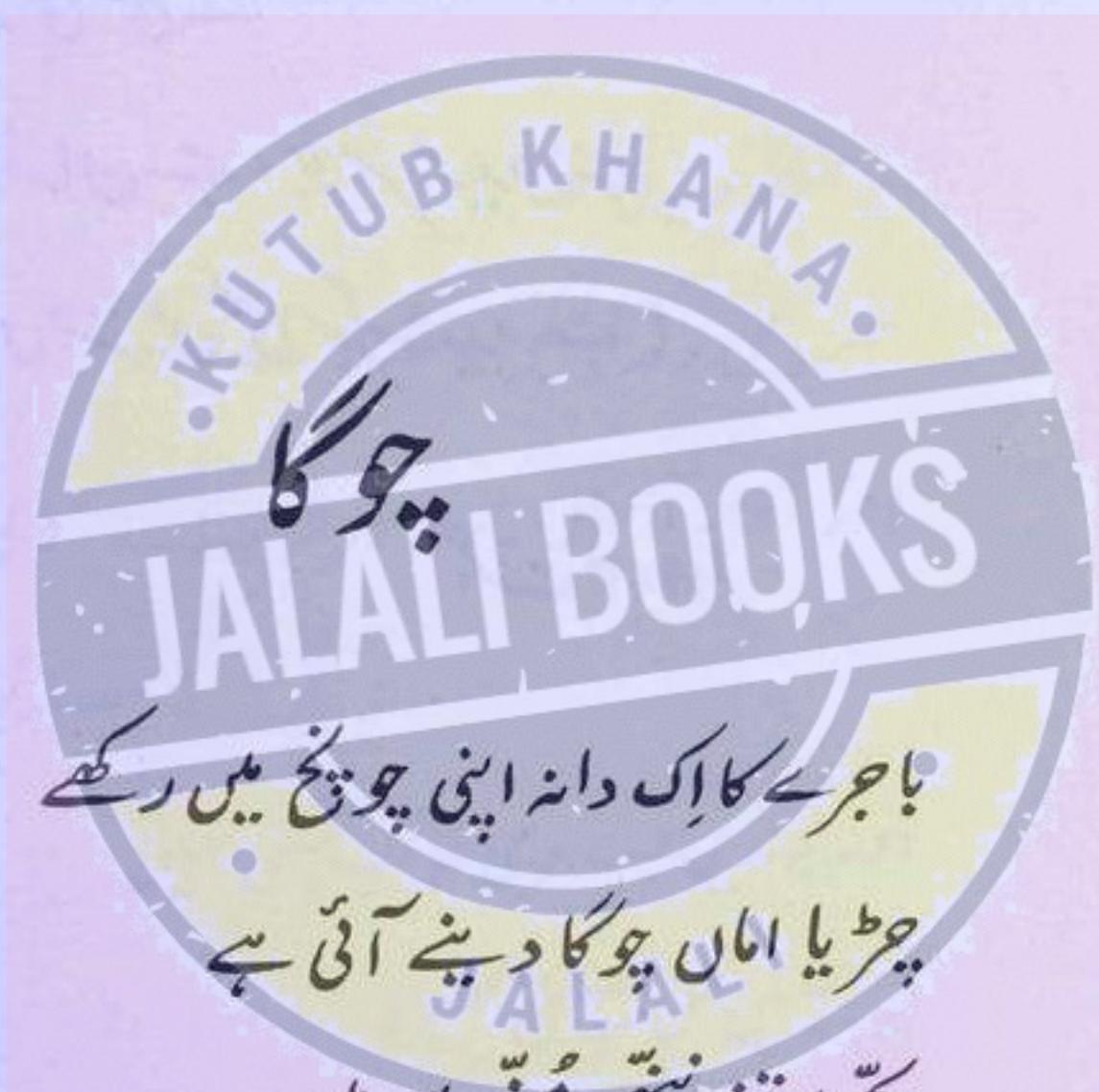
جب وہ چیختے ہیں

سر سے پنجوں تک چونچیں بن جاتے ہیں

دانہ ایک اور بچّے دس ہیں

چڑیا امّاں کس کو چوگا دے

کس کس کی چونچ سے چونچ ملا کر ڈھارس دے

ذرّہ توڑ کے حشر بپا کرنا تو تم نے سیکھ لیا ہے
دانہ توڑ کے زندگی برپا کرنا اس سے اُونچا فن ہے

کیا تم دانہ توڑ سکو گے ؟
دانہ ایک اور بچّے دس ہیں !

اگست ۷۳ء۱۹
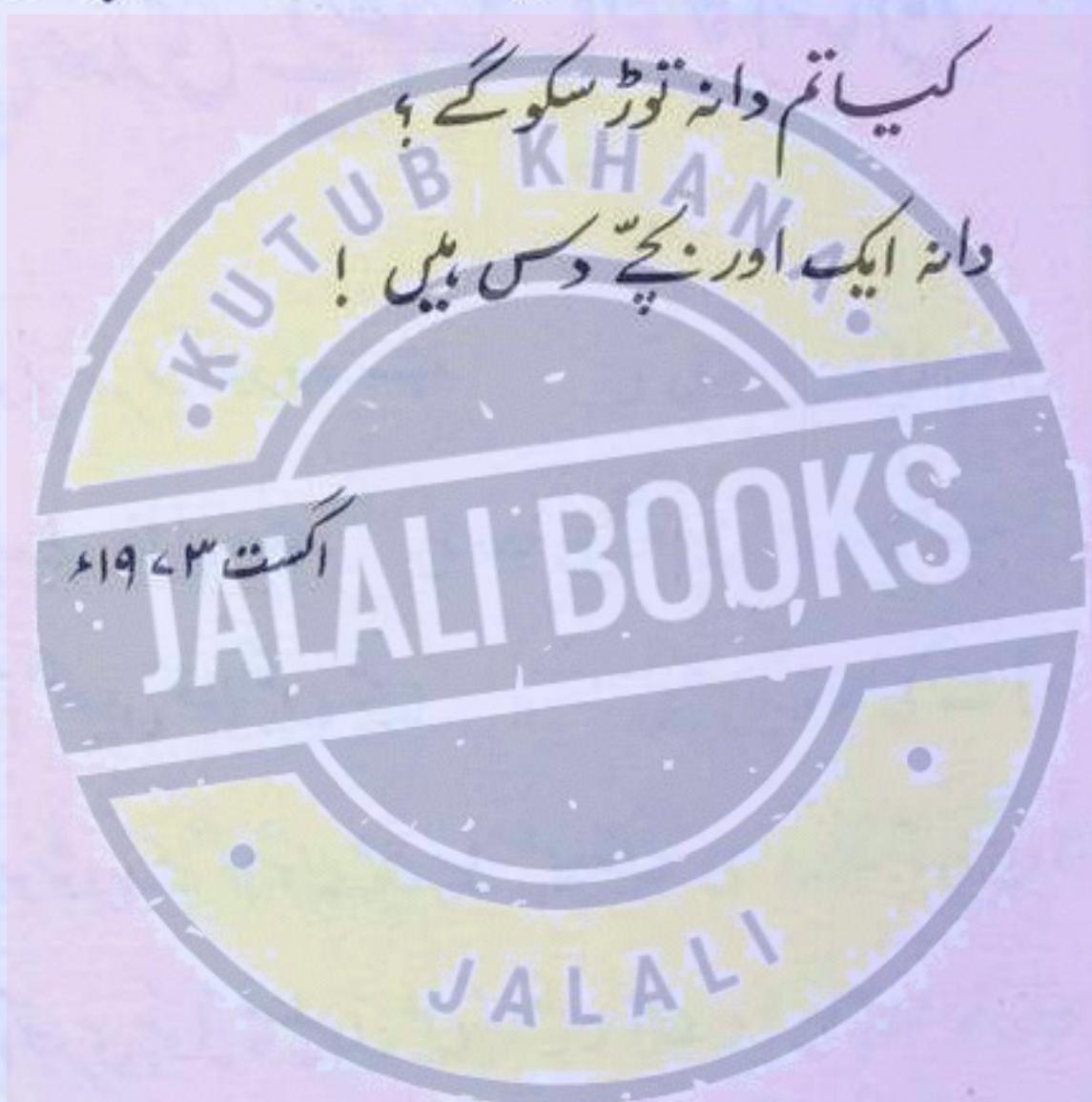
بیسویں صدی کے نصف آخر کا اِنسان

آدمی سر بر آوردہ ہے

پیٹ خالی ہے

آنکھیں خلائیں ہیں

ہونٹوں کے گوشوں میں پیاسیں ہیں

اُبھری ہوئی پسلیوں میں کمانیں ہیں
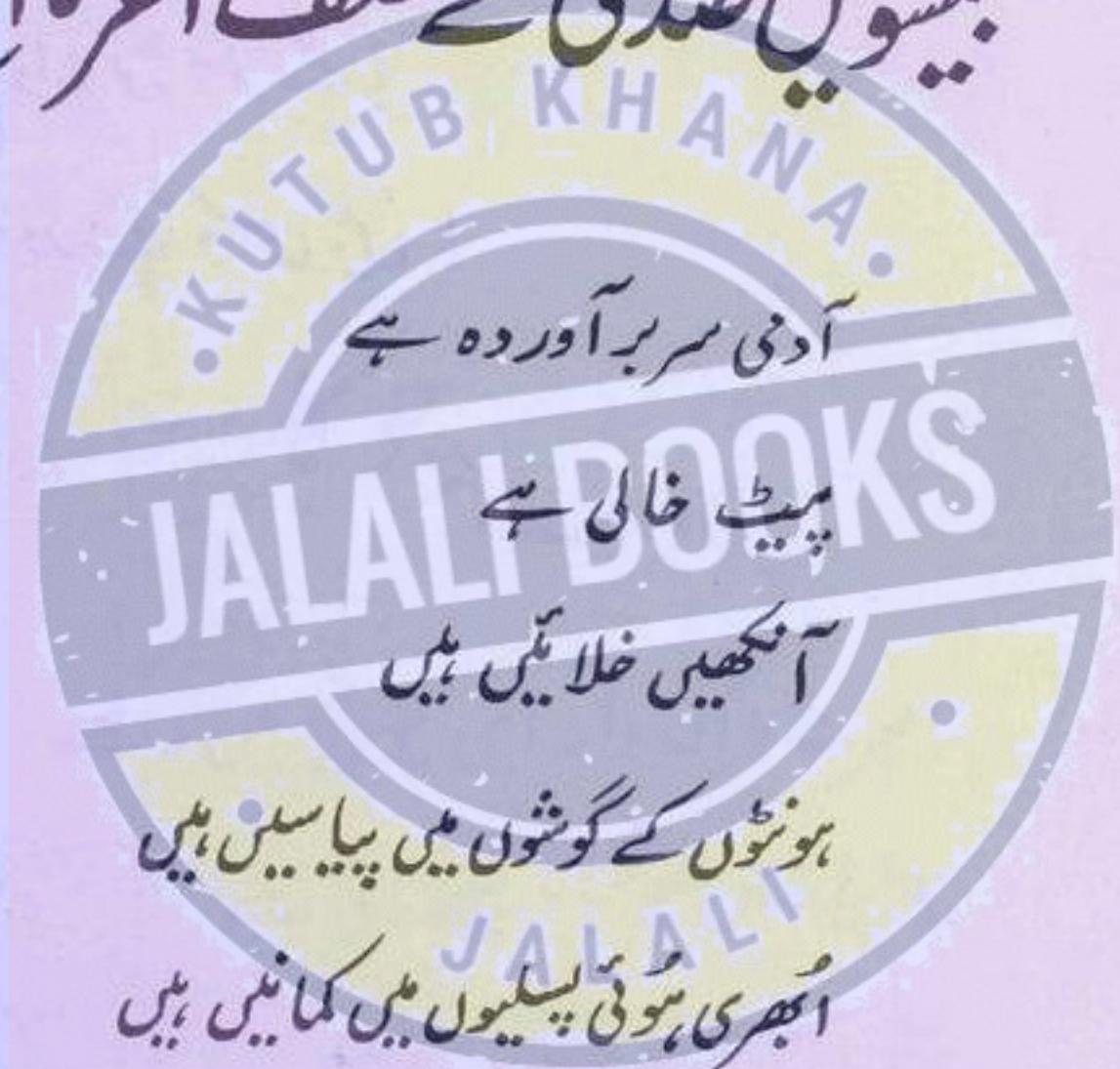
اور استخواں ہاتھ میں

رُوح کی ایک دھجّی کا پرچم لیے

آدمی سر بر آوردہ ہے

اگست ۱۹۷۳ء

یار لوگ

بوم مزاجی یاروں کی

سب میری دیکھی بھالی

رات کی تاریکی میں

ان کی انگارہ سی آنکھیں — پوری!

دن کو اندھی اور ادھوری!

خالی!
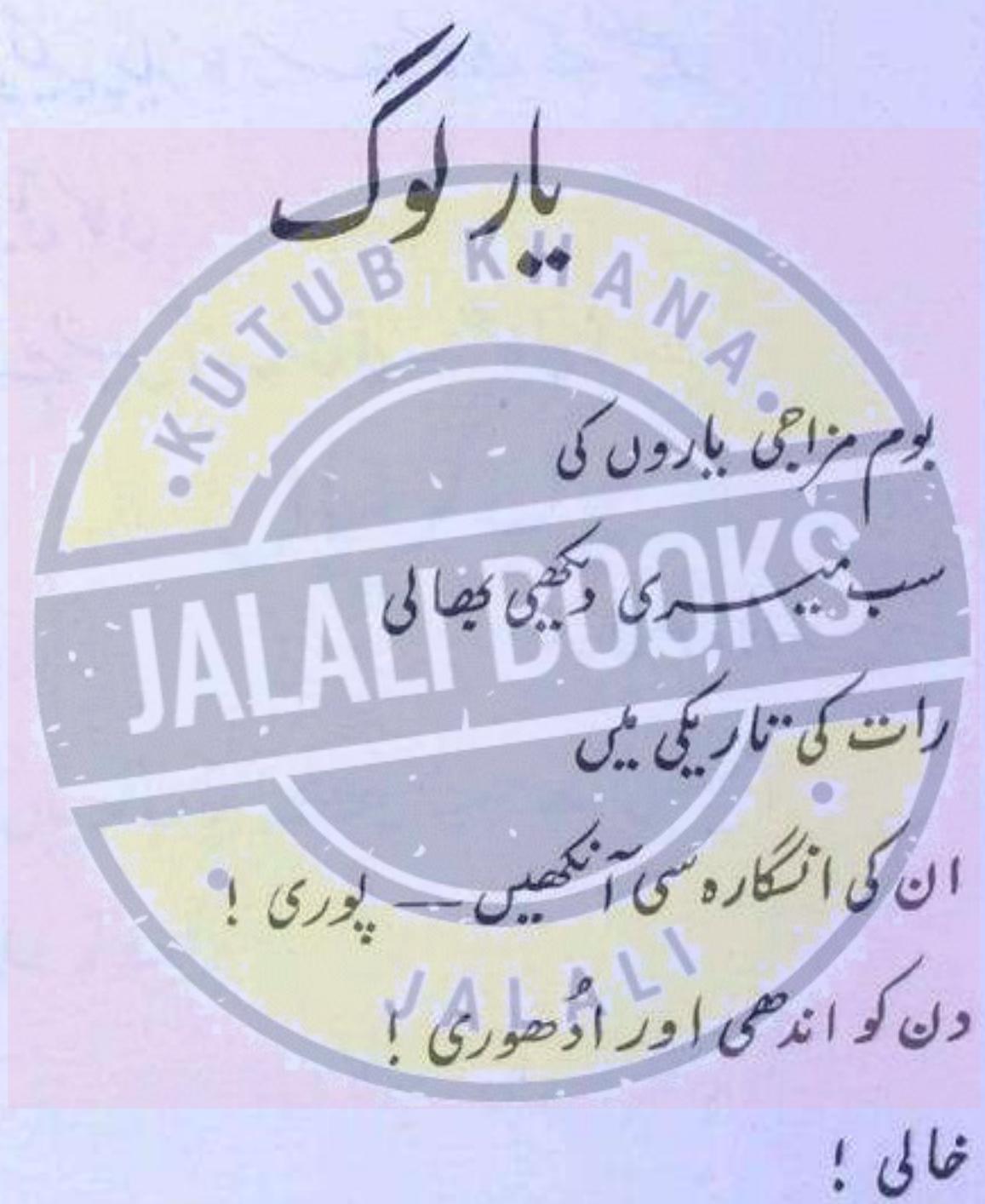
دن کے یہ درویش مگر راتوں کے والی

اپنے محسن کو جب دن کے آئینے میں دیکھیں

فرطِ ادب سے سمٹیں، سُکڑیں، جُھک جائیں

اور کچلے، مسلے، روندے لہجے میں پُوچھیں

کیسا ہے مزاجِ عالی؟ —

رات کو لیکن پیار کا رستہ کاٹ کے نکلیں

جیسے بلّی کالی

ان کی ہے بس ایک نشانی — گالی!

مارچ ۱۹۷۳ء

چاکِ گریباں

اُس نے جب میرے چاکِ گریباں کو

دیکھا تو بولی

'نمودِ سحر ہو رہی ہے'
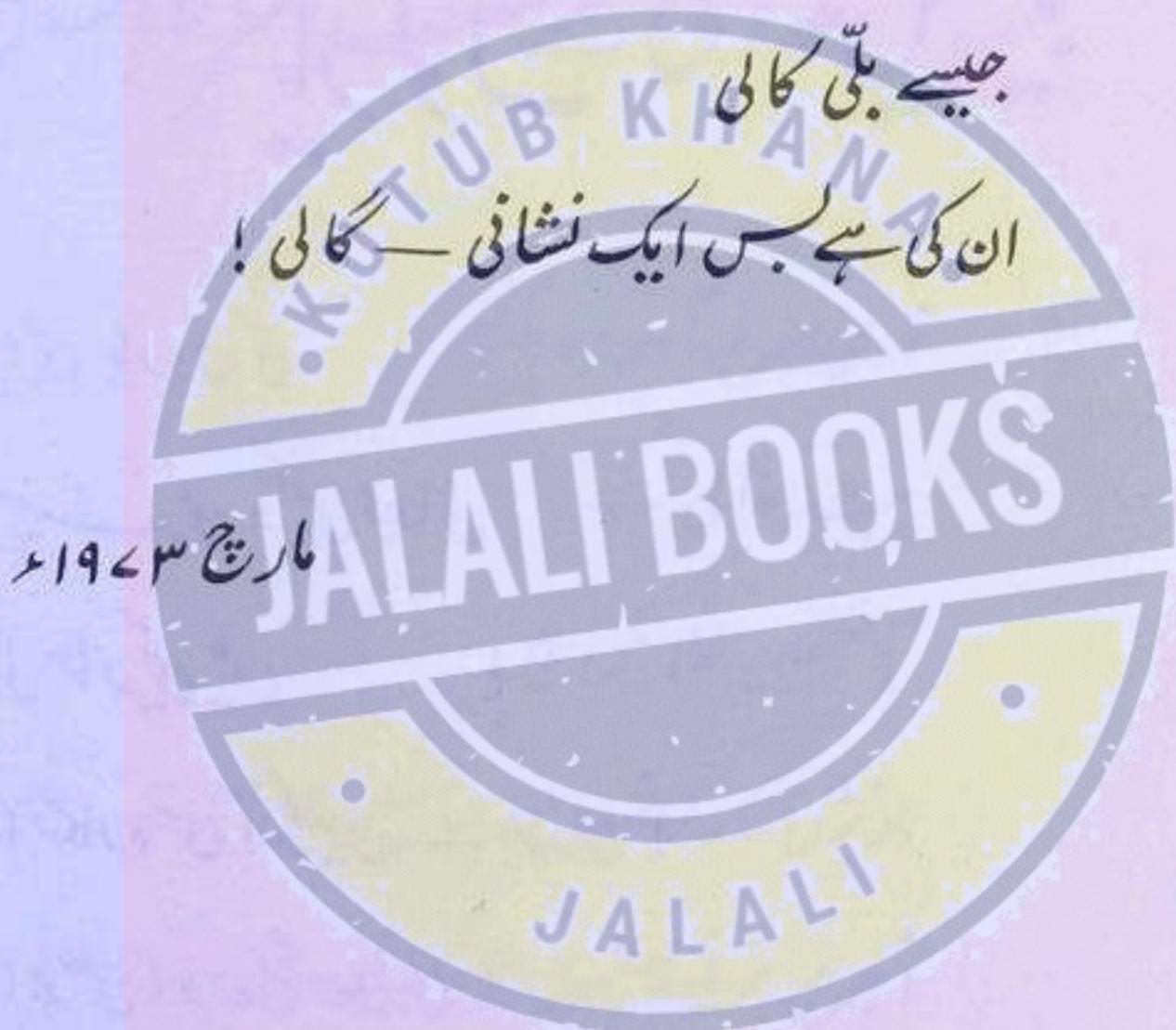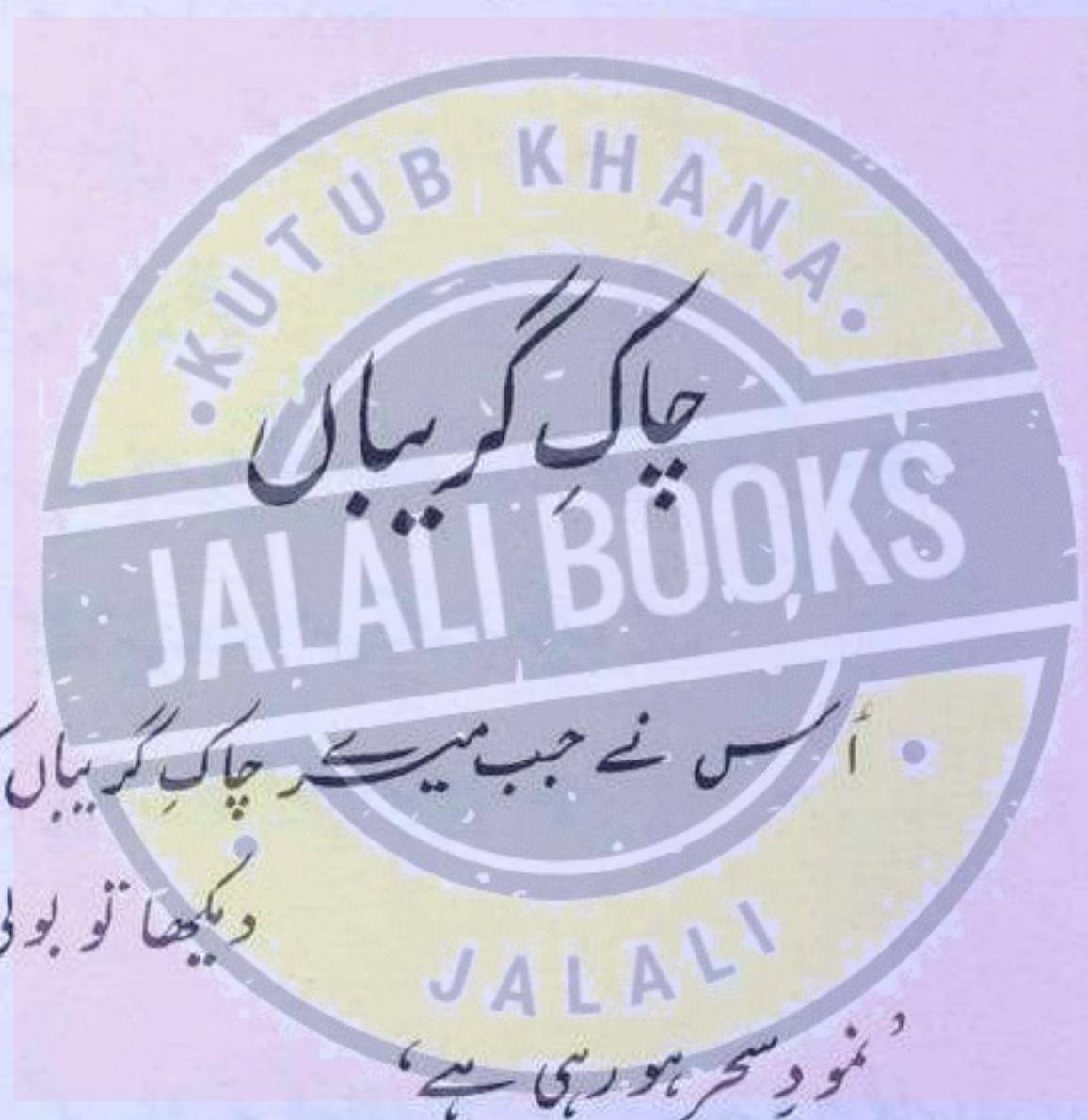
مجھے فیض کی یاد آئی

کہ موجِ ہوائے بیاباں میں

اس کے گریباں کے ہر چاک سے

"لیلیٰ لیلیٰ" کی آواز آتی تھی

کہتے ہیں

اک روز آندھی چلی

اور لیلیٰ جو خیمے میں خوابیدہ تھی

چیخ اُٹھی تھی

مُرے قیس، تُو آئنے کیوں سجائے کھڑا ہے

مجھے تیرے دامن کے ہر چاک میں

اپنی صُورت نظر آرہی ہے"

گریباں تو یکساں ہیں ہر عہد، ہر قوم،

ہر مُلک کے عاشقوں کے

وہ ہیلن کا، لیلیٰ کا یا ہیر کا ہم زمانہ ہو

یونان کا دل گرفتہ ہو یا نجد و پنجاب کا

ایک ہی لمحۂ بے بسی میں گرفتار ہے

وہ گریباں کو یوں چاک کرتا ہے جیسے بدن

چاک کرنے چلا ہے!

مگر اُس نے جب میرے چاکِ گریباں کو

دیکھا تو بولی :

نمودِ سحر ہو رہی ہے'

اگست

۱۹۷۲ء

۲۵۔ الفاظ

(بنگلہ دیش کی "بہاری" آبادی کے خطوط)
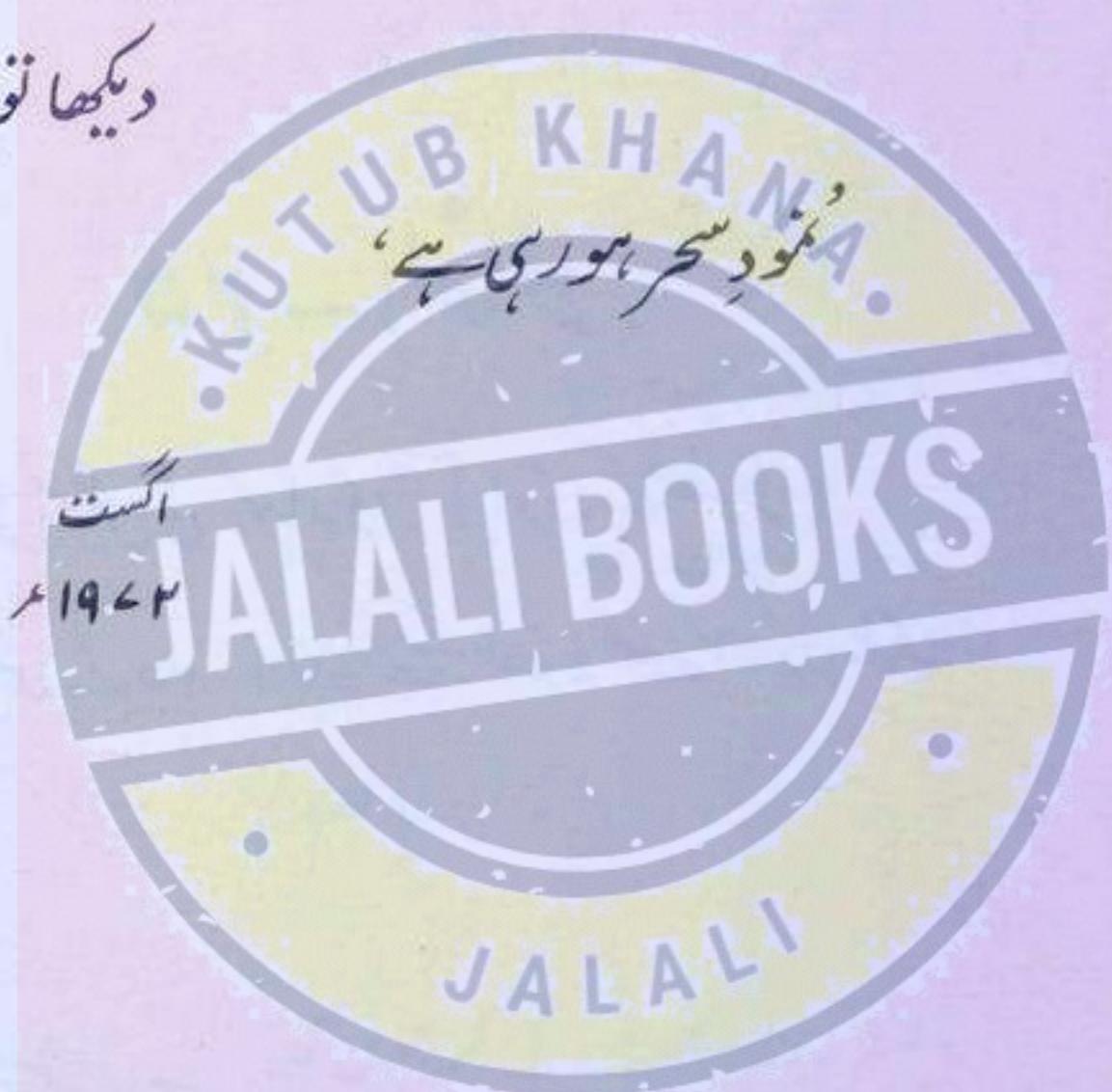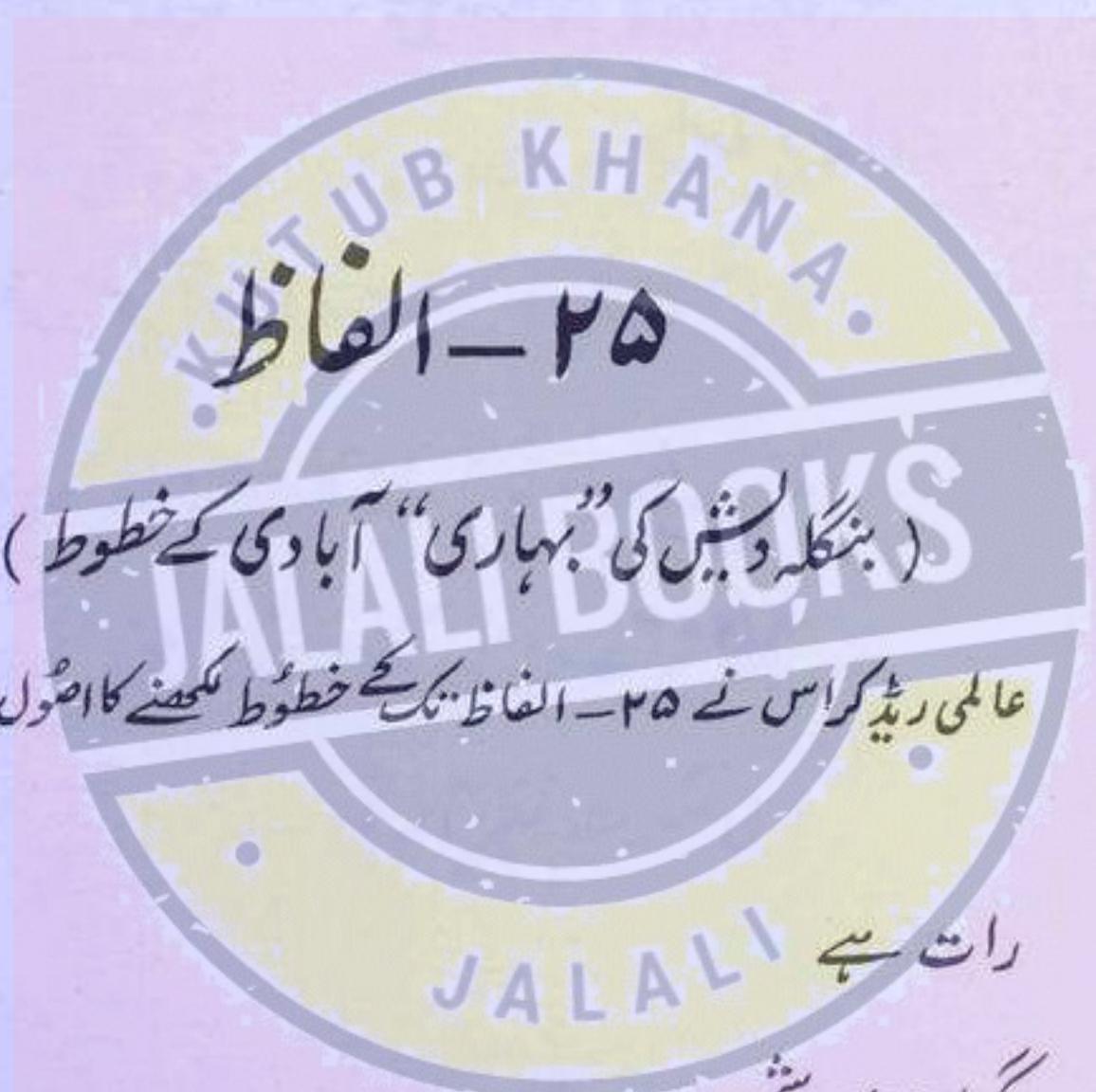
عالمی ریڈ کراس نے ۲۵۔ الفاظ تک کے خطوط لکھنے کا اصول طے کیا تھا

رات ہے

گھات میں دشمن ہے

وہ دشمن ، جو مرا بھائی ہے

میرا ہتھیار ، فقط —

(اے مرے اربابِ وطن)

آپ کی بخشی ہوئی تنہائی ہے

(۲)

چلو، یُوں کریں
اِس کگر سے سمندر میں کُودیں
مگر جسم کے ساتھ پتھّر بھی ہوں
اپنی تاریخ کے
اپنی تہذیب کے
اپنے ایمان کے

(۳)

نظریّات کے بِلّور کی کرچوں کو
مرے سینۂ بریاں میں بھر دو
اور پھر میرے تڑپتے ہُوئے لاشے کے چھناکے پہ
کوئی رقص کرو
رقص کرو

(۴)

میرے نورِ نظر!

جب صدی دو صدی بعد

اس سمت آنا

کسی ناریل کے تلے

(کوئی بھی ناریل ہو)

مجھے یاد کرنا

مجھے بھول جانا

(۵)
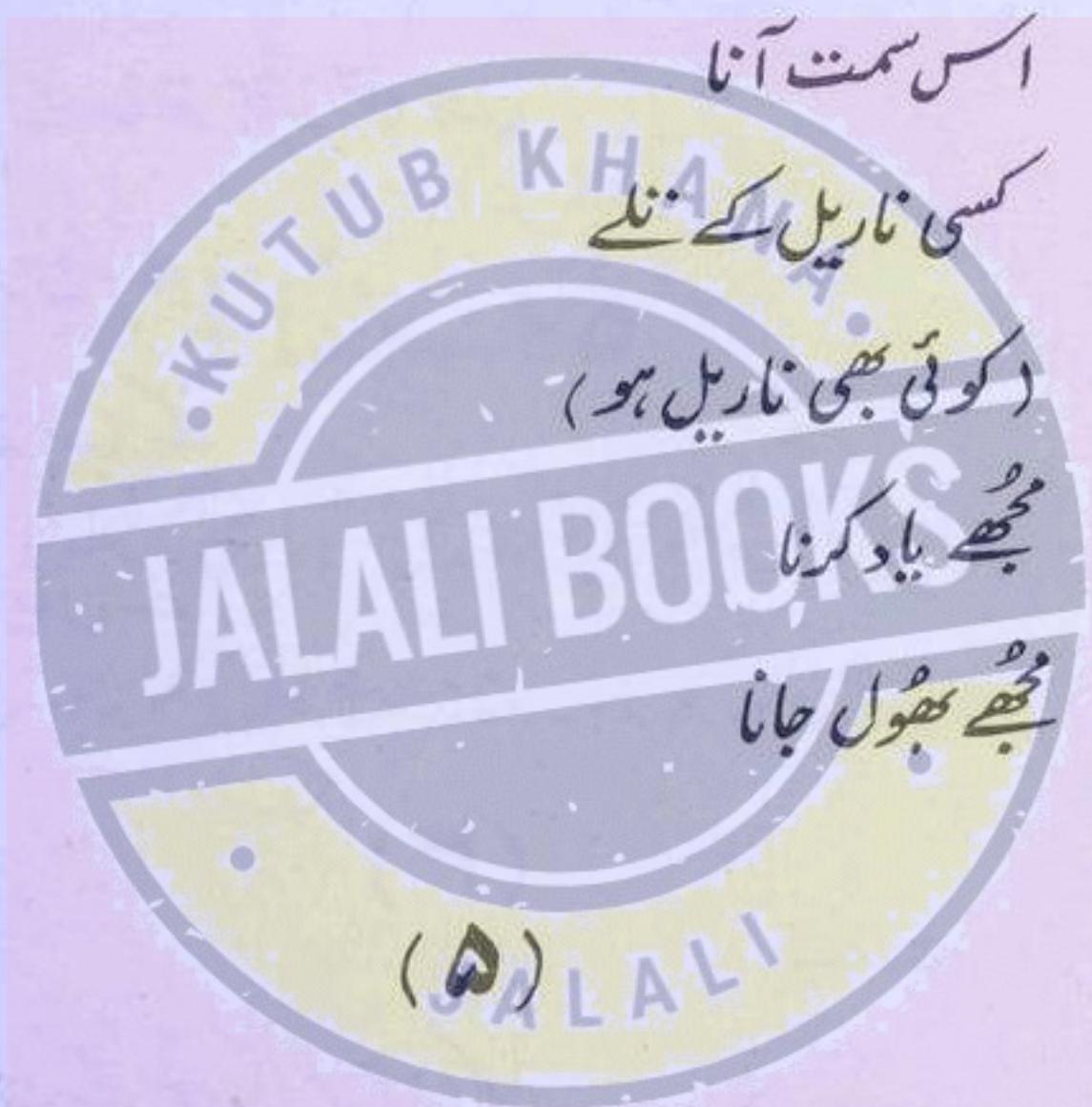
میں پکاری

میں عورت بھی ہوں

عالمِ آدمیت کی عزت بھی ہوں

اور وہ بولا

کہ میں تیرا بھائی بھی ہوں

اور فدائی بھی ہوں

(۶)

شہر ٹیگور کے ایک بازار میں

تین سو میری عصمت کی قیمت پڑی

آخری بولی جس شخص نے دی

وہ ٹیگور کا کتنا ہم شکل تھا!

(۷)
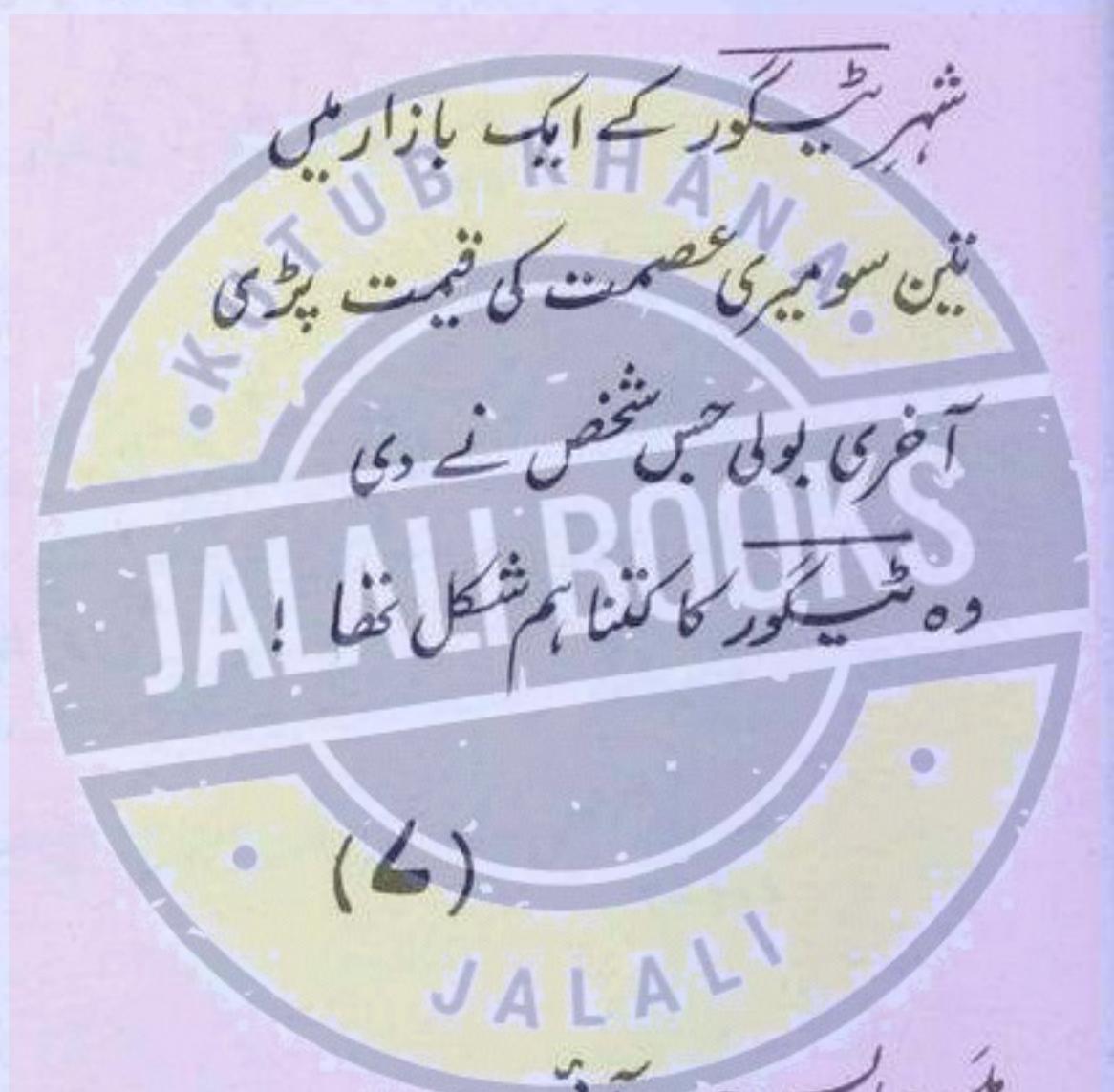
میں واپس جب آئی

تو رو کر پکاری ـــــ

"مرا جسم اب چیتھڑا ہے"

کہا میری امّی نے ـــــ

"بیٹی، نہ رو

سب کا شاہد خدا ہے"۔

(۸)

بھیّا، جب تُم مُجھ کو لینے آنا

اُردو کا اِک لفظ نہ کہنا

چُپکے رہنا

مجبُوراً کچھ کہنا پڑے تو اِتنا

"مَیں گونگا ہُوں"

مئی
۱۹۷۲ء

ایک ذاتی نظم

عمر بھر جن کو سکھاتا رہا میں ابجدِ فن
طعنہ زن ہیں مرے فن پر کہ یہ گہرا ہے بہت
جیسے خفاش نے خورشید کے بارے میں کہا
صورت اچھی ہے مگر رنگ سنہرا ہے بہت
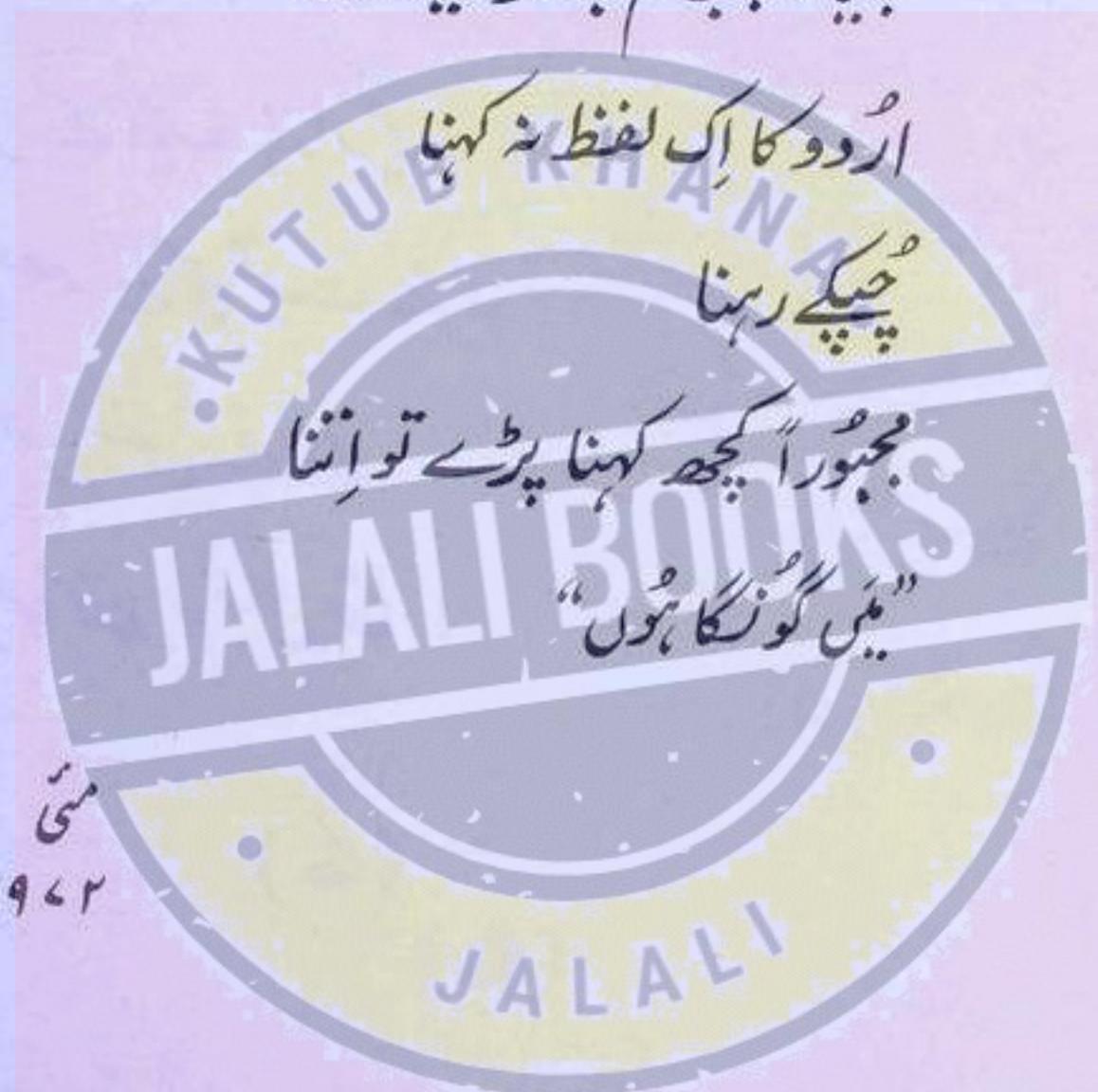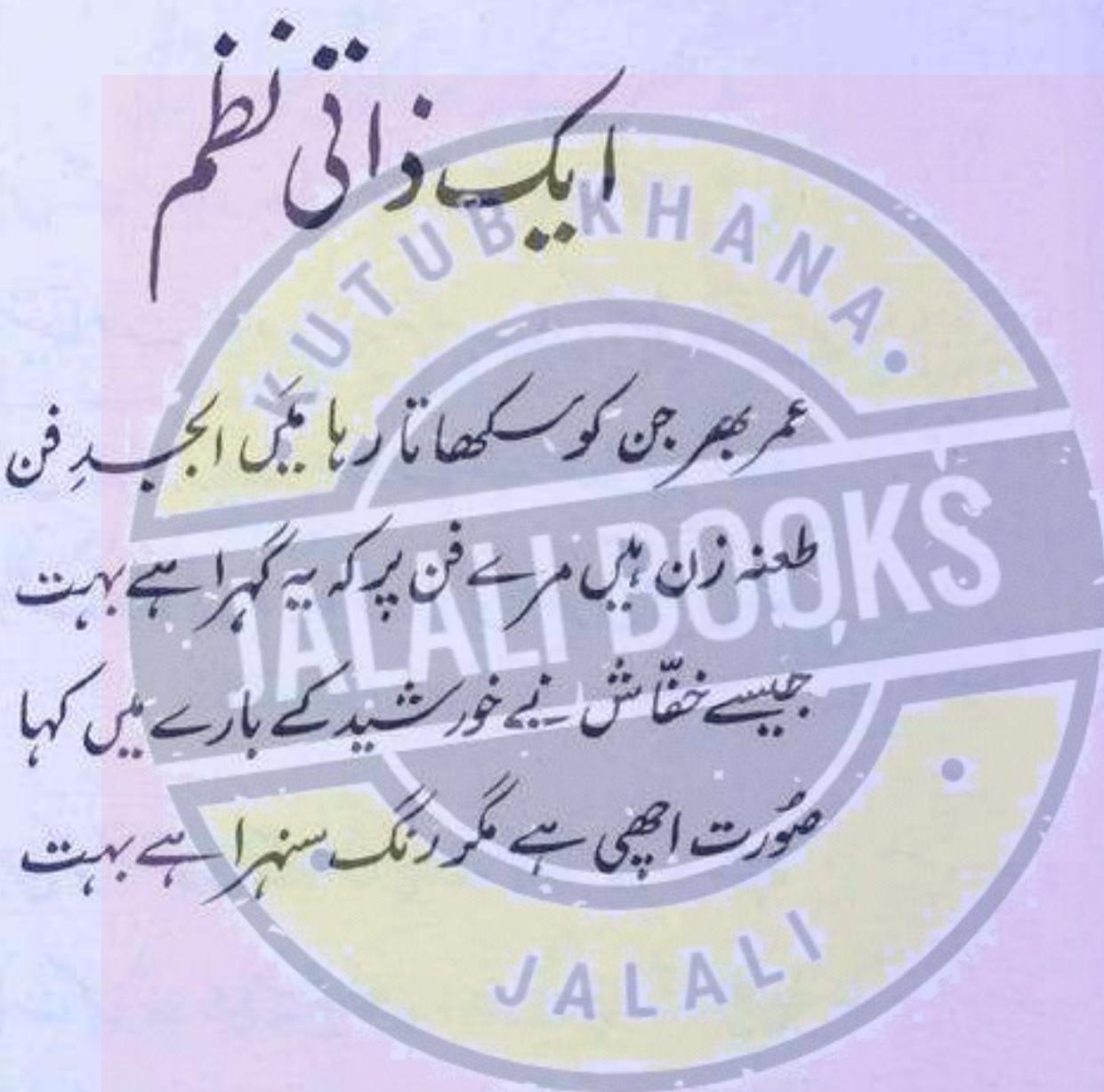
وہ جنھیں منصبِ شاعر سے نہیں آگاہی
نوکِ شمشیر سے شعروں کی گرہ کھولتے ہیں
صحنِ گلشن میں بھی پایا انھیں میزان بدست
پھول کو جنسِ تجارت کی طرح تولتے ہیں

ذات کے گنبدِ بے در میں جو بھٹکے برسوں
انھیں انسان کے رشتوں کی خبر کیا ہو گی
یوں بظاہر تو وہ اربابِ نظر ہیں، لیکن
جو محبّت سے نہ اُٹھی، وہ نظر کیا ہو گی

جن کے معیار بدل جاتے ہیں ہر موسم میں
استقامت کا وہ مفہوم کہاں سمجھیں گے
جن کے نزدیک بصارت ہے فقط عجزِ نگاہ
دشت کو آگ، پہاڑوں کو دھواں سمجھیں گے

جن کو لفظوں کے معانی سے کچھ ایسی کد ہے
بات کرتے ہی پشیمان سے رہ جاتے ہیں
اُن کو کیا میرے مقامات کا عرفاں ہوگا
جو مجھے دیکھ کے حیران سے رہ جاتے ہیں

مارچ ۱۹۷۲ء

شبنم کے ساتھ حادثہ

شب کو شبنم کا اُترنا تو عناصر کا تقاضا تھا
سو شبنم اُتری
شب، جو ظلمات کی پروردہ ہے
تاریک تو ہوتی ہے
کہ تاریک نہ ہو گی تو وہ شب کیا ہو گی
شبنم اس شب کے خم و پیچ سے آگاہ نہ ہوتی
تو اُترتی کیسے
سو وہ صدیوں کے وظیفے کے مطابق اُتری
تو اُترتے ہی مچل کر رو دی
اور چلّائی ——

— کہاں ہیں مری کلیاں، مرے غنچے، مرے پھول
نہ کسی شاخ پہ پتّہ، نہ کسی کھیت میں اِک نوکِ گیاہ
ہر طرف ریت کے انبار — نمو کی قبریں
اور مَیں رُوحِ نمو — جُوئے نمو
اب زمیں پر جو اُترتی ہوں تو مر جاؤں گی
اور پلٹ بھی نہیں سکتی کہ پلٹنا تو نہیں خُوئے نمو

مارچ ۱۹۷۲ء

اگر ہے جذبۂ تعمیر زندہ

اگر ہے جذبۂ تعمیر زندہ
تو پھر کس چیز کی ہم میں کمی ہے

جہاں سے پھول ٹوٹا تھا — وہیں سے
کلی سی اِک نمایاں ہو رہی ہے
جہاں بجلی گری تھی — اب وہی شاخ
نئے پتّے پہن کر تن گئی ہے

خزاں سے رُک سکا کب موسمِ گُل
یہی اصلِ اصُولِ زندگی ہے
اگر ہے جذبۂ تعمیر زندہ
تو پھر کس چیز کی ہم میں کمی ہے

کھنڈر سے کل جہاں بکھرے پڑے تھے
وہیں سے آج ایواں اُٹھ رہے ہیں
جہاں کل زندگی مبہوت سی تھی
وہیں پر آج نغمے گونجتے ہیں
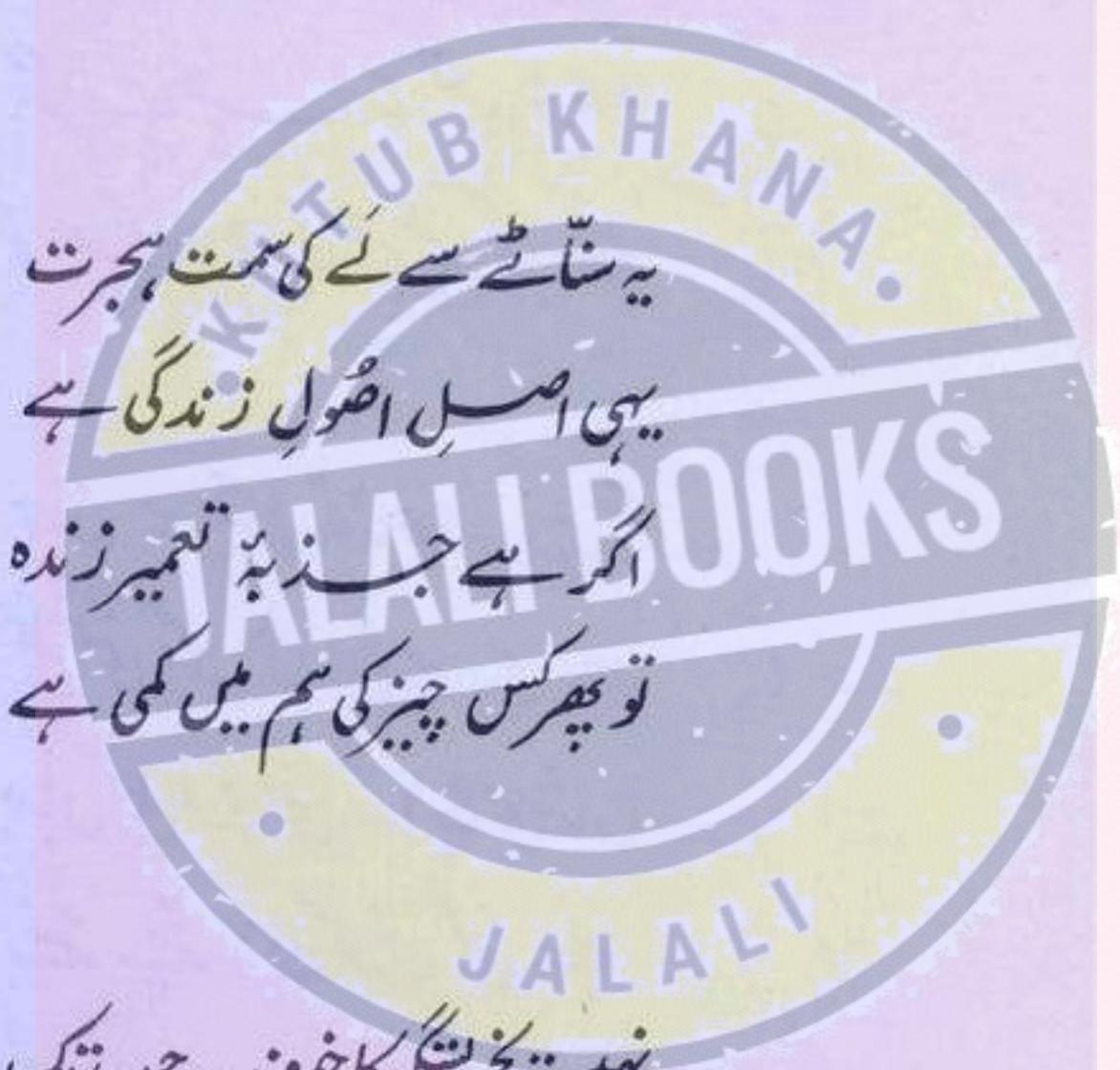
یہ سنّاٹے سے لَے کی سمت ہجرت
یہی اصلِ اصُولِ زندگی ہے
اگر ہے جذبۂ تعمیر زندہ
تو پھر کس چیز کی ہم میں کمی ہے

نہیں یخ بستگی کا خوف ۔ جب تک
شعاعیں برف پر لرزاں رہیں گی
اندھیرے جم نہیں پائیں گے ۔ جب تک
چراغوں کی لَویں رقصاں رہیں گی

بشر کی، اپنی ہی تقدیر سے جنگ
یہی اصلِ اصولِ زندگی ہے
اگر ہے جذبۂ تعمیر زندہ
تو پھر کس چیز کی ہم میں کمی ہے

مارچ ۱۹۷۲ء
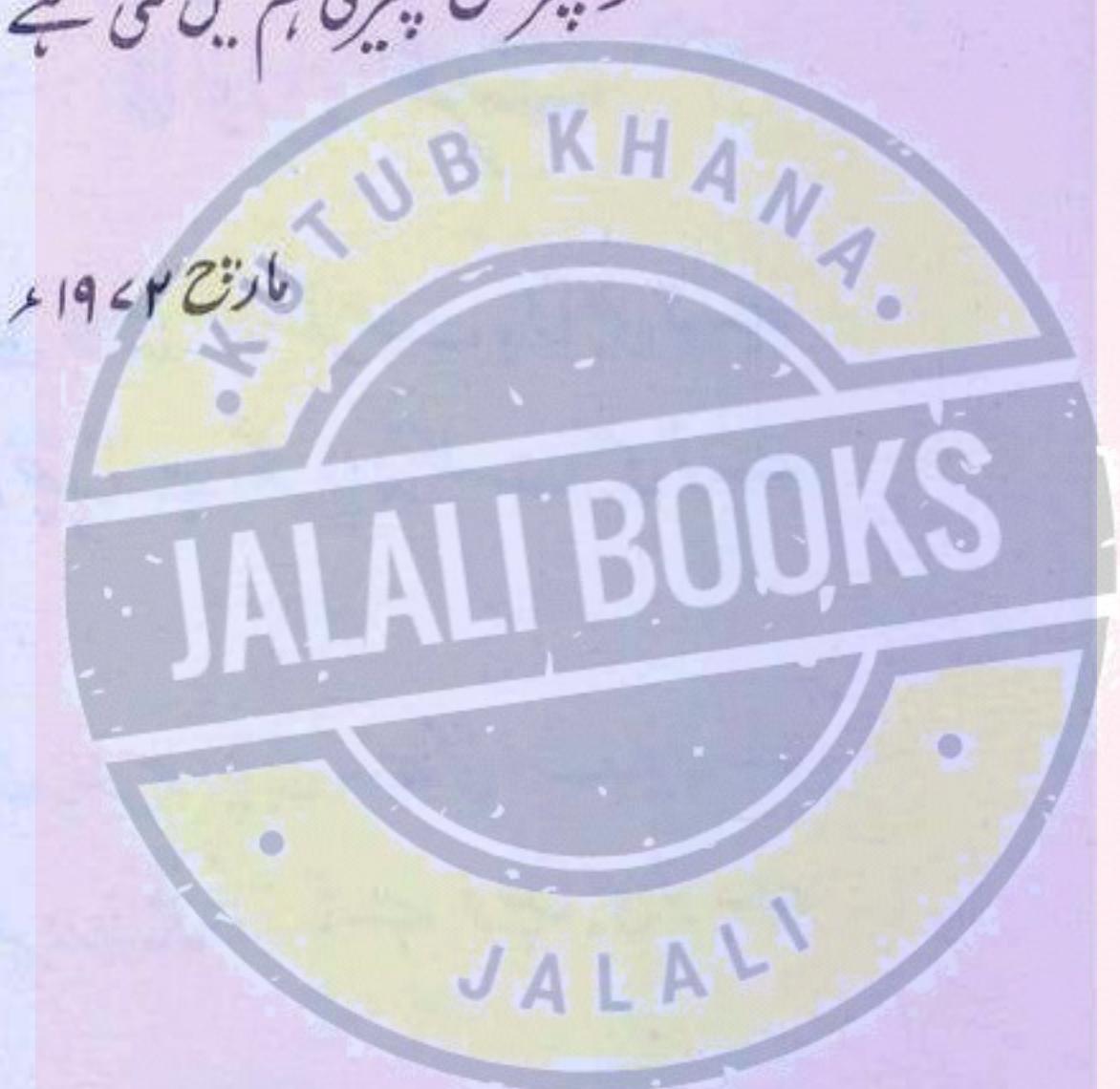
قانونِ فطرت

وقت بڑھتا ہے، مگر سمت بدلتا بھی تو ہے
چاند چھپتا ہے، مگر چاند نکلتا بھی تو ہے

ایک پتھر جو اپاہج ہے کئی صدیوں سے
قعرِ دریا میں اُترتا ہے تو چلتا بھی تو ہے

جو دیا طاق پہ رکھا تھا، اگر بجھنے لگا
دل جو سینے میں دھڑکتا ہے وہ جلتا بھی تو ہے

اِک نہ اِک روز جھپٹتے ہیں شغالوں پہ غزال
جام بھر جاتا ہے جس وقت چھلکتا بھی تو ہے

جبر کی آگ ہمیشہ تو نہیں جل سکتی
چاہے خورشیدِ قیامت ہو، وہ ڈھلتا بھی تو ہے

برف انبار در انبار جمی ہے ۔ لیکن
ایک موسم میں یہ کہسار پگھلتا بھی تو ہے

۳۱ - جنوری
۱۹۷۲ء
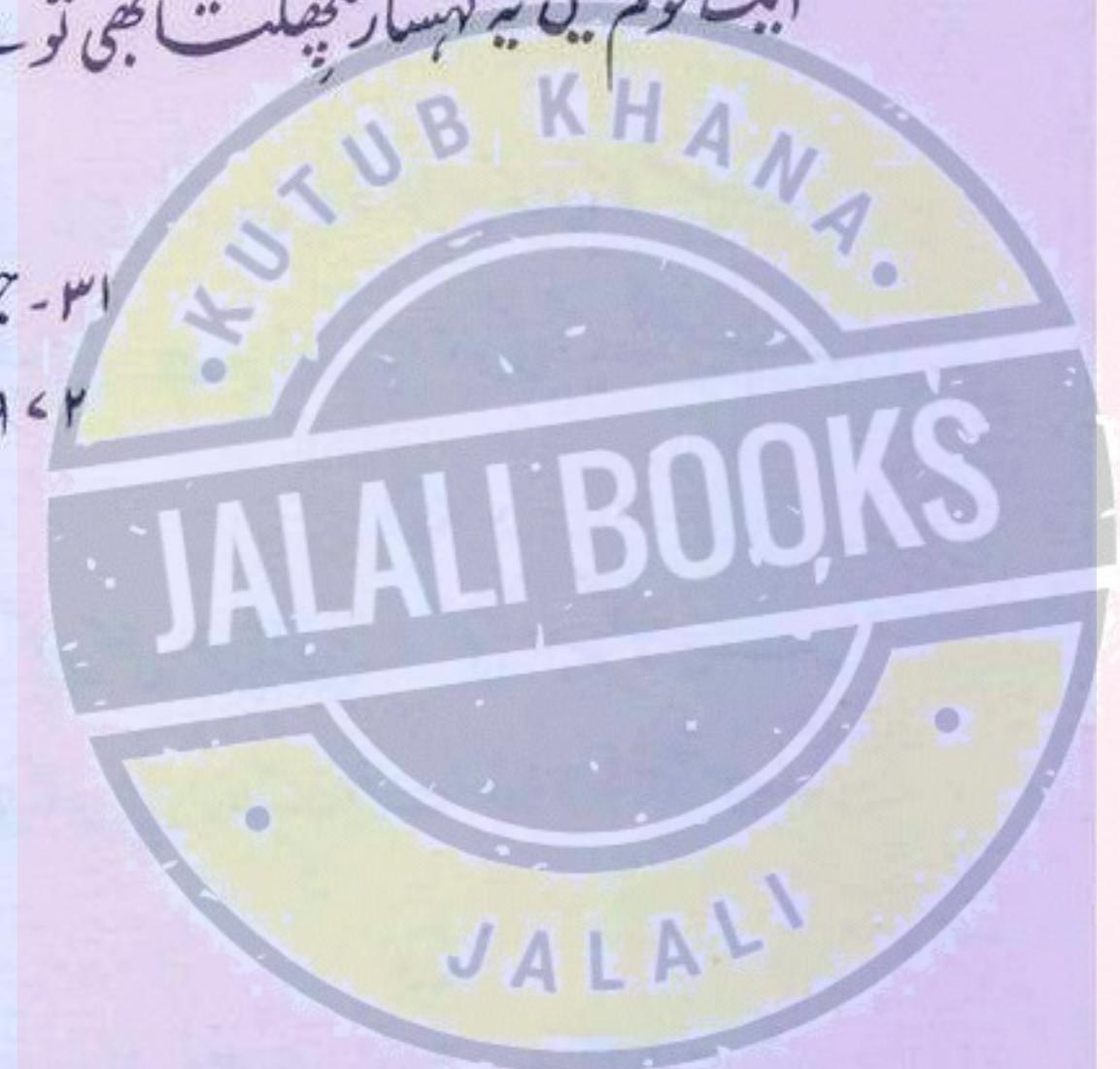
دوہے

لالچ تاج و تخت کا، کڑی کمان کا تیر
کھینچتا ہے ہر دور پر، لہو کی ایک لکیر

○

دیکھے کل چوپال پر، کئی امیر کبیر
قد اونچے، طرّے بڑے، ذرا ذرا سے ضمیر

○

نذرانے لیتا ہُوا، گاؤں میں آیا پیر
ریشم کے ملبوس میں، مانگے بھیک فقیر

○

ہیر گریباں چاک ہے، چادر لیر و لیر
رانجھا ونجلی توڑ کر، تکتا ہے دلگیر

دُنیا کی تاریخ میں ڈھونڈیں کوئی نظیر
دُور دیس میں قید ہیں، جن بہنوں کے وِیر

○

کون بڑھائے حوصلے، کون بندھائے دِھیر
سب ہاتھوں پر خُون ہے، سب آنکھوں میں نیر

۳۱- جنوری
۱۹۷۲ء

بچّوں کا کھیل

سکیسٹر[1] کے قدموں میں اِک جھیل ہے

جس میں مُرغابیاں تیرتی ہیں

تو تصویر لگتی ہیں

چاروں طرف سر برآوردہ کہسار ہیں

جو غزالوں کے مسکن ہیں

---

۱ : وادیٔ سون (ضلع خوشاب) کا ایک پہاڑ
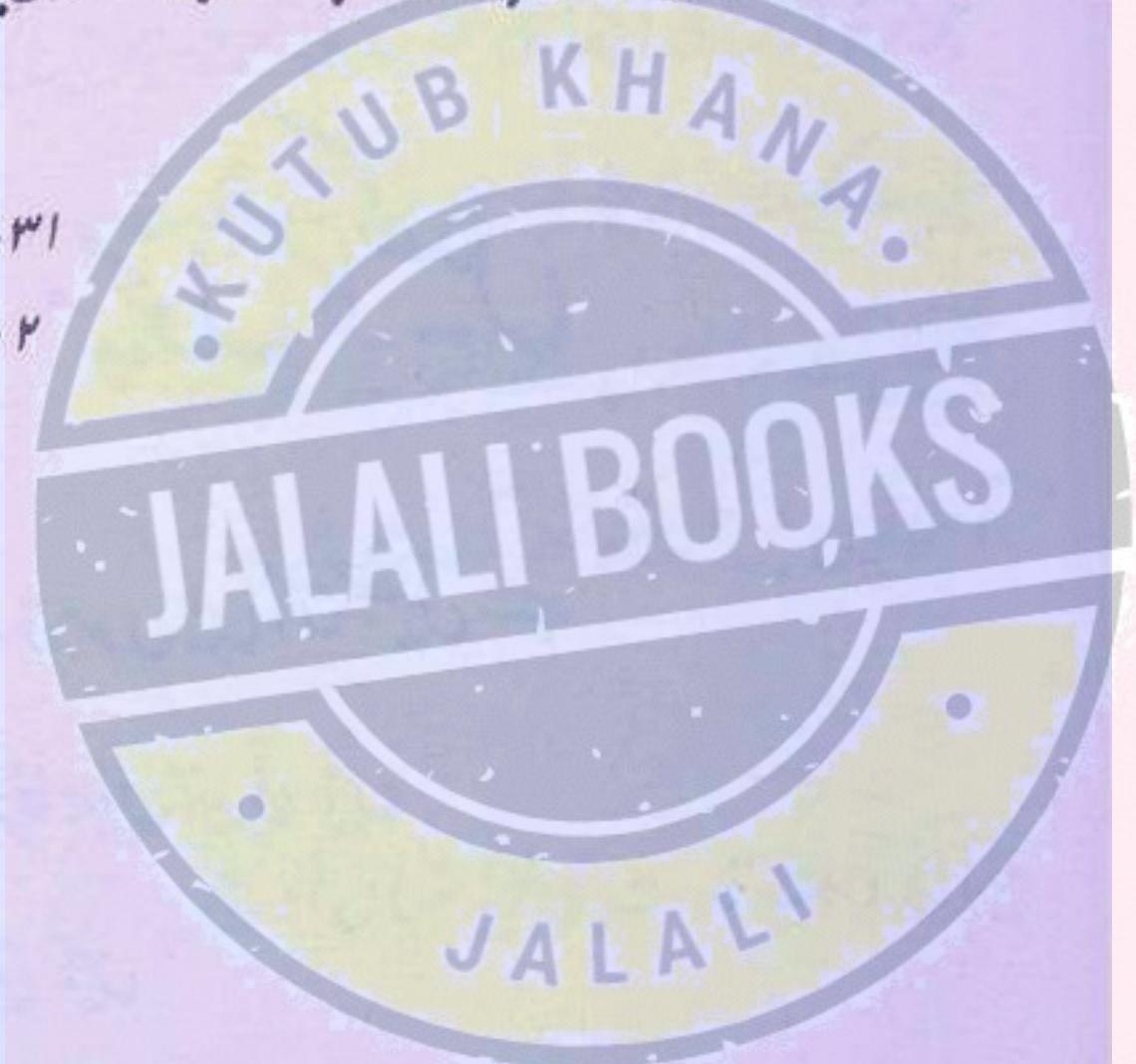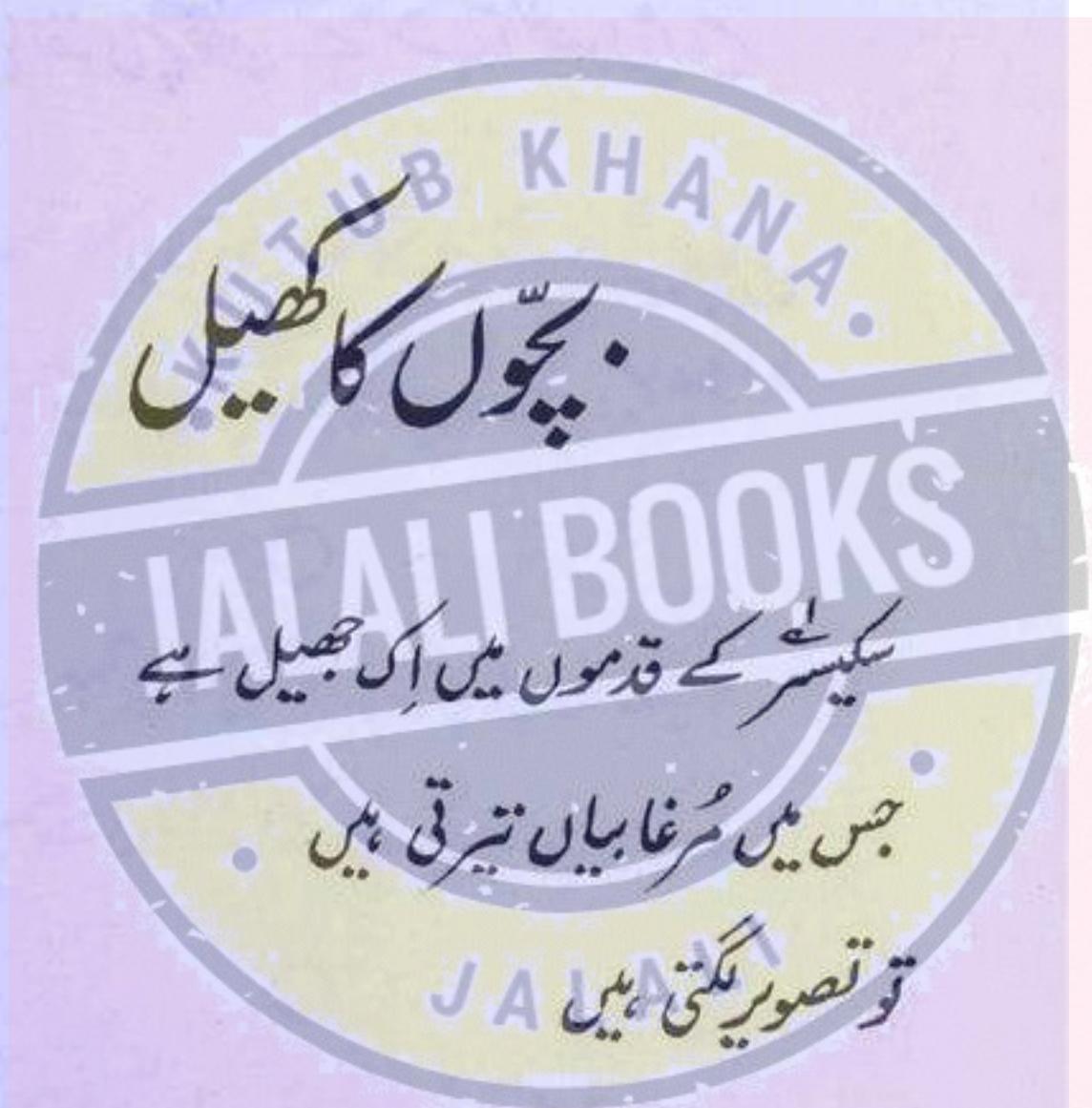
جنگل ہیں جن میں کہو اور زیتون کی چھاؤں

قالین کی طرح بچھتی ہوئی

زنتڑیوں[1] تک پہنچتی ہے

(یہ زنتڑیاں سُرخ مٹی کے کہسار پارے ہیں

جو کرۂ ارض کی ابتدا کی نمائندگی کر رہے ہیں)

ہرے کھیت، زینہ بہ زینہ تراشے ہوئے

جھیل کے ساحلوں سے اُبھرتے ہوئے

آسمانوں میں گھستے نظر آ رہے ہیں

یہاں دستِ قدرت کی فیاّ ضیاں اوج پر ہیں

مگر چشمِ قدرت نے شاید یہ دیکھا نہیں ہے

کہ اس جھیل کے اِک طرف میرا گاؤں بھی ہے

---

[1] : سرخ رنگ کی مٹی کی یہ صف بہ صف پہاڑیاں وادئ سون کے شمال میں ضلع چکوال کی تحصیل تلہ گنگ تک پھیلی ہوئی ہیں۔

جس کی ڈھلوان گلیوں میں
سونے کی رنگت کے معصوم بچّے
گھسے سنگ ریزوں سے
بلّور کی گولیاں کھیلتے ہیں

۲۳- جنوری
۱۹۷۲ء
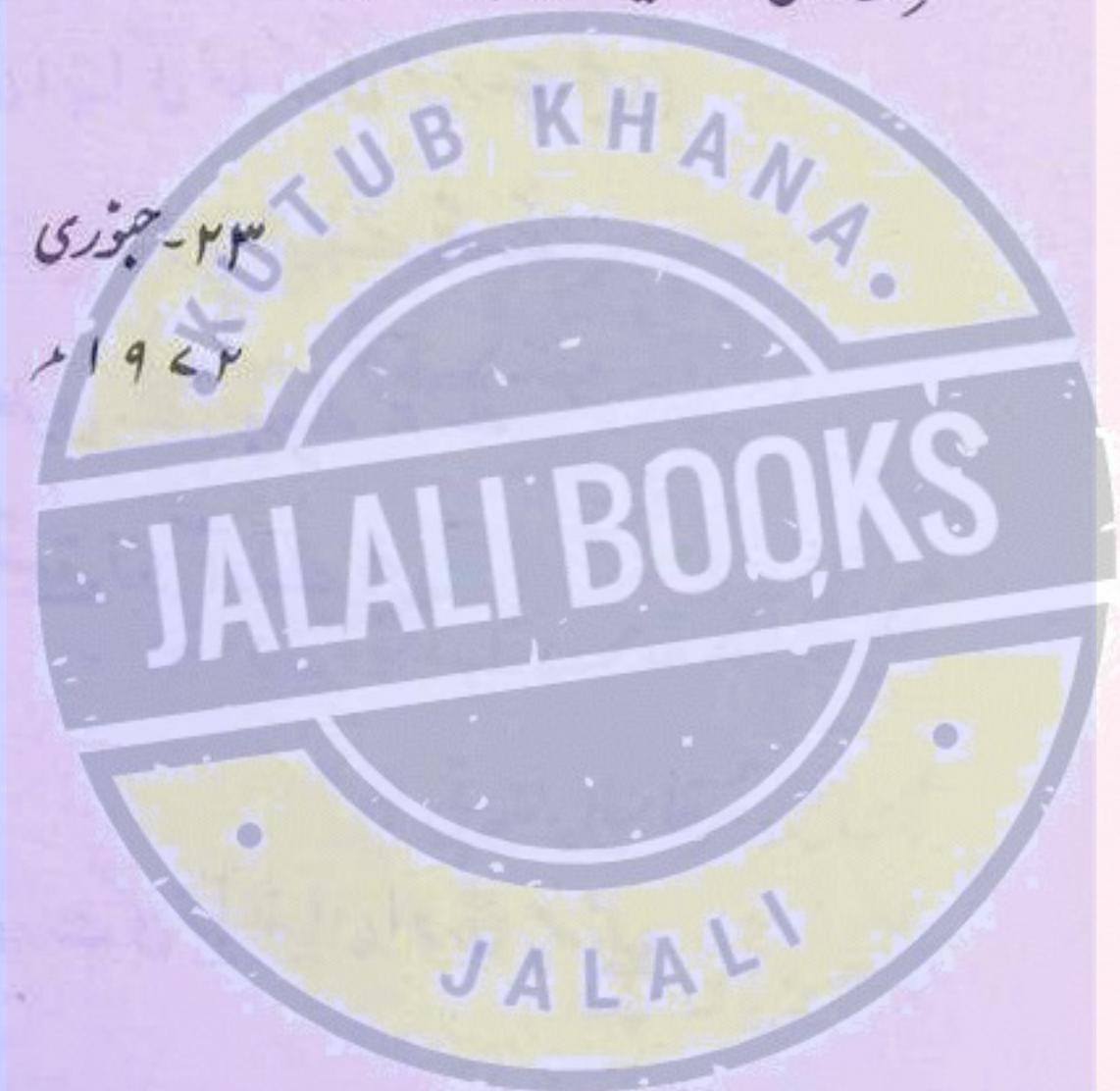
دُعا

یارب، مرے وطن کو اِک ایسی بہار دے
جو سارے ایشیا کی فضا کو نکھار دے

یارب، مرے وطن میں اِک ایسی ہوا چلا
جو اس کے رُخ سے گرد کے دھبّے اُتار دے

یارب، وہ ابر بخش کہ جو ارضِ پاک کو
حدِّ نظر تک اُمڈے ہُوئے سبزہ زار دے

میداں جو جل چکے ہیں، بُجھا ان کی تشنگی
شاخیں جو لُٹ چکی ہیں، انھیں برگ و بار دے
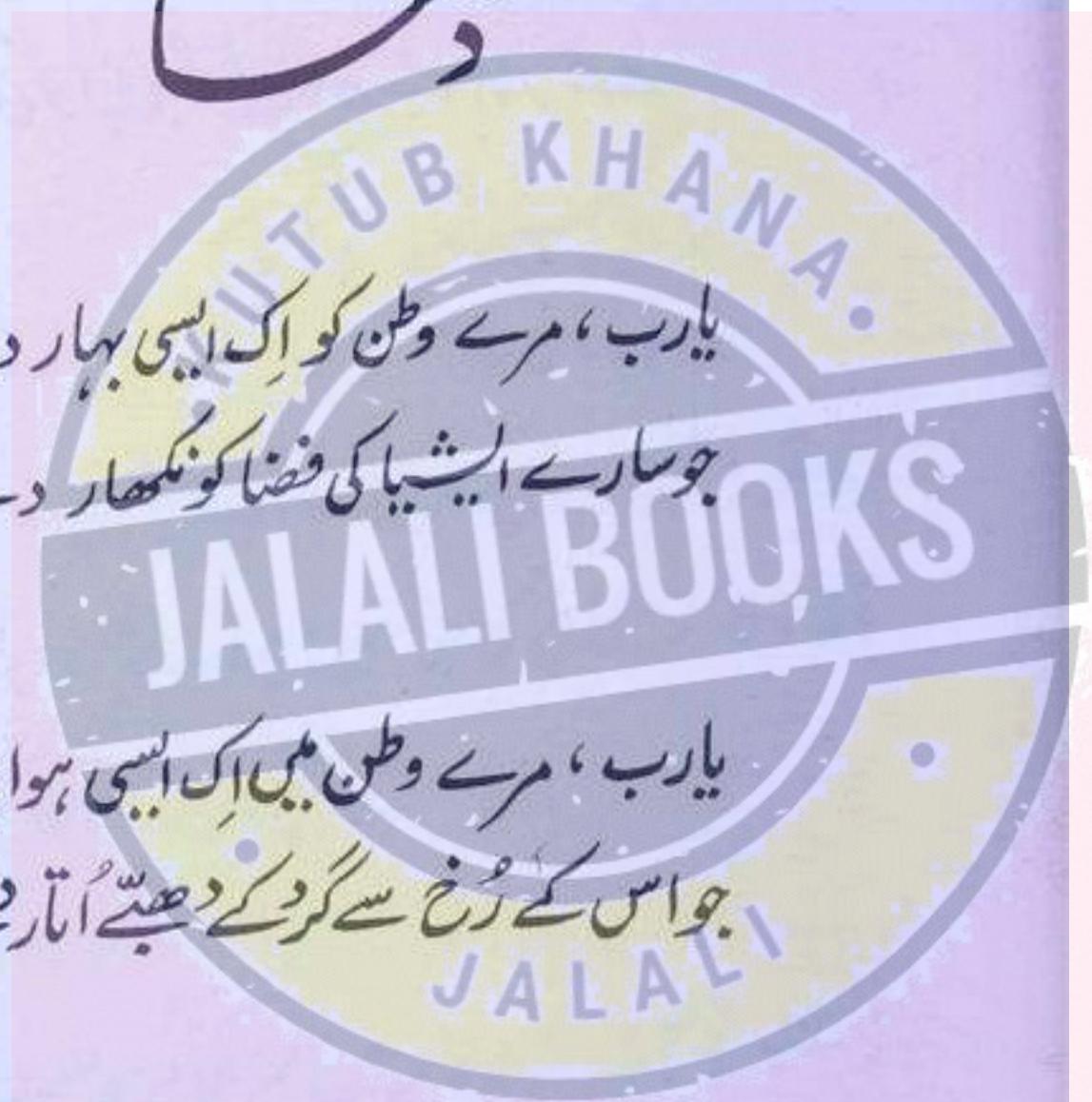
ہر فرد میری قوم کا، اِک ایسا فرد ہو
اپنی خوشی، وطن کی خوشی پر جو وار دے

یہ خطّۂ زمین معنوَن ہے تیرے نام
دے اس کو اپنی رحمتیں اور بے شمار دے

جنوری ۱۹۷۲ء
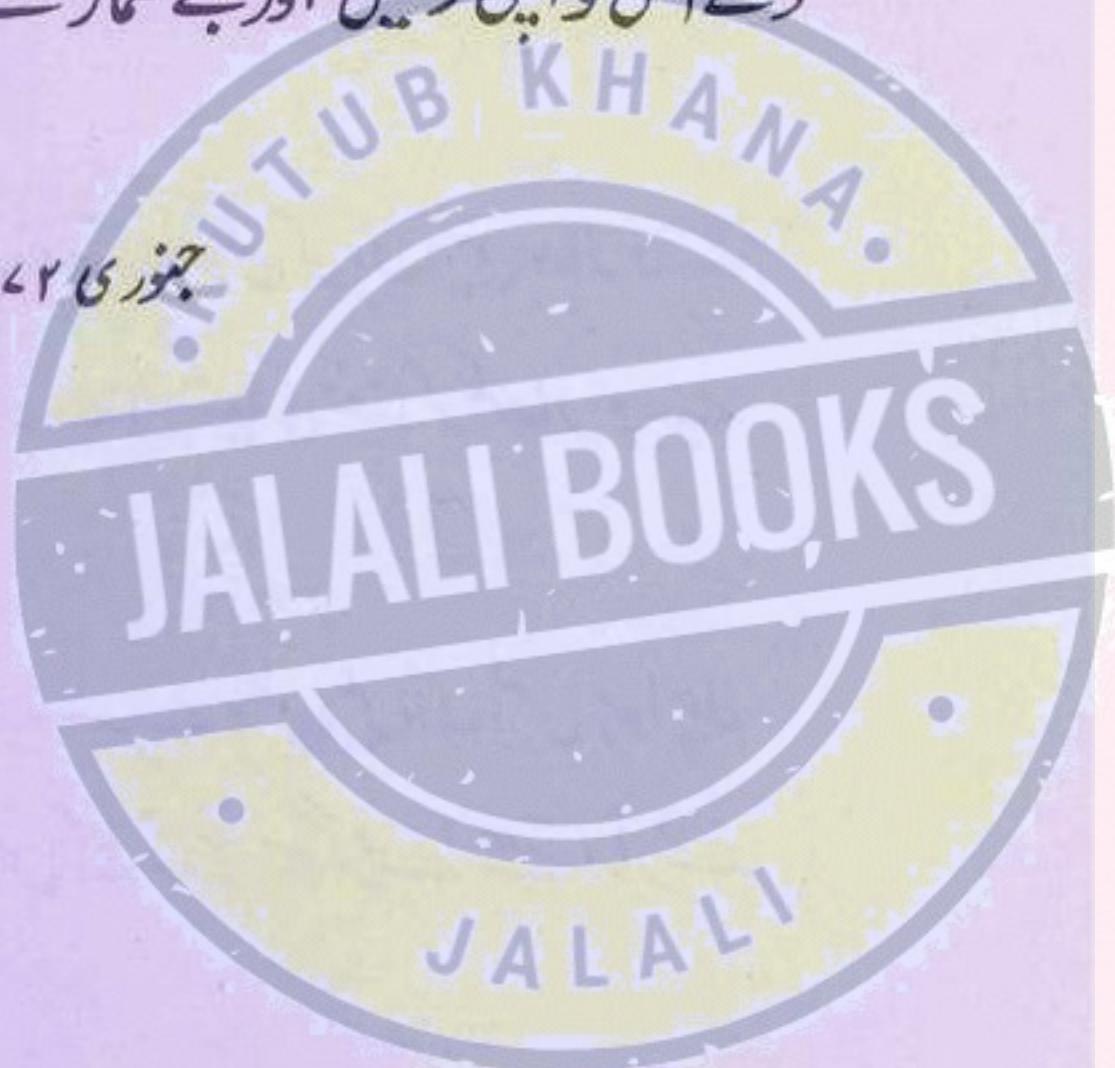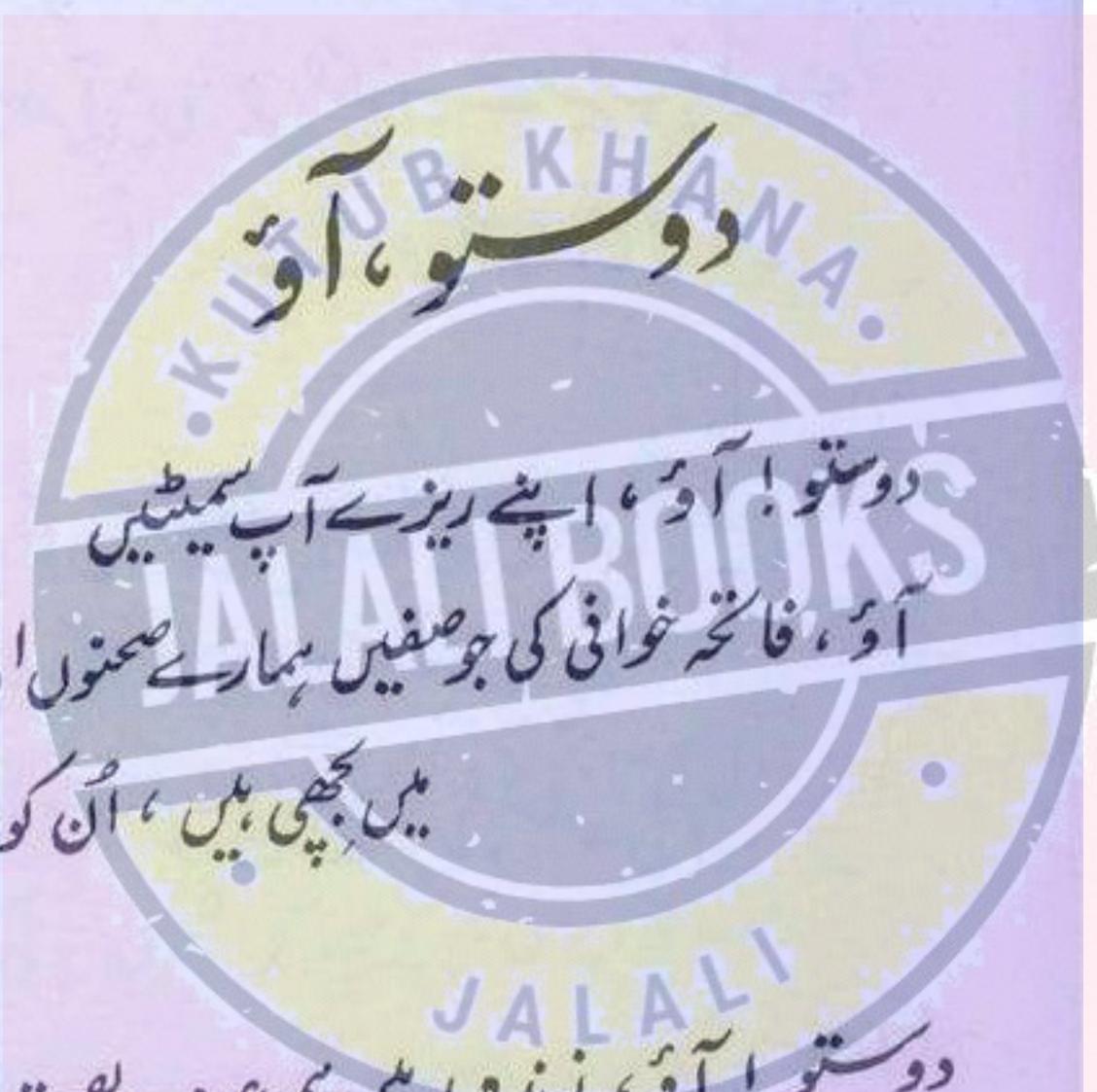
دوستو، آؤ

دوستو! آؤ، اپنے ریزے آپ سمیٹیں

آؤ، فاتحہ خوانی کی جو صفیں ہمارے صحنوں اور ذہنوں

میں بچھی ہیں، اُن کو لپیٹیں

دوستو! آؤ، زندہ رہیں ہم عزم و یقیں سے،

جب تک سانسیں آئیں جائیں

آؤ، قبروں کو قبریں رہنے دیں، اور اپنے تاریک

گھروں میں چراغ جلائیں

دوستو! آؤ، بھوبھل میں چنگاری ڈھونڈیں

آؤ، خزاں کی زرد پتّاور کے نیچے جو دفن ہُوئی،
وہ نگہتِ بادِ بہاری ڈھونڈیں

دوستو! آؤ، اپنی اَنا کا ملبہ کھودیں
آؤ، چٹختی دھرتی میں، جو اشکوں سے سیراب ہُوئی ہے،
اُمیدوں کے موتی بو دیں

دوستو! آؤ، خُون آلُود زمیں سے پھُول اُگانا سیکھیں
آؤ، محنت اور لگن سے جینا سیکھیں،
عزّت سے مرجانا سیکھیں!

۲۲- جنوری ۱۹۷۲ء

باقی ہے

دل کی تائید، نہ اقرارِ زباں باقی ہے
اب جو ایمان کی پوچھو تو گماں باقی ہے
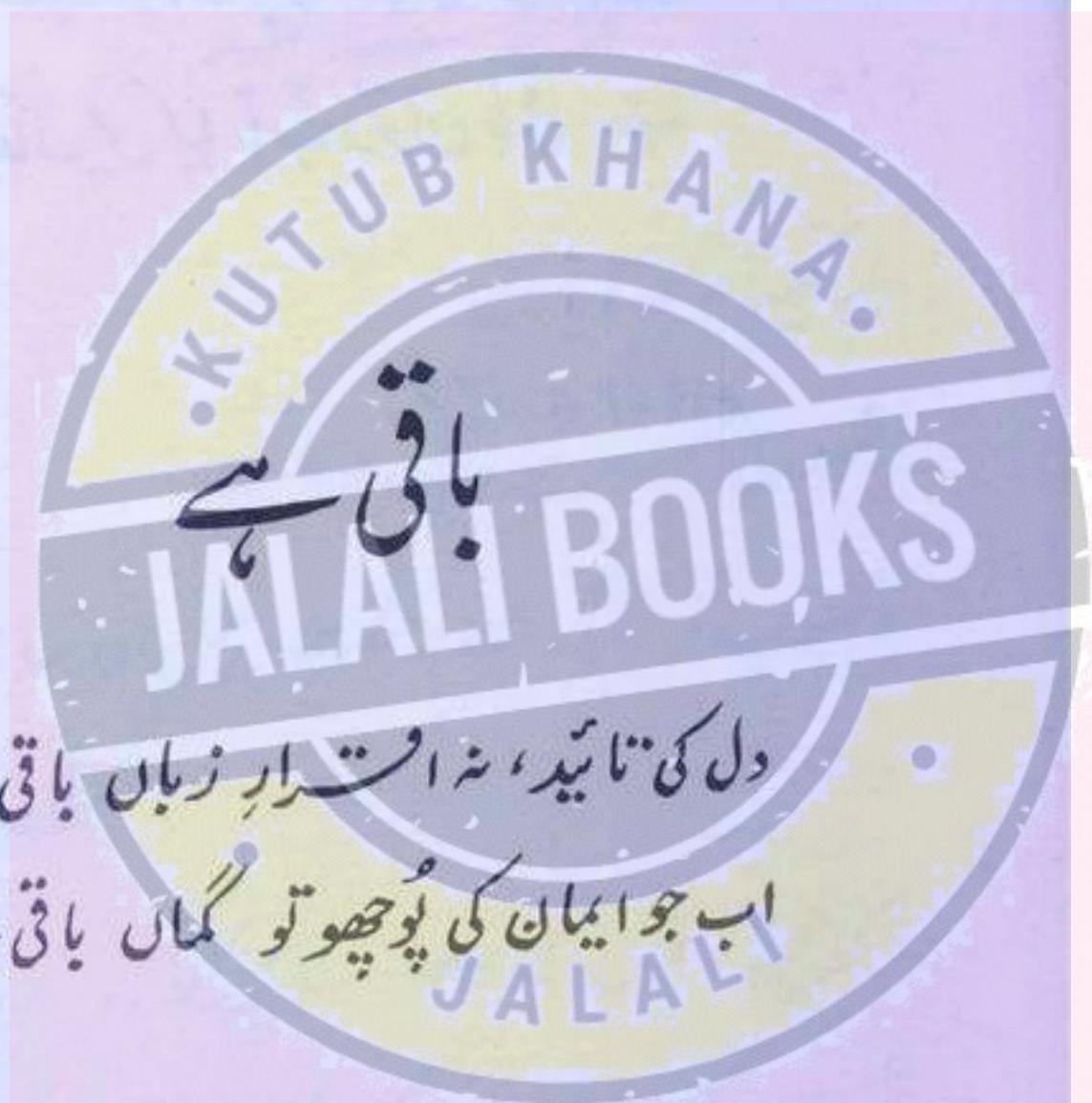
لوگ اس بزم میں کیا دیکھنے آئے ہیں، جہاں
کچھ جو باقی ہے تو شمعوں کا دھواں باقی ہے

وقت نے کر دیے پامال ضمیروں کے حصار
صرف اک آرزوئے امن و اماں باقی ہے

مَیں جو زندہ ہُوں تو صرف اپنی انا کے دَم سے
کٹ چکا جسم ، مگر یہ رگِ جاں باقی ہے

ابر امڈا ہے تو اِک بار برس کر دیکھے
کہ مری خاک میں کیا تاب و تواں باقی ہے

یکم جنوری ۱۹۷۲ء
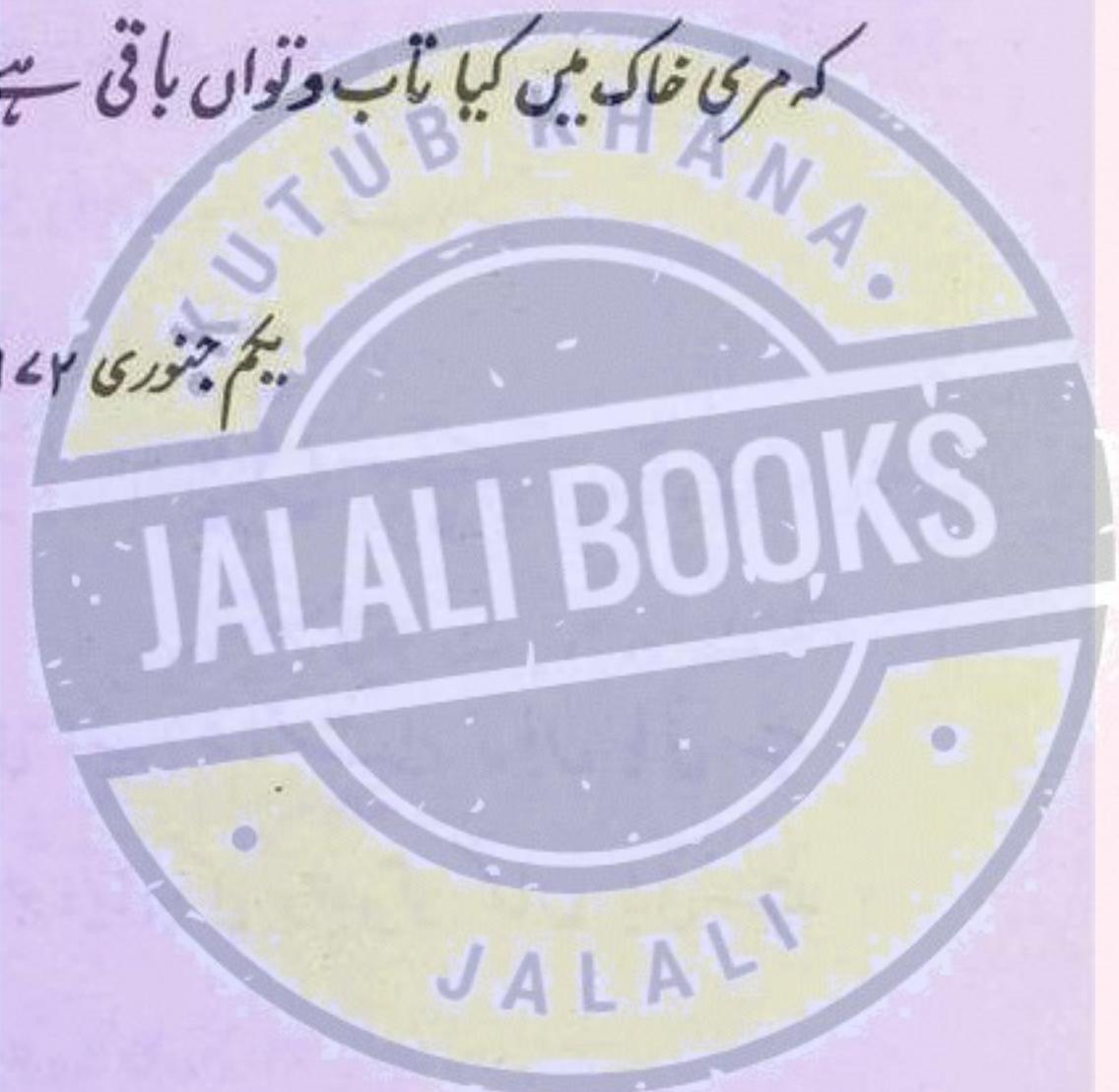
سقوط کے بعد

یہ کیسا موسم آیا ہے
سُورج سر پر دہک رہا ہے
دُھوپ کی آگ سے دشت و جبل اور ساحل و بحر
سُلگنے لگے ہیں
کرنیں، خُون کے دھارے بن کر
شہروں کے دیوار و در کو چاٹ رہی ہیں
حدِ نظر تک پھیلے کھیتوں سے، بھٹّی میں بھُنے اناج
کی بُو آتی ہے!
جلتے ہُوئے اشجار کی صُورت میں، دھرتی سے جیسے
کوئلہ اُگ آیا ہے

لیکن میرے دل و دماغ پہ برف کے گالے

اُتر رہے ہیں

میرا ہاتھ — اور میرا قلم — اور میرا فن

سب کِتنے یخ ہیں!

کِتنے یخ ہیں!!

یکم جنوری ۱۹۷۲ء

پُتلی

میں سوچتا ہوں، کہ جب میں تڑپنا چاہتا ہوں

مرے بدن میں کوئی چیز مرنے لگتی ہے

میں سوچتا ہوں، کہ جب میں اُبھرنا چاہتا ہوں

تو نیند میرے لہو میں اُترنے لگتی ہے
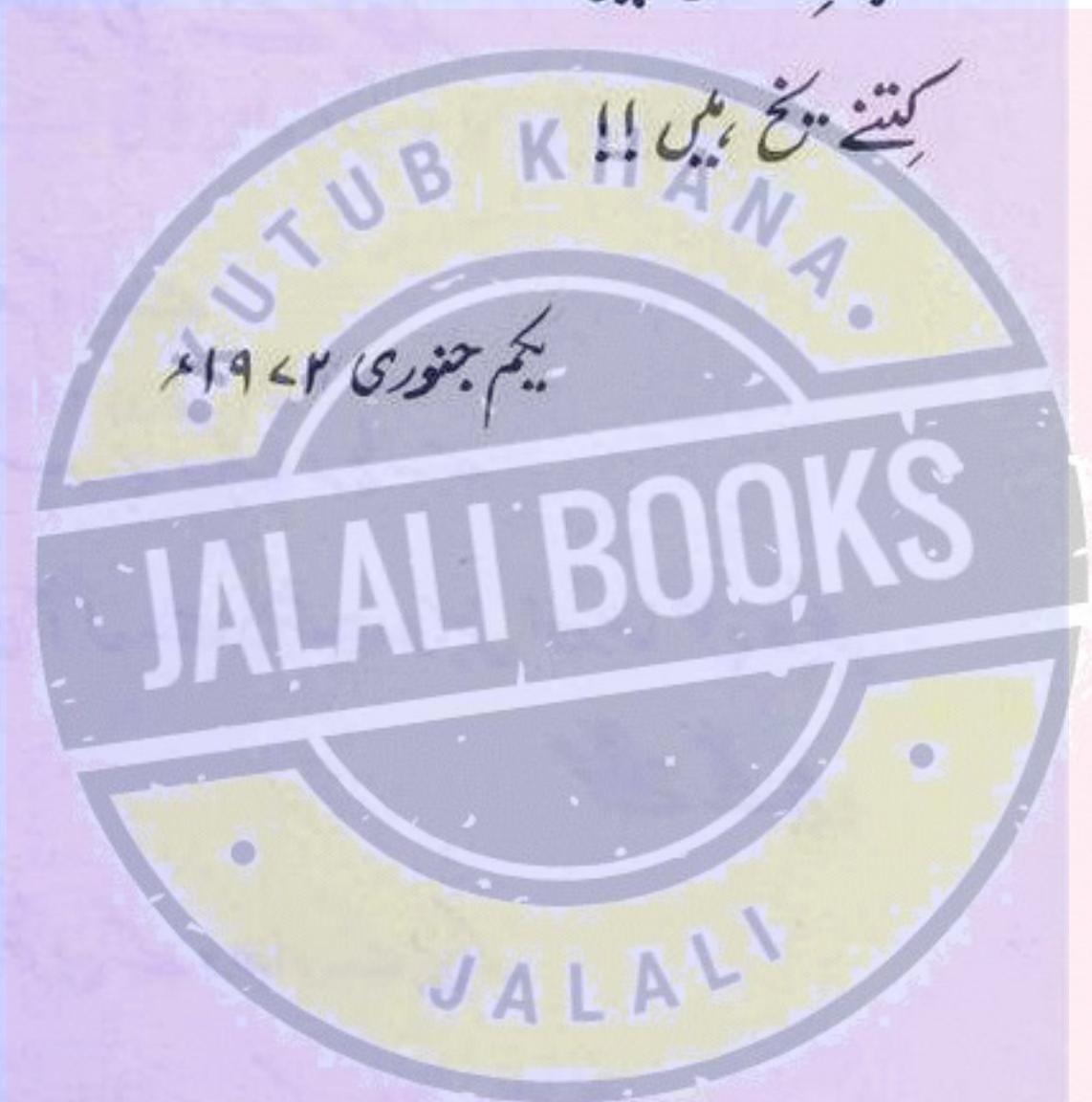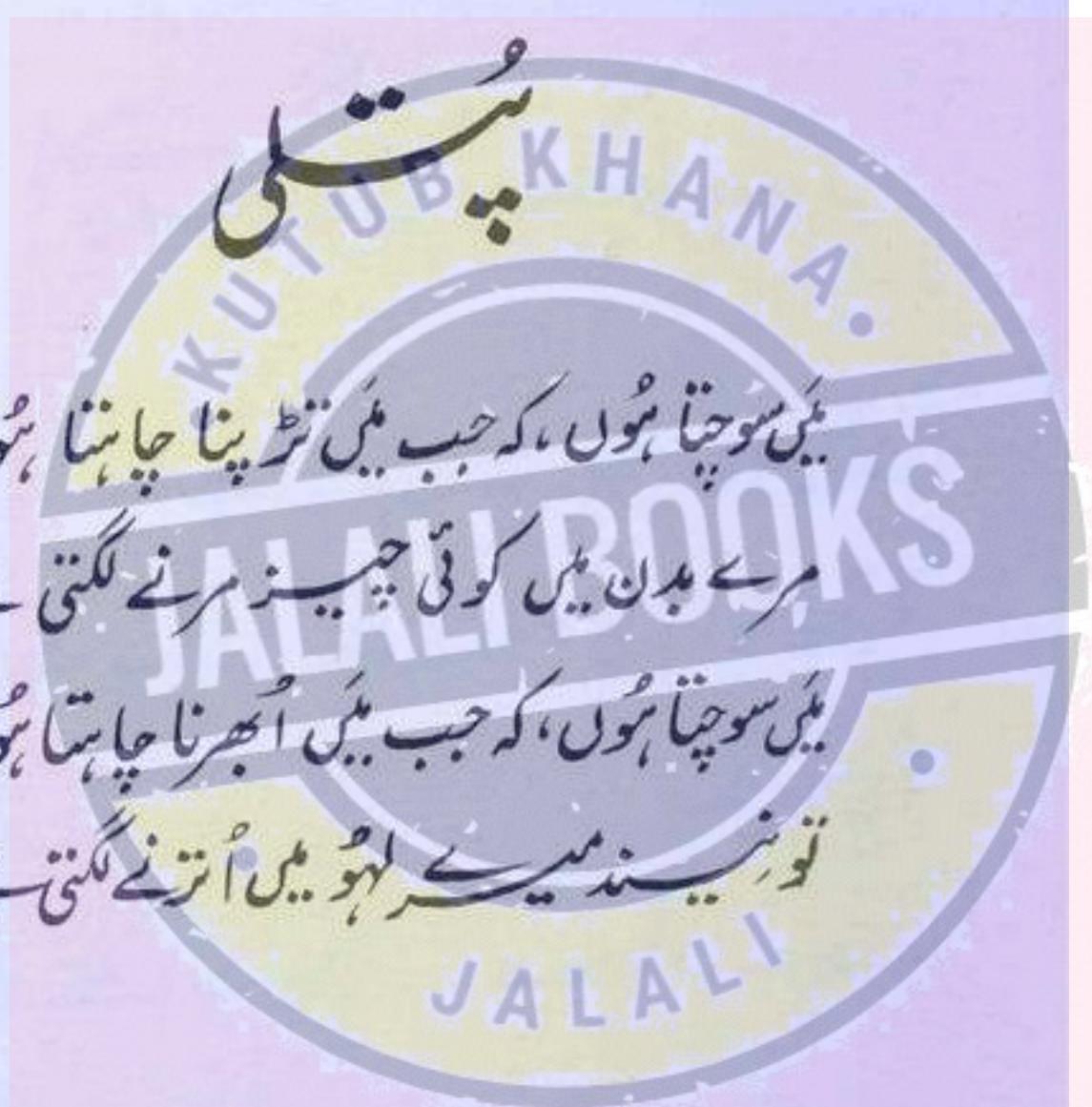
میں سوچتا ہوں، کہ جو کچھ ہوں وہ نہیں ہوں میں

میں جو نہیں ہوں وہ کیوں ہوں، مجھے بتائے کوئی

فریب دیتے ہیں کیوں میرے آئنے مجھ کو

مرے ضمیر کے اندر سے گھوم آئے کوئی

میں سب کے ساتھ، مگر کوئی میرے ساتھ نہیں،
عجب ضدیں مرے اندر کی کائنات میں ہیں
بندھے ہیں میرے رگ و پے میں تارِ ریشم کے
جو اُن کے اگلے سرے ہیں، کسی کے ہات میں ہیں

۳۱- دسمبر ۱۹۷۱ء

ایک ہی رنگ ہے
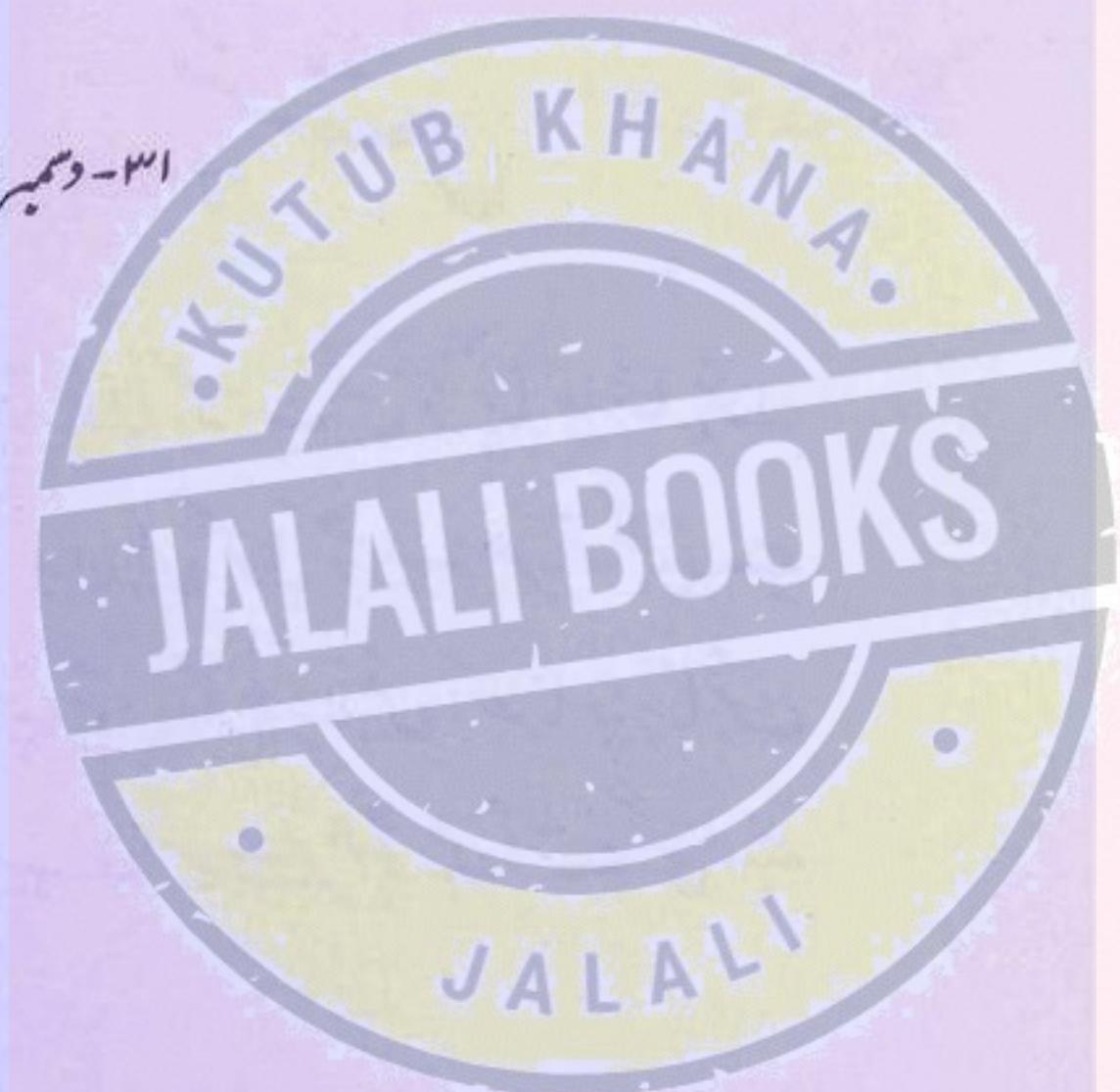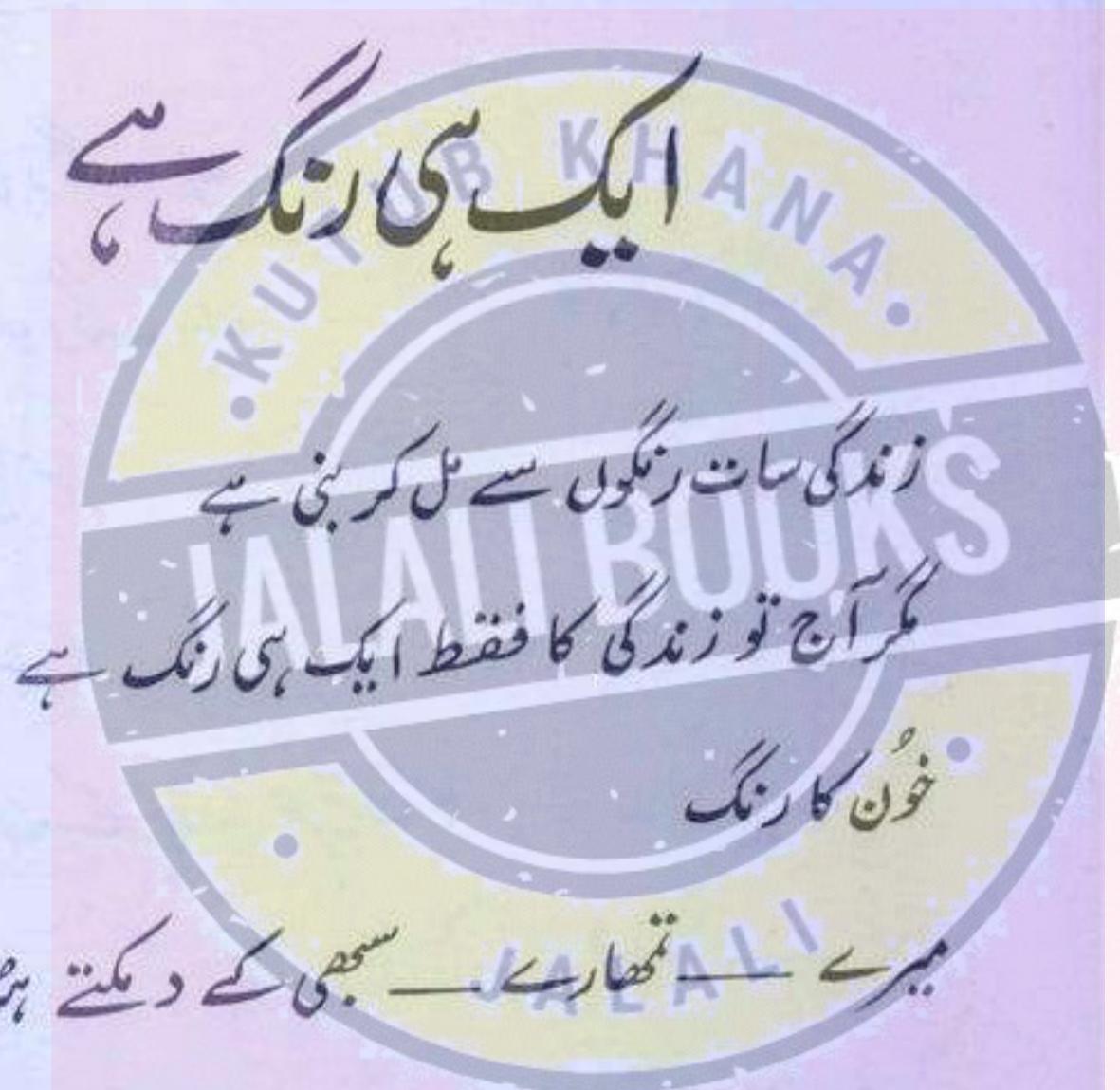
زندگی سات رنگوں سے مل کر بنی ہے
مگر آج تو زندگی کا فقط ایک ہی رنگ ہے
خُون کا رنگ
میرے ــــ تمھارے ــــ سبھی کے دہکتے ہُوئے خُون
کا رنگ

جس طرح سُورج کا عکس آئینے میں

مرے چار جانب وہی رنگ ہے
میرے اندر وہی رنگ ہے

میرے فن میں — مرے فکر میں — میری یادوں میں

— میرے خیالوں میں

— میرے عقیدوں میں

بس ایک ہی رنگ ہے

اور یہ خُون کا رنگ ہے

خُون تاریخ کا

خُون تہذیب کا

خُون اسلاف کے جذبۂ حرّیّت کا

مری آن کا

میری غیرت کا

میری حمیّت کا

میری محبّت کا
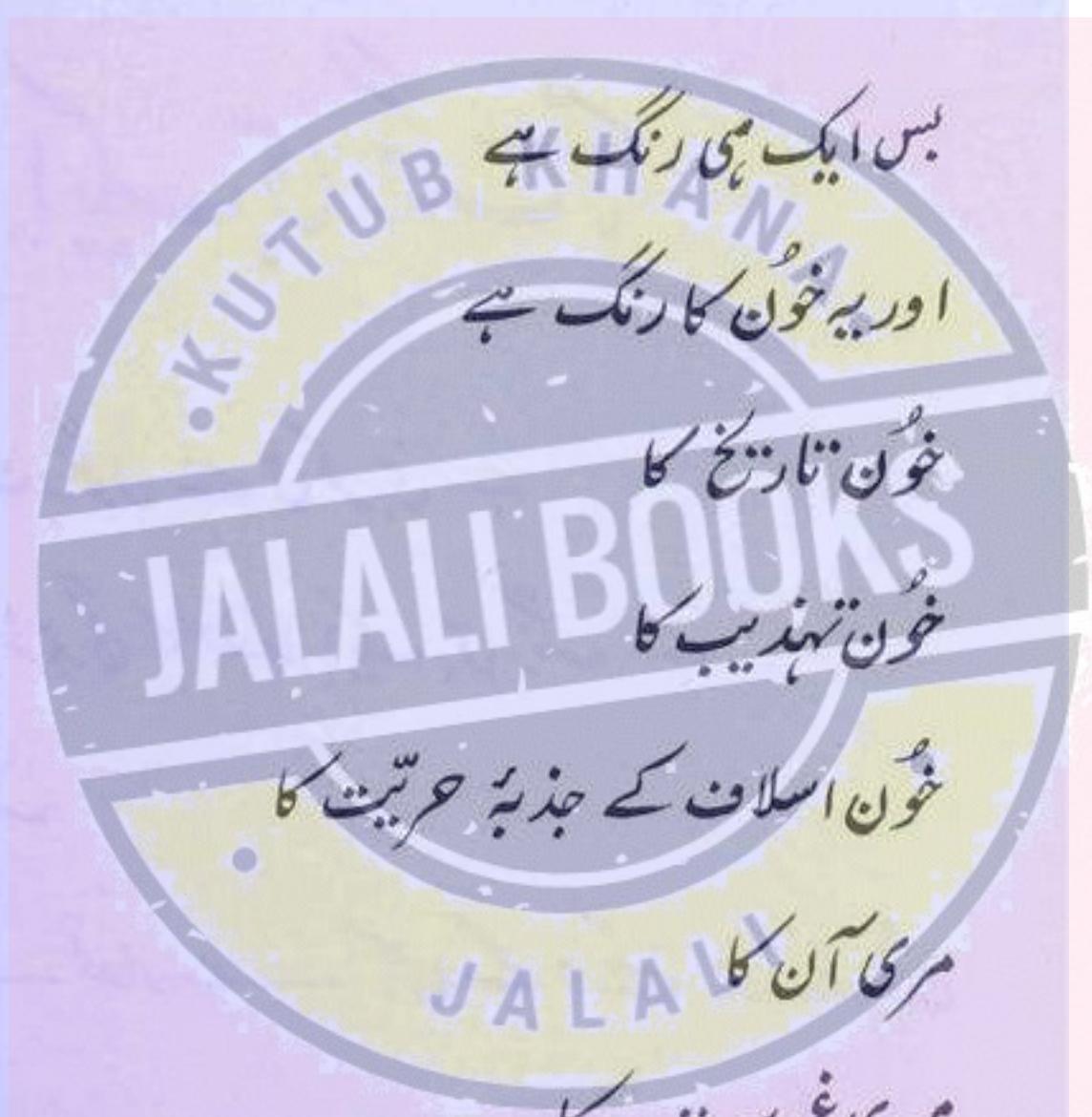
ان حسرتوں، ان امنگوں کا

جو پیاس سے مر گئیں

ان امیدوں کا

جو یاس سے مر گئیں

خُون ماؤں کا ـــــ بہنوں کا ـــــ بچّوں کا ـــــ شعروں کا

ـــــ نغموں کا

ـــــ گیتوں کا

اسلوبِ گفتار کا

حسنِ کردار کا

میرے پندار کا

یم بہ یم خُون

میرا ـــــ تمہارا ـــــ سبھی کا
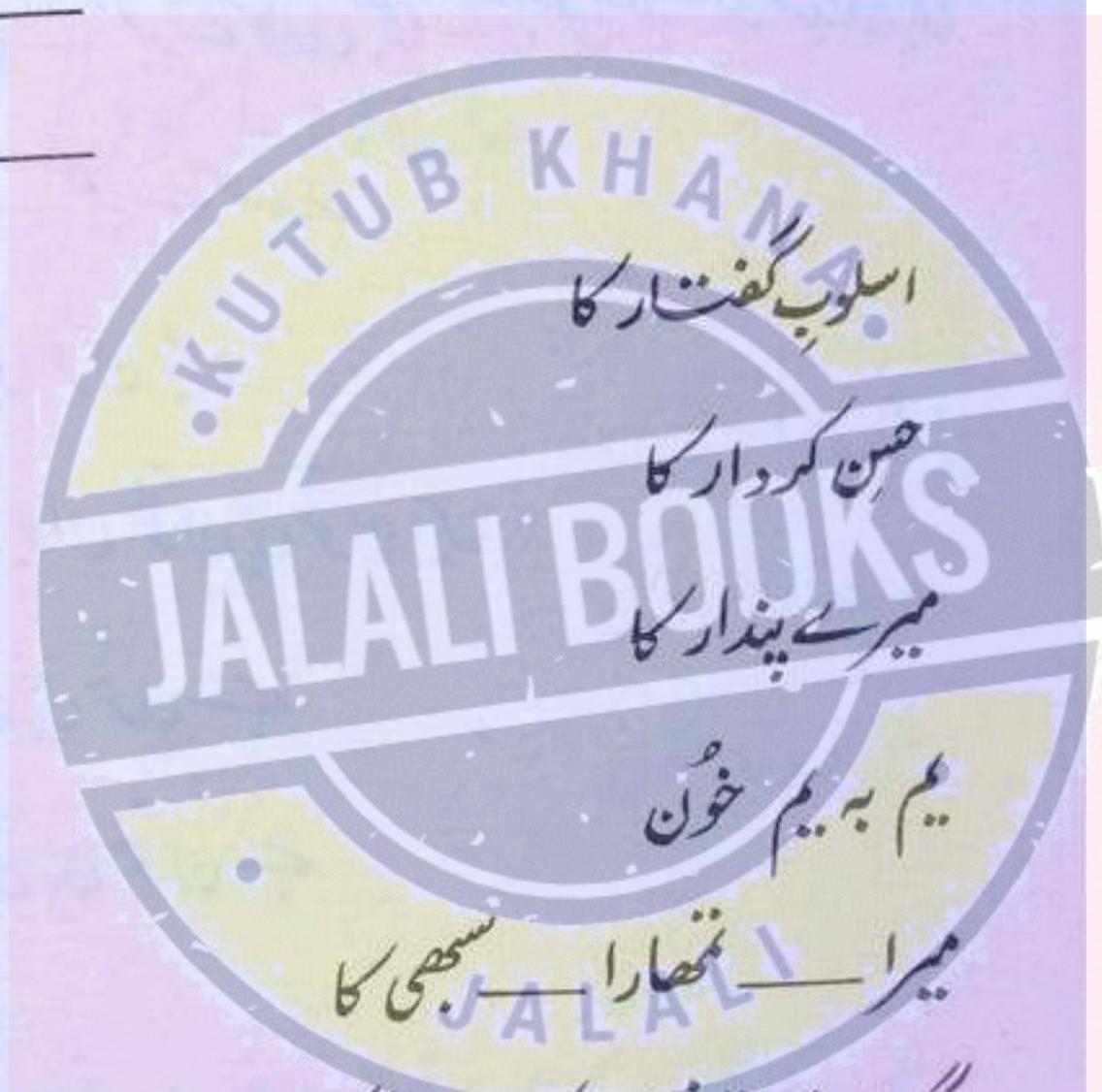
مگر خون کا تو فقط ایک ہی رنگ ہے

چاہے ڈھاکے کا ہو

چاہے لاہور کا

آج کے دن کا

یا آنے والے دنوں کا

ہزاروں کا ہو یا کروڑوں کا ہو

رنگ تو خُون کا ایک ہے

اور یہی رنگ ہے آج کی زندگی کا

مرے شہر بھی — میرے گاؤں بھی — جنگل بھی — میدان بھی

میرے کہسار — میرے سمندر

سبھی خُون ہی خُون ہیں

میرے کڑیل جواں خُون ہی خُون ہیں

میرا گھر خُون ہی خُون ہے

میرا دل خُون ہی خُون ہے

۱۸-دسمبر ۱۹۷۱ء

میں روتا ہوں

میں روتا ہوں

اے ارضِ وطن
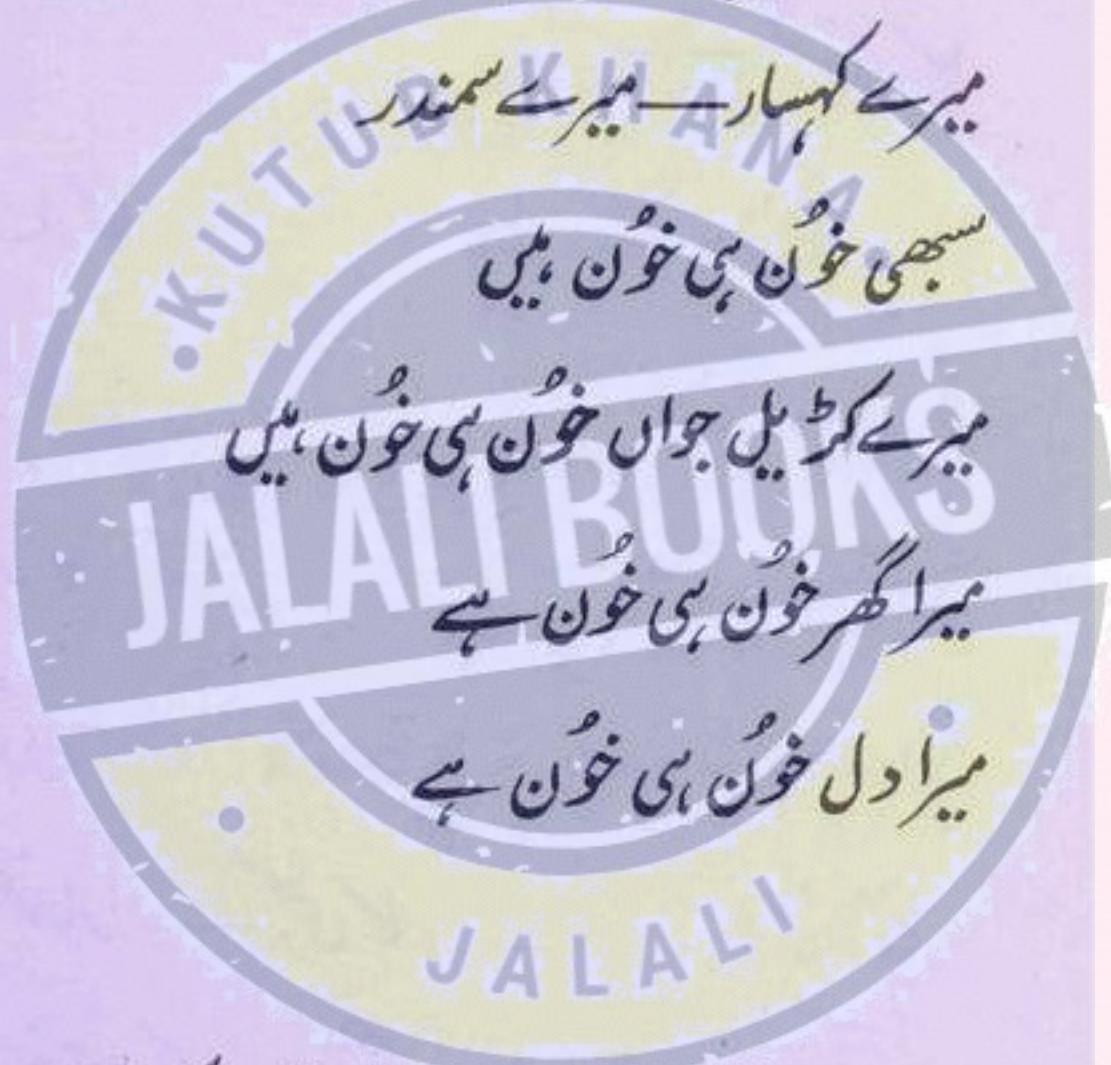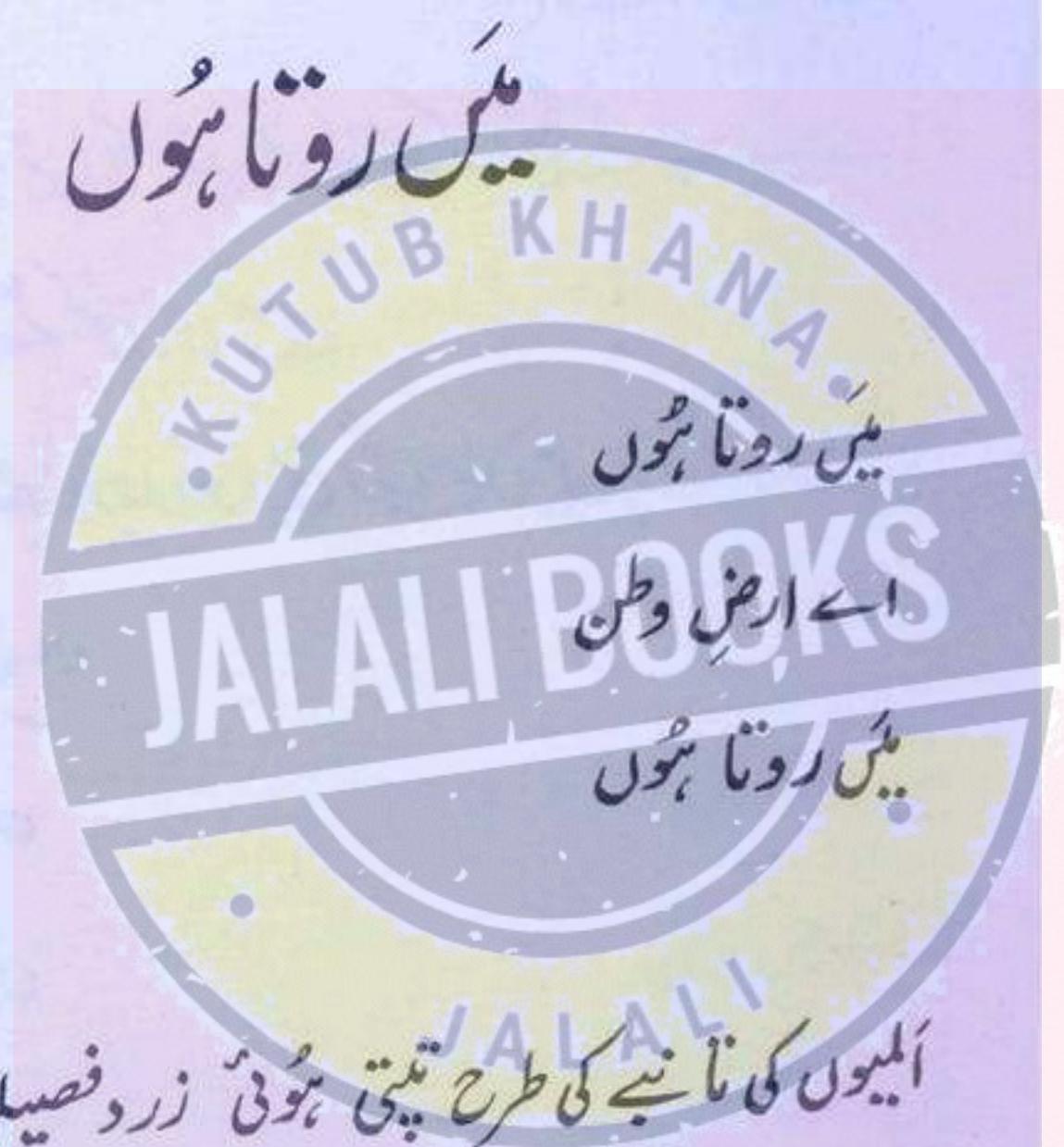
میں روتا ہوں

المیوں کی تانبے کی طرح تپتی ہوئی زرد فصیلوں کے

آئینوں میں

جب خود کو مقابل پاتا ہوں

میں روتا ہوں

میں جب بھی اکیلا ہوتا ہوں

مَیں روتا ہُوں
اے ارضِ وطن
مَیں روتا ہُوں

جب اک اک لمحۂ تنہائی مفلوج سا ہو کر رینگتا ہے
جب شب کاٹے کٹتی ہی نہیں
مَیں اپنے لہو کے قطروں کو اپنی رگِ جاں میں پروتا ہُوں
مَیں روتا ہُوں
اے ارضِ وطن
مَیں روتا ہُوں

مَیں نکہتِ گُل کا رسیا تھا، اب مجھ پر یہ اُفتاد پڑی
پھولوں سے بچ کر چلتا ہُوں، کانٹوں کو دل میں چبھوتا ہُوں
مَیں روتا ہُوں
اے ارضِ وطن

میں روتا ہوں

آ، میری جلد اُتار کے اپنے سارے زخم رفو کر لے
جب تک، اے ماں!
اے میرے جیسے کتنے کروڑوں کی باعظمت، باعزت،
باعصمت ماں!
تیرے دامانِ دریدہ کو میں آبِ سرشکِ غیرت و غم میں
دھوتا ہوں
میں روتا ہوں
اے ارضِ وطن
میں روتا ہوں

۱۷- دسمبر ۱۹۷۱ء (شب)

غرورِ ذات

وہ جو آئندہ کا اِک خواب ہے

وہ حال کے بیدار نگاہوں نے کہاں دیکھا ہے

وہ تو یہ دیکھتے ہیں

ان کے سر پر ہیں کلاہیں کہ نہیں
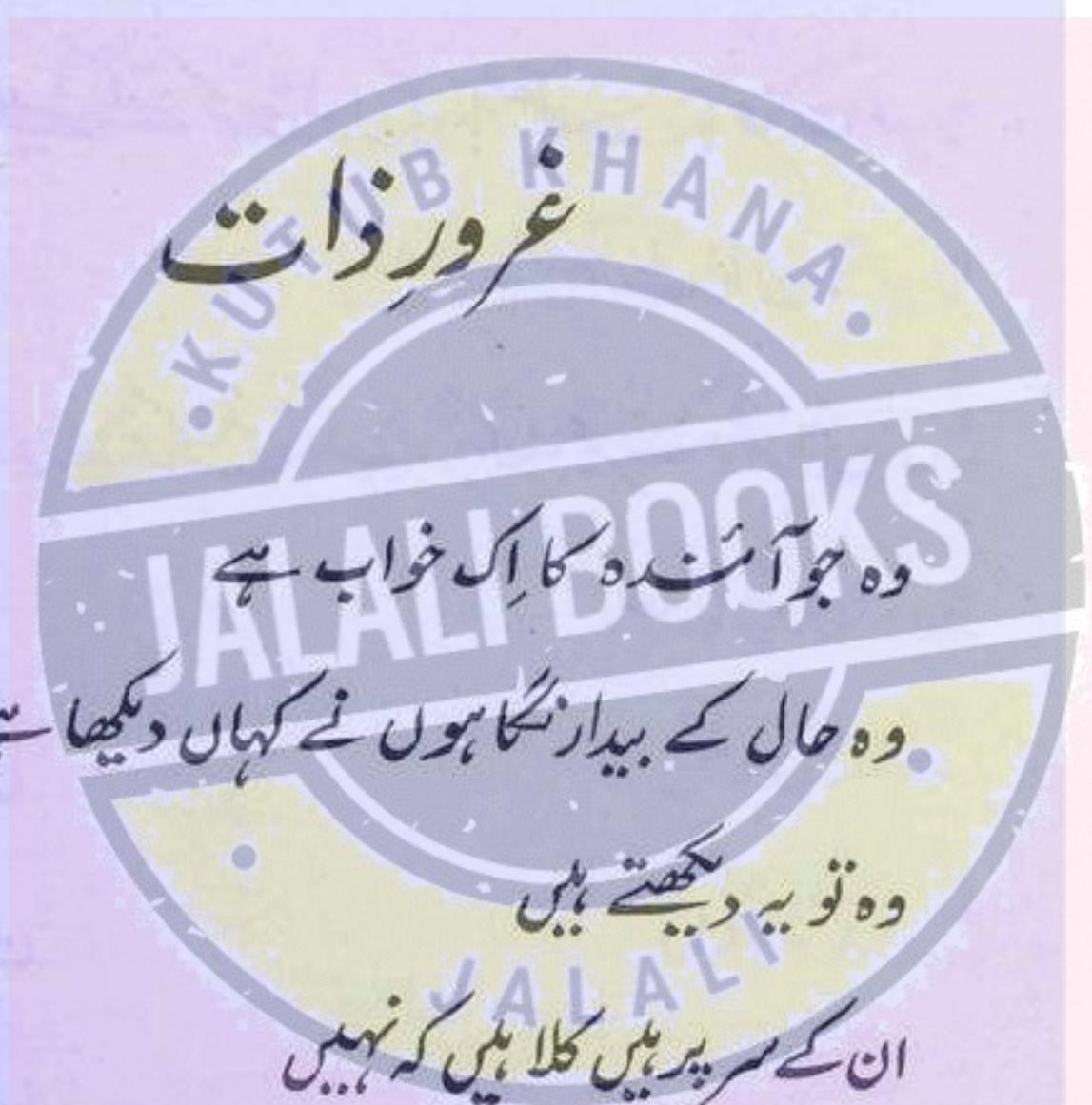
اور اگر ہیں تو وہ کج ہیں کہ نہیں

اور کج ہیں تو وہ کتنی کج ہیں

اور وہ لوگ تو دیوانے ہیں، جن کو اب تک

کج کلاہی کے سوا دہر کا کوئی اَلمیہ نظر آتا ہی نہیں

وہ تو یہ کہتے ہیں

جو کچھ بھی ہے، یہ لمحۂ موجود ہے اور کچھ بھی نہیں

وہ تو یہ سوچتے ہیں

کہ اگر ان کی اکائی ہے تو سب کچھ ہے

وگرنہ یہ دُنیا

تو وہ خاک ہے اور کچھ بھی نہیں

مشتِ خاشاک ہے اور کچھ بھی نہیں

کہ کروڑوں بھی صفر ہوں تو اکائی کے بغیر

کچھ نہیں، کچھ بھی نہیں

ستمبر ۱۹۷۱ء

بیسویں صدی کا اِنسان

مُجھے سمیٹو

مَیں ریزہ ریزہ بکھر رہا ہُوں

نہ جانے مَیں بڑھ رہا ہُوں

یا اپنے ہی غبارِ سفر میں، ہر پَل، اُتر رہا ہُوں

نہ جانے مَیں جی رہا ہُوں

یا اپنے ہی تراشے ہُوئے نئے راستوں کی تنہائیوں میں،

ہر لحظہ، مر رہا ہُوں
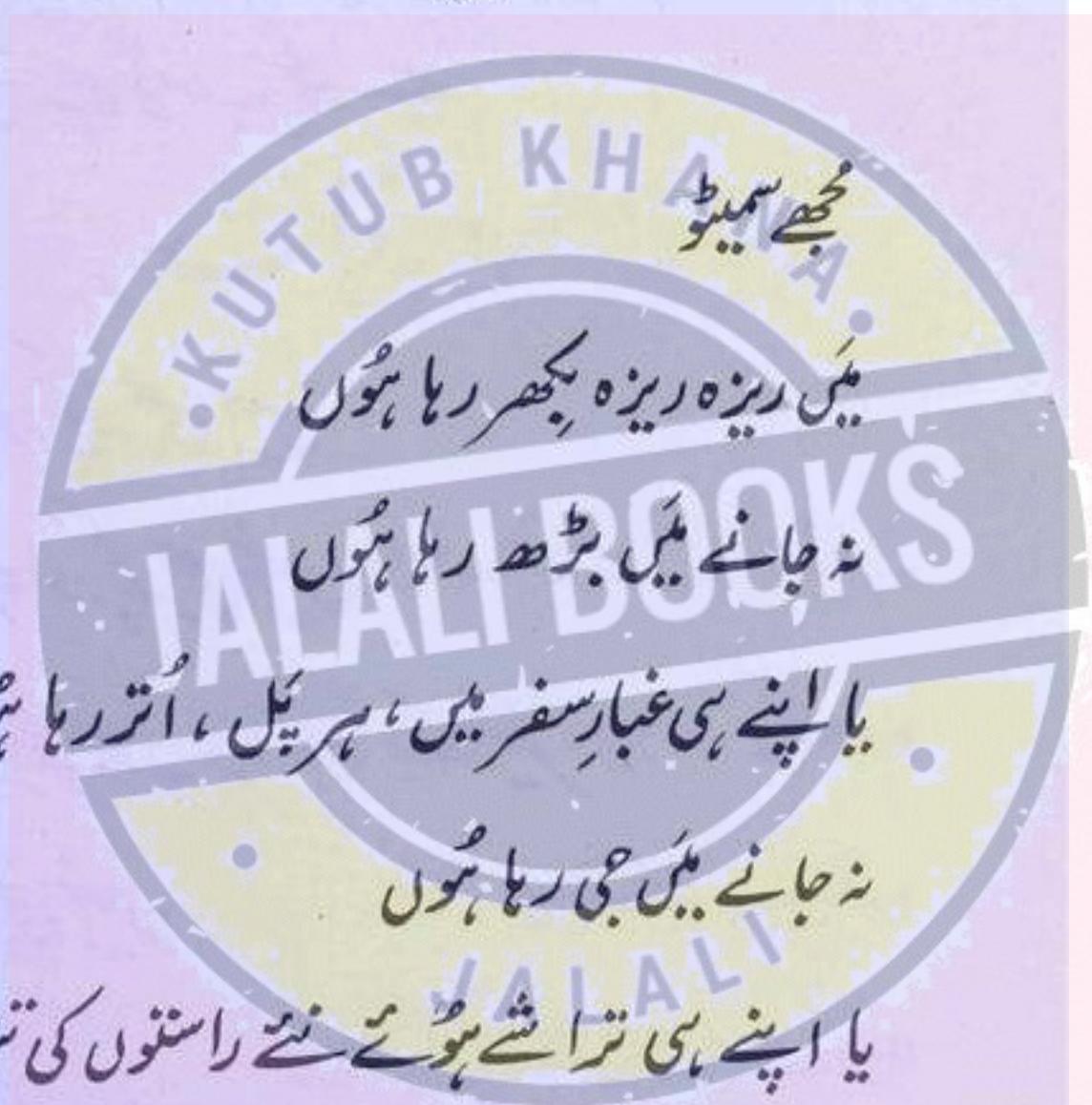
مَیں ایک پتھّر سہی، مگر ہر سوال کا، بازگشت بن کر جواب دُوں گا

مُجھے پُکارو، مُجھے صدا دو

مَیں ایک صحرا سہی، مگر مجھ پہ گھِر کے برسو
مُجھے مہکنے کا ولولہ دو

مَیں اک سمندر سہی، مگر آفتاب کی طرح مجھ پہ چمکو
مُجھے بلندی کی سمت اُڑنے کا حوصلہ دو

مُجھے نہ توڑو
کہ مَیں گُلِ تر سہی مگر اوس کی بجائے لہو میں تر ہُوں
مُجھے نہ مارو
مَیں زندگی کے جمال اور گہما گہمیوں کا پیامبر ہُوں
مُجھے بچاؤ — کہ مَیں زمیں ہُوں

کروڑوں کرّوں کی کائناتِ بسیط میں صرف مَیں ہی ہُوں جو
خدا کا گھر ہُوں!

اگست ۱۹۷۱ء
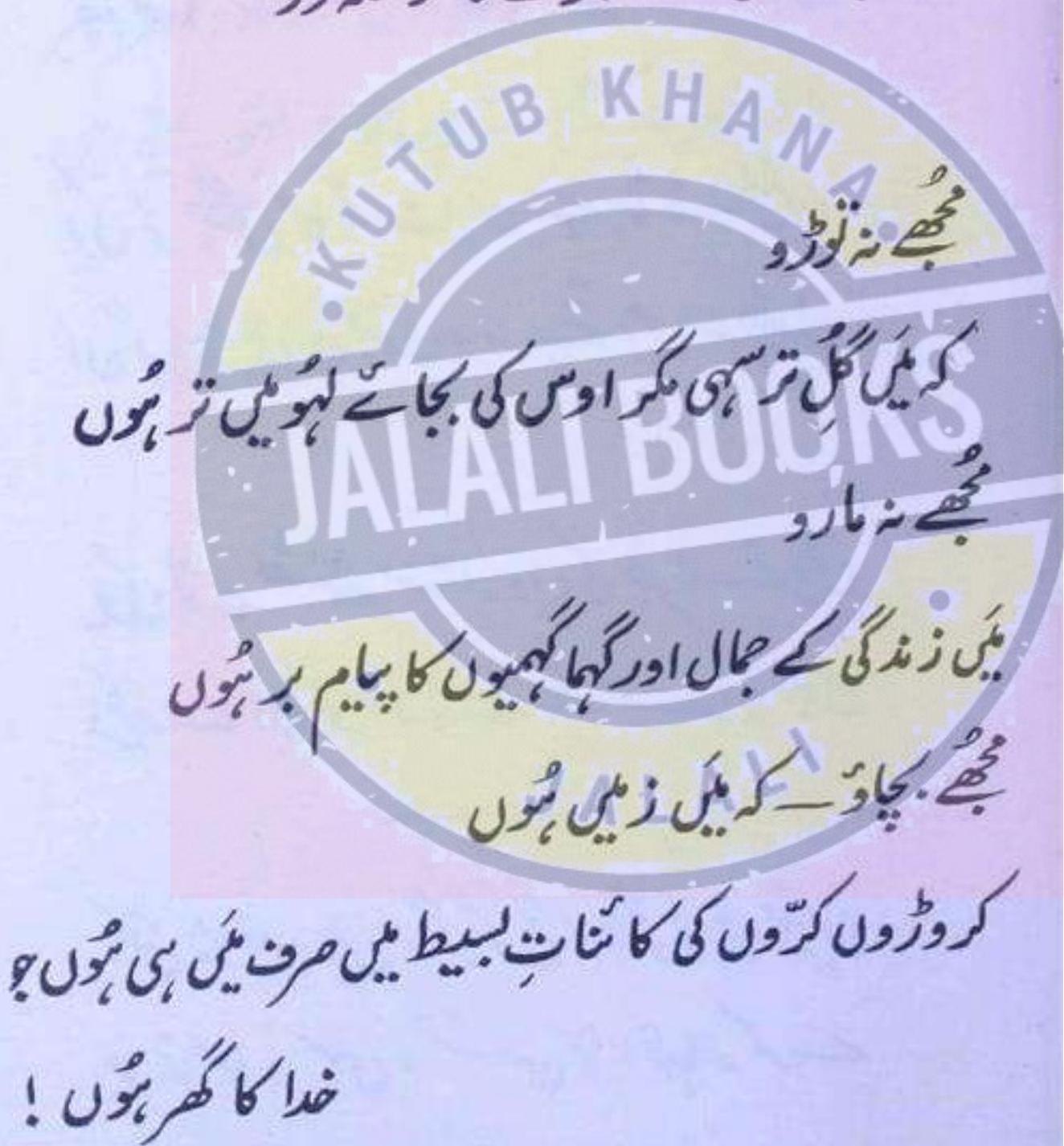
سیّاح کی ڈائری کا ایک ورق

یُوں تو جنگل کا گھنا پن ہے بلا کا — لیکن
ان گرانڈیل درختوں پہ نہ پتّے ہیں نہ پھول

یُوں تو یہ ٹُھنٹھ ستاروں کی خبر لاتے ہیں
دیکھ لے ان کو، تو ہنسنے لگے صحرا کی ببول

کتنی شاخیں ہیں، مگر کوئی شگوفہ ہی نہیں
جو نمو کا نہ سہی، حُسن کا اظہار کرے

ایک چڑیا بھی نہیں ہے جو اُڑانیں بھر کر
سالہا سال کے سنّاٹوں کو بیدار کرے

یہ وہ جنگل ہے جو جنگل کی روش بھول گیا
اسی عالم میں اسے کتنے ہی جُگ بیتے ہیں

کچھ یہاں ہے، تو درختوں کے کروڑوں پنجر
یا وہ کیڑے کہ جڑوں کا جو لہُو پیتے ہیں

جون ۱۹۷۱ء

اجنبی لفظ کی تلاش

کیسے فن کار ہو تم

کیسے شاعر ہو کہ تخلیق کا دعویٰ ہے،
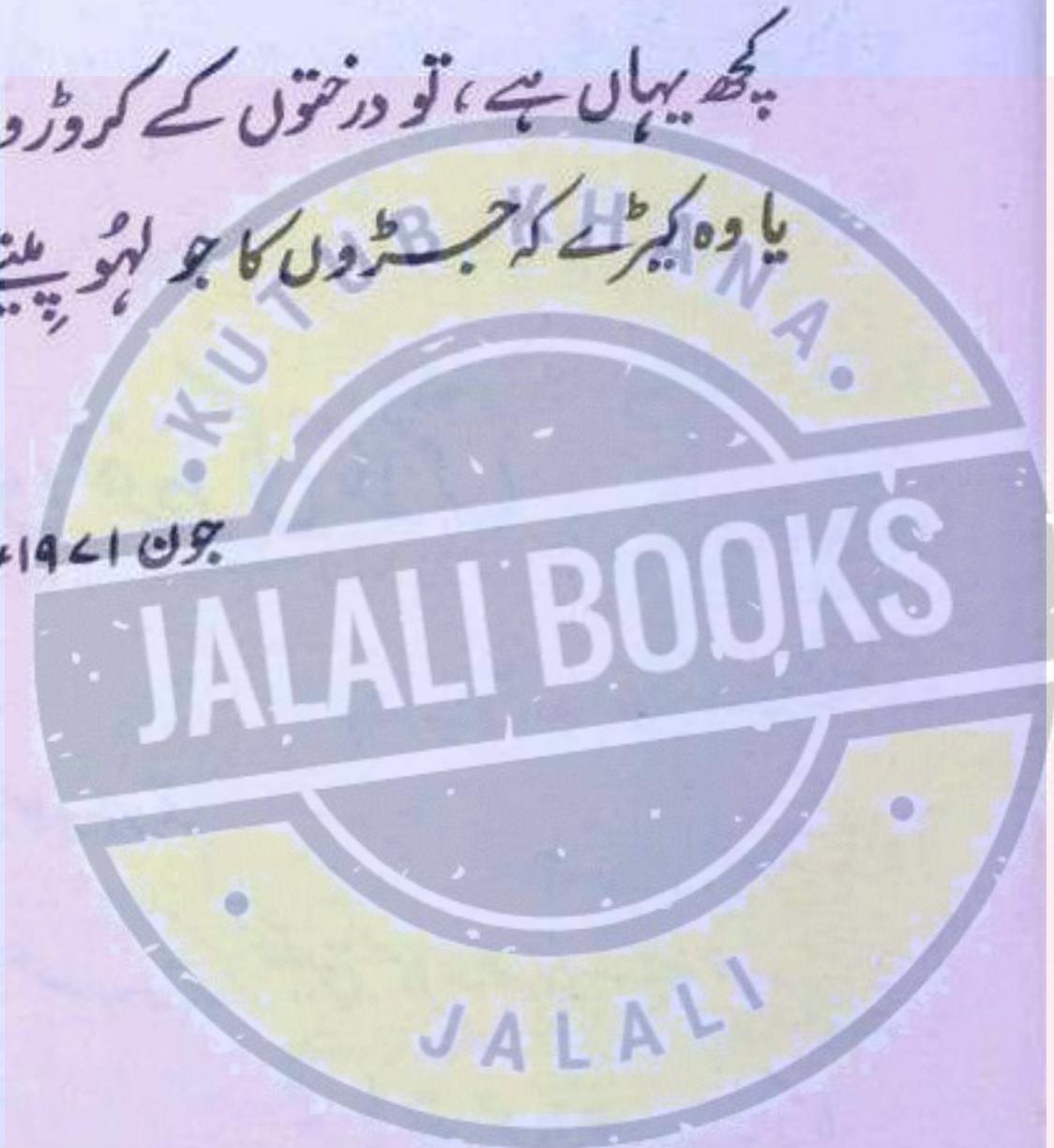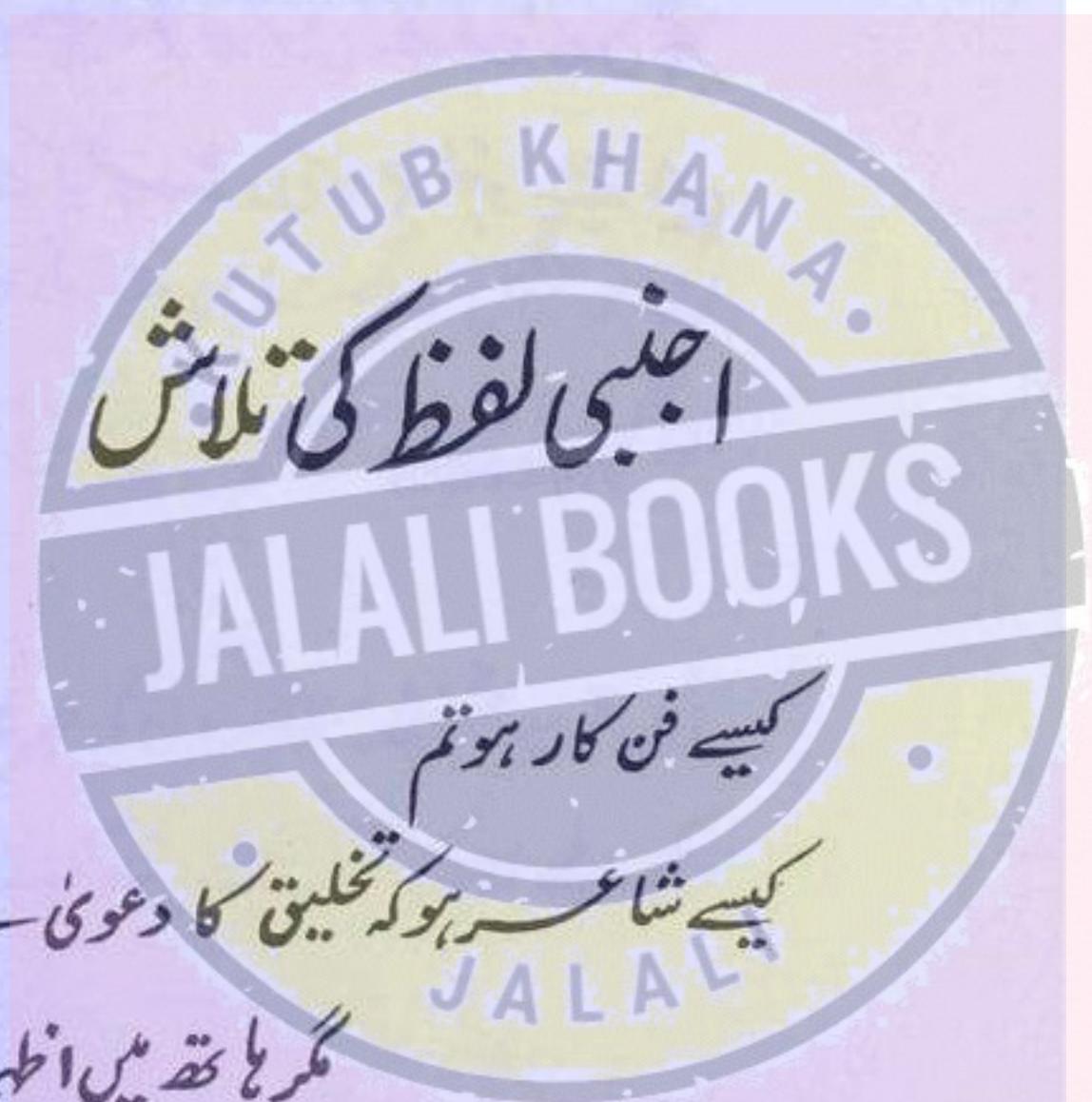
مگر ہاتھ میں اظہار کا

کشکول لیے پھرتے ہو،

کہ تمھیں دوسرے دیسوں سے کسی لفظ کی خیرات ملے

چاہے یہ لفظ ہو اِک پارۂ سنگ

چاہے مفہوم کی ہیبت نے زباں کاٹ رکھی ہو اُس کی

تم مگر دوسرے دیسوں سے درآمد شدہ اشیا کے پجاری ہو

کہ معیار کی معراج سمجھتے ہو انھیں

اور وہ لفظ، جو دیسی ہے

جو اس دیس کی مٹی سے اُگا ہے جسے تم اپنا وطن کہتے ہو

یعنی وہ لفظ جو مفہوم کا صد رنگ عجائب گھر ہے

وہ جو اصوات سے پُر ہے

وہ جو اظہار کے سُورج کی کرن ہے

وہ تمھارے لیے بے رنگ ہے

آواز سے محروم ہے

ٹُوٹے ہُوئے حرفوں کا کھنڈر ہے

جو صدف ہے، وہ تمھارے لیے صرف ایک خزف ہے

یہ عجب رنگِ سخن ہے کہ بڑے فخر سے تم کہتے ہو

یہ سخن گنگ سہی

سرد سہی

تابشِ آہنگ کے فقدان سے بے نُور سہی

اس کے پیکر پہ مگر ریشم و دیبا کا جو صد رنگ کفن لپٹا ہے

تُم اسے چھُو کے تو دیکھو لوگو!

کیسے فن کار ہو تم

اپنے آنگن کے درختوں پہ جو گُل کھِلتے ہیں

ان سے بیزار ہو تم

اور اُن اجنبی پھُولوں کے پرستار ہو تم

جن پہ اس دیس کی تتلی بھی اُترتے ہُوئے گھبراتی ہے

تم حقیقت میں تو ہر دَور کے فن کار کی مانند بڑے ہو۔ لیکن

خود کو چھوٹا جو سمجھتے ہو تو یہ راز مجھے کھولنے دو

سخت بیمار ہو تم

جون ۱۹۷۱ء
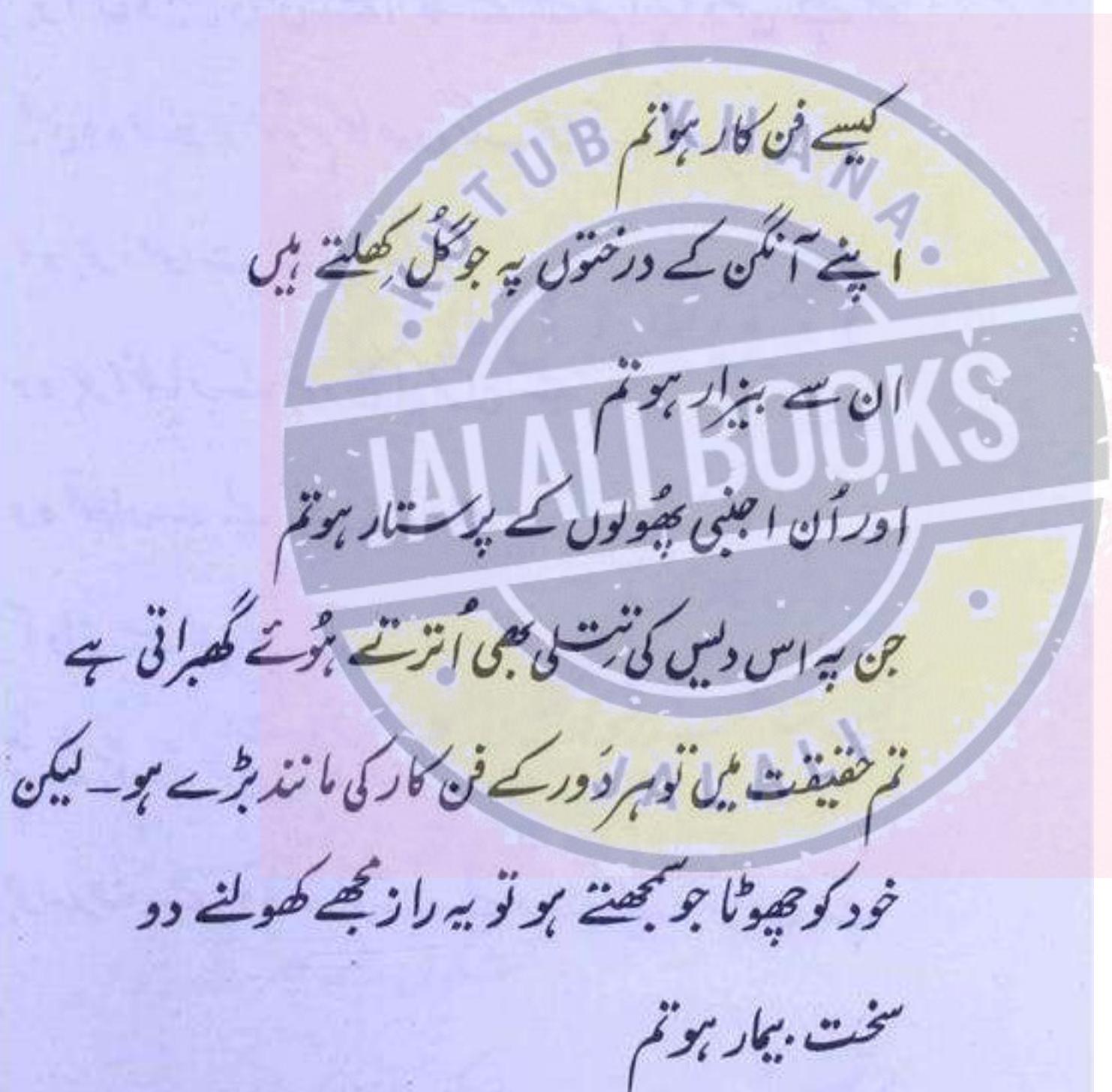
اشعار

کیوں ہر انساں کو اِک انساں کی ہوس ہے یارب
جب ہر انساں کی ہوس پر ترا بس ہے یارب

ایک مرتا ہے تو سب قافلہ رو دیتا ہے
ہچکیاں ہیں کہ یہ آوازِ جرس ہے یارب

تجھ کو پوچھوں کہ ترے حُسن کے فن پاروں کو
فرصتِ زیست اِک نفس یا دو نفس ہے یارب

میرے نذرانۂ اشعار کو دے حُسنِ قبول
میرا سب کچھ مری آواز کا رس ہے یارب

اپریل ۱۹۷۱ء

سرمایہ
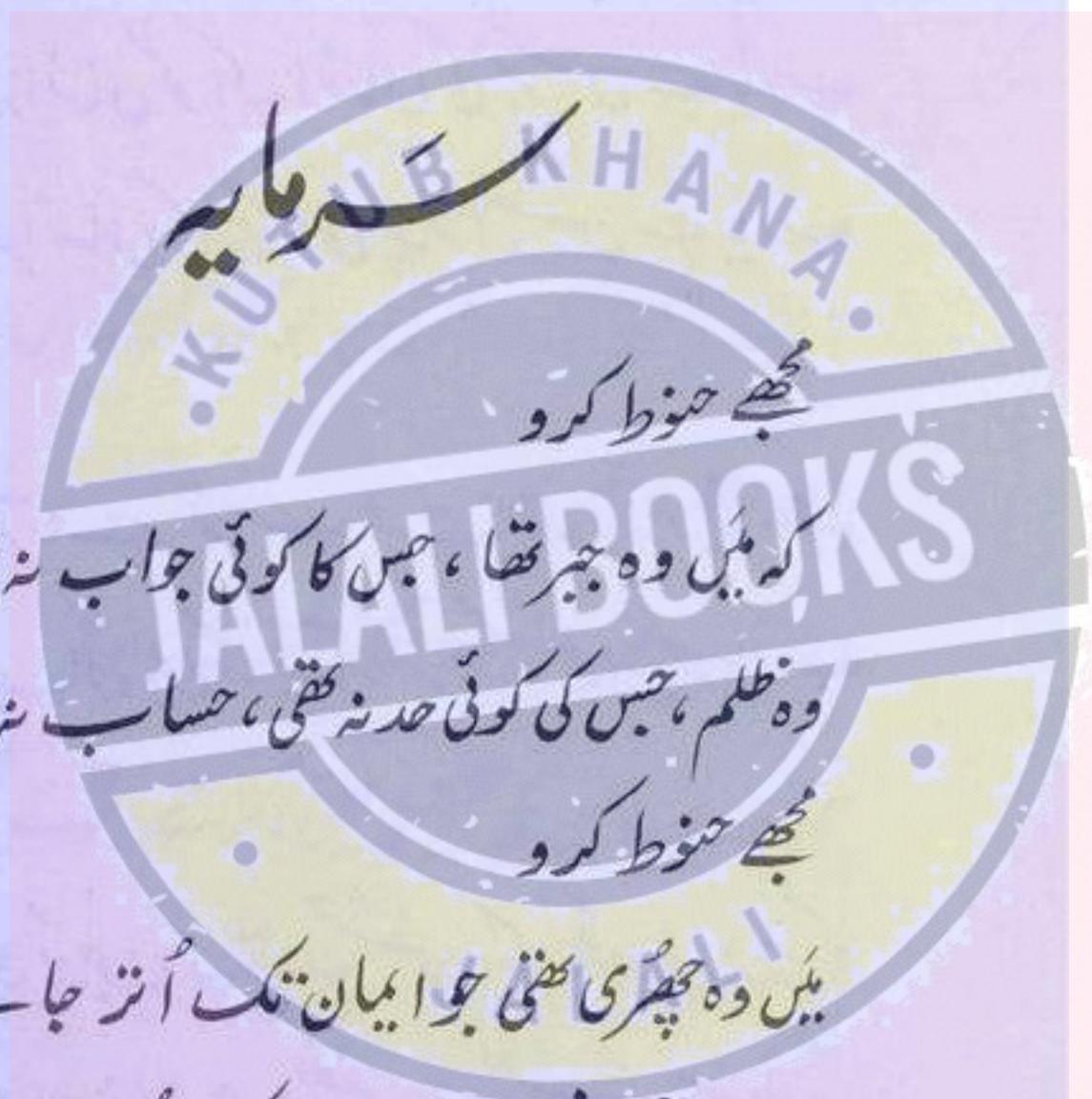
مجھے حنوط کرو

کہ میں وہ جبر تھا، جس کا کوئی جواب نہ تھا
وہ ظلم، جس کی کوئی حد نہ تھی، حساب نہ تھا
مجھے حنوط کرو

میں وہ چھری تھی جو ایمان تک اُتر جائے
جو صرف جسم نہیں، جان تک اُتر جائے
مجھے حنوط کرو

میں اپنے توسنِ وحشت کو جب بڑھاتا تھا
وہ گرد اُڑتی تھی، ہر حُسن ڈوب جاتا تھا
مجھے حنوط کرو

لہو لہو تھے اگر لب مرے ذخیروں کے
ضمیر میں نے چبائے تھے باضمیروں کے
مجھے حنوط کرو

کہ میں خود اپنے تضادوں میں پس کے خاک ہُوا
کہ میرا دامنِ زرّیں مجھی سے چاک ہُوا
مجھے حنوط کرو

کہ میرا جسم عجائب گھروں کے کام آئے
دماغ چیخ اُٹھیں، جب بھی میرا نام آئے
مجھے حنوط کرو

اکتوبر ۱۹۷۰ء
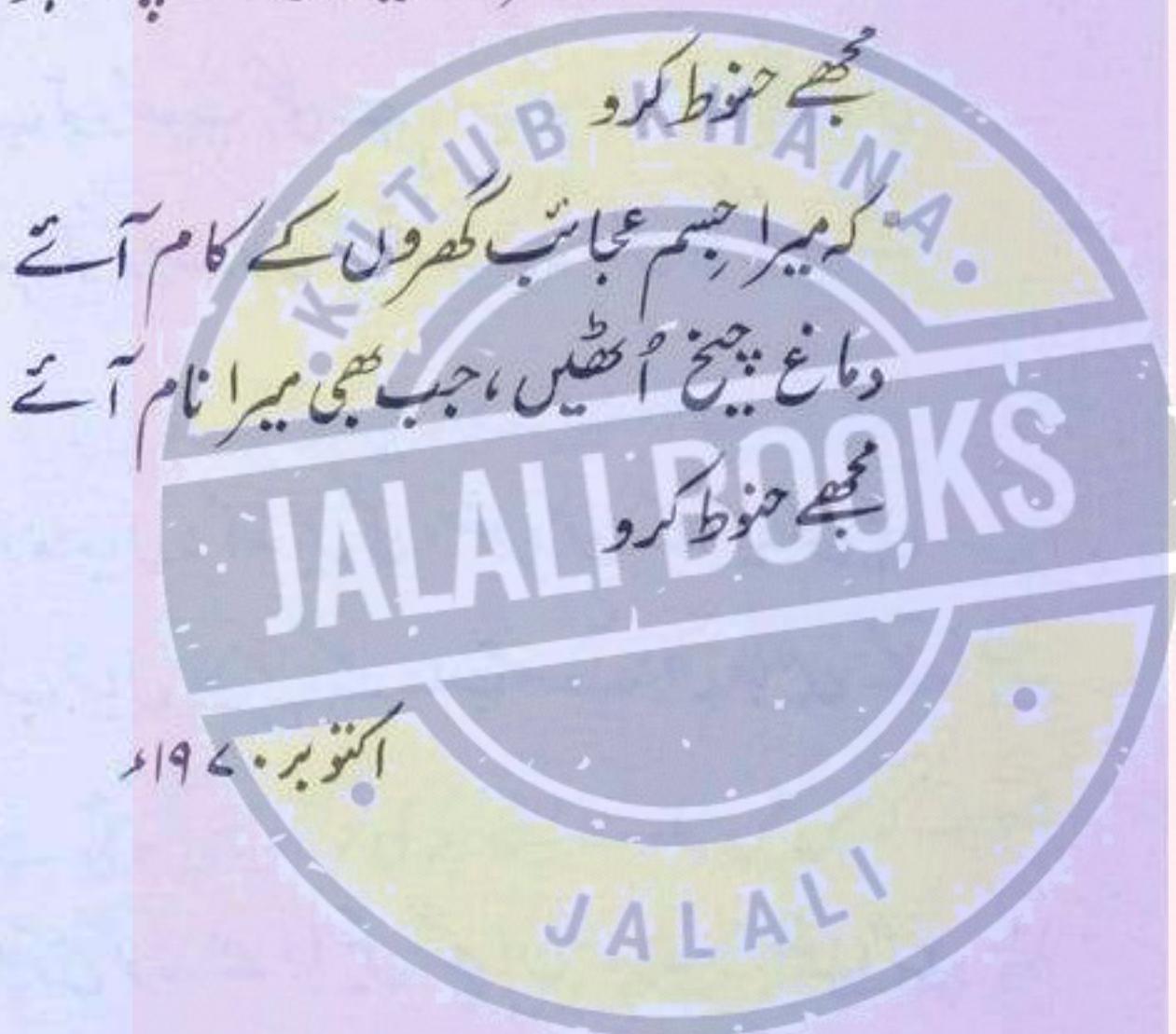
پیش گوئی

اب تو دھوپ نکلی ہے، اب تو برف پگھلے گی
اب تو کوہساروں کے خدّ و خال جاگیں گے

آندھیاں نہ اٹھیں گی، شعر و فن کے میداں میں
اب خیال نکھریں گے، اب غزال جاگیں گے

پھول گوندھے جائیں گے ان غبار زلفوں میں
ان اداس چہروں پر اب جمال جاگیں گے

اب نہ رات بھر ہوگا، دل کو صبح کا دھڑکا
میٹھی نیند سوئیں گے، بے ملال جاگیں گے

اکتوبر ۱۹۷۰ء

اُردن

(آزادیٔ فلسطین کے مجاہدین کے قتلِ عام پر)

یہاں تو حدِّ نظر تک اِک دشت ہے لہُو کا

لہو — کہ جس میں ہمارے اپنے لہُو کی خُوشبو بسی ہُوئی ہے

لہُو ہمارے جگر کے ٹکڑوں کا

اُن صبیحوں کا
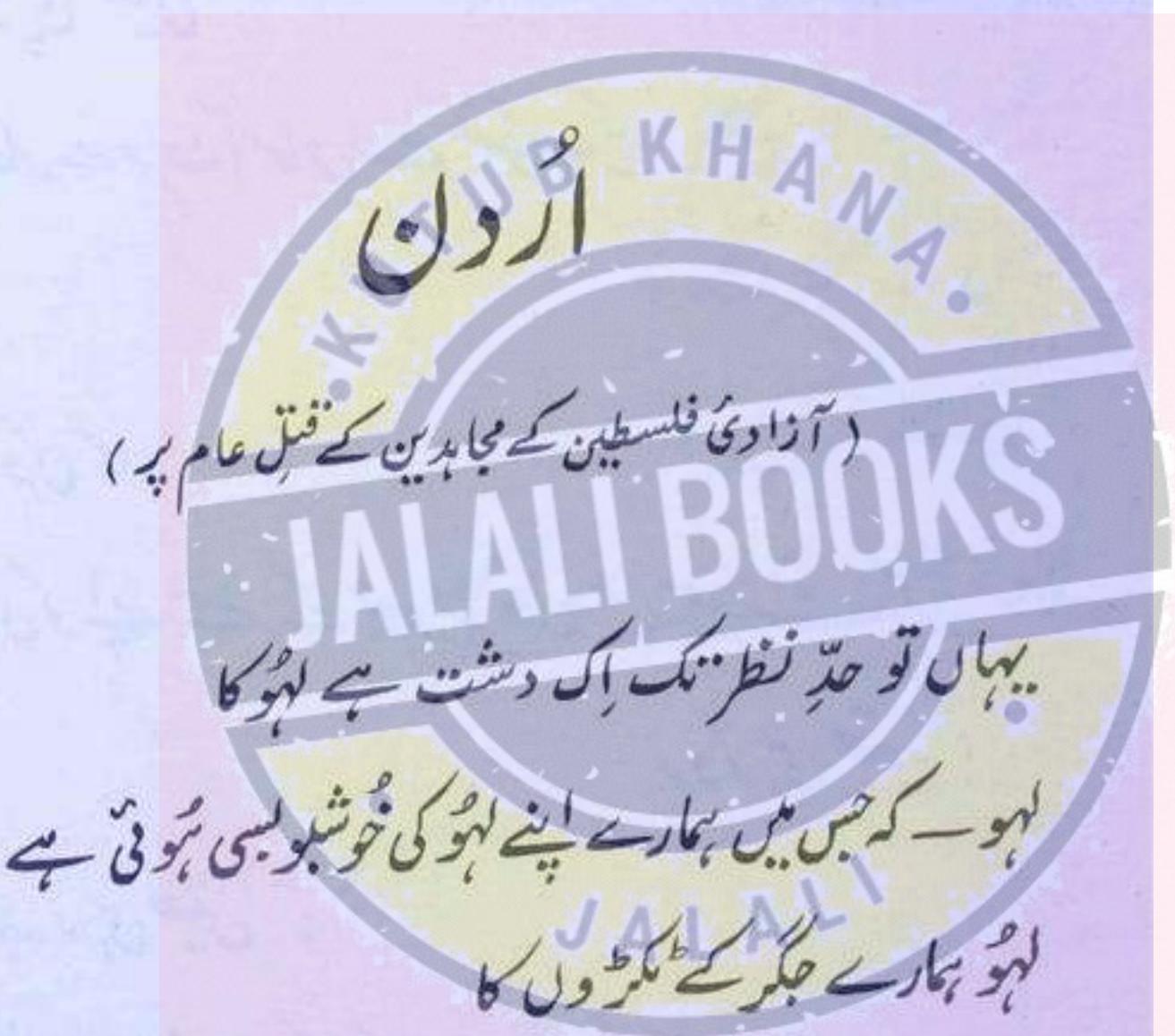
جن میں ربِّ قدیر نے

اپنے فنِّ تخلیق کو مجسّم کیا تھا

اُن بیٹیوں کا

جو حُسن اور حیا کی نقاب اوڑھے

مجاہدوں کے نقوشِ پا دیکھتی تھیں

اور سوچتی تھیں

آخر ستارے صرف آسماں سے منسوب کیوں ہیں

اُن ماؤں کا

جو بچّوں کو اپنے سینے کے جھونپڑوں میں سمیٹ کر

رو رہی تھیں!

اور کہہ رہی تھیں:

ربِّ عظیم! پیغمبروں کی اس سرزمین کا واسطہ

خدائے جلیل! اپنے حبیبؐ کا واسطہ

ہمیں خود ہمارے بیٹوں کے خنجروں سے بچا

کہ وہ جس لہو کے پیاسے ہیں

وہ خود اُن کا لہو ہے

ہم سب لہو کے اس دشت میں کھڑے سوچتے ہیں
جو ہاتھ ہم پہ اُٹھے
ہمارے ہی ہاتھ تھے
مگر اُن میں کس کے خنجر تھے؟

کس کے خنجر تھے؟
کس کے خنجر تھے؟
کس سے پُوچھیں!
چلو، چلیں، آستینوں سے پُوچھیں

اکتوبر ۱۹۷۰ء
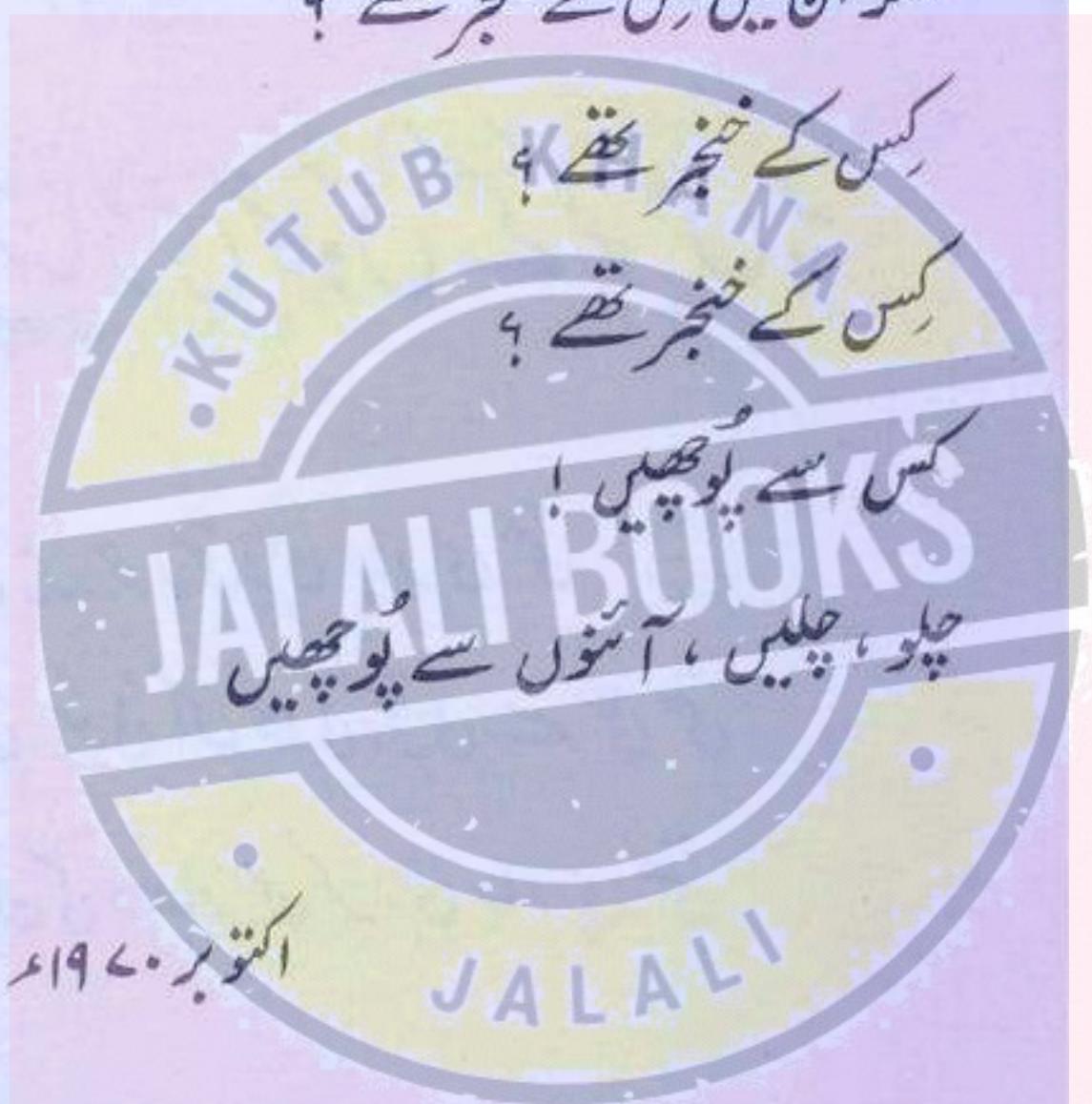
ایک پہاڑی گاؤں کے کنوئیں پر

کنوئیں میں جو رسّی بہی جا رہی تھی
وہ چھلتی ہوئی اِک گلابی ہتھیلی سے نکلی تھی
اور خوں کی دھار بن کر بہی جا رہی تھی

پھر اِس دھار کو اس گلابی ہتھیلی نے کچھ
اس طرح سے سمیٹا،
گزوں لمبے اژدر کا اِک ڈھیر سا لگ گیا
اُس کے پھن میں لہو تھا

یہ رسّی ، بظاہر جو اِک ڈول کو کھینچ کر
لاتی ہے
اصل میں اِس چھلی ، نرم و نازک گلابی
ہتھیلی کی ،
صدیوں پرانی مشقّت کی سفاک بے انتہائی
کا اظہار ہے !

ستمبر ۱۹۷۰ء
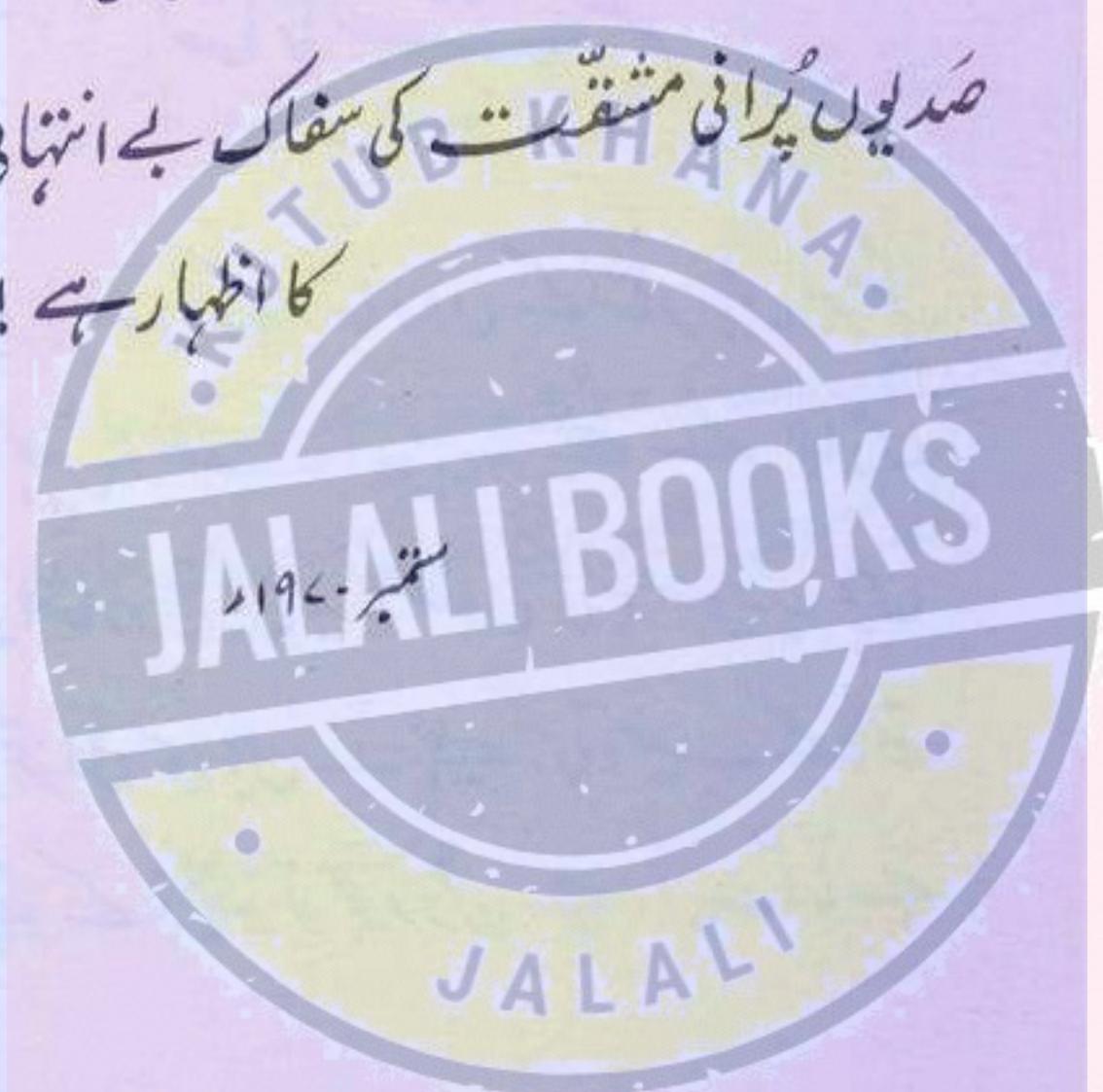
نشاناتِ سفر

یہ جو ہاتھوں کے اشاروں کے نشاں ہیں ہر سُو
یہ کہیں دشتِ ابد میں نہ مجھے لے جائیں
اِن اشاروں میں یہ ہاتھوں کی جو تصویریں ہیں
استخوانی سی ہیں — جیسے کسی آسیب کے ہاتھ
چھُو کے دیکھو تو جو روغن ہے، اُچٹ آتا ہے

انہی ہاتھوں کے اشاروں پہ چلے تھے جو لوگ
کچھ خبر آئی تھی ان کی، نہ صدا آئی تھی
صرف اِک گُونجتی گھنگھور گھٹا آئی تھی
جس سے جو بُوند نکلتی تھی، پلٹ جاتی تھی
خشک ہونٹوں پہ زباں پھیر کے رہ جاتے تھے

میں حقیقت کا نمائندہ ہُوں، دیوانہ نہیں!
اِن اشاروں سے جو اپنا سفر آغاز کروں
ان گپھاؤں میں اُترنے سے تو بہتر ہے، کہ مَیں
اپنے ہاتھوں سے نئی راہیں تراشوں اپنی
نئے شہروں، نئی دنیاؤں کے در باز کروں

یہ الگ بات کہ وہ قبر کے در بن جائیں
ہاتھ میرے کبھی، نشاناتِ سفر بن جائیں

اگست ۱۹۷۰ء

یہ لمحہ
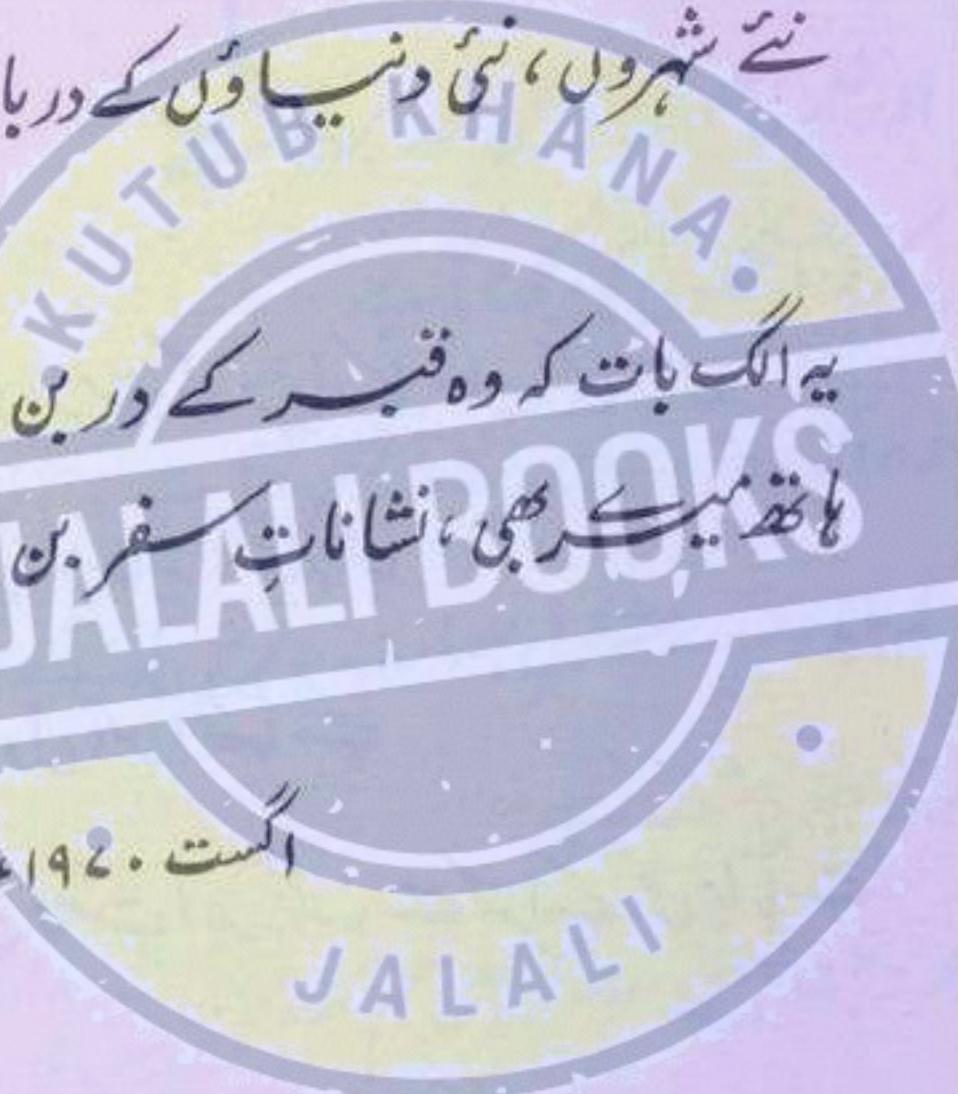
دشت میں ریت کی دیوار کا سایہ بھی نہیں
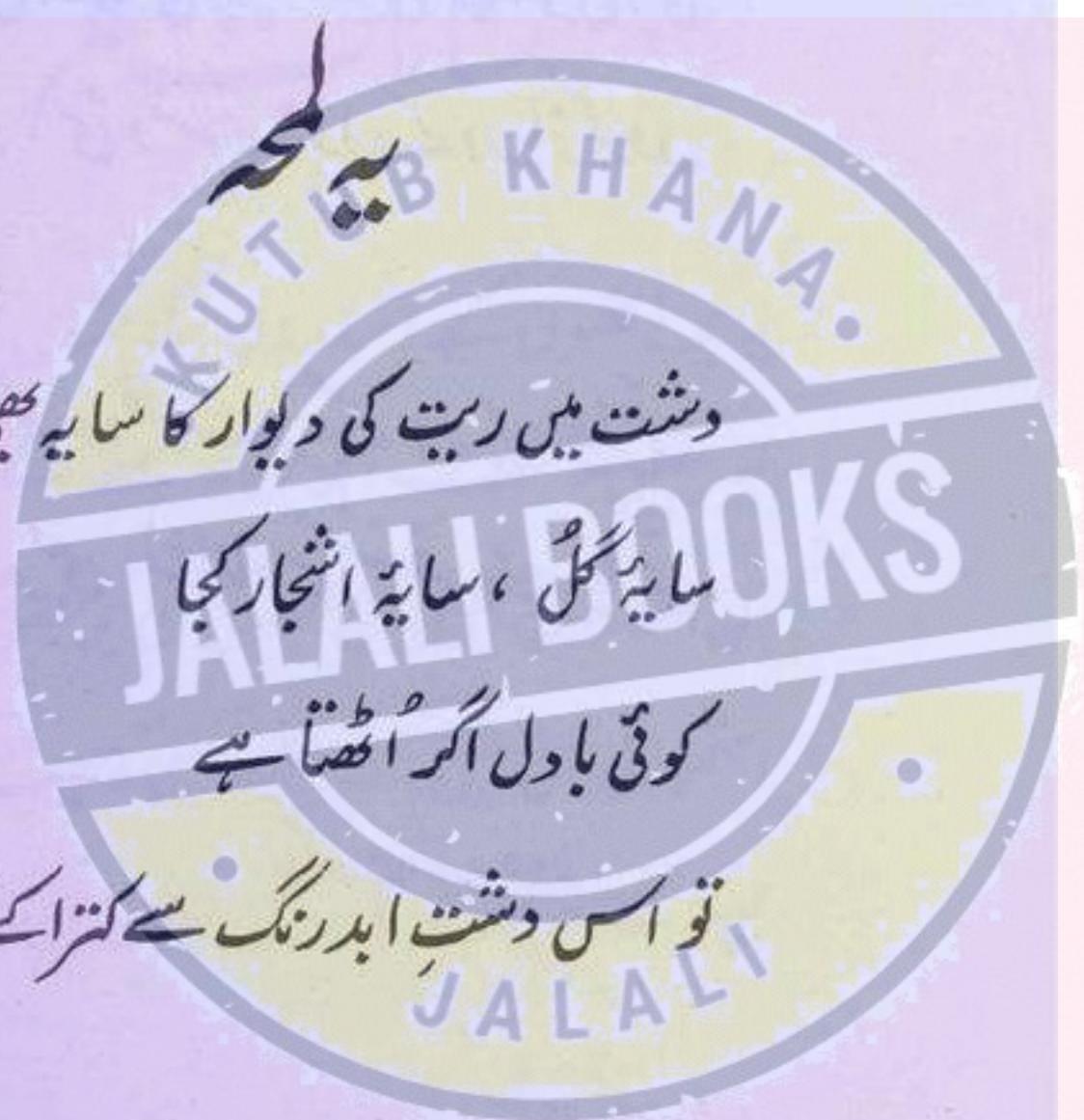
سایۂ گل، سایۂ اشجار کجا

کوئی بادل اگر اٹھتا ہے

تو اس دشتِ ابد رنگ سے کترا کے نکل جاتا ہے

وہ جو اقبال کے صحراؤں میں لالے ہیں

وہ ہم دشت نوردانِ حقیقت کے کفِ پا کے

وہ چھالے ہیں

جو پھوٹیں تو کچھ اس طرح کہ چنگاریاں ٹوٹیں

نہ زمیں پر کوئی سایہ
نہ فلک پر کسی سائے کا یقیں ہو نہ گماں ہو باقی
دشت کا کوئی کنارا تو یقیناً ہوگا
یہ تو پھر دشت ہے
اور ظلم کی ظلمت کی بھی حد ہوتی ہے
کہ جو آنکھوں کو بجھاتا ہے
وہ اک روز یہ آواز لگاتا نظر آتا ہے
کہ بابا، مرے کشکولِ بصارت پہ ترس کھا کے چلو!
یہ تو پھر دشت ہے
جو وقت نہیں ہے کہ کبھی ختم نہ ہو

دشت کی آخری حد
کل نہ سہی
ایک صدی بعد سہی
آئے گی

آئے گی ضرور

لیکن اس وقت یہ عالم ہے

کہ سورج اُتر آیا ہے سوا نیزے پر

اور ماحول کی حدّت سے اُلجھتا ہُوا

جو لمحہ گزرتا ہے

وہ بھُن جاتا ہے

جولائی ۱۹۷۰ء

ویت نام کا دعوت نامہ

(امریکہ کے شاعروں اور فن کاروں کے نام)

یہاں بھی آؤ، زمین گردانِ حوصلہ مند!
اس مقامِ حیات بخش و حیات کُش کی بھی
سیر کر لو
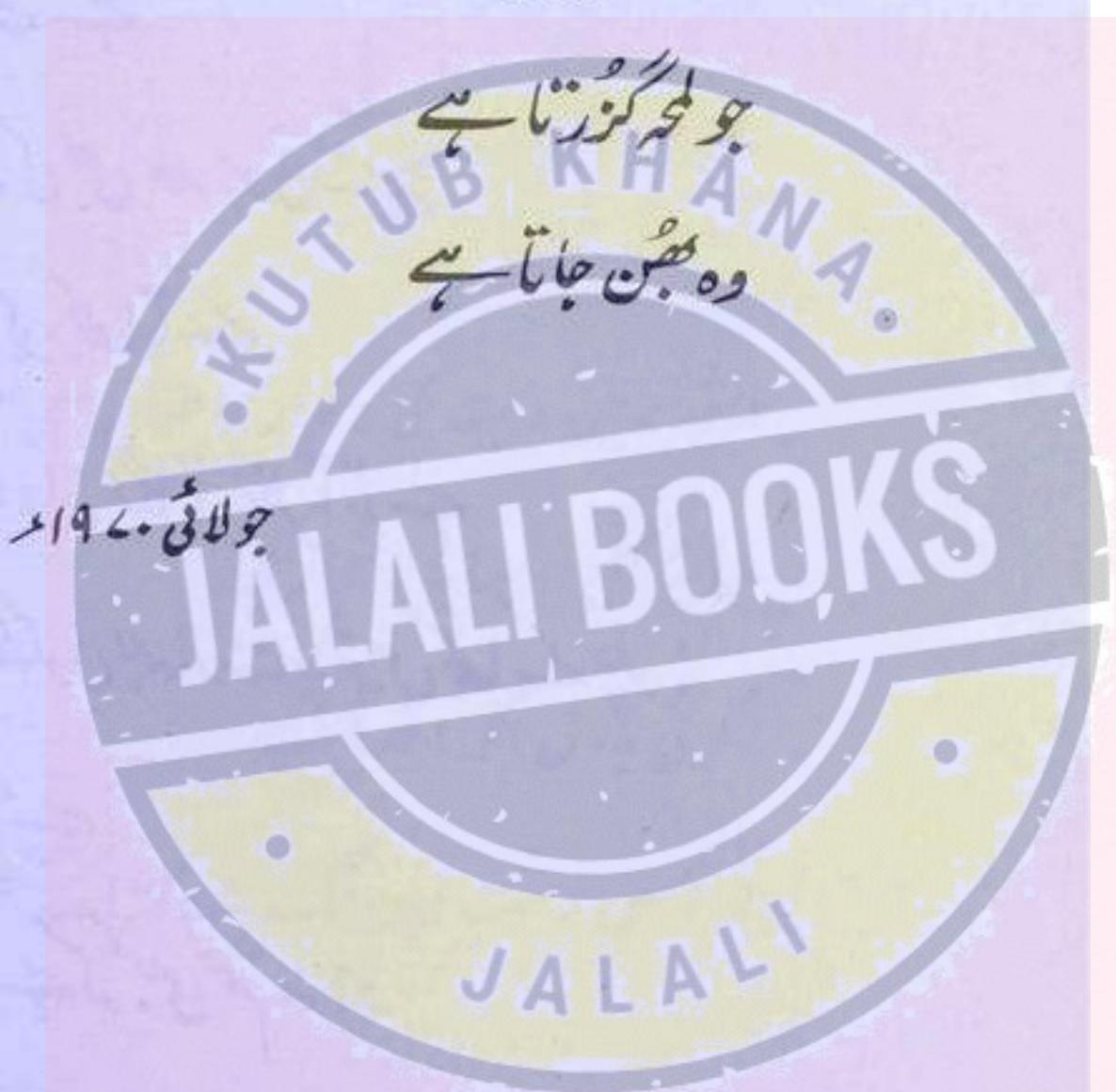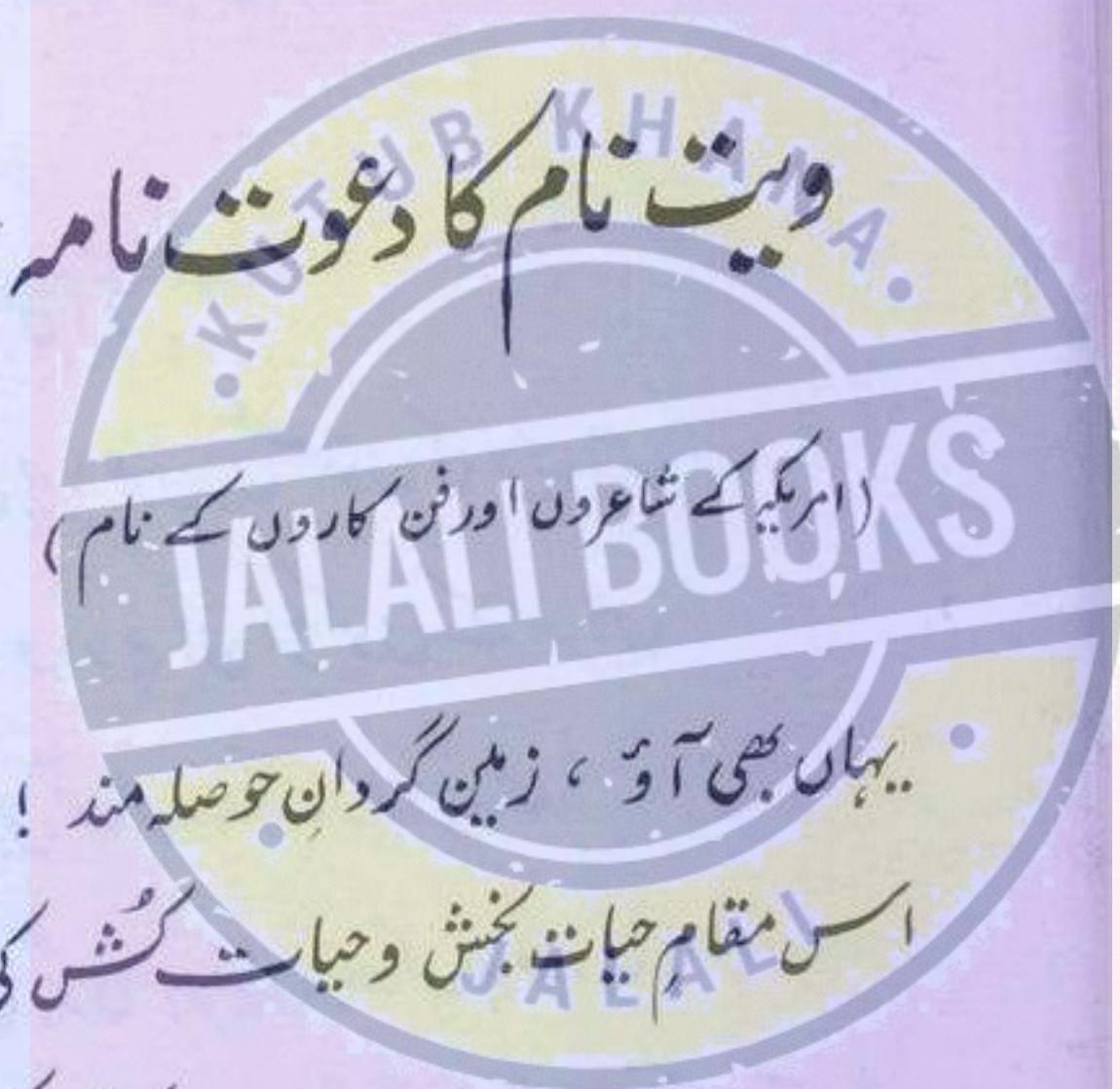
جہاں کی چھتنار خلوتوں میں
ہرے بھرے جنگلوں کے بیٹے
تمھاری خاطر
لہُو کے کاسے لیے کھڑے ہیں

یہاں بھی آؤ

جہاں کٹی ہڈیوں کے سازوں پہ

علم اور آگہی کا اِک آرکسٹرا

کب سے سینہ زن ہے

یہاں بھی آؤ

جہاں چراغوں میں عصمتوں کی لویں ہیں

دیوار و در پہ ان لڑکیوں کے سر ہیں

جنھیں تمھارے شکاریوں نے

ڈری ہُوئی ہرنیاں سمجھ کر ہدف بنایا

تپائیوں پر ہزاروں بچّوں کی گول آنکھیں سجی ہیں

جو اپنی حیرتوں کے حصار میں گھومتی ہیں

اور ڈھونڈتی ہیں اپنے بدن کے ٹُوٹے ہُوئے کھلونے

یہاں بھی آؤ

جہاں تمھارے بڑوں کی تہذیب

اپنے دانتوں میں لحمِ آدم لیے ہوئے

ایشیا کے اربابِ فن کو

وٹمین کے ترانے سُنا رہی ہے

جولائی

۱۹۷۰ء
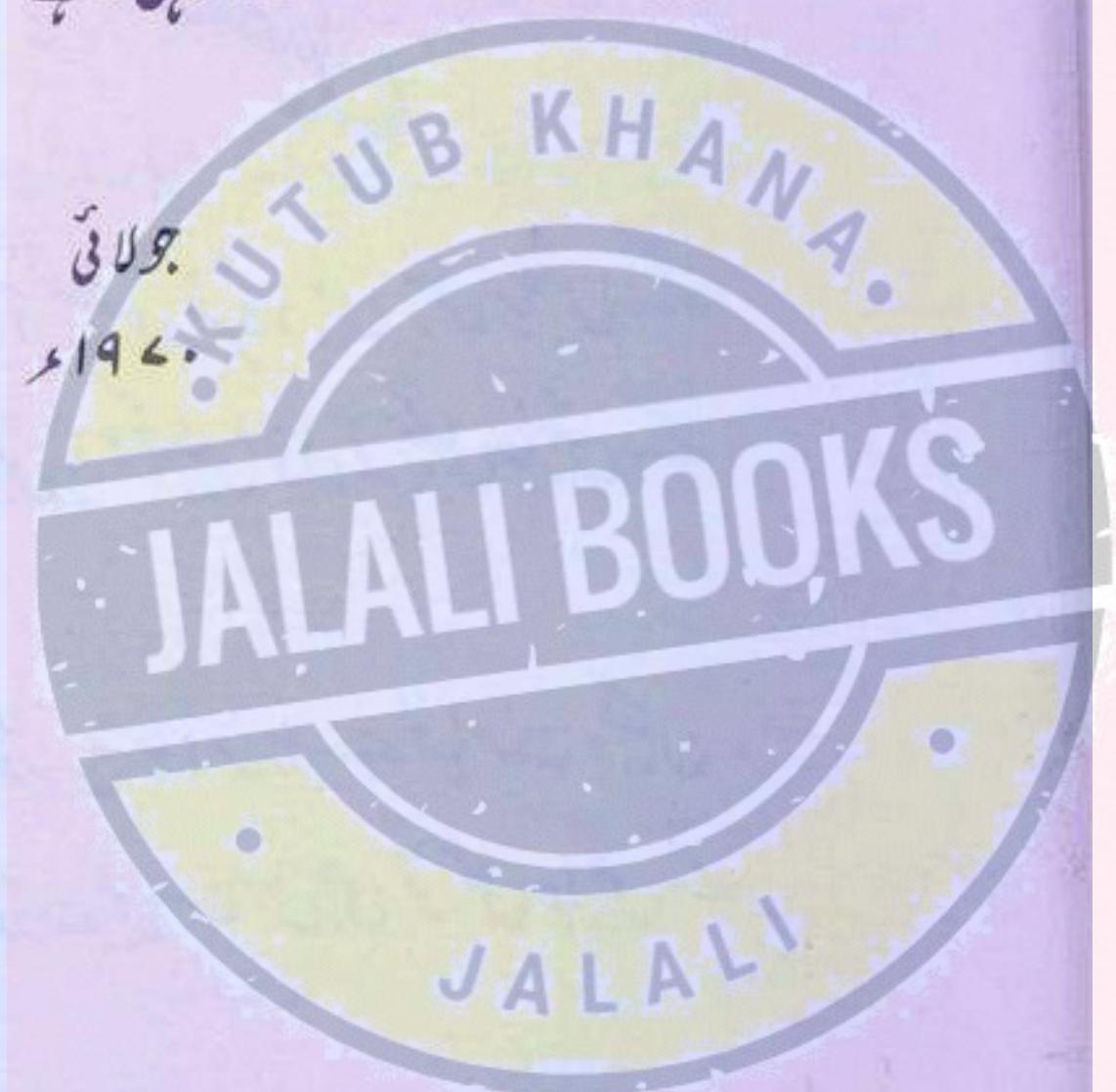
مُستقبل

ہم اگر آتشِ نمرُود میں جل جائیں گے
گُل کھلیں یا نہ کھلیں، دل تو پگھل جائیں گے

سر پہ سُورج کا اُترنا ہے قیامت، لیکن
اس کی حدّت میں سلاسل بھی تو گل جائیں گے

جن سے انسان کو ذلّت کے سوا کچھ نہ ملا
ایسی اقدار کو حالات نگل جائیں گے

اپنے خولوں ہی میں چِھد جائیں گے خوابیدہ ضمیر
تیر تاریخ کی جھٹکی سے نکل جائیں گے

ریت سُلگی تو سمندر سے بھی لَو اُٹھے گی،
برف ٹُوٹی تو کہستاں بھی مچل جائیں گے

اِک عجب زلزلہ، خود نگری آئے گا،
ذہن ہِل جائیں گے، معیار بدل جائیں گے

اپریل ۱۹۷۰ء

امیر و غریب

کتنے امیر ہیں

مجھ سے محبّت کرنے والے !

اِتنی بے اندازہ وفائیں !

اِتنا پیار ! اِتنا ایثار !
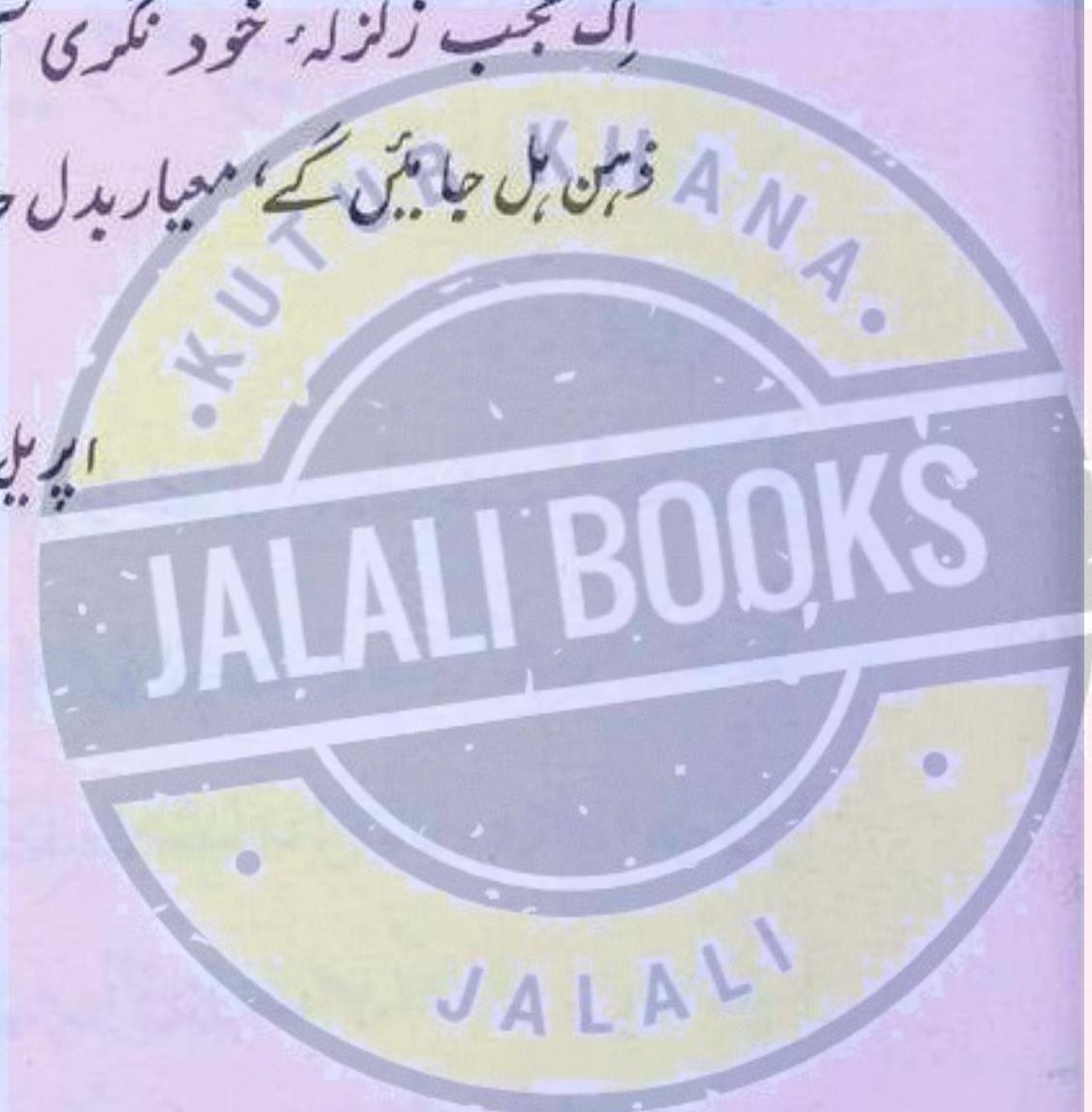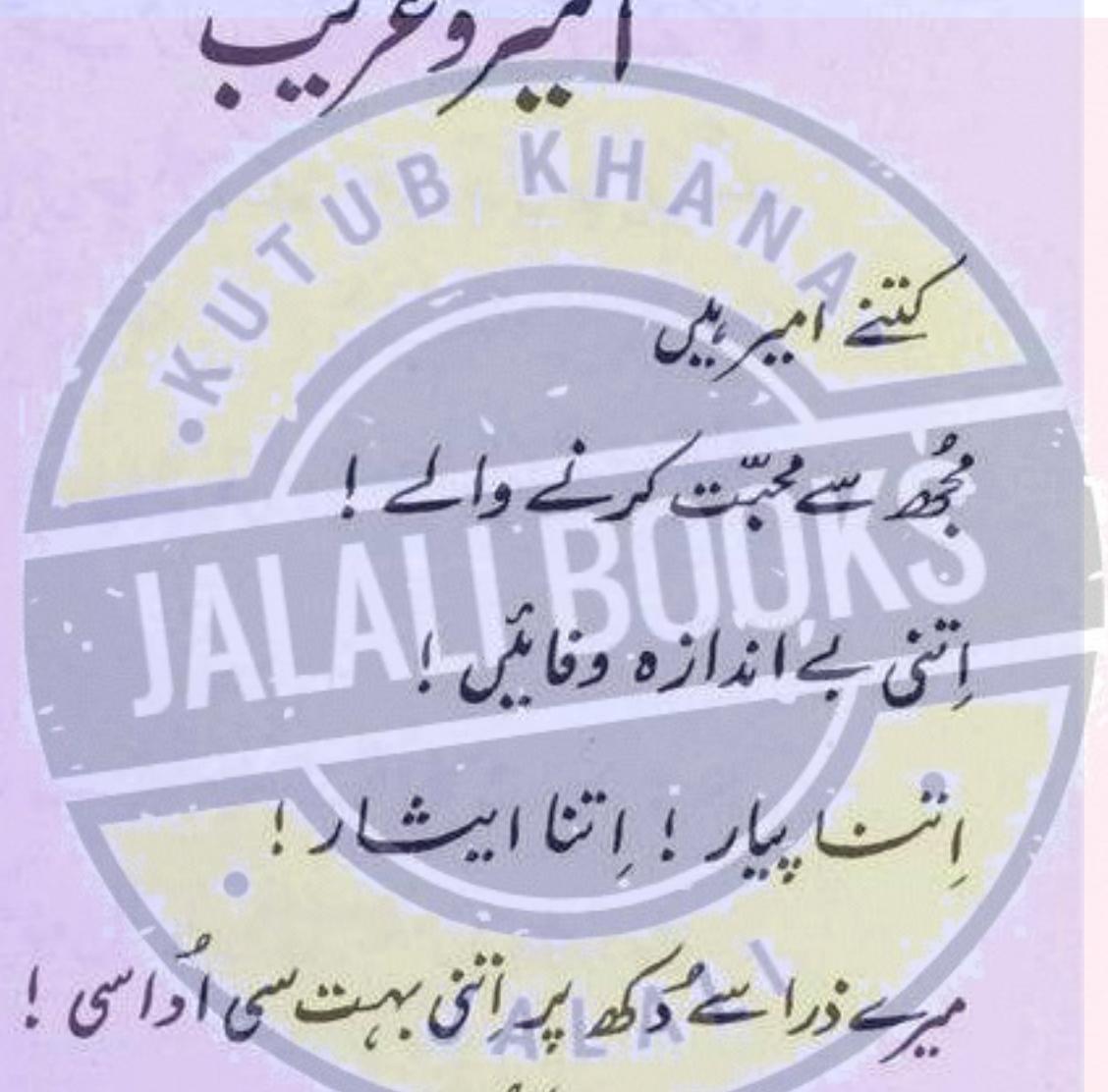
میرے ذرا سے دکھ پہ اتنی بہت سی اُداسی !

میری ذرا سی خوشی پر کھل کر ہنسنا ان کا شعار

مجھ سے محبّت کرنے والوں کی نظروں میں

میری فن کارانہ خاموشی کے بھی مفہوم ہزار

مجھ سے محبّت کرنے والے

کتنے سنہرے جذبوں کے سرمایہ دار !

کِتنے غریب ہیں

مجُھ سے نفرت کرنے والے !

ان کے دماغ و دل بیمار

ان کے پاس فقط اِک کالی خواہش

صرف اِک ننگا مقصد

آخری وار !

مجُھ سے محبّت کرنے والو !

مجُھ سے نفرت کرنے والے چند غریبوں کو بھی بنا لو

اپنی بے اندازہ وفاؤں، اپنے سنہرے جذبوں،

اپنے موتیوں کے سے احساسات کا حصّہ دار

اپریل ۱۹۷۰ء

اے خُدا

اے خدا، ترے در سے
مَیں فقیر کیا مانگوں
زخم زخم ہونٹوں سے
صِرف اِک دُعا مانگوں
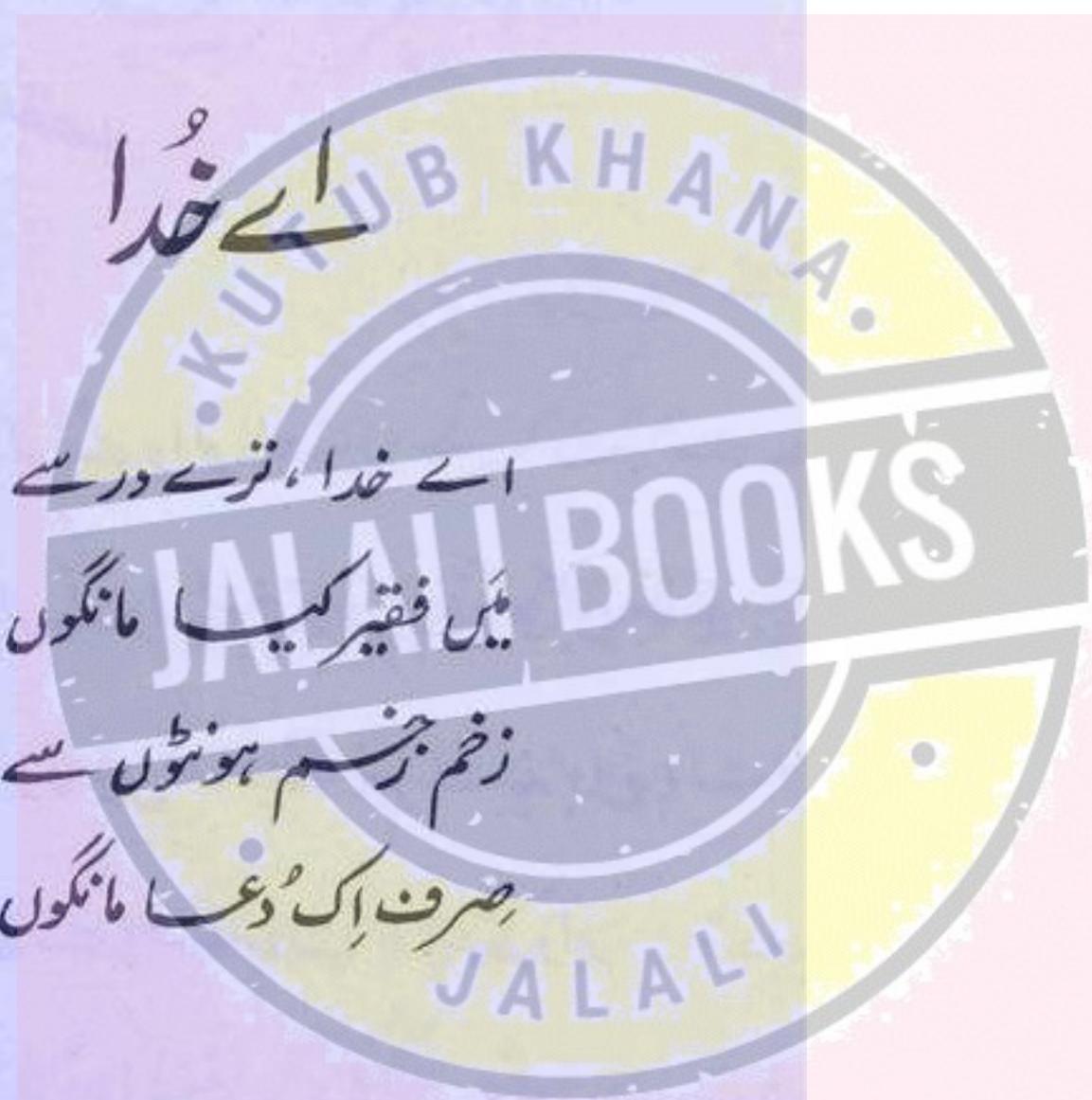
اے خُدا زمانے کے
تُو مرا خُدا بھی ہے
صِرف اِک تبسّم کی
تشنگی بلا کی ہے

آنسوؤں کو روکوں بھی
مُسکرانا چاہوں بھی
اپنے اِس ارادے کو
مَیں اگر نبھاہوں بھی
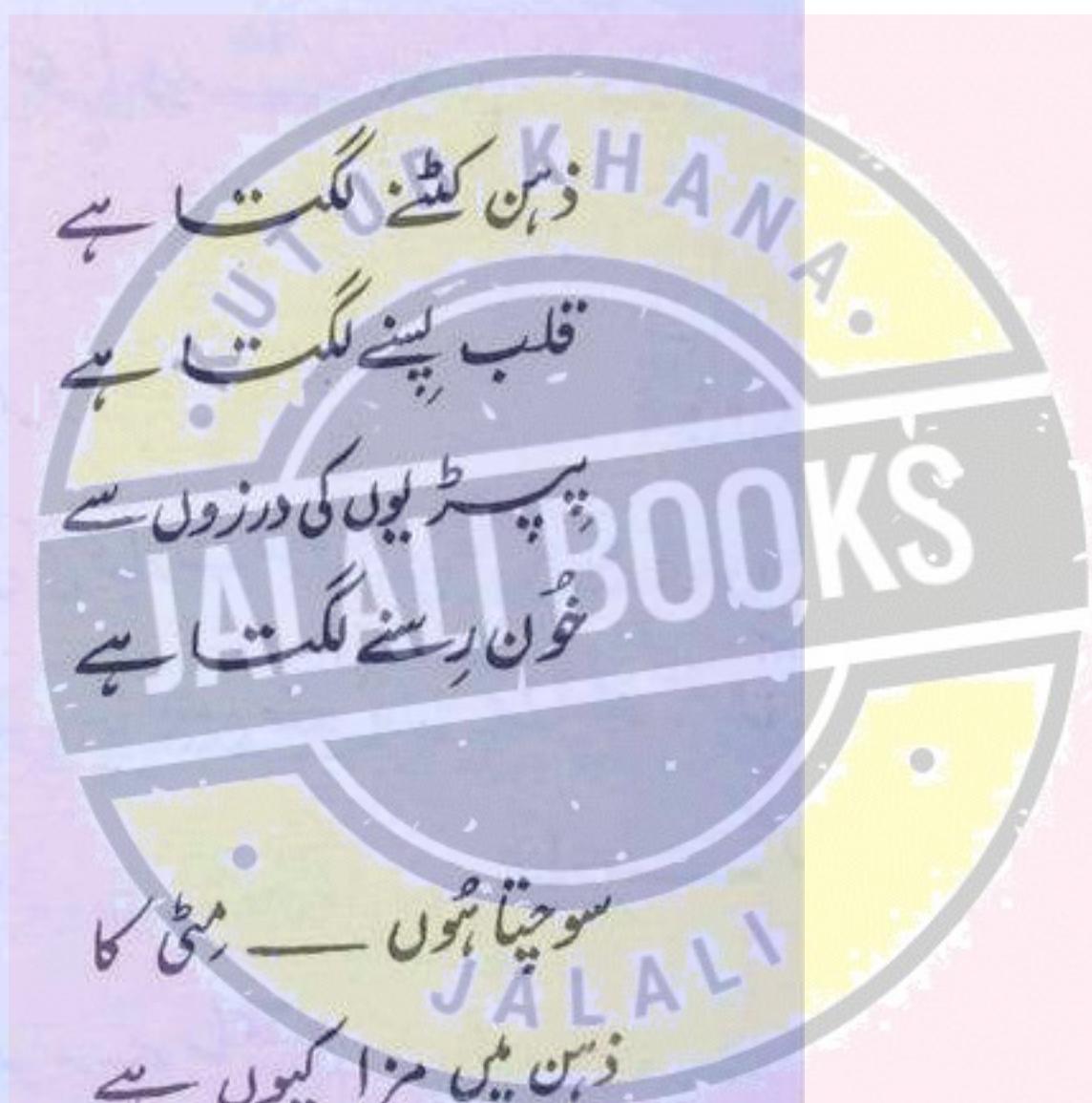
ذہن کٹنے لگتا ہے
قلب پِسنے لگتا ہے
پپڑیوں کی درزوں سے
خُون رِسنے لگتا ہے

سوچتا ہُوں ـــــ مٹی کا
ذہن میں مزا کیوں ہے
اے خُدا، مِرے مُنہ میں
تیرا ذائقہ کیوں ہے

اپریل ۱۹۷۰ء

عبادت

عبادت کرو

پتھّروں کی عبادت کرو

تیس چالیس صدیوں پُرانے بُتوں کی
عبادت کرو

یاد رکھو مرے ساتھیو

یہ زمانہ بھی پتھّر کا ہے

وہ زمانہ بھی پتھّر کا تھا

جب تمھیں پتھّروں کی قباؤں میں

اپنے خداؤں کے پیکر

چٹانوں میں دبکے ہوئے مل گئے تھے

تمہارے ہی تیشے اُٹھے تو یہ پتھر سنور کر

خدا بن گئے تھے!

تمہاری ہی تخلیق کے معجزے دیوتا بن گئے تھے

وہی دیوتا

اِس زمانے میں بھی
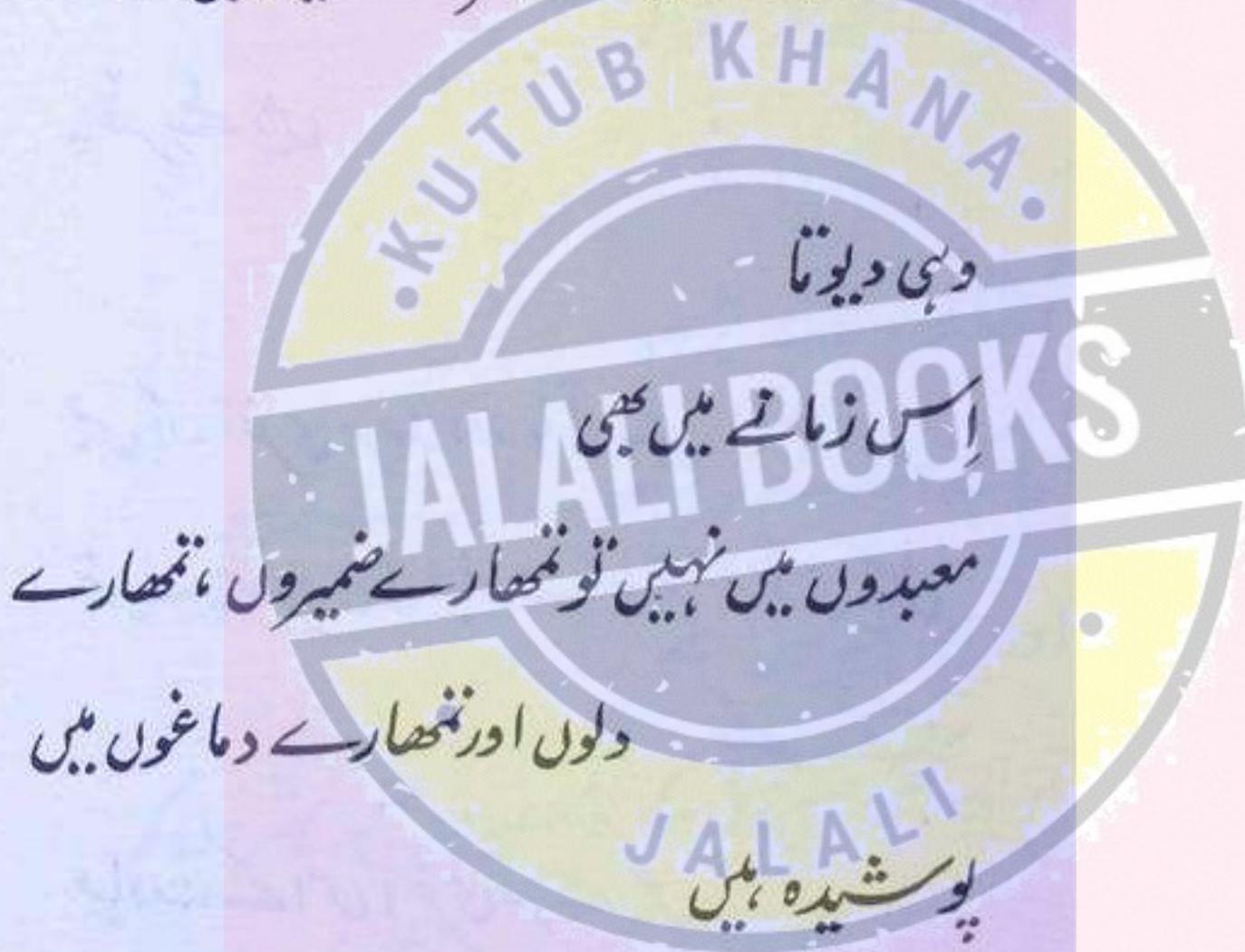
معبدوں میں نہیں تو تمہارے ضمیروں، تمہارے

دلوں اور تمہارے دماغوں میں

پوشیدہ ہیں

وہ تمہارے خیالات ہیں

اور افکار ہیں

لپٹے لپٹائے

اِک نسل سے دُوسری نسل میں منتقل ہوتے ہوتے

یہاں تک چلے آئے ہیں

اپنے چہرے ہی دیکھو

تمہاری بھوؤں کے خموں میں بھی پتھر جڑے ہیں

تمھیں پتھروں کی عبادت کے بدلے

دماغوں، دلوں اور آنکھوں کی صورت میں

پتھر ملے ہیں

بس اک آخری مرحلہ اور باقی ہے

تب پتھروں کی عبادت کا تم آخری پھل

چکھو گے!

عبادت کے اس آخری مرحلے میں

تم اپنے خیالوں کو

خوابوں کو

سب آرزوؤں کو

ساری امنگوں کو

پتھّر بنا لو

پھر ان گرم، جیتے ہوئے، سانس لیتے ہوئے

ساری رُوحوں میں اُترے ہوئے

ساری دھرتی پہ بکھرے ہوئے پتھّروں کو

خزانے سمجھ کر اُٹھا لو

اُٹھا لو تو آگے بڑھو

ان کے انبار لے کر بڑھو — اور آگے بڑھو

اور اِن پتھّروں سے

تم اِن کتنی صدیوں کے بوسیدہ و منجمد پتھّروں کو

نشانے بناؤ

شرارے اُڑاؤ

نئی آگ روشن کرو

جس میں پتھّر کے ہمراہ

وہ دل بھی

وہ ذہن بھی جل بُجھیں

جو تمھیں پتھّروں کے پجاری بنائے رہے

بُت بنانا، انھیں معبدوں میں سجانا، عبادت سہی

اپنے رستوں سے ان پتھّروں کو ہٹانا،

عبادت نہیں ہے تو پھر اور کیا ہے؟

مارچ ۱۹۷۰ء

ابلاغ

سب صدائیں گنگ، سب الفاظ معنی پوش ہیں
شعر حل کرتے ہیں قلب و ذہن کی باریکیاں
ہونٹ ہلتے ہیں، دہن میں رقص کرتی ہے زباں
لیکن اربابِ سماعت کس قدر خاموش ہیں
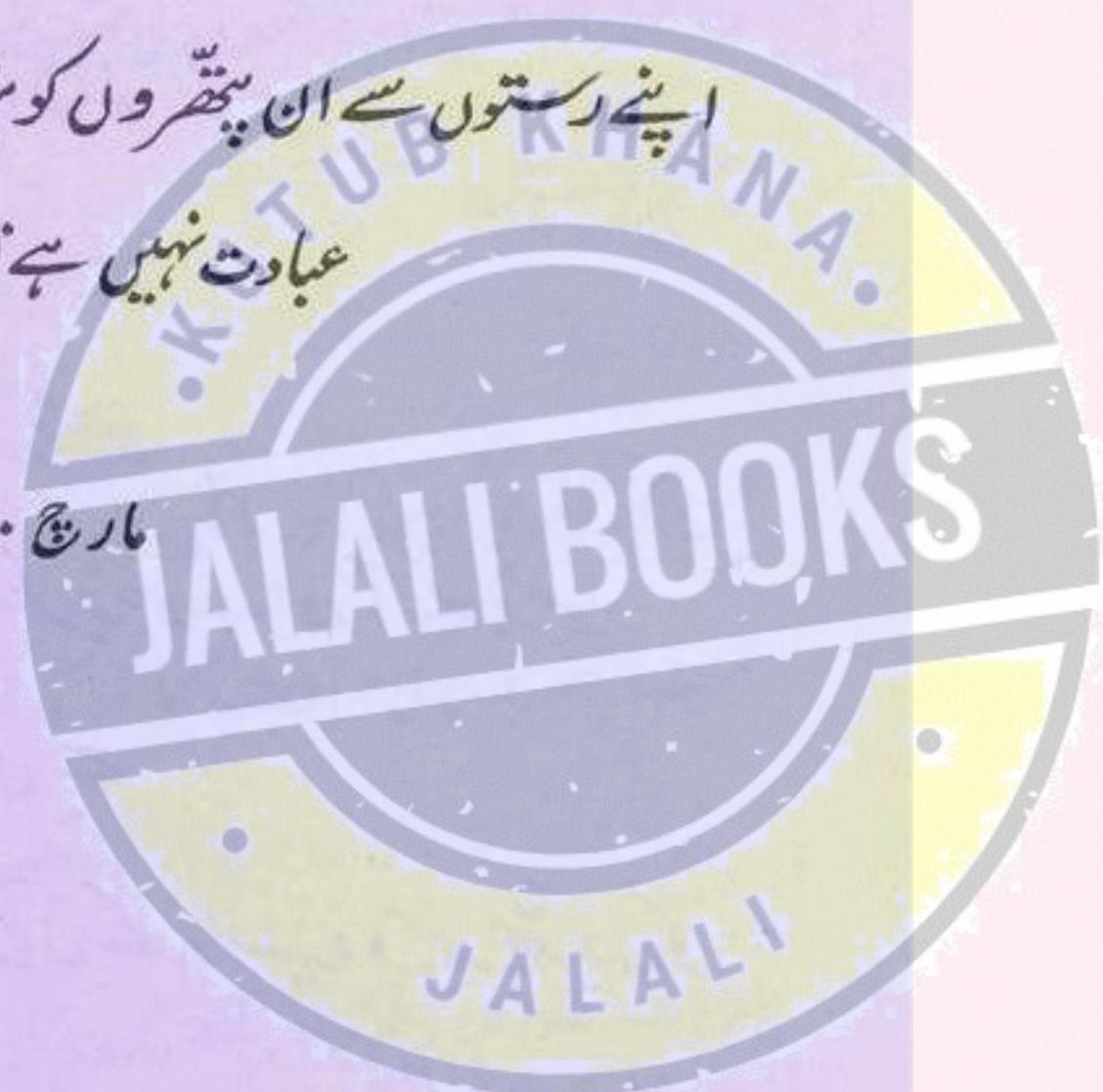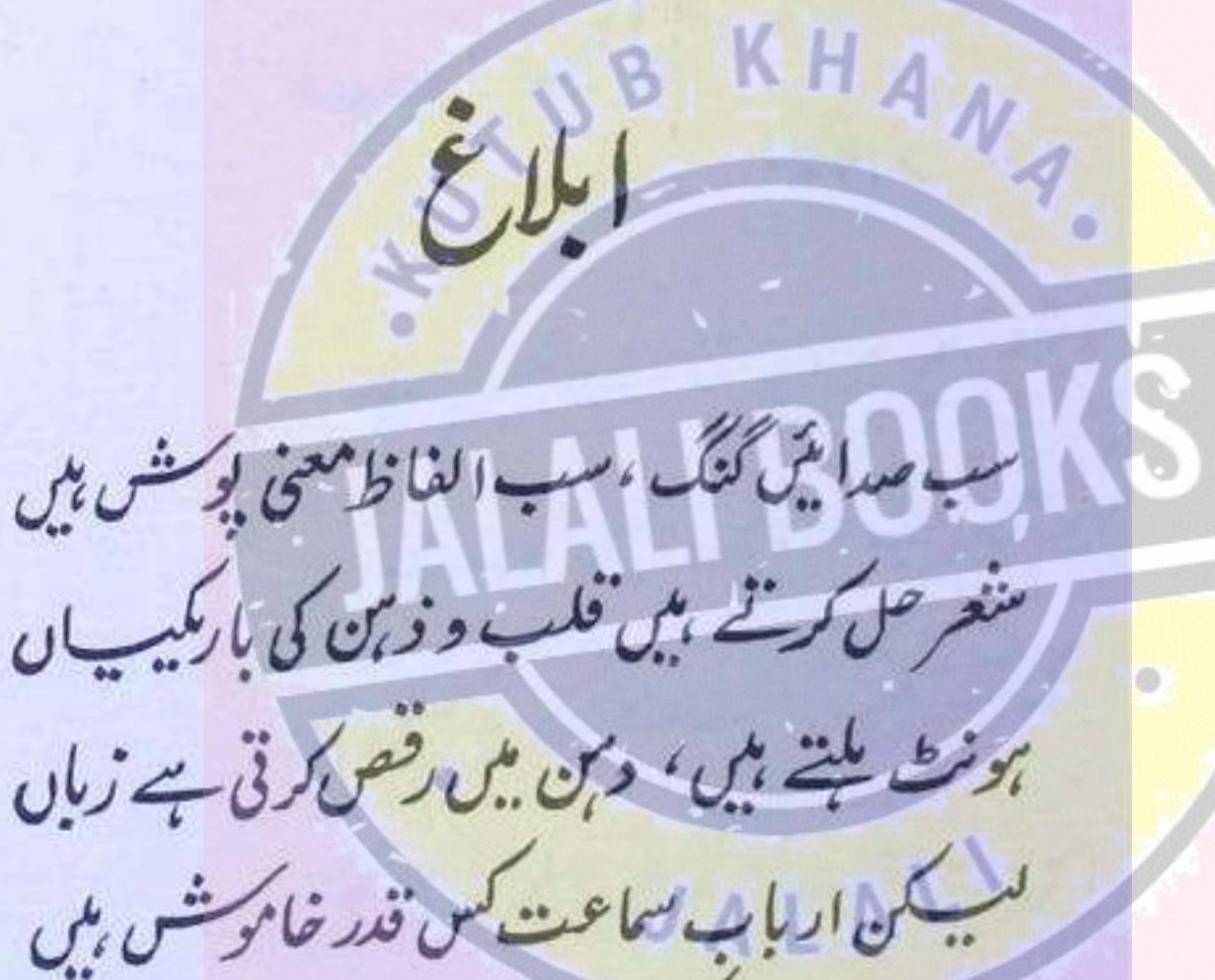
جب کلی چٹکے تو مَیں سُنتا ہُوں آوازِ درا
جب چمن مہکے تو نکہت چار سُو ہو نغمہ بار
شاخ سے پتّہ جو چِھن جائے تو چِلّائے بہار
روئے اور نوحے پڑھے ننگے درختوں میں ہوا

کب مرا ہر لفظ کلیوں کی چٹک اپنائے گا
کب مِری آواز میں مچلے گی خوشبوئے چمن
کب خزاں کی زد میں آئے گا مرا نخلِ سخن
کب زبانِ بے زبانی کا مجھے فن آئے گا

۱۹۷۰ء

نامناسب

نہیں ہمدم، یہ مناسب نہیں ہے

یہ تہذیب کی ایک ایسی نفی ہے

کہ تہذیبِ آئندہ کے پاس بھی

اس کے اثبات کا کوئی پہلو نہ ہوگا
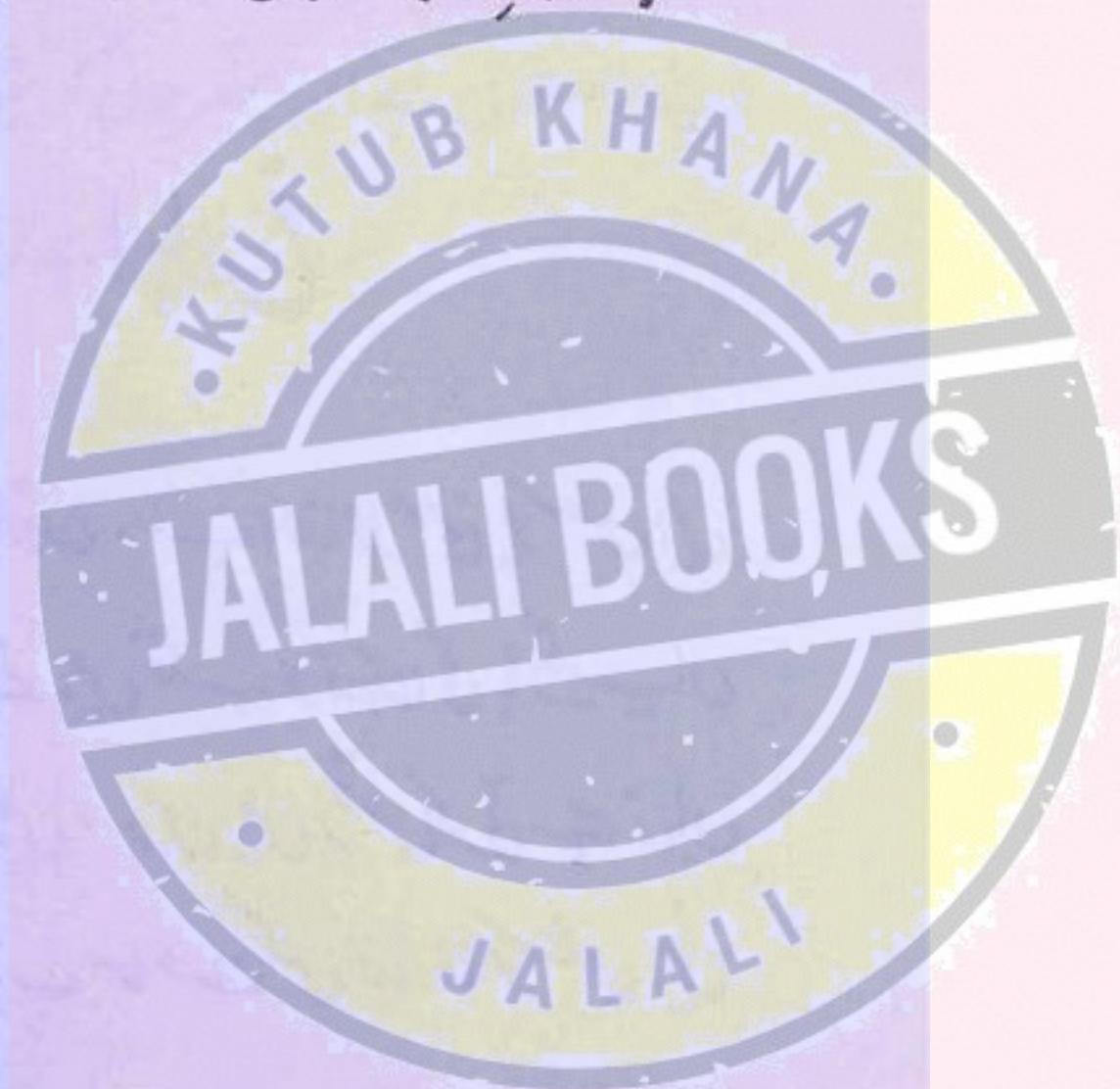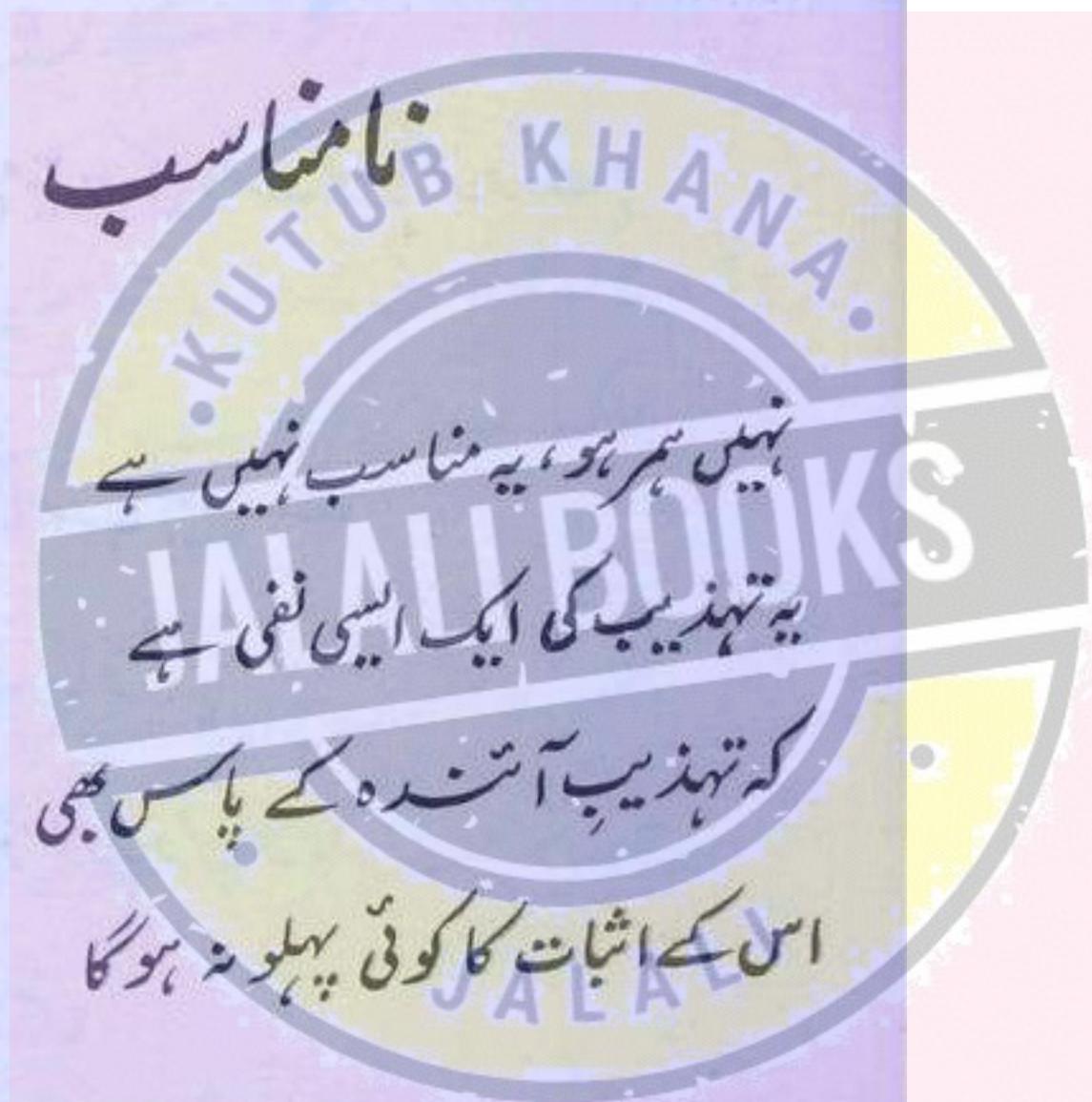
اصولوں کی لاشوں کو

یوں دھوپ میں چھوڑ کر

آگے بڑھنا مناسب نہیں ہے

یہ ماضی کی سچائیاں ہیں

اگر حال ان کی صداقت سے مُنکر ہُوا ہے

اگر آج یہ بے حقیقت ہیں

بے مایہ ہیں

بے اثر ہیں

تو کیا تم بزرگوں کی میّت کی ذِلّت گوارا کرو گے؟

نہیں ہمرہو، یہ مناسب نہیں ہے

اصُولوں کی تربت بناؤ

کفن اِن کو پہناؤ اور دفن کر دو

کہ نسلیں جب آئیں

تو تہذیب کے ان شہیدوں کے مرقد پہ

اپنی عقیدت کے پھُولوں کی چادر چڑھانا نہ بھُولیں

فروری ۱۹۷۰ء

ہوا کے رُوپ

یُوں تو دھرتی پر ازل سے سایہ افگن ہے ہوا
خاک سے دامن کشاں ہے، کتنی پُرفن ہے ہوا

اس کا منصب یُوں تو ہے مشاطۂ گلزار کا
جب سرِ صحرا پہنچتی ہے تو جوگن ہے ہوا

یہ عناصر کا وہ مظہر ہے، کہ جس کے لاکھ رُوپ
چیخ ہے، نغمہ ہے، سرگوشی ہے، شیون ہے ہوا

یہ سمیٹے جا رہی ہے کتنے قدموں کے نقوش
کتنی رہزن، پھر بھی کتنی پاک دامن ہے ہوا

زرد پتے گرتے ہیں شاخوں سے جب روتے ہوئے
سوچتا ہوں، کتنی آوازوں کا مدفن ہے ہوا

جب ہوا چلتی ہے، یادوں سے مہک اُٹھتا ہے ذہن
نکہتیں جتنی بھی ہیں، ان کا نشیمن ہے ہوا

کھل گئے ہیں ایک جھونکے سے کئی چہروں کے پھول
آج کی شب چاند نکلا ہے کہ روشن ہے ہوا

اس نے انسانوں سے کچھ سیکھا تو کیا سیکھا ندیمؔ
پربتوں کی دوست ہے، تنکوں کی دشمن ہے ہوا

جنوری ۱۹۷۰ء

اعتماد

میں نے سورج کے سمندر کے کنارے جا کر
دل شعاعوں میں ڈبویا تو عجب راز کھلا

تیرگی کچھ بھی نہیں تھی، فقط اِک پردہ تھا
پردہ سرکایا تو اِک مطلعِ پرواز کھلا

جتنے گزرے ہوئے پل تھے، وہ ستارے بن کر
میری پرواز کے رستے میں بچھے جاتے تھے

جتنی قبریں تھیں، وہ روشن تھیں الاؤ کی طرح
جتنے کتبے تھے، وہ فانوس ہوئے جاتے تھے

میں چمکتا ہُوا اُترا ہُوں زمیں پر جب سے
ایک لمحے کو بھی ہر سُو نگراں پایا ہے

یہ شعاعوں کا وہ قطرہ ہے جو سُورج پر سے
دل میں چھُپ کر مرے ہمراہ چلا آیا ہے

جنوری ۱۹۷۰ء

فردِ جرم

ہم گنہگار ہیں

اور اقبال کرتے ہیں اپنے گناہوں کا

ہم جن گناہوں سے آلودہ ہیں

ان کی فہرست نذرِ وطن ہے
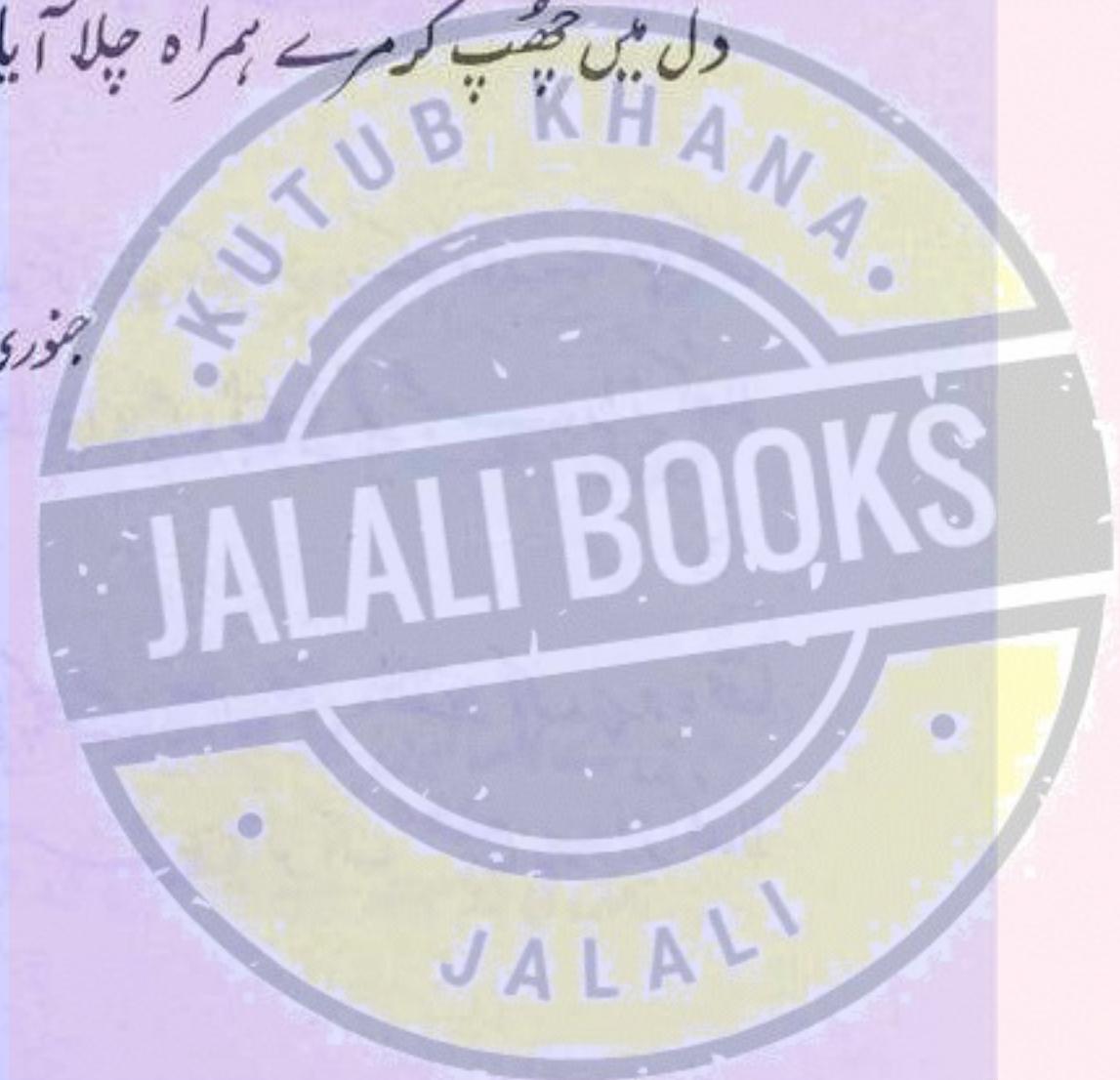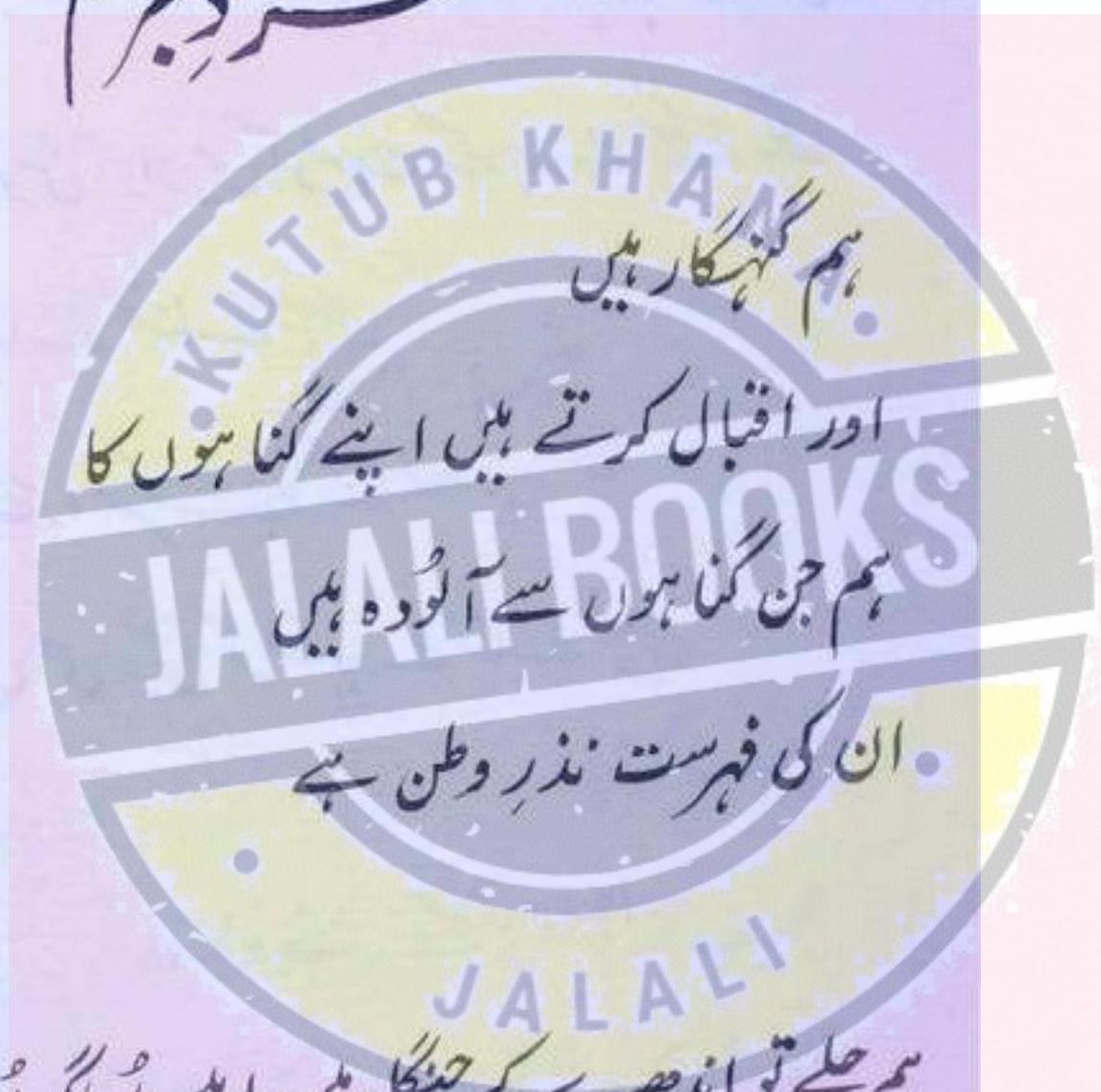
ہم چلے تو اندھیرے کے جنگل میں راہیں اُجاگر ہُوئیں

ہم رُکے تو خیابان و گلزار بن کے رُکے

ہم جو روئے تو اپنی طرح کے کروڑوں کے رونے میں شامل رہے

ہم ہنسے تو ہماری ہنسی دُوسروں کے لبوں سے چُرائی ہُوئی

مسکراہٹ کا ملبہ نہ تھی!

ہم جو کڑکے تو زنجیر کے دائروں کے دہن کھُل گئے

ہم جو بولے تو رُوحِ سماعت دُلھن بن گئی

ہم نے لکھا تو لفظوں کے صحراؤں میں کشتِ مفہوم افق تا افق

لہلہانے لگی!

ہم نے گایا تو آغوشِ آواز میں آدمیت کے جذبے ہمکنے لگے

ہم کسی جبر کے سامنے منمنائے نہیں

ہم جہاں بھی گئے سربریدہ گئے

ہم نے دربار میں بھی پہنچ کر قصیدے سُنائے نہیں

جنوری ۱۹۷۰ء

چہل پہل
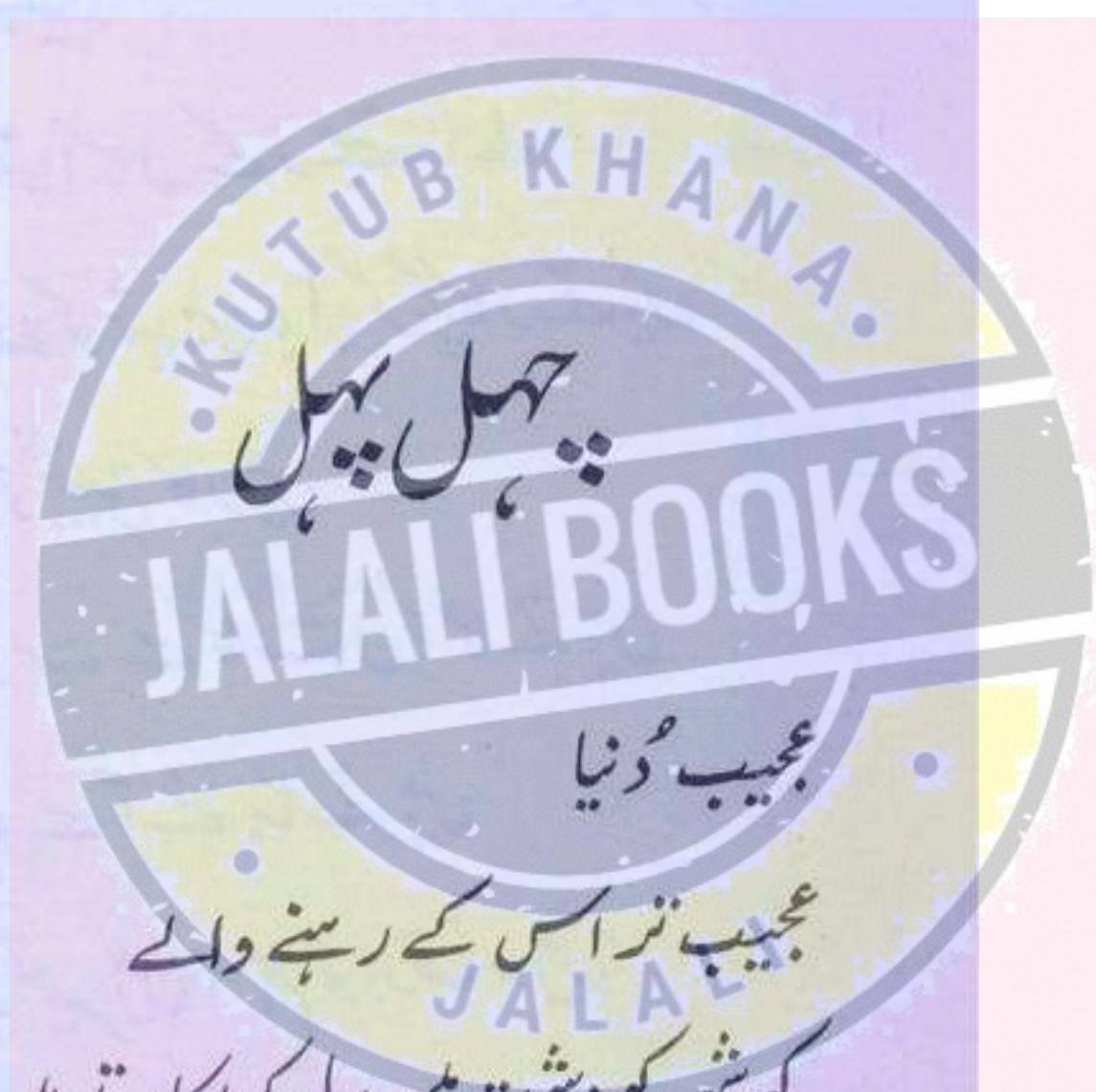
عجیب دُنیا

عجیب تر اُس کے رہنے والے

کہ شہر کو دشت میں بدل کر پکارتے ہیں

کہ ہم اکیلے ہیں

کائنات اِک عظیم صحرا ہے

جس میں مثلِ غزال ہم اپنے ہمدموں کی تلاش میں

ہر طرف رواں ہیں!

مگر متاعِ سفر ہماری، فقط زمین اور
آسماں ہیں

عجیب دُنیا

عجیب تر اس کے رہنے والے
کہ دشت کو شہر میں بدل کر پکارتے ہیں
کہ ہم تو تخلیق کار ہیں
ہم تو ریت سے گلستاں اُگاتے ہیں
سنگ سے آئینے بناتے ہیں
ہم تو تعمیر ہیں، ہم تو ارتقا ہیں

عجیب دُنیا
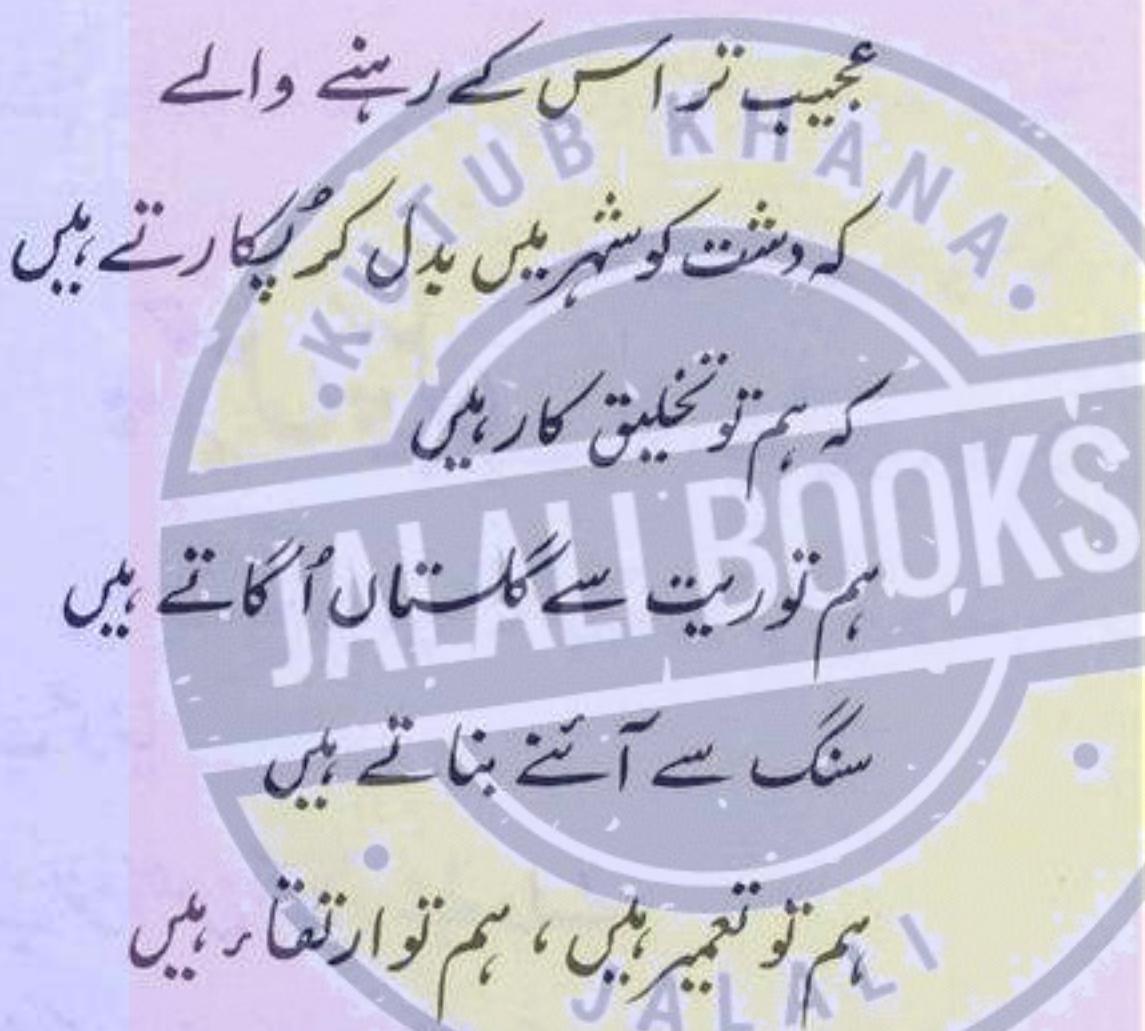
عجیب تر اس کے رہنے والے
کہ خود ہی اپنے غنیم ہیں اور خود ہی
اپنے ندیم ہیں!

اپنے شاہکاروں کو آگ میں جھونک کر بِلکتے ہیں
پھر بھی راکھ شاہکاروں میں ڈھالتے ہیں
بِگڑ رہے ہیں، سنور رہے ہیں، اُلجھ رہے ہیں،
سنبھل رہے ہیں
ازل کے دن سے بدلتے آئے ہیں اور اب تک
بدل رہے ہیں!

دسمبر ۱۹۶۹ء
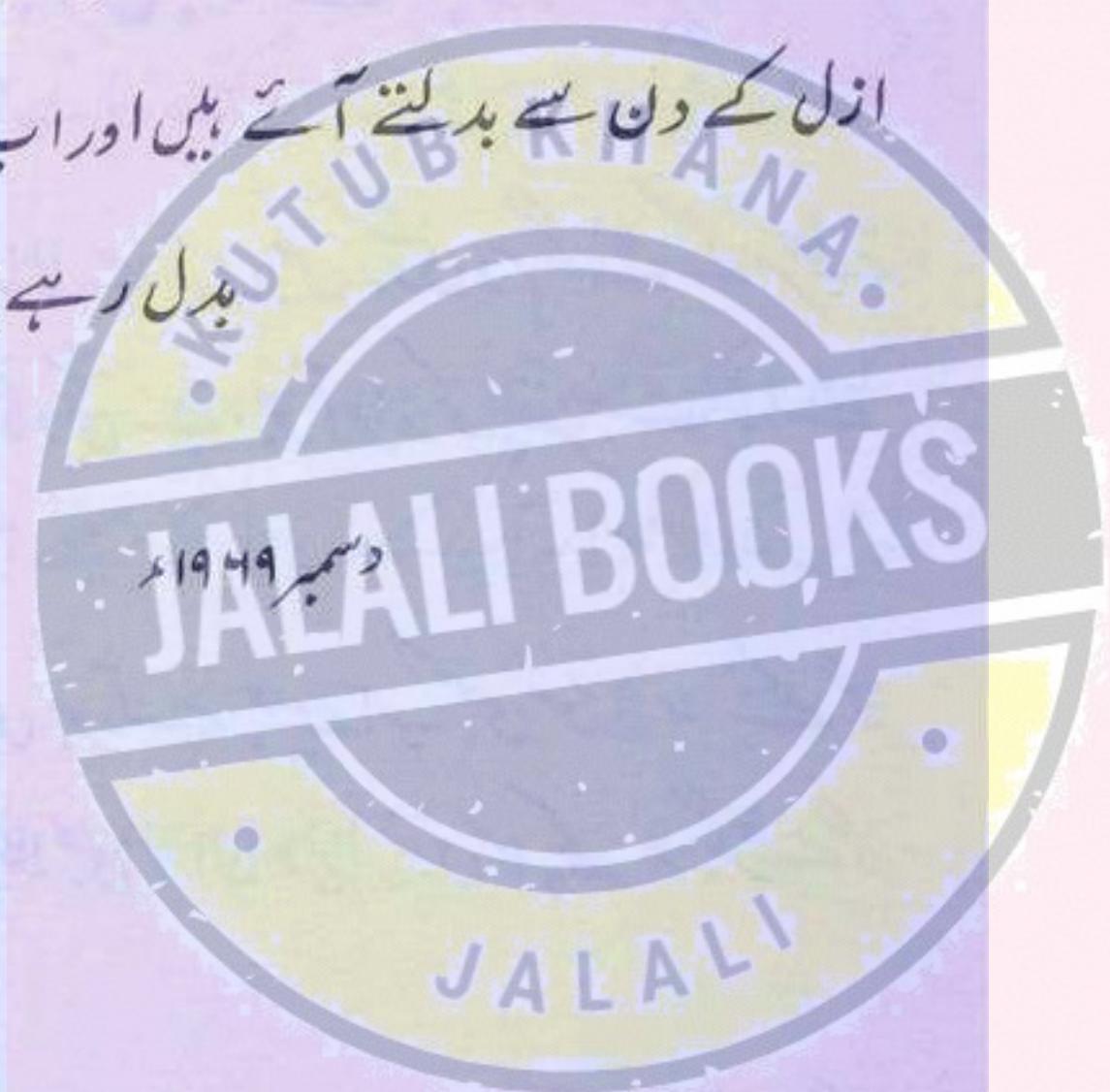
جوہری جنگ کے بعد کا ایک منظر

وہ سنّاٹا ہے، جس میں روشنی دم گھٹ کے مرجائے
وہ تاریکی ہے، جو آواز کو پتھّر بنا ڈالے

گماں ہوتا ہے جیسے اب کبھی سُورج نہ نِکلے گا
جو نِکلا بھی تو ان ویرانیوں کا کچھ نہ بگڑے گا

صداؤں کی شعاعیں اب نہ تاریکی میں لپکیں گی
گجر بھی گنگ ہوں گے اور اذانیں بھی نہ گُونجیں گی

یہ صحراؤں کے ٹیلے ہیں کہ آسیبوں کے جمگھٹ ہیں
یہ جنگل ہیں کہ رنگ و نکہت و نزہت کے مرگھٹ ہیں

پہاڑوں پہ دھواں، کھیتوں میں بھوبھل، تشنہ لب دریا
سمندر سے اُبل کر ساحلوں کو چاٹتا لاوا

یہ کل کا شہر ہے، جس کے کھنڈر صدیوں پرانے ہیں
کہ اس آج اور کل میں سینہ زن کتنے زمانے ہیں

گھروں کے آنگنوں میں سر بریدہ سائے بیٹھے ہیں
زمیں کے قاتلو! یہ آپ کے ماں جائے بیٹھے ہیں

نومبر ۱۹۶۹ء

عشق کے اِمتحاں

نظر جس طرف بھی اُٹھی
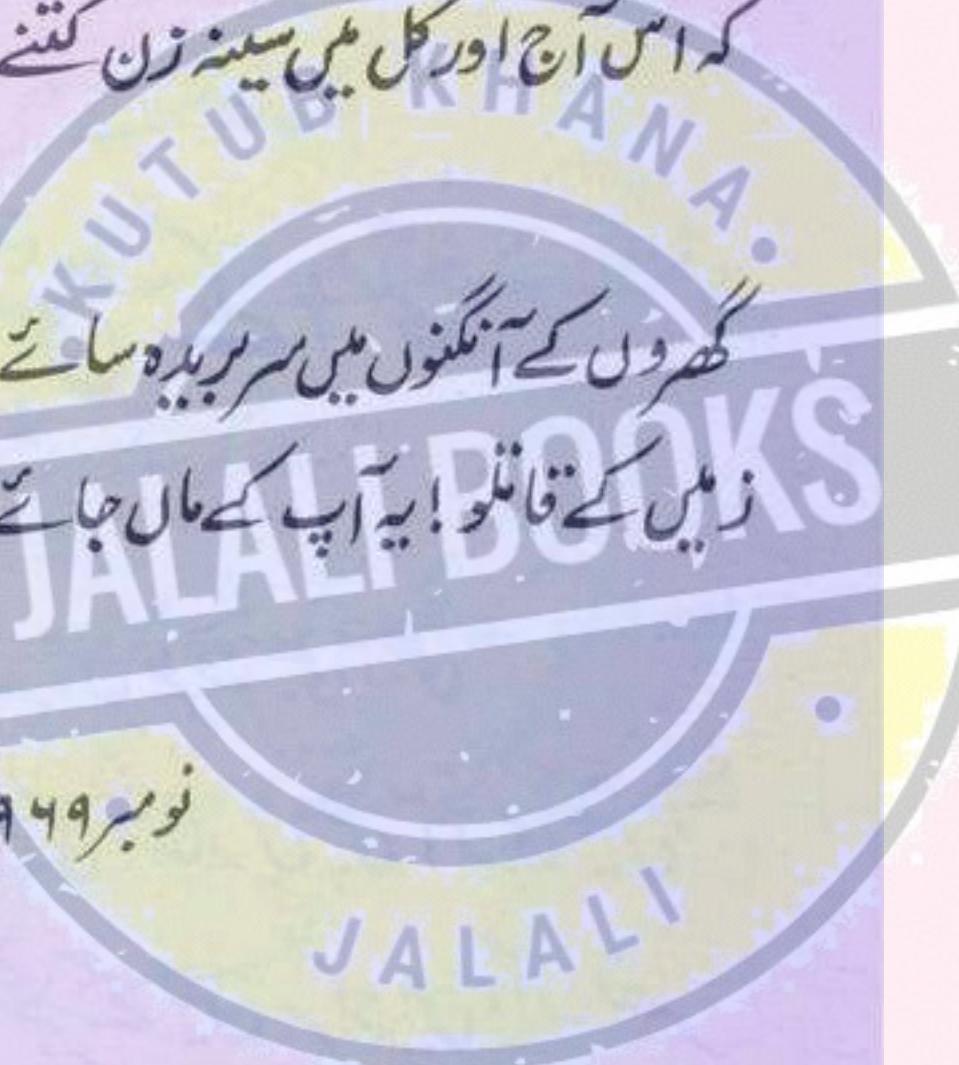
موٹروں کی قطاریں چلی آرہی تھیں

مرے شہر کے عین مرکز میں، اِک قصر

آنکھوں کو پگھلانے والی چمک میں

نہایا کھڑا تھا!

خواتین گڑیوں کی مانند، پھیلے ہُوئے

لان میں منتشر تھیں!

ہوا عطر کا بوجھ اپنی خمیدہ کمر

پر اُٹھائے ہُوئے

رینگتی پھر رہی تھی

بہت زور کے قہقہوں میں مسرّت کا

اِک شائبہ بھی نہ تھا

وقت کے طشت میں سنگریزے

سے گِرتے تھے!

اور لان کے ایک گوشے میں

طبلے کھڑکتے تھے، سارنگیاں

نغمہ زن تھیں

کوئی گا رہا تھا ــــــ

"ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

ابھی عِشق کے امتحاں اور بھی ہیں"

وہاں، ایک چھتنار کے نیم اُجالے میں

اِک نوجواں ، اِک حسینہ کو سینے سے بھینچے
ہُوئے کہ رہا تھا۔!

اگر عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
تو مَیں پُورا اُتروں گا ہر امتحاں میں
کہ مُجھ کو حکومت سے لاکھوں روپے کی
درآمد کا ایک اور
پرمٹ مِلا ہے!

نومبر ۱۹۶۹ء

اے دیوتا
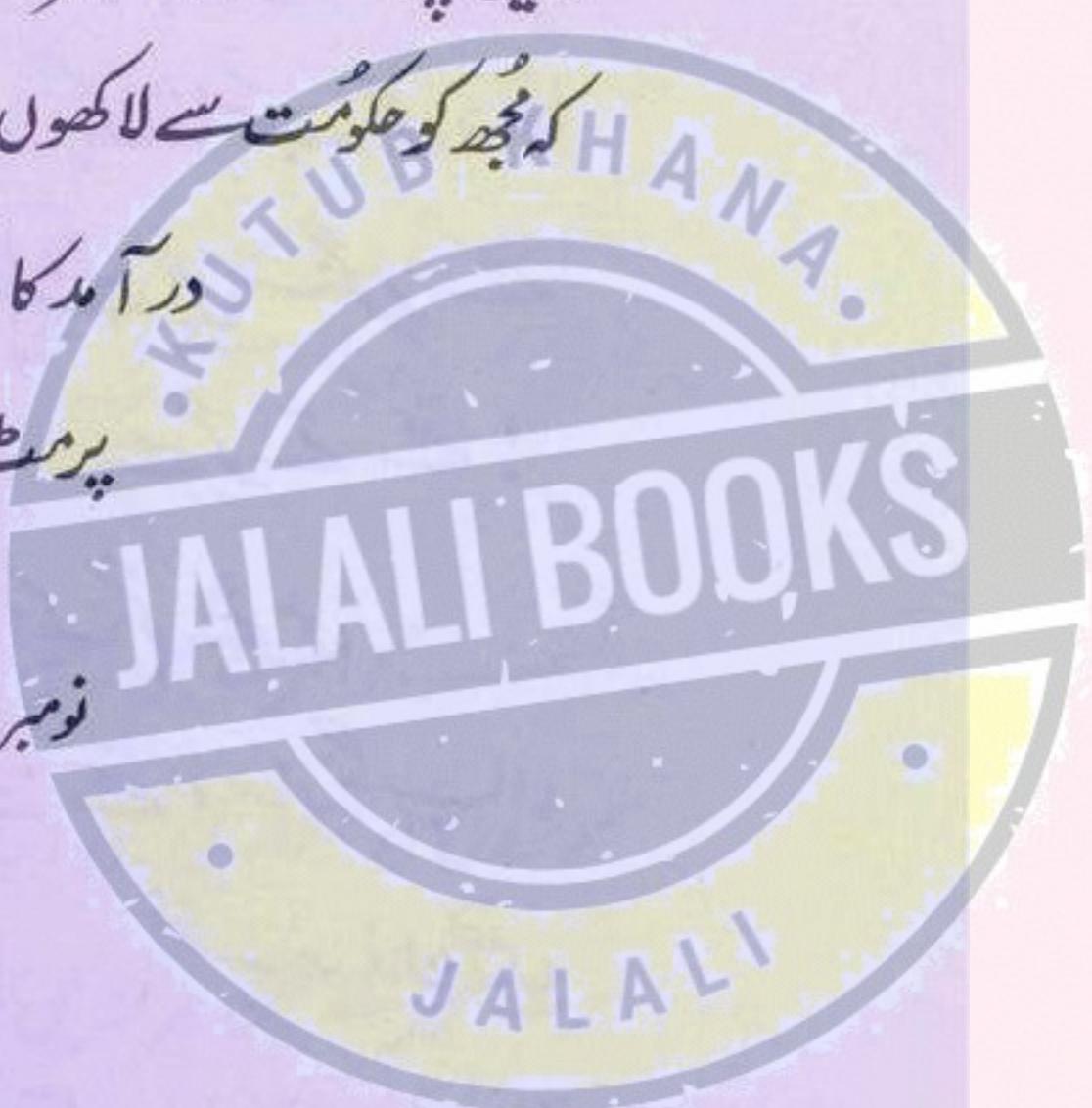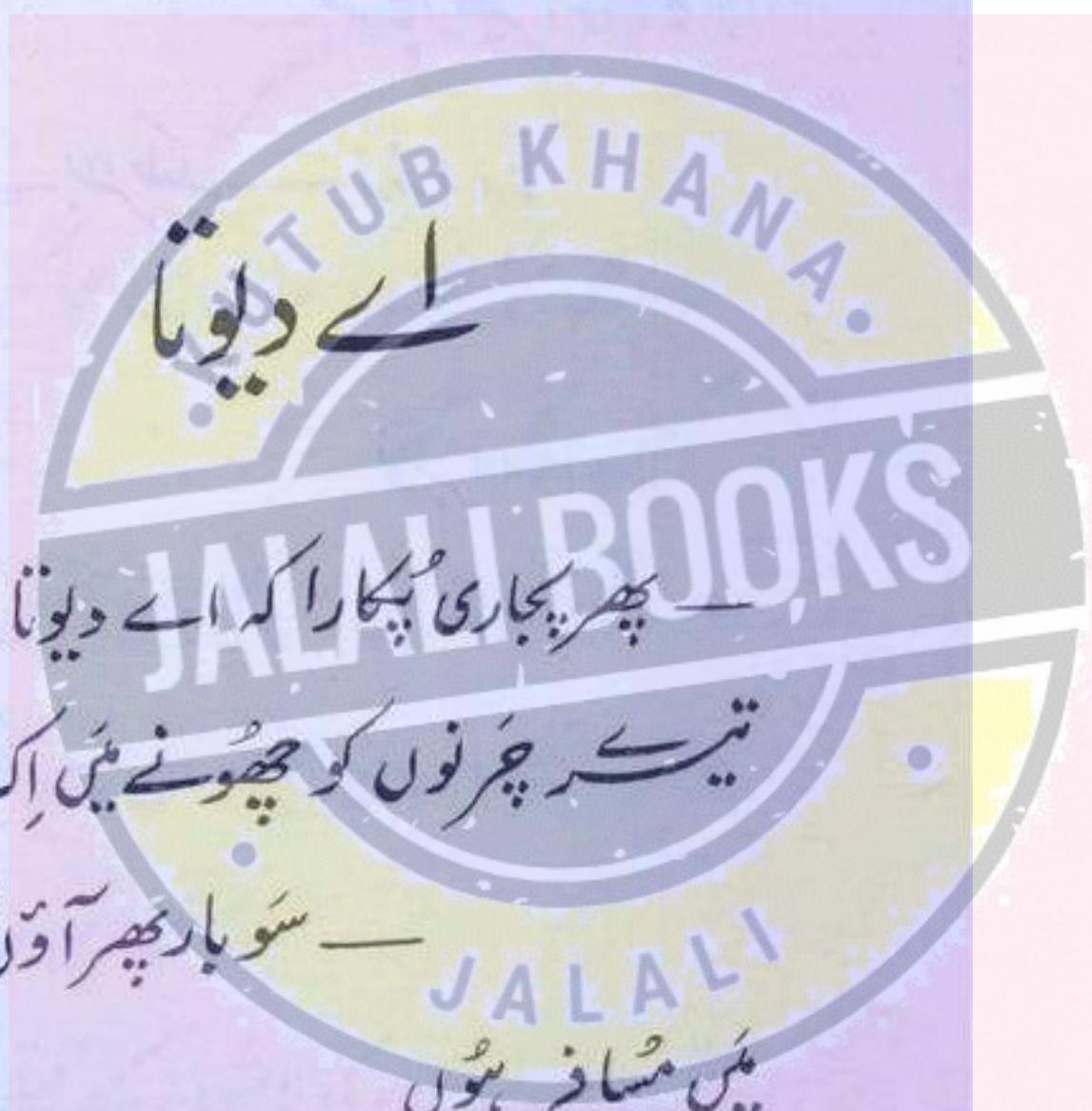
پھر پجاری پکارا کہ اے دیوتا —!
تیرے چرنوں کو چھونے میں اک بار
سو بار پھر آؤں گا —
میں مسافر ہوں
اور دائروں کے مسافر جہاں سے چلے
لوٹ آئے وہیں
ان کی منزل کہیں بھی نہیں
ان کی منزل مسلسل سفر ہے

تو مَیں تیرے مندر میں اعلان کرتا

ہُوں اے دیوتا!

تیرے چرنوں کو چھُونے مَیں اِک بار

— سَو بار پھر آؤں گا!

تُو — بشرطیکہ — زندہ رہا

نومبر ۱۹۶۹ء

صفر
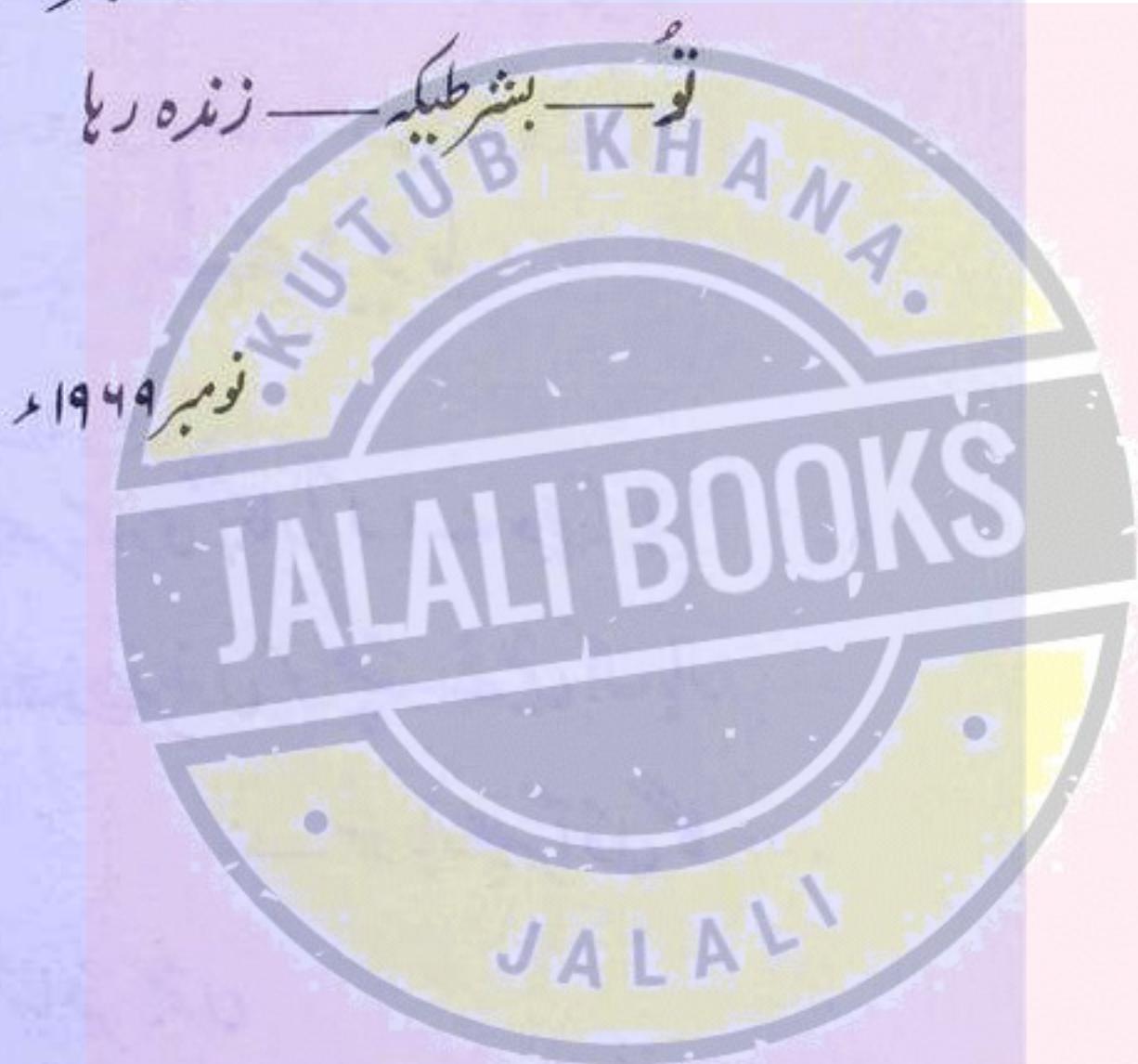
لوگ جن سُورجوں کو دلوں میں سجا کر چلے تھے

کہیں بُجھ گئے

اب تو ہر ہاتھ میں اس کی اپنی ہتھیلی کا جلتا دیا ہے

یہاں جِتنے انسان ہیں، ان سے دُگنے دئے اور

دُگنے ہی سائے ہیں!

رستوں میں سایوں کی لاشوں کے قتلے پڑے ہیں

قدم جِتنے اُٹھتے ہیں، اتنے ہی پنجر چٹختے ہیں

اور آسمانوں پہ ایسی خموشی مسلّط ہے

جیسے وہ بھولے سے بھی گونج بیٹھے تو پھٹ

کر بکھر جائیں گے!

جیسے وہ اُن خلاؤں کا حصّہ ہیں

جن میں صداؤں کی قبریں ہیں اور کچھ نہیں ہے

صداؤں کی قبریں

دعاؤں کی قبریں

لہو میں نہائی ہوئی التجاؤں کی قبریں

نومبر ۱۹۶۹ء

کھنڈر

یہ میری تاریخ کا کھنڈر ہے

یہ میرے رہوارِ برق پیکر کی ہڈیاں ہیں

یہ میری تلوار ہے جو تنکا بنی پڑی ہے

یہ ڈھال ہے جس پہ پاؤں رکھ دو تو خشک پتّے

کے ٹوٹنے کی پکار سُن لو!

یہ میرے پرچم کی دھجیاں ہیں

یہ میری قدروں کی کرچیاں ہیں

یہ میرے معیار ہیں، جو پتھّر بنے پڑے ہیں
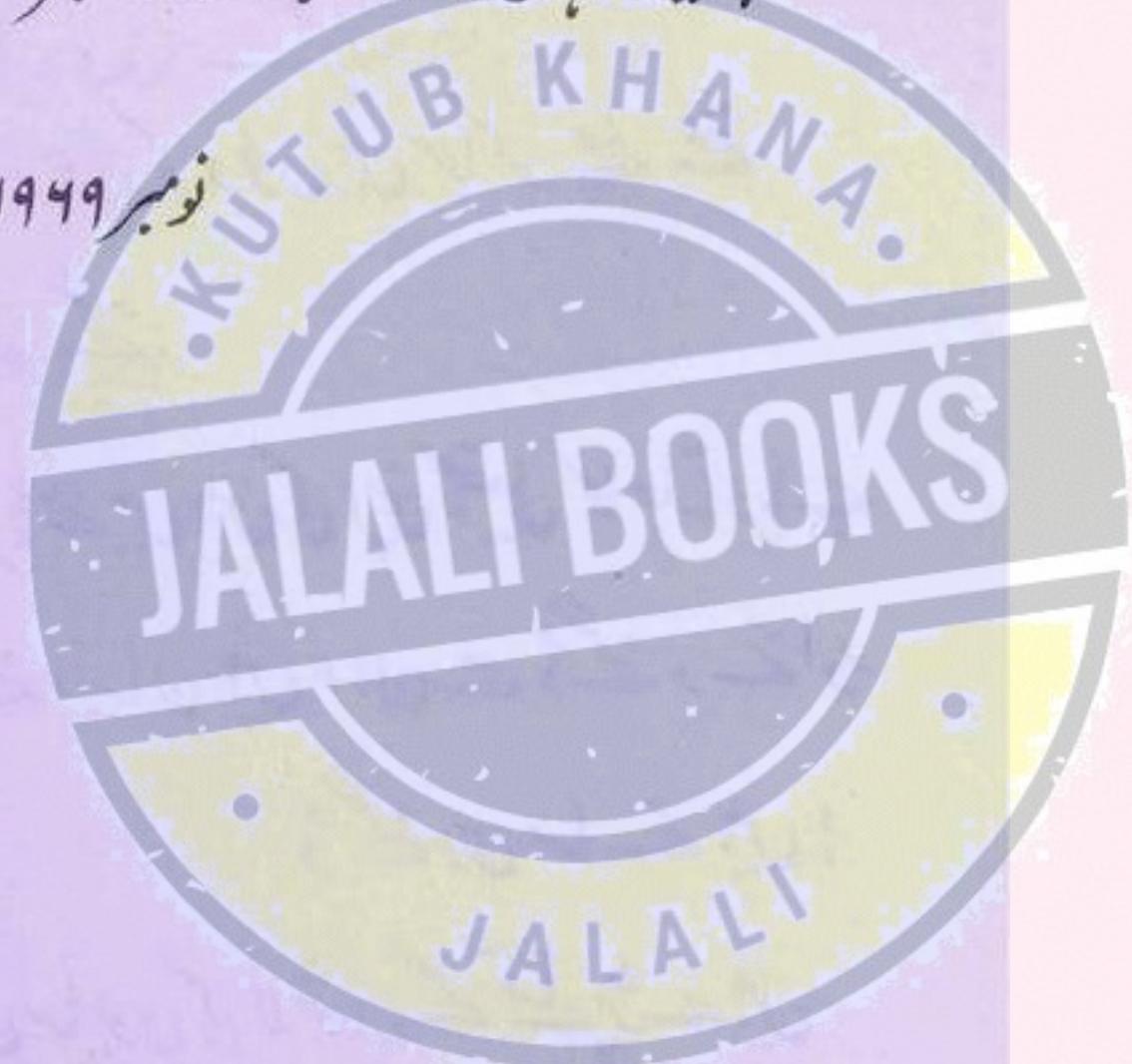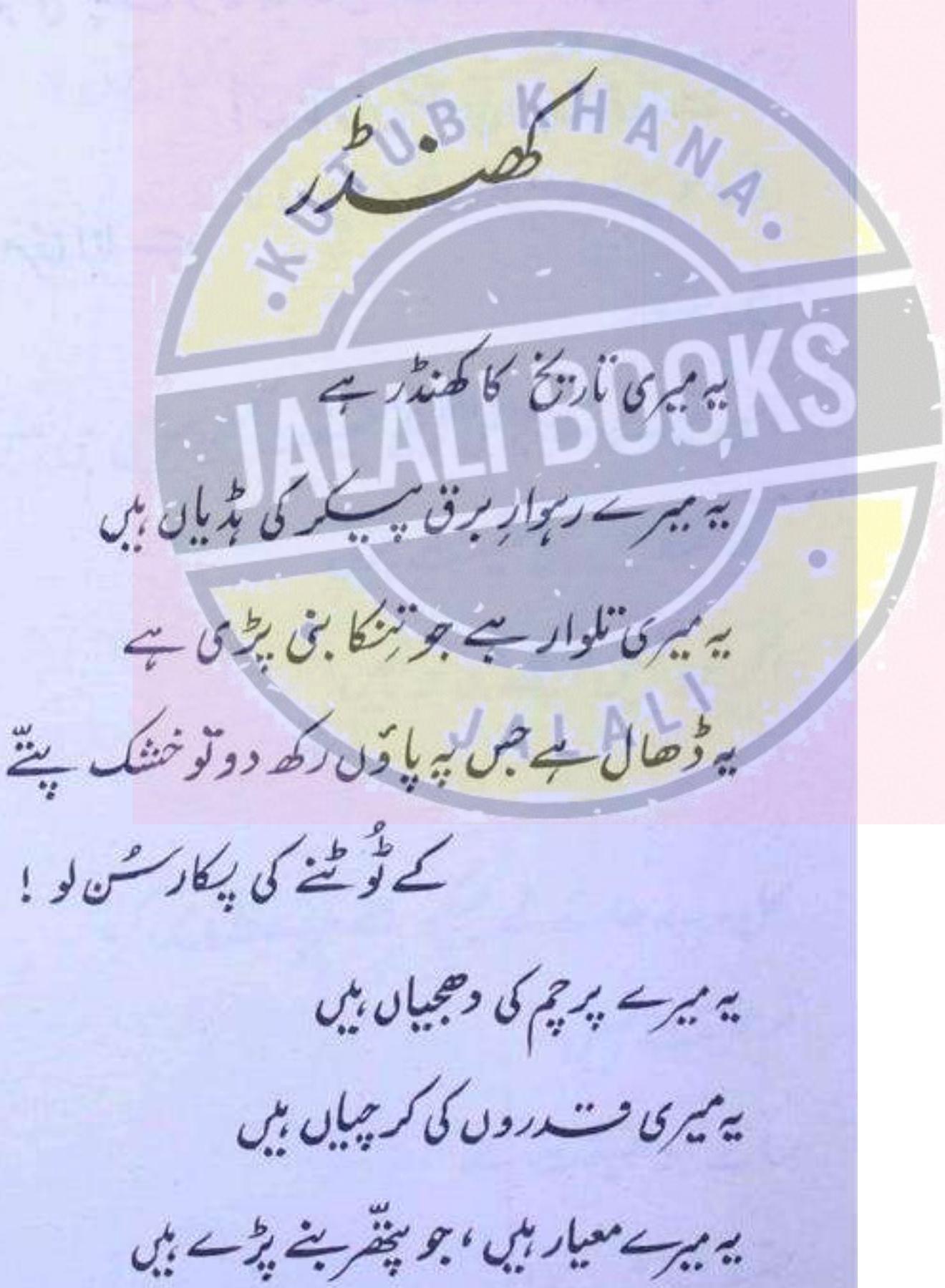
یہ میرے افکار ہیں، جنھیں عنکبوت نے

اپنے تانے بانے کی کھونٹیاں سی

بنا لیا ہے!

یہ ٹوٹتی چھت کو سالہا سال سے سنبھالے ہوئے جو

اک ناتواں ستون ایستادہ ہے

یہ مری انا ہے

مئی ۱۹۶۹ء

ہیولیٰ

میرا سایہ بھی حقیقت ہے تو پھر میں کیا ہُوں ؟

میں جو پروردہ ہُوں خُود اپنی اَنا کا

مَیں نے

اِس حقیقت سے بڑی کوئی حقیقت کبھی سوچی ہی نہیں

کہ فقط مَیں ہی حقیقت ہُوں

اگر مَیں نہیں، کچھ بھی تو نہیں
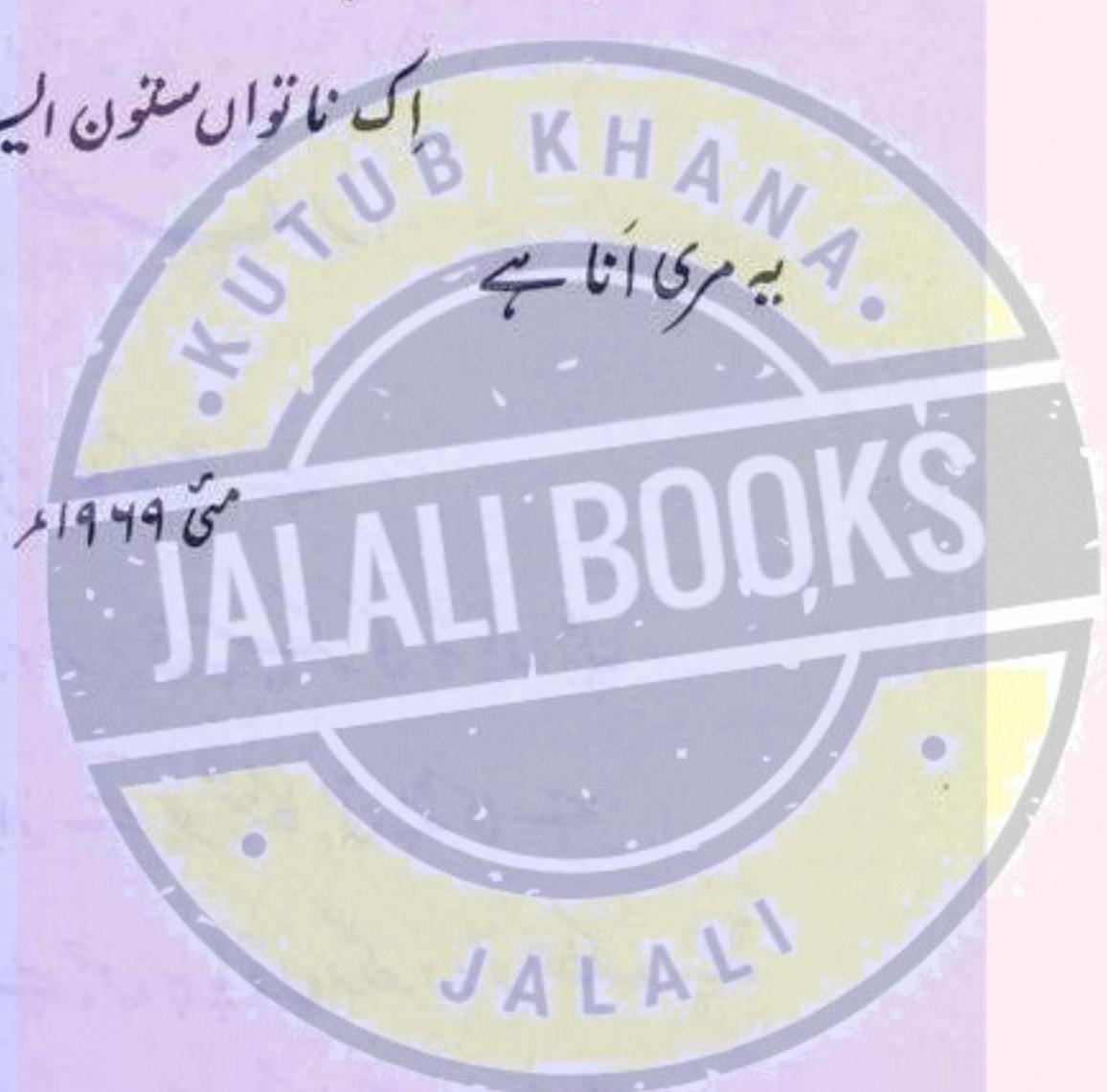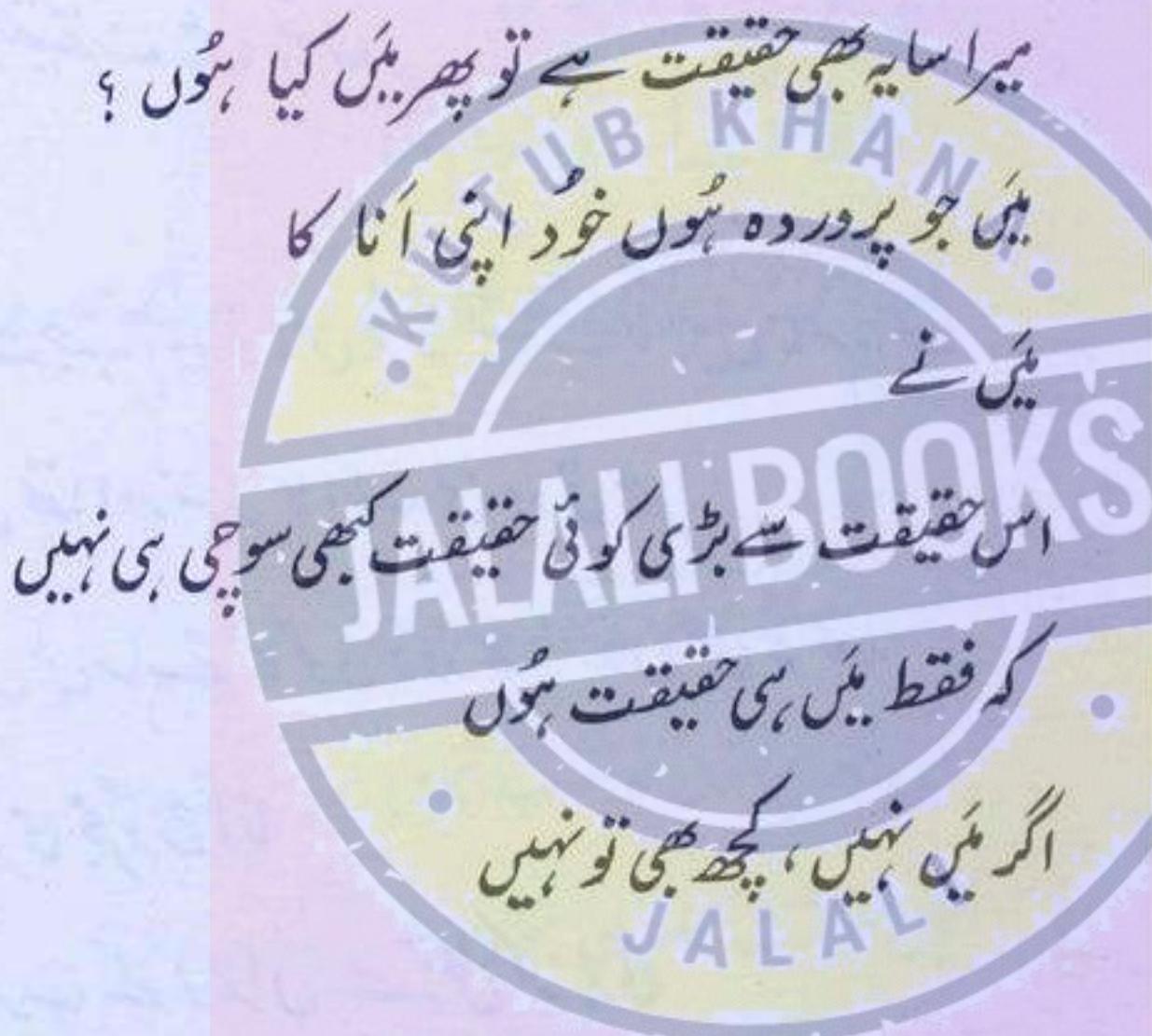
کل مرے سائے نے چپکے سے مرے دل میں کہا

تم حقیقت نہیں

سائے ہو حقیقت کے

حقیقت مَیں ہُوں

میرا دعویٰ تمھیں تسلیم نہیں ہے تو ذرا مجھ سے جُدا ہونے کی ہمّت تو کرو

مَیں جہاں جاؤں گا، تم ساتھ رہو گے میرے

کہ مرے سائے ہو تم

اور حقیقت مَیں ہُوں

رات جب آئی تو اس طُرفہ حقیقت کا کہیں نام نہ تھا

مَیں تھا اور تیرگی کا ایک لق و دق صحرا

جس میں سائے کا کوئی دُور کا امکاں بھی نہ تھا

میری مجرُوح اَنا

کرب کے زنداں سے نکل کر بولی

کہ فقط مَیں ہی حقیقت ہُوں

اگر مَیں نہیں، کچھ بھی تو نہیں

میری آواز سے بجنے لگی تاریکیٔ شب

اور پھر گنبدِ ظلمت میں بھٹکتی ہُوئی جب گونج بنی

تو پلٹ آئی

مگر یُوں —

کہ اسے میری سماعت بھی نہ پہچان سکی

یہ کسی اور کی آواز تھی

الفاظ کا کچھ اور ہی مفہوم تھا

اور اس میں نمایاں تھے کسی اور ہی ابجد کے حروف :۔

مَیں سُکڑ جاؤں تو دن ہُوں

مَیں بکھر جاؤں تو شب ہُوں

مَیں حقیقت کا بدن ہُوں

مرے سائے کا ہیولیٰ تم ہو'

مئی ۱۹۶۹ء

اندھیرے نے کہا

کس قدر سرد ہے یہ رات ___ اندھیرے نے کہا

میرے دشمن تو ہزاروں ہیں ___ کوئی تو بولے

چاند کی قاش بھی تحلیل ہُوئی شام کے ساتھ

اور ستارے تو سنبھلنے بھی نہ پائے تھے ابھی

کہ گھٹا آئی، اُڑتے ہُوئے گیسُو کھولے

وہ جو آئی تھی تو پھر ٹُوٹ کے برسی ہوتی

مگر اِک بُوند بھی ٹپکی نہ مرے دامن پر

صرف یخ بستہ ہواؤں کے نکیلے جھونکے

میرے سینے میں اُترتے رہے، خنجر بن کر

کوئی آواز نہیں ___ کوئی بھی آواز نہیں

چار جانب سے سمٹتا ہوا سناٹا ہے،
میں نے کس کرب سے اس شب کا سفر کاٹا ہے

دشمنو! تم کو مرے جبرِ مسلسل کی قسم
میرے دل پر کوئی گھاؤ ہی لگا کر دیکھو

وہ عداوت کا سہی، تم سے مگر ربط تو ہے
میرے سینے پہ الاؤ ہی لگا کر دیکھو

دسمبر ۱۹۶۸ء
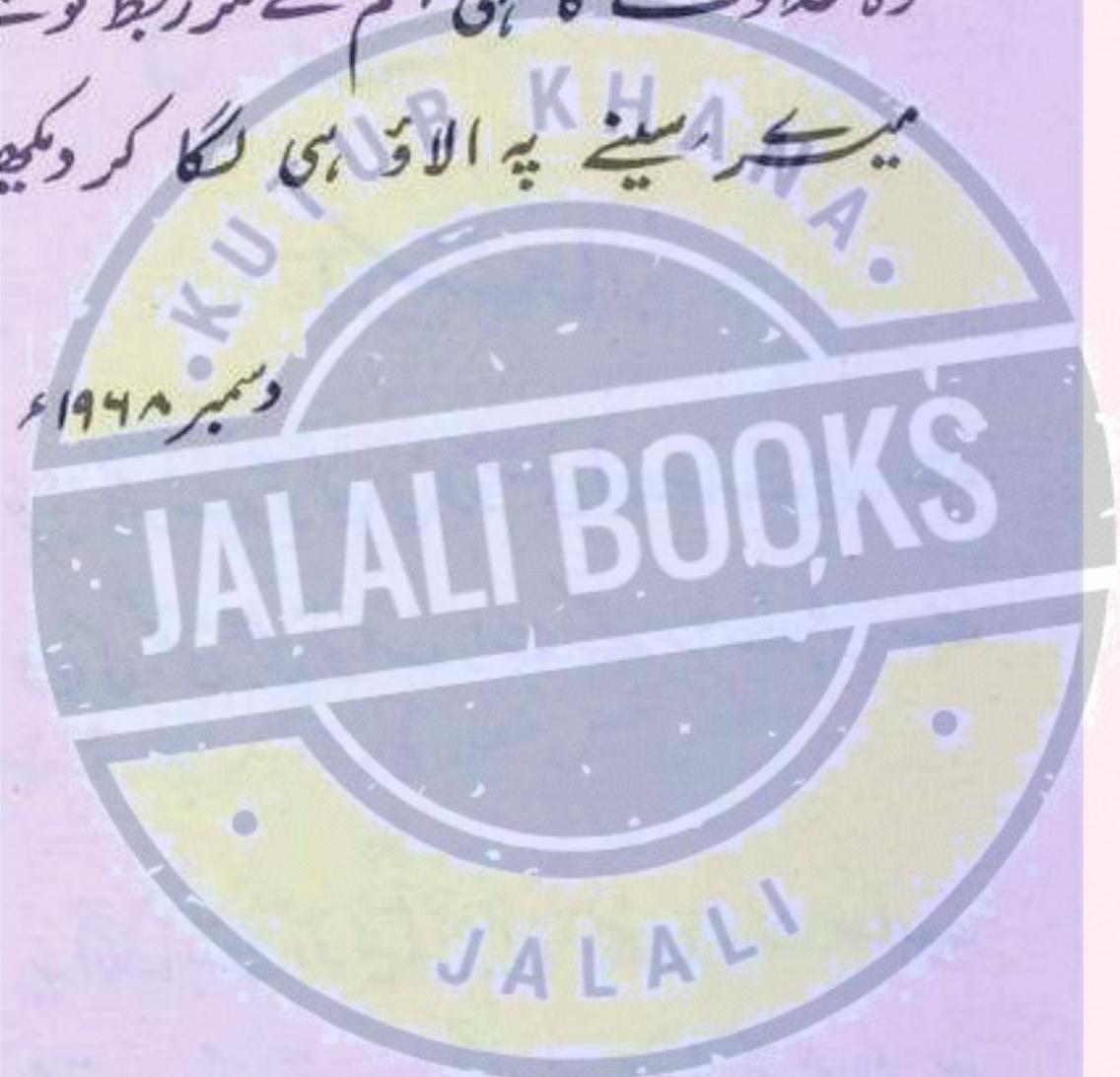
اشعار

فرق اگر ہے تو کہاں روشنی اور سائے میں ہے
دن کی گنتی بھی تو اب رات کے سرمائے میں ہے

یہ الگ بات، کہ لیتا نہیں اپنوں سے حساب،
محتسب یوں تو بہت نیک، مری رائے میں، ہے

گھر سے نکلے گی فقط رات کو اُس کی بیٹی
اتنی غیرت تو ابھی تک مرے ہمسائے میں ہے

دسمبر ۱۹۶۸ء

محنت کش

ہماری رُوحوں میں ارتقا پَر سنوارتا ہے
کہ پیکرِ اضطراب ہیں ہم

نفس نفس شعلہ بار ہو کر پکارتا ہے
کہ ہمسرِ آفتاب ہیں ہم
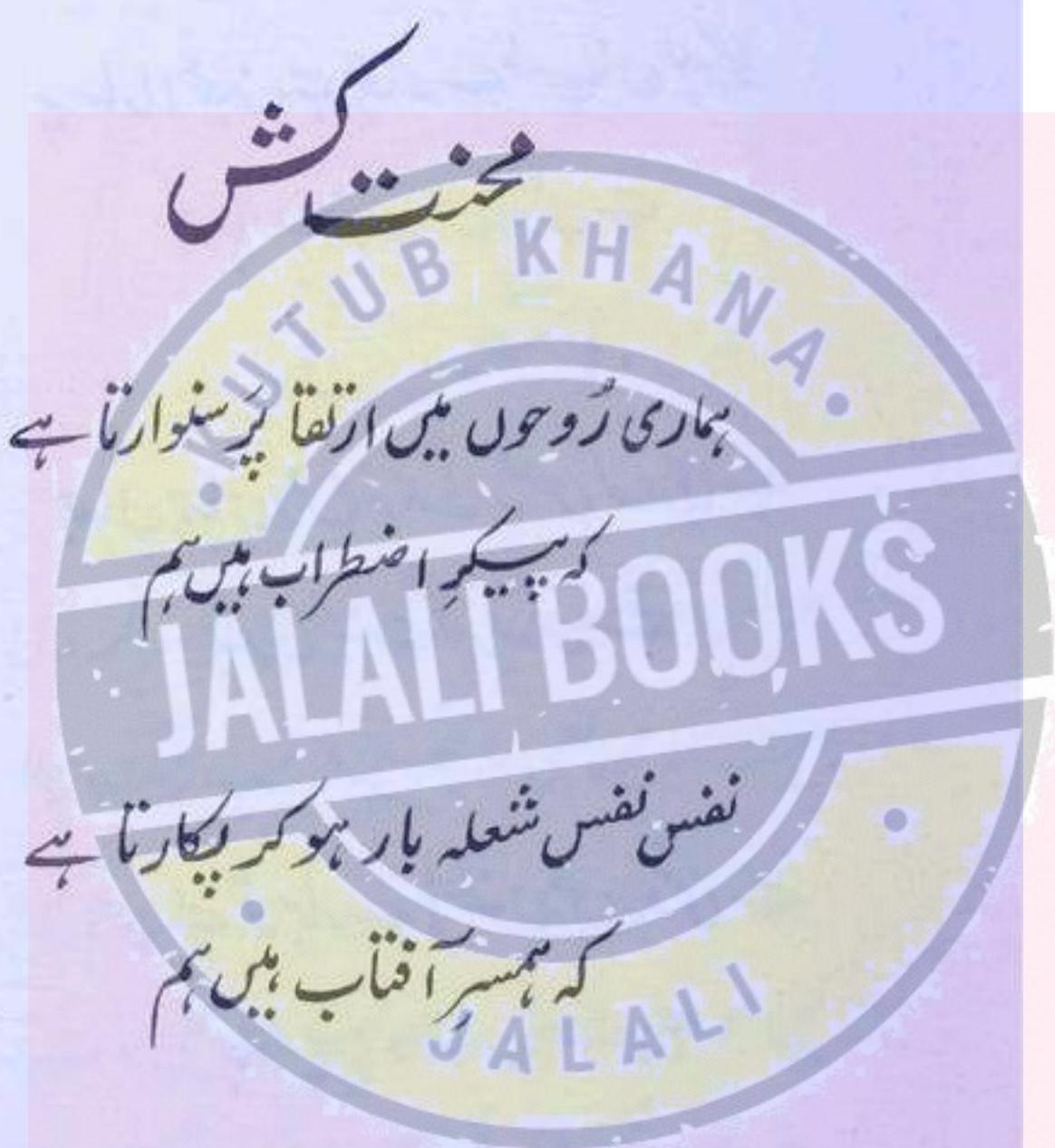
ہمیں سے سیّارگاں کو گردش کی خُو ملی ہے
کہ سر بسر پیچ و تاب ہیں ہم

ہمیں سے پھولوں کو رنگ، مٹی کو بُو ملی ہے
کہ حُسن ہیں ہم، شباب ہیں ہم

ہمیں سے قائم ہے جب سے اب تک بھرم نمو کا
ہمیں سے بالیدگی جواں ہے

یہ سارا اعجاز ہے ہمارے طپاں لہو کا
جو چار جانب رواں دواں ہے

جہاں جہاں روحِ زندگی رقص کر رہی ہے
ہماری محنت گہر فشاں ہے

اسی لیے تو ہمارے ہاتھوں میں روشنی ہے
ہمارا چہرہ دھواں دھواں ہے

دسمبر ۱۹۶۸ء

اشعار

خزاں تو خیر، تری یاد میں بسر کر دی
بہار میں بھی نہ مجھ پر فریبِ رنگ چلا

کہی جو مَیں نے بڑے بھولپن سے سچّی بات
اِدھر سے سنگ، تو اُس سمت سے خدنگ چلا

مری حیات کے حالاتِ مختصر یہ ہیں
مَیں عدل مانگنے آیا تھا اور دنگ چلا

جون ۱۹۶۸ء

عِشق کرو

عِشق کرنے کا یہی وقت ہے' اے انسانو
اس سے بہتر کوئی لمحہ تمھیں شاید ہی ملے

اب سے پہلے کبھی نفرت کے یہ معیار نہ تھے
جنگ کرتے تھے فقط اپنے تحفّظ کے لیے
نوعِ انساں سے تو ہم برسرِ پیکار نہ تھے
حُسن و زیبائیِ عالم سے تو بیزار نہ تھے

وہ بھی کیا دن تھے کہ "تہذیب" ترقی پہ نہ تھی
جب عداوت کے بھی آداب ہُوا کرتے تھے
دل جو بنجر ہیں وہ شاداب ہُوا کرتے تھے

اب تو انسان کچھ اس زور کا جذباتی ہے
جنگ، کلیوں کے چٹکنے سے بھی چھڑ جاتی ہے

اِس طرح چاک ہُوا پیرہنِ امن و سکوں
رہنمایانِ سیاست سے یہ شاید ہی سِلے
اپنے فن کار کا اِک بار تو کہنا مانو
اِس سے بہتر کوئی لمحہ تمھیں شاید ہی مِلے
عشق کرنے کا یہی وقت ہے، اے انسانو

اتنی نفرت بھی نہ بوؤ کہ قیامت کاٹو
عِشق کر لو، کہ یہی عِشق ہے اب شرطِ بقا
پتھّروں نے اسی قوّت سے اُبھارے کہسار
یہی قوّت ہے سمندر، یہی قوّت صحرا
اِسی قوّت سے ہے مربُوط ستاروں کا نظام
شاخِ گُل ہے اِسی قوّت کے سہارے گلنار
یہی قوّت ہے توازن، یہی قوّت ہے خدا

آج ہو جائے جو انسان کو انسان سے پیار
چار سُو ایک تبسّم کا ہو عالم طاری
صحنِ گلشن میں بدل جائے یہ دھرتی ساری
توپ ہو رُوئے زمیں پر، نہ فضا میں بم بار

لاکھ طوفان اُٹھیں، لاکھ عناصر گرجیں
عِشق چاہے تو مسخر کیا، کوئی پتّا نہ ہِلے
آدمیّت کا جو منصب ہے، اسے پہچانو
اس سے بہتر کوئی لمحہ تمھیں شاید ہی مِلے
عِشق کرنے کا یہی وقت ہے، اے انسانو

دسمبر ۱۹۶۷ء

حکم
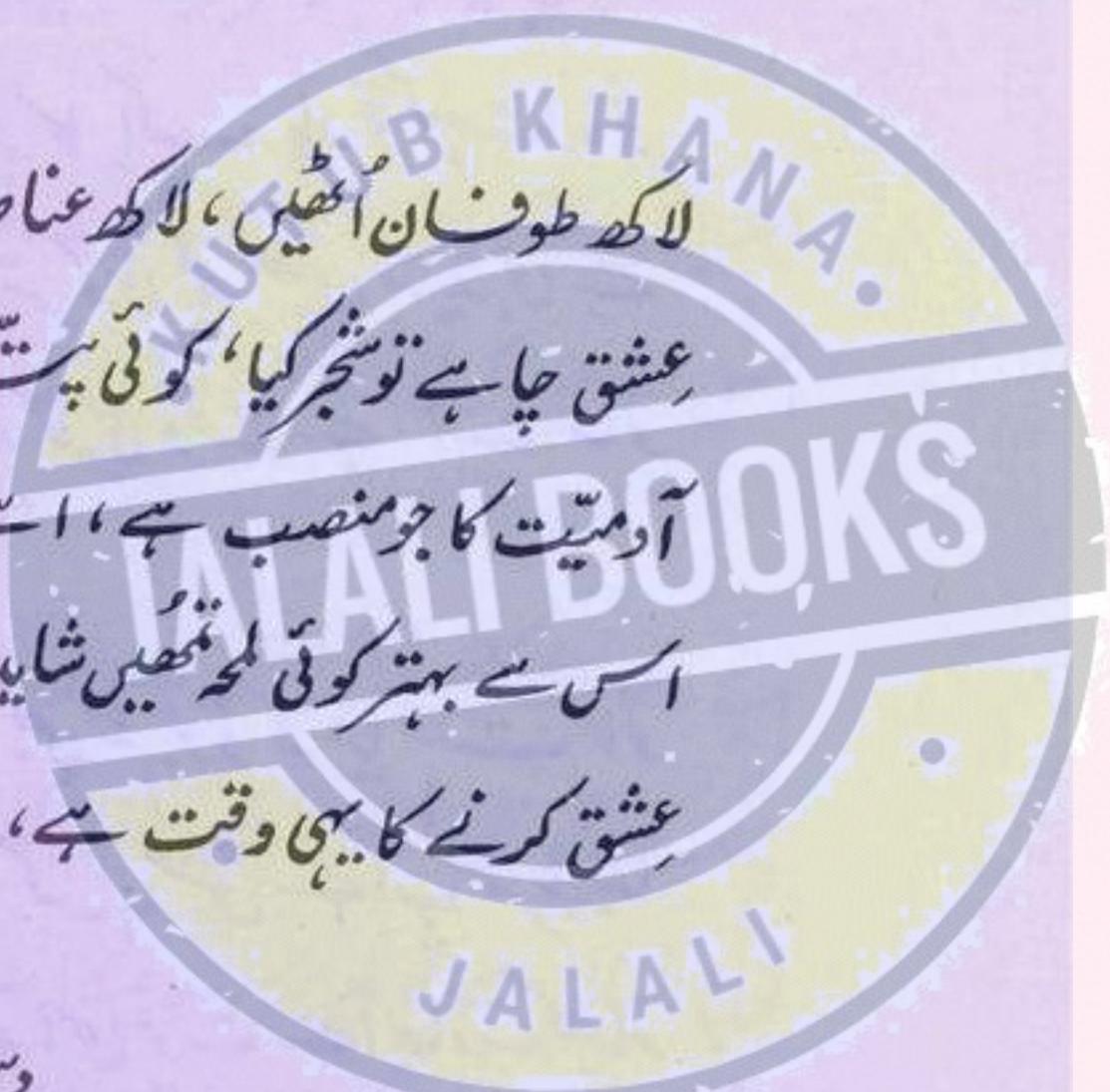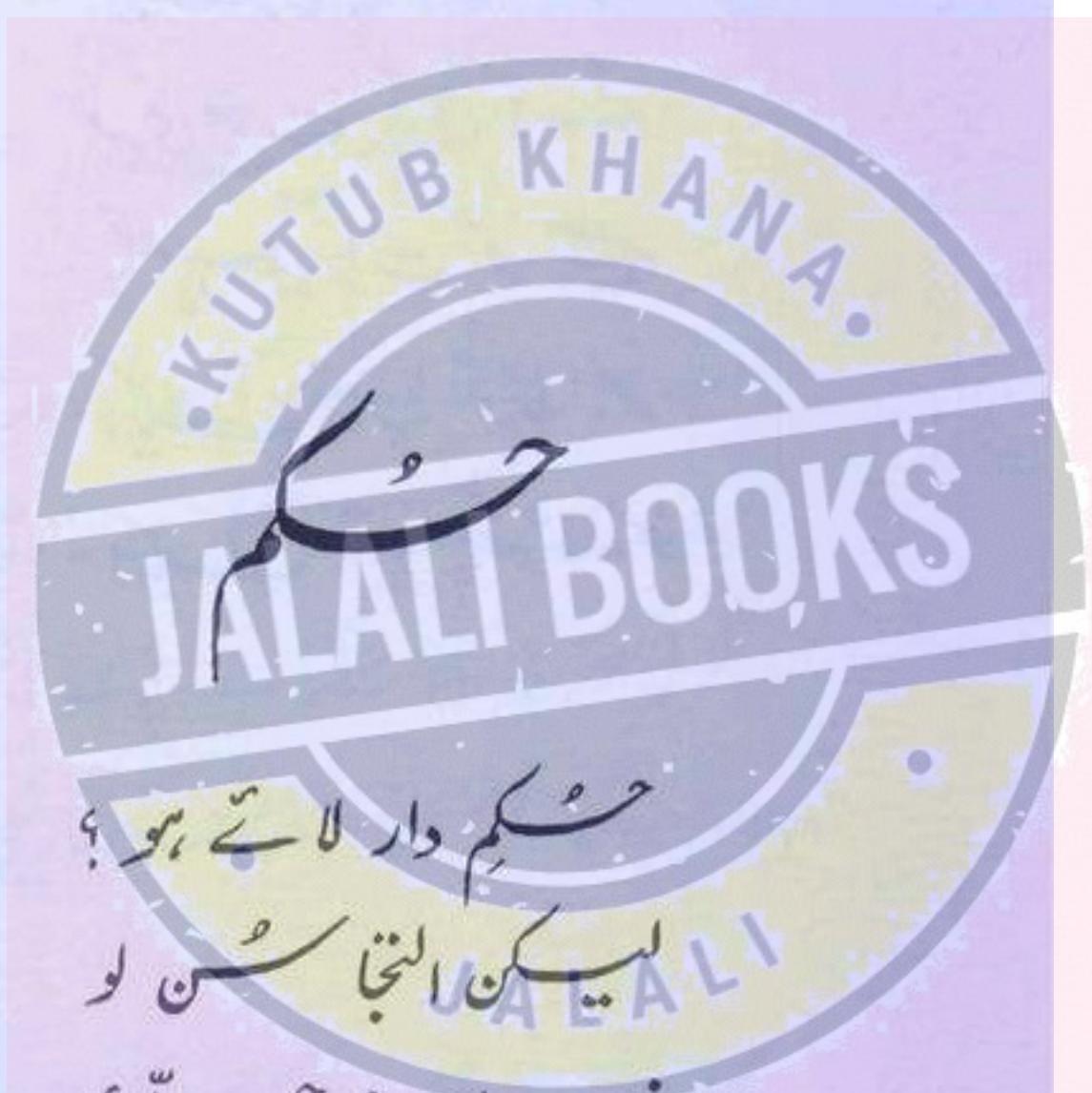
حکم دار لائے ہو؟
لیکن التجا سن لو
زور سے نہ چلاؤ
کچھ قریب آجاؤ
تم کو جو بھی کہنا ہے
تیوروں کو کہنے دو،
دبدبے کو رہنے دو!

مَیں کہ ایک شاعر ہُوں
نِگہتوں کا رکھوالا
زمیوں کا متوالا
میری یہ تمنّا ہے
میری موت یُوں آئے
پچھلی رات کو جیسے
ایک تارہ ٹُوٹا ہو
ایک تیر چُھوٹا ہو

دسمبر ۱۹۶۷ء

ابدیت

اب یہاں سے ابدیّت کی حدیں دُور نہیں
برف ہی برف نظر آتی ہے تا حدِّ نظر
کوئی سُورج ہے نہ تارا ہے نہ لَو ہے نہ شفق
برف کی روشنی ہے برف کی تاریکی ہے
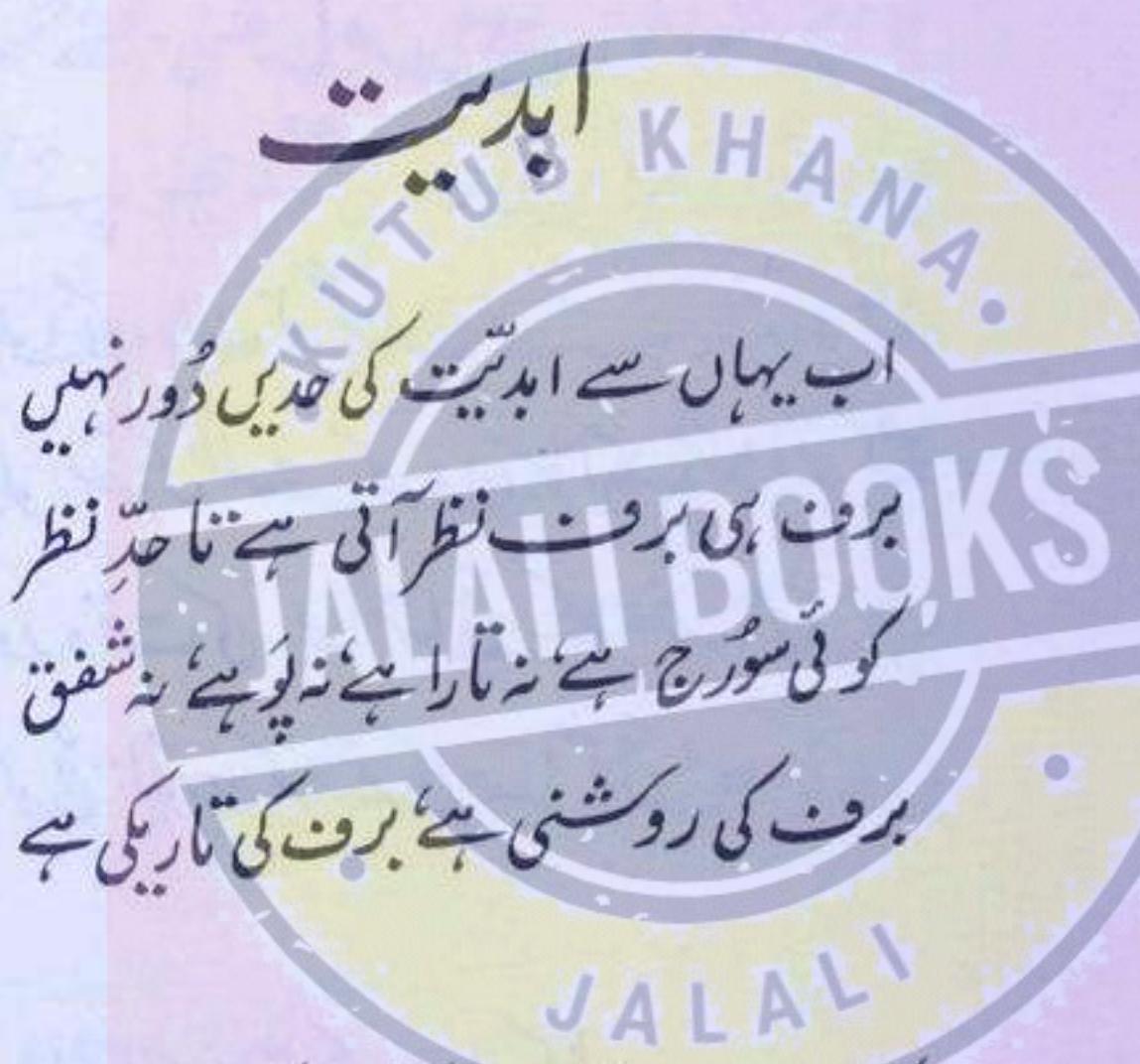
کیا یہی وہ ابدیّت ہے کہ جِس کی دُھن میں
ہم نے جذبات و خیالات کی حِدّت کھو دی
اور اب وقت کے اِس روضۂ یخ بستہ میں
کچھ بنیں گے تو مجاور ہی بنیں گے ہم لوگ

اکتوبر ۱۹۶۷ء

قیامت

چلو، اِک رات تو گزُری
چلو، سفّاک ظلُمت کے بدن کا ایک ٹکڑا تو کٹا
اور وقت کی بے انتہائی کے سمندر میں
کوئی تابُوت گرنے کی صدا آئی

یہ مانا، رات آنکھوں میں کٹی
ایک ایک پل پربت سا بن کر جم گیا
اِک سانس لی تو اِک صدی کے بعد پھر سے سانس
لینے کا خیال آیا،
یہ سب سچ ہے کہ رات اِک کربِ بے پایاں تھی
لیکن کرب ہی تخلیق ہے

اے پَو پھٹے کے دلربا لمحو، گواہی دو

یونہی کٹتی چلی جائیں گی راتیں
اور پھر وہ آفتاب ابھرے گا
جو اپنی شعاعوں سے ابد کو روشنی بخشے گا
پھر کوئی اندھیرا میری دھرتی کو نہ چھو پائے گا
دانایانِ مذہب کے مطابق، حشر آجائے گا
لیکن حشر بھی اِک کرب ہے
ہر کرب اِک تخلیق ہے
اے پَو پھٹے کے دلربا لمحو، گواہی دو!

اکتوبر ۱۹۶۷ء

دُوری

تُو بہت دُور ہے

اور دُوری خُدا ہے

مگر تُو خُدا تو نہیں ہے

خدا لمس سے ماورا ہے

تُجھے مَیں نے چُھو کر بھی دیکھا ہے
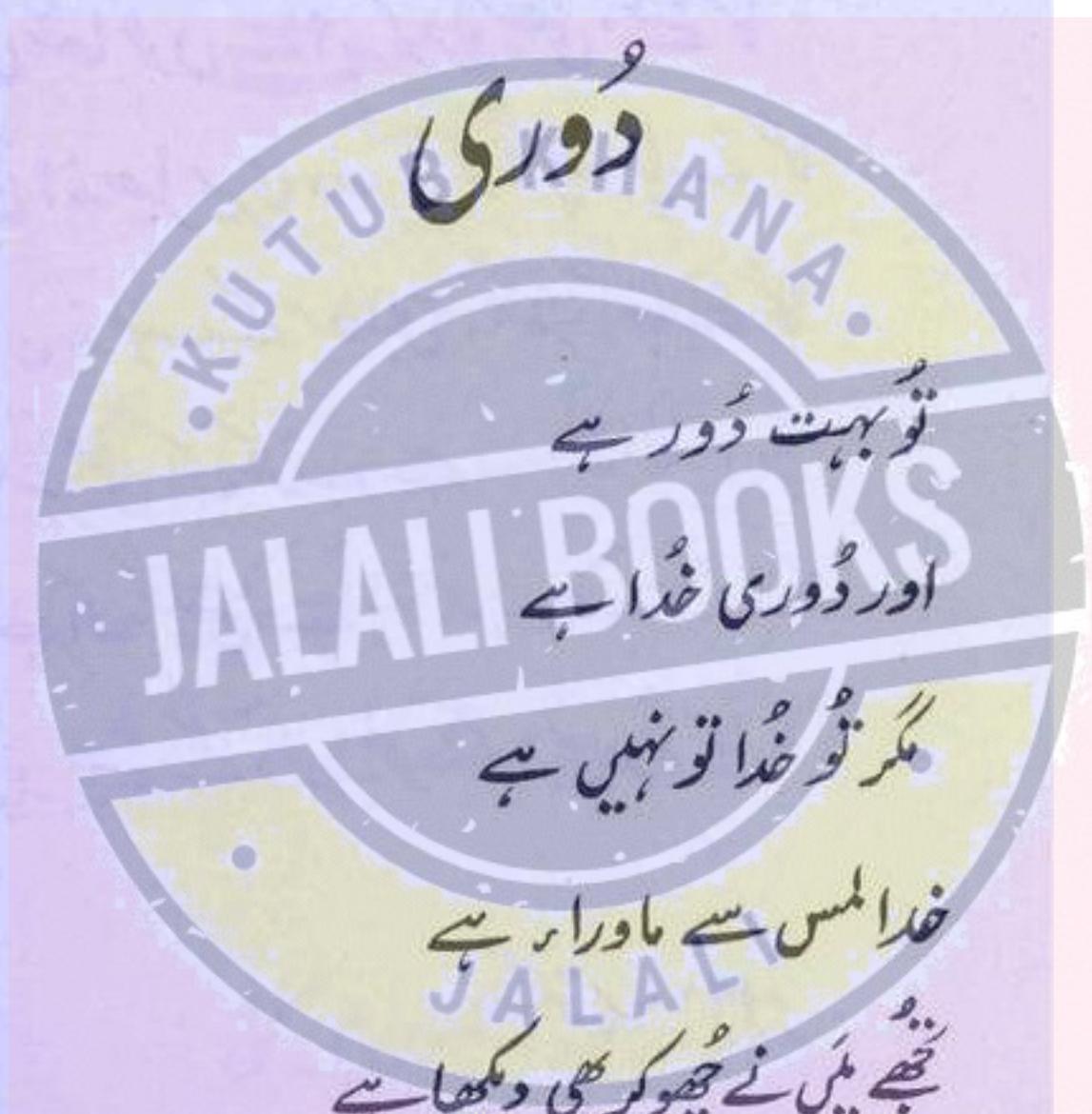
باہوں میں لے کر سمیٹا بھی ہے

تُجھ کو سوچا بھی ہے اور سمجھا بھی ہے

تُو فقط دُور ہے

تُو خدا کی طرح دُور ہے

مَیں نے دُوری کے اعجاز دیکھے ہیں

اِنسان نے دُور پاکر خُدا کو

اسے اَن گِنت دیوتاؤں میں بدلا ہے

پھر اَن گِنت بُت بنائے ہیں

اُن کے لبوں پر سکوتِ مسلسل کی مُہریں لگائی ہیں
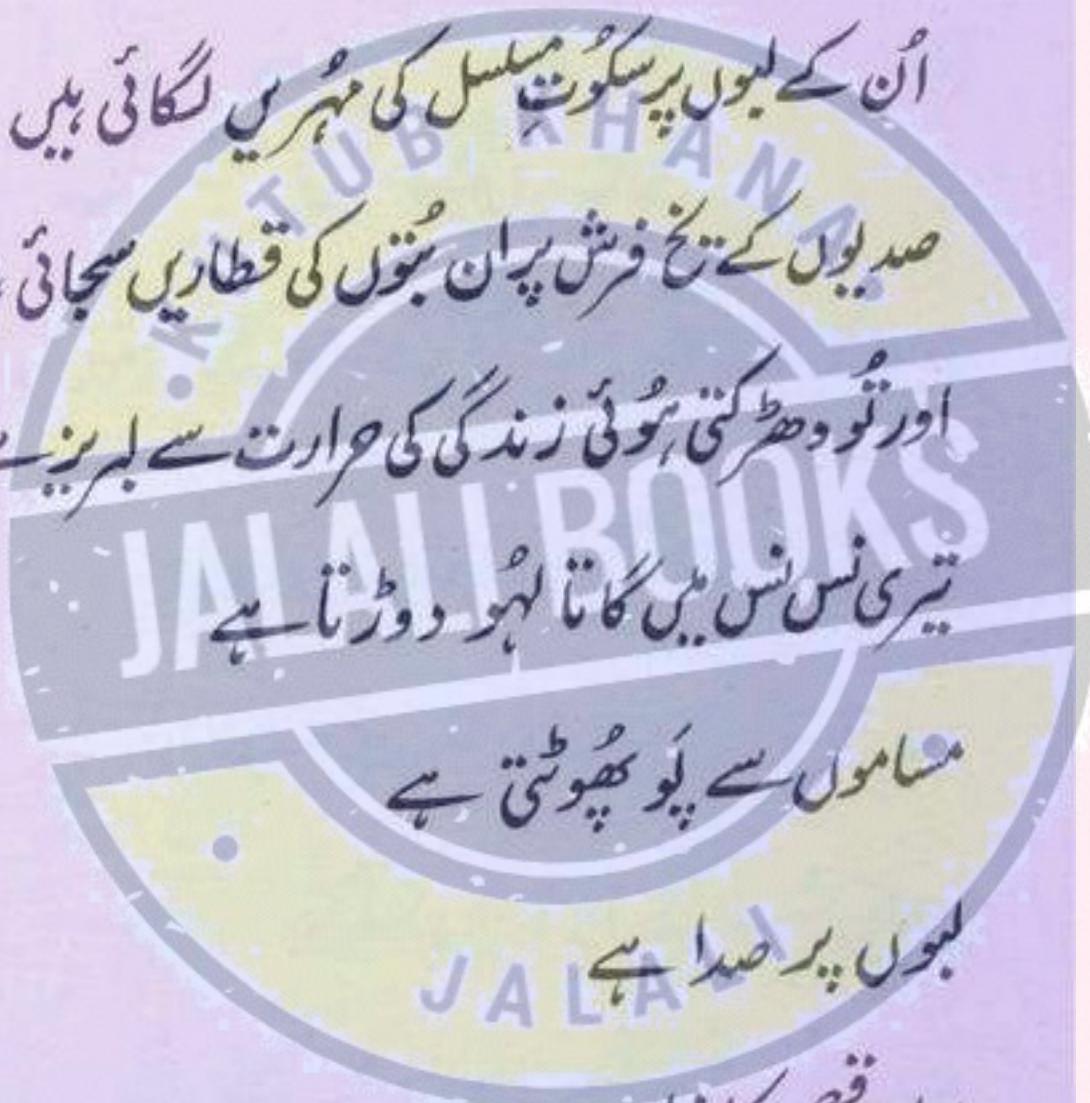
صدیوں کے تخِ فرش پر ان بُتوں کی قطاریں سجائی ہیں

اور تُو دھڑکتی ہُوئی زندگی کی حرارت سے لبریز ہے

تیری نس نس میں گاتا لہُو دوڑتا ہے

مساموں سے پَو پھُوٹتی ہے

لبوں پر صدا ہے

بدن رقص کا زاویہ ہے

تُو اِنسان ہے — یعنی تُو رنگ ہے، شاعری ہے، غنا ہے

سُنا ہے کہ انساں اگر دُور جاتے ہیں

پھر لوٹ آتے بھی ہیں

تُو خدا بھی نہیں

دیوتا بھی نہیں

اور اس پر ستم یہ کہ تُو لَوٹتا بھی نہیں

جولائی

۱۹۶۷ء
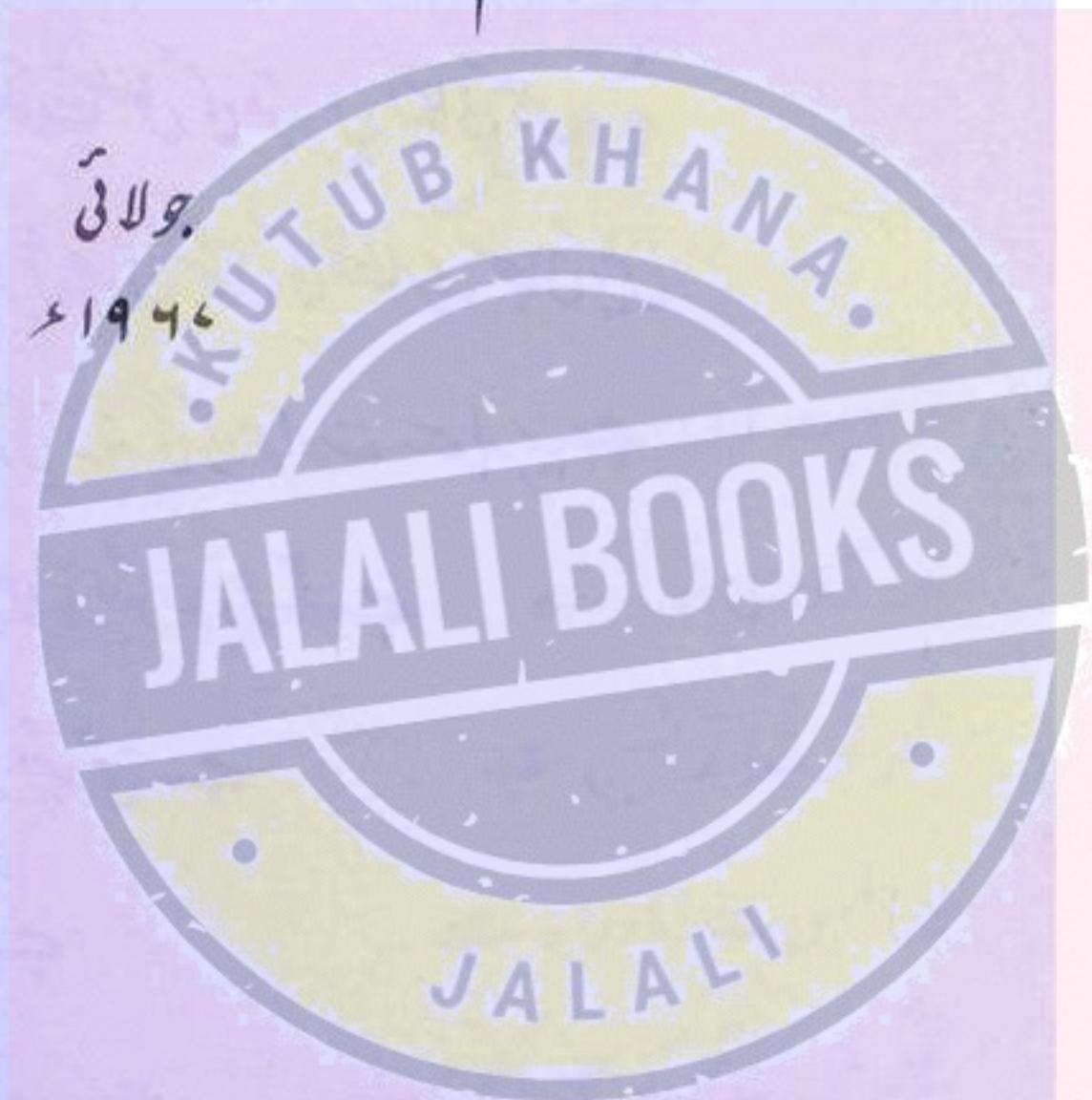
روشنی کی تلاش

(اسرائیل کے ہاتھوں مصر کی شکست اور مصر کے دوستوں کی بے حسی کے پس منظر میں)

اب کہاں جاؤ گے، اے دیدہ ورو؟

اب تو اُس سمت بھی ظلمت ہے

جہاں شب کے الاؤ میں نہا کر

مرے سُورج کو اُبھرنا تھا، گجر بجنے تھے

اب تو مشرق پہ بھی مغرب کا گماں ہوتا ہے

اب تو جب ذکر کرو نُورِ سحر کا

تو بلک اُٹھتی ہے دُنیا، کہ کہاں ہوتا ہے!

اب تو اُس شب کی سیاہی نے ہمیں گھیر لیا ہے

کہ جہاں چاند تو کیا، کوئی ستارہ بھی نہیں جی سکتا
اب کہاں جاؤ گے اے دیدہ ورو؟

صرف اِک سمت کے ماتھے پہ لرزتی ہے اُجالے کی لکیر
اور یہ سمت گزرتی ہے ہمارے ہی گھروں اور ہمارے ہی دِلوں سے
یہ ہے وہ سمت کہ جس پر مرے ٹیپو کے نقوشِ کفِ پا
چاند ستاروں کی طرح روشن ہیں
اور اس سمت سفر کرنے کی یہ شرط ہے
ہم ظلمتِ مغرب کو بتا دیں
کہ ہمیں صبح کے وارث ہیں
کہ ہم مشرق ہیں

جون ۱۹۶۷ء

کمالِ دانش

سُنا ہے —

ایک ایک ذرّے کے گرد

ایسا ایسا نظامِ گردش رواں دواں ہے

کہ ذہن اُس کے رمُوز پر غور کرتے کرتے

خُود ایک گردش میں مُبتلا ہے
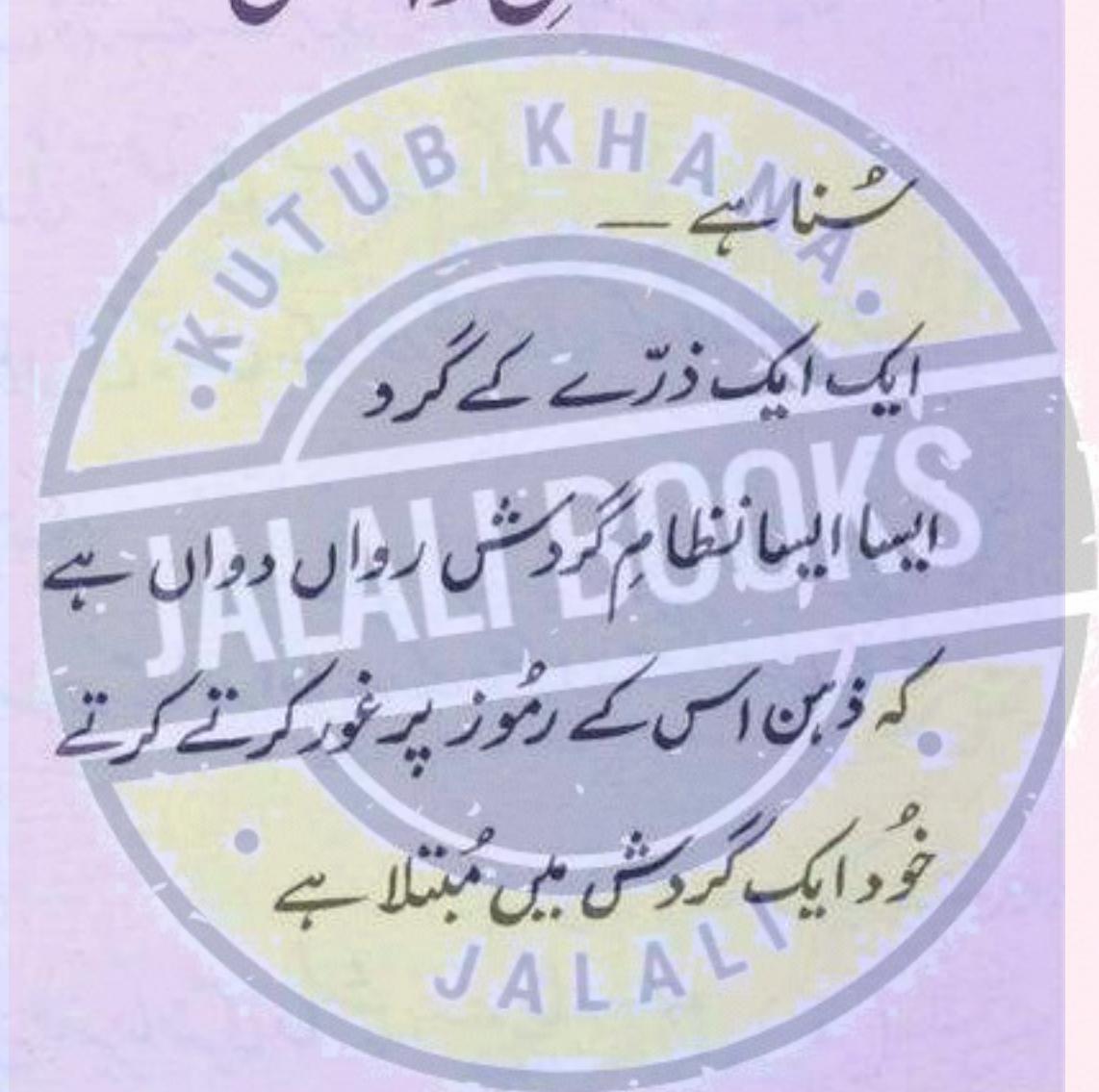
فضا کا ایک ایک ذرّہ، اِک آفتاب ہے

اور کِتنے مرّیخ و مُشتری

اَن گِنت زمینیں

ہزاروں چاند

اس کے گِرد محوِ طواف ہیں

مَیں زمین پر اِک مہین نقطے کی حیثیت میں یہ سوچتا ہُوں

کہ اُن زمینوں پہ

ایک ذرّے کے گِرد جو اُڑتی پھر رہی ہیں

کوئی تو مخلُوق بستی ہو گی

وہاں بھی صُبحوں کے اور شاموں کے رُوپ میں

زندگی

مسرّت کے اور اُداسی کے مرحلوں سے گزرتی ہو گی

یہ عصرِ حاضر کی دانشِ بے پناہ ہے

جِس نے میری دُنیا کو

ایک کرّے سے ایک ذرّہ بنا دیا ہے

مئی ۱۹۶۷ء

ماورائے سماعت

تیرگی جب در و دیوار پہ چھا جاتی ہے

کِتنی صدیوں سے مرے کانوں میں

دُور سے ایک صدا آتی ہے

اس تسلسل میں کوئی طنز ہے
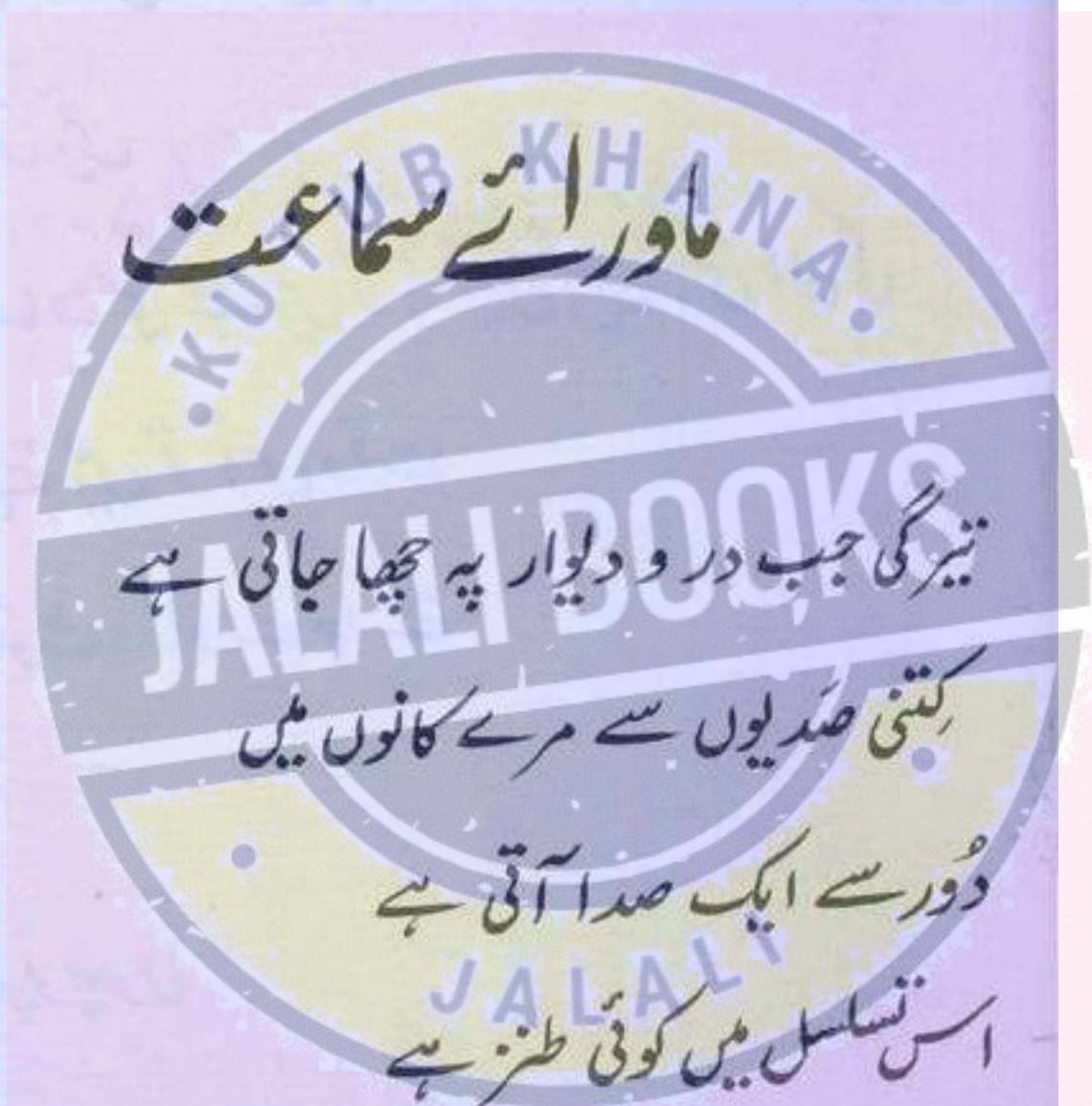
یا درد ہے

آسیب ہے

یا واہمہ ہے

مَیں نے داناؤں سے پُوچھا تو وہ ڈر کر بولے

"یہ تو آثارِ قیامت ہیں

یہ معمول نہیں قدرت کا !"

کس نے داناؤں سے حق بات سُنی ہے

یہ تو وہ لوگ ہیں

جو ظُلم کو اِنصاف بھی کہتے ہیں تو آنکھیں نہیں جُھکتی ان کی

سچ بھی کہتے ہیں تو اُس وقت

کہ جب جھُوٹ دغا دے جائے

کِس سے پُوچھوں

یہ صدا کیا ہے

جو دُنیا کی سماعت کی حدوں میں نہیں آئی اب تک

اور راتوں کو مُجھے آکے ستائے

مرے افکار پہ منڈلائے

مری رُوح کی گہرائی میں اُترے تو سوالوں کا الاؤ سا لگا جائے

یہ آوارہ عناصر کی صدا ہے ؟
کہ خدا عظمتِ تخلیق کے غرفے میں کھڑا بول رہا ہے ؟
کہ یہ انساں ہے جو سفّاکیِ تقدیر پہ مصروفِ بکا ہے ؟

اپریل

۱۹۶۷ء

کرب

کرب کی آخری حد، ایک نہیں

ایک وہ ہیں جو بنے کرب کی شدّت سے بُتِ سنگ نژاد

اور اِک وہ ہیں جو اس درجہ ہوئے نرم و گداز

کہ کوئی قہقہہ مارے تو لرز جائیں
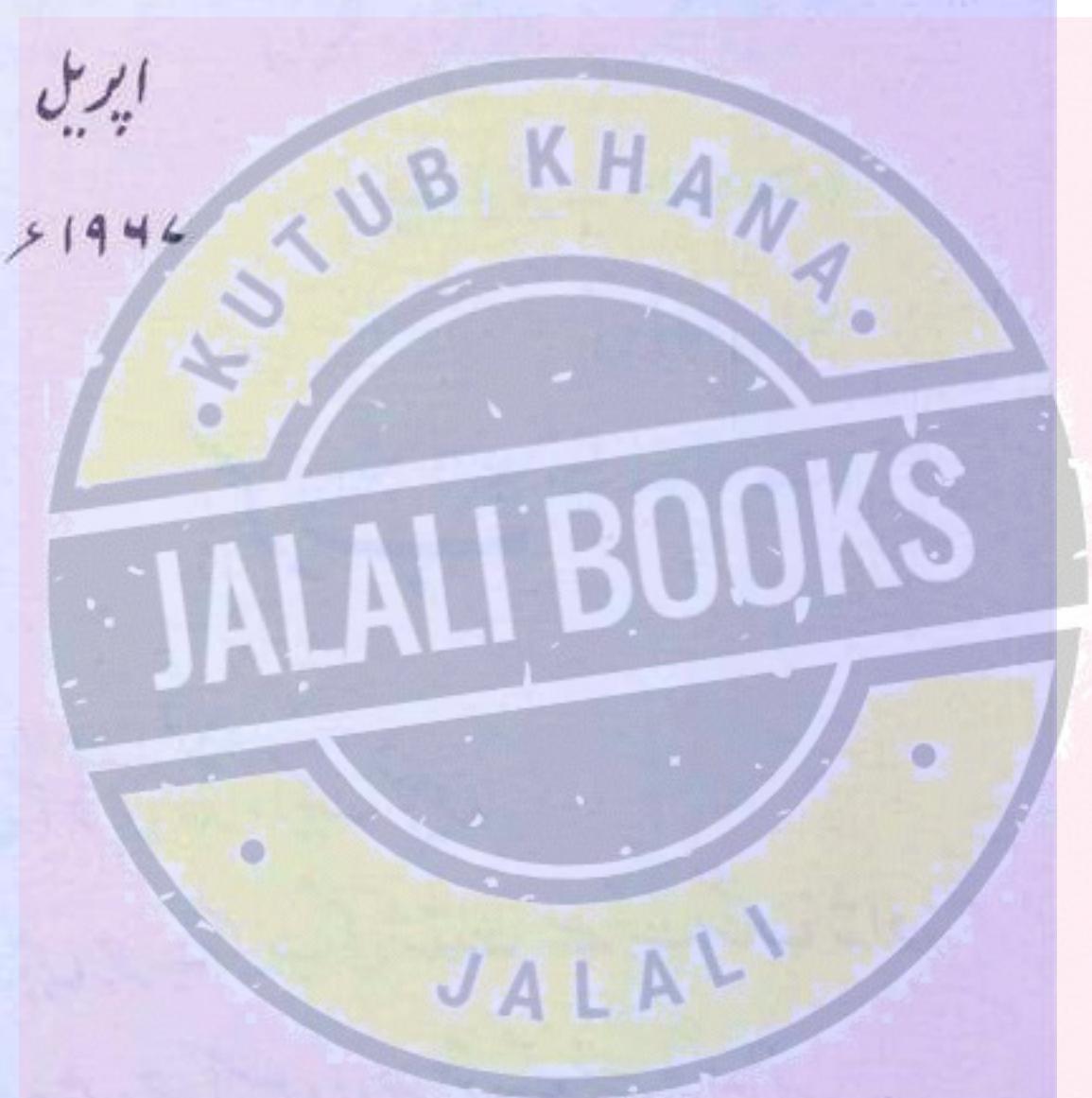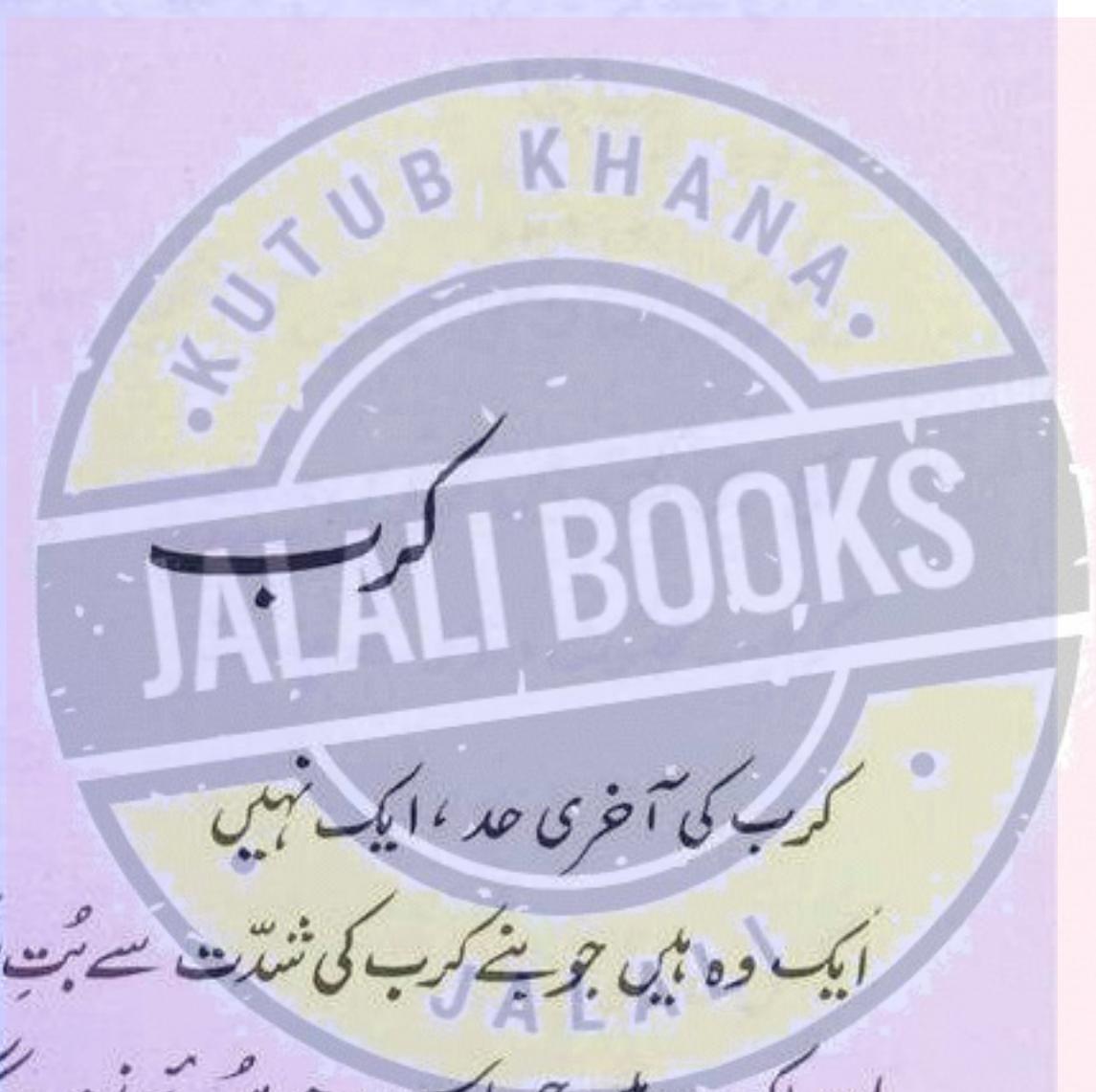
لرز کر رو دیں

کرب کے صید کچھ ایسے بھی ہیں

تلوے سے اگر خار نکالیں تو پکاریں کہ بہار آئی ہے

اور وہ بھی ہیں جو کہتے ہیں

کہ ہم کرب کا کندن ہیں
ہمیں کرب نے مارا ہے کہ ہم زندہ رہیں

اور اِک مَیں ہُوں
کہ جس کرب سے گُزرا ہُوں
اسے دوست بنایا ہے
جہاں جاؤں
اسے ساتھ لیے پھرتا ہُوں

اپریل ۱۹۶۷ء

تقاضے

آج کی رات کے دامن میں ستارے ہیں نہ چاند
آج کی رات تو بے رختِ سفر آئی ہے

آج کی رات کا سرمایہ ہیں وہ سنّاٹے
جن کو تاریکیٔ شب ساتھ لگا لائی ہے
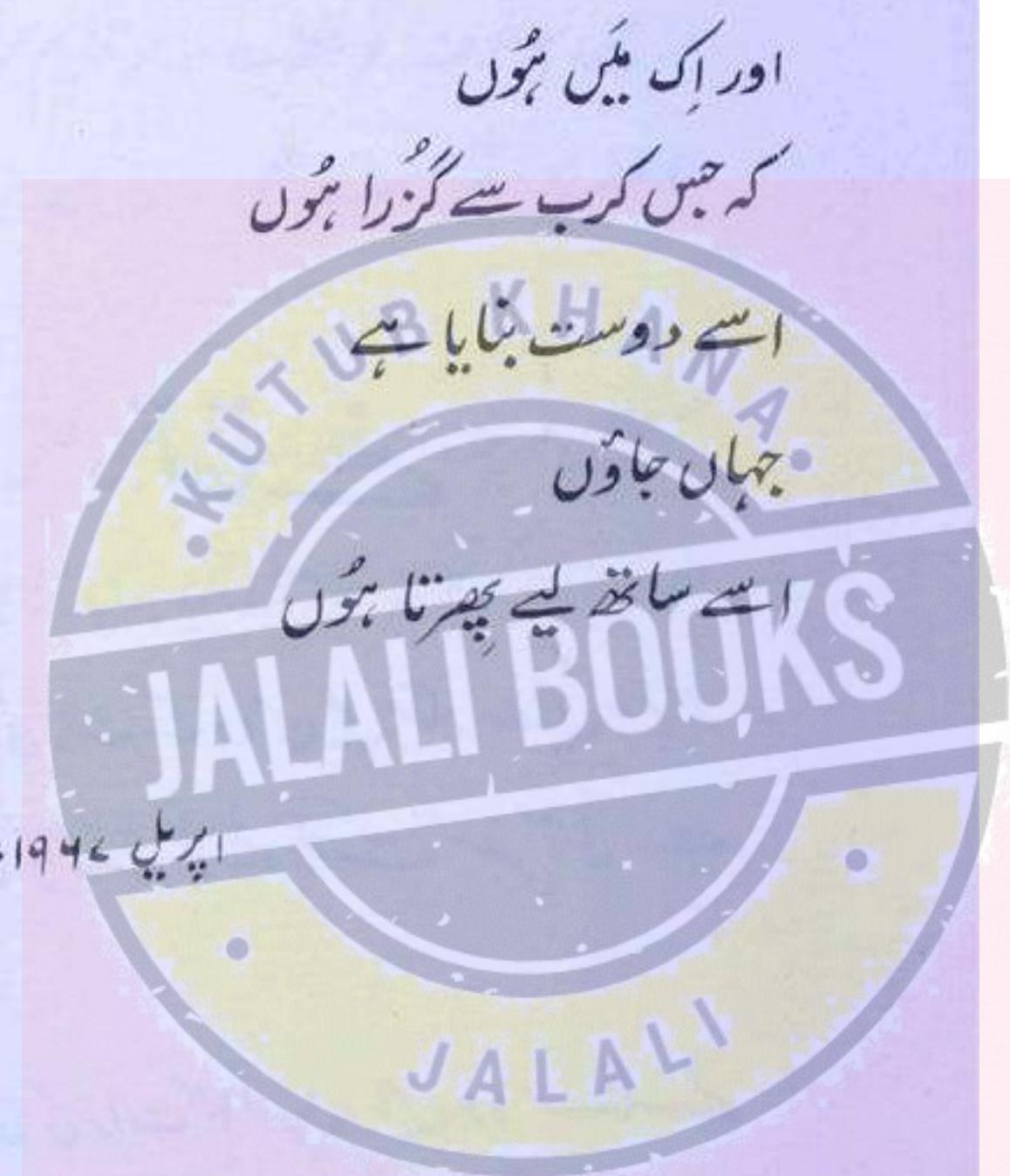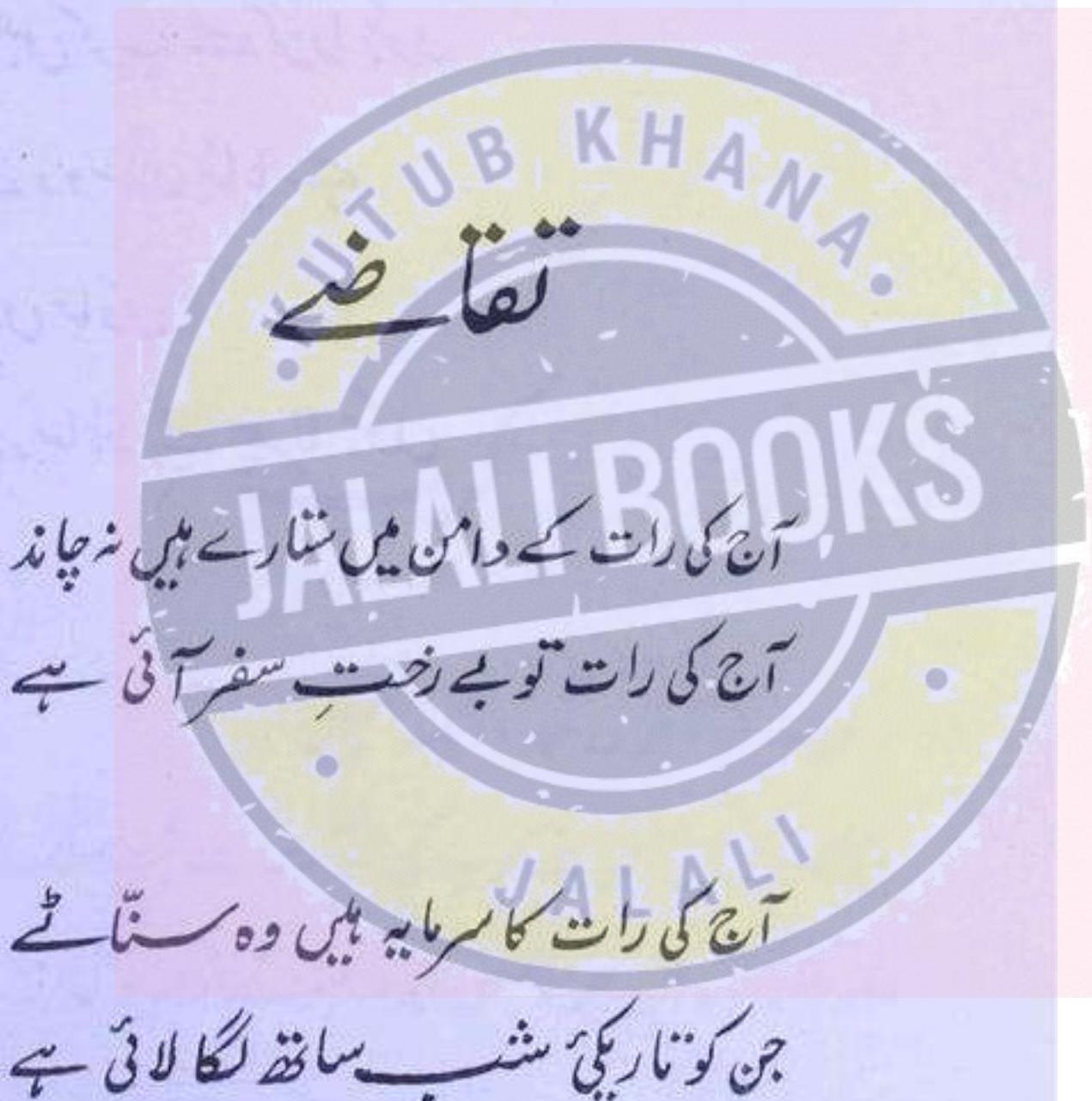
کتنے خاموش ہو اے ہم سفرو! کچھ تو کہو
تم نے کیوں ہونٹ ہلانے کی قسم کھائی ہے

کٹ تو جاتی ہے، مگر رات کی فطرت ہے عجیب
اِس کو چپ چاپ جو کاٹو، تو صدی بن جائے

دل میں ہو خوف، تو قطرے پہ ہو قلزم کا گماں
حوصلہ ہو، تو سمندر بھی ندی بن جائے

مشعلیں صرف اندھیرے میں بھلی لگتی ہیں
ورنہ دن کو تو یہ نیکی بھی بدی بن جائے

مارچ ۱۹۶۷ء

وقفہ

راستہ نہیں مِلتا
منجمد اندھیرا ہے

پھر بھی باوقار انساں
اس یقیں پہ زندہ ہے

برف کے پگھلنے میں
پَو پھٹے کا وقفہ ہے
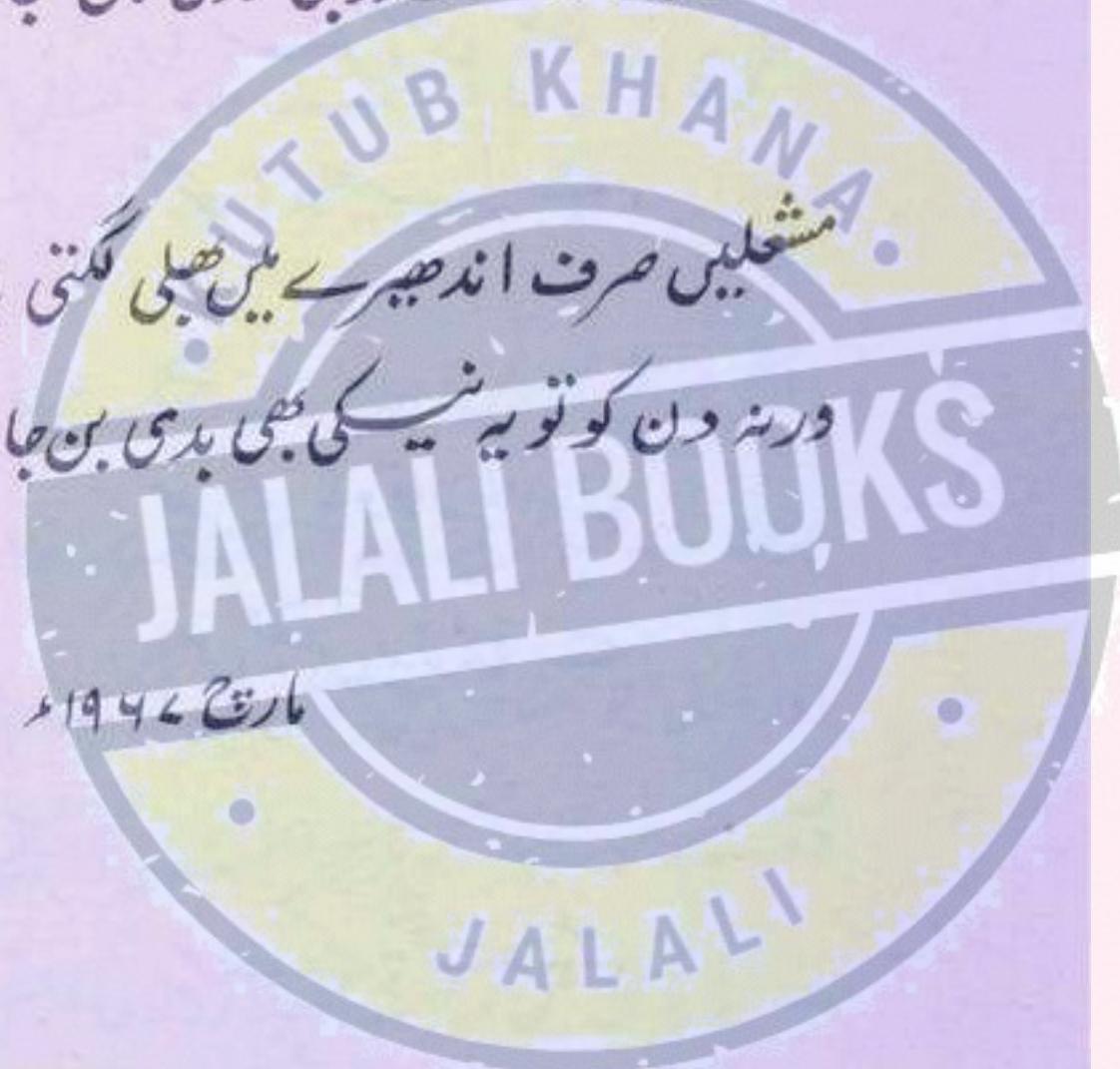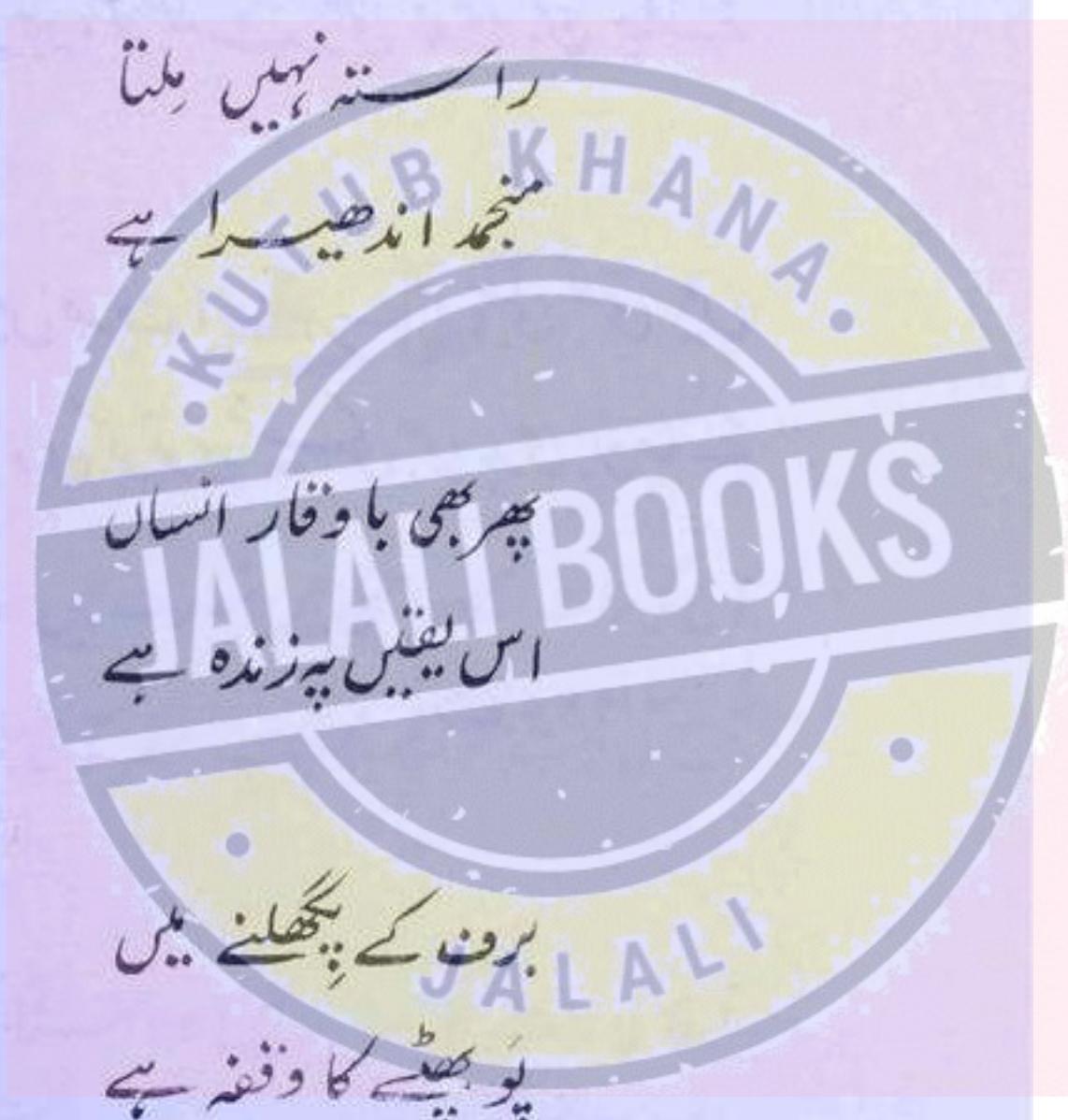
اِس کے بعد سُورج کو
کون روک سکتا ہے!

دسمبر ۱۹۶۶ء

بھونچال

کرۂ ارض کی مانند ہے انساں کا وجود

سطح پر پھول ہیں، سبزہ ہے، خنک چھاؤں ہے
برف ہے، چاندنی ہے، رات ہے، خاموشی ہے
اور بادل، جو فضاؤں میں رواں ہیں چُپ چاپ
دُور سے موتیے کے ڈھیر نظر آتے ہیں
اور باطن میں گرجتا ہے وہ لاوا، جس سے
زلزلے آتے ہیں، کہسار چٹخ جاتے ہیں
کس کو فرصت ہے کہ اِک پل کو ٹھٹک کر سوچے
لبِ دریا جو یہ معصوم سا اِک گاؤں ہے
اس کے نیچے وہ جہنّم ہے، کہ جب جاگے گا
آدمی اپنے ہی پیکر سے نکل بھاگے گا

کرۂ ارض کی مانند ہے انساں کا وجود

کِس کو معلُوم، کہ رعنائیِ تن کے اُس پار
کون جانے، کہ دمکتے ہُوئے عارض سے اُدھر
نگہتِ گیسو و شیرینیِ لب کے پیچھے
حُسنِ تہذیب و تمدّن سے ذرا ساہٹ کر
ذہن کی آتشِ سیّال میں پڑتے ہیں بھنور
اِس کے رستے ہیں کوئی فلسفہ حائل ہو اگر
قدریں تھرّاتی ہیں، معیار اُلٹ جاتے ہیں
اور اِس زلزلۂ فکر و نظر سے، ہر بار
کِتنے دیوانے، روایت سے دغا کرتے ہیں،
کِتنے بُت ٹوٹتے ہیں، کِتنے "خُدا" مرتے ہیں

مئی ۱۹۶۶ء

بیسویں صدی

بات وجدان کی ہوتی تو بڑی بات نہ تھی
کہ رگِ سنگ سے خوشبو کے شرارے جھڑتے

ربط انسان کا افلاک سے اتنا بڑھتا
وہ جب اٹھتا تو ستاروں پہ بھی سائے پڑتے

اپنے محور پہ زمانے کو گھمانے لگتا
آدمی گردشِ افلاک سے لڑتے لڑتے
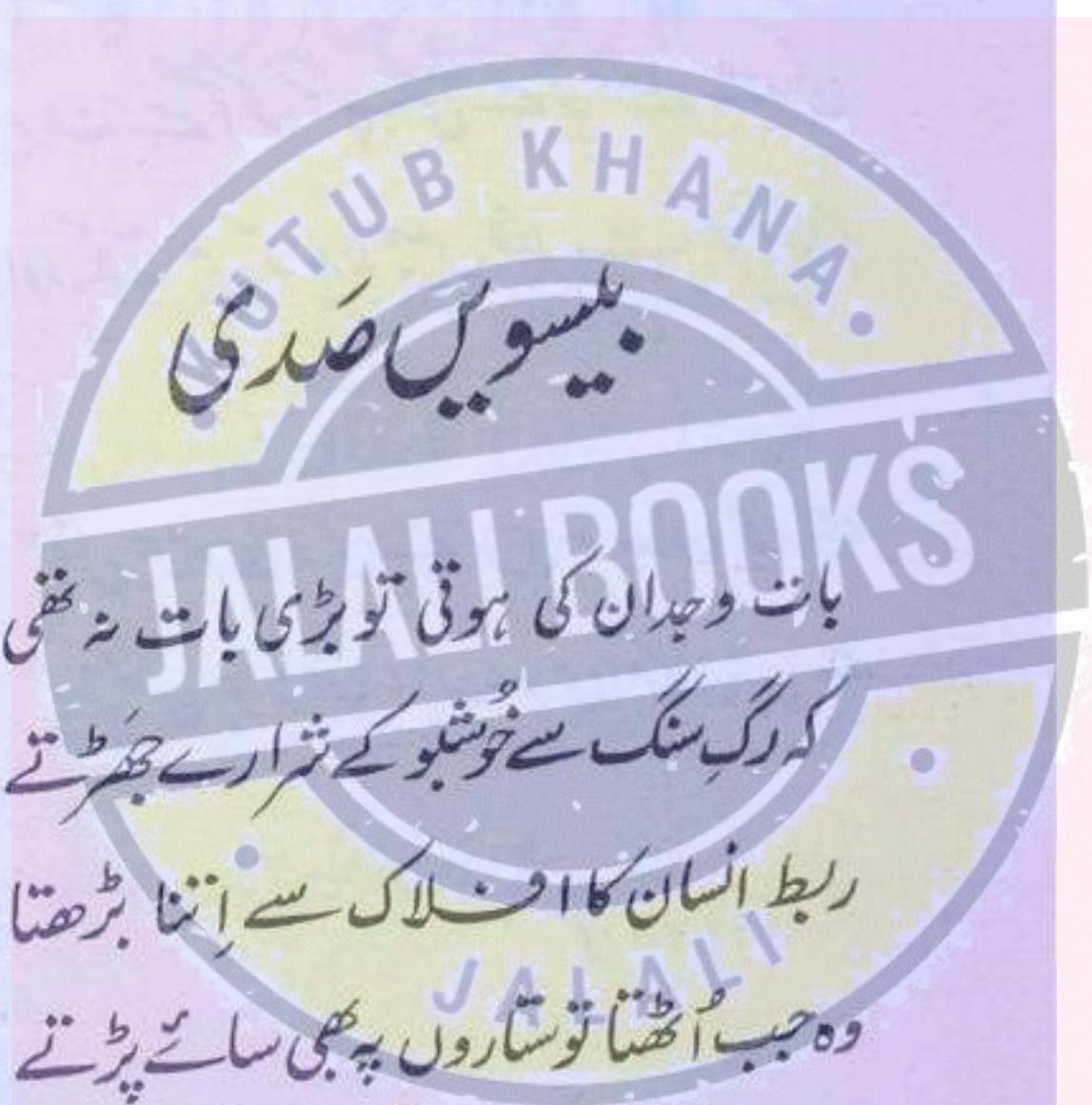
کیا خبر تھی کہ اِک ایسی بھی گھڑی آئے گی
عقل، وجدان کی باہوں میں سما جائے گی

آج جو شخص یہ کہتا ہے کہ سورج ہے سیاہ
اس کو اِک روز صداقت کا ملے گا انعام
آج کے لوگ، بایں نعرۂ عدل و انصاف
چاند بجھتا ہے تو دھرتے ہیں صبا پر الزام
برف سے آگ ٹپکتی ہے تو شعلے سے نمی
اور کہتے ہیں کہ بدلا نہیں فطرت کا نظام

عقل جو سوچ رہی ہے وہی وجدان میں ہے
پہلے ممکن جو نہ تھا، اب وہی امکان میں ہے

مئی ۱۹۶۶ء

کارواں بہاروں کا

فضا سے ابر برستا رہا ہزاروں کا
مگر رواں ہی رہا کارواں بہاروں کا

وہیں سے پھوٹ رہا ہے طلوعِ صبح کا نور
جہاں شہید ہُوا اِک ہجوم تاروں کا
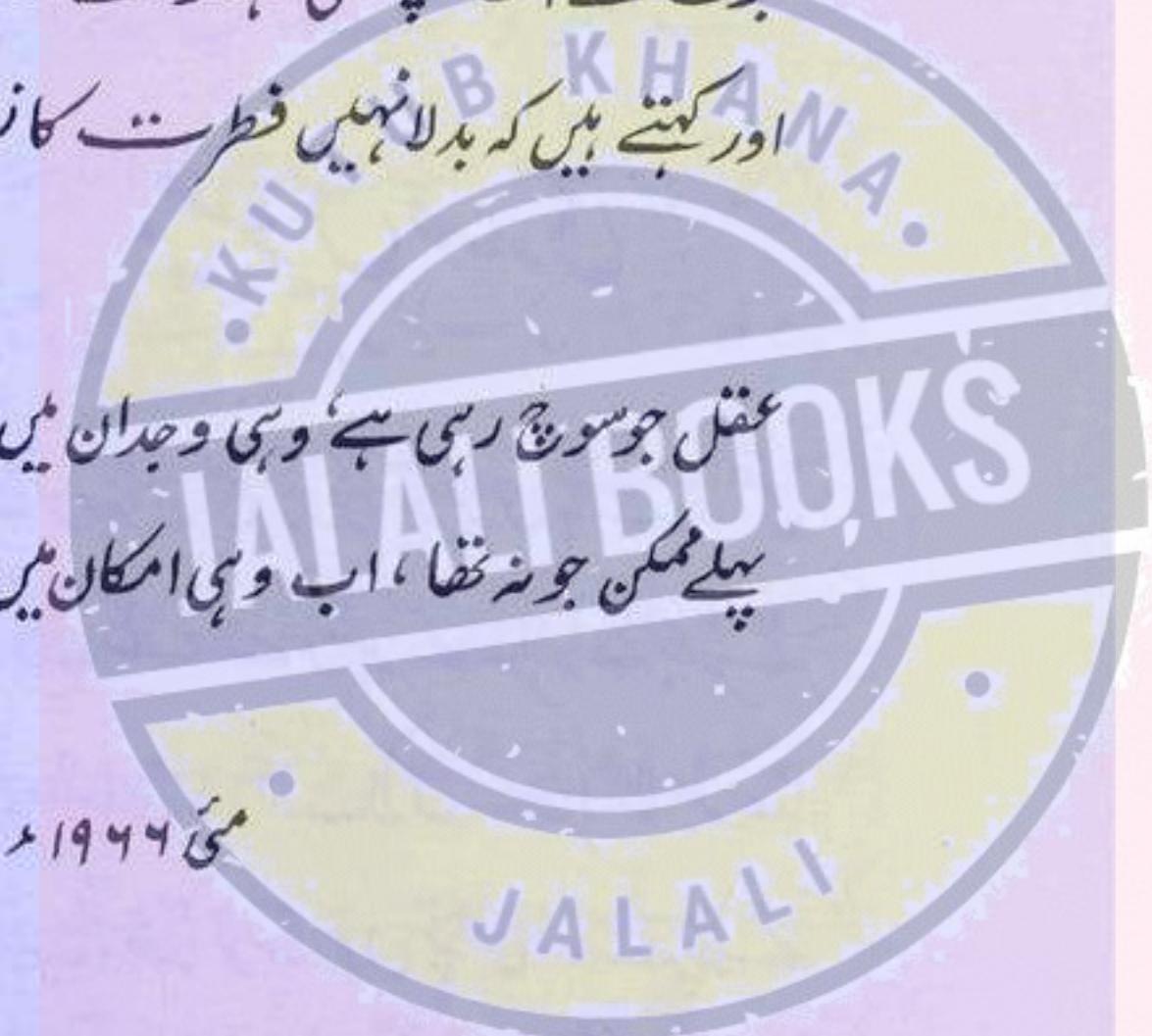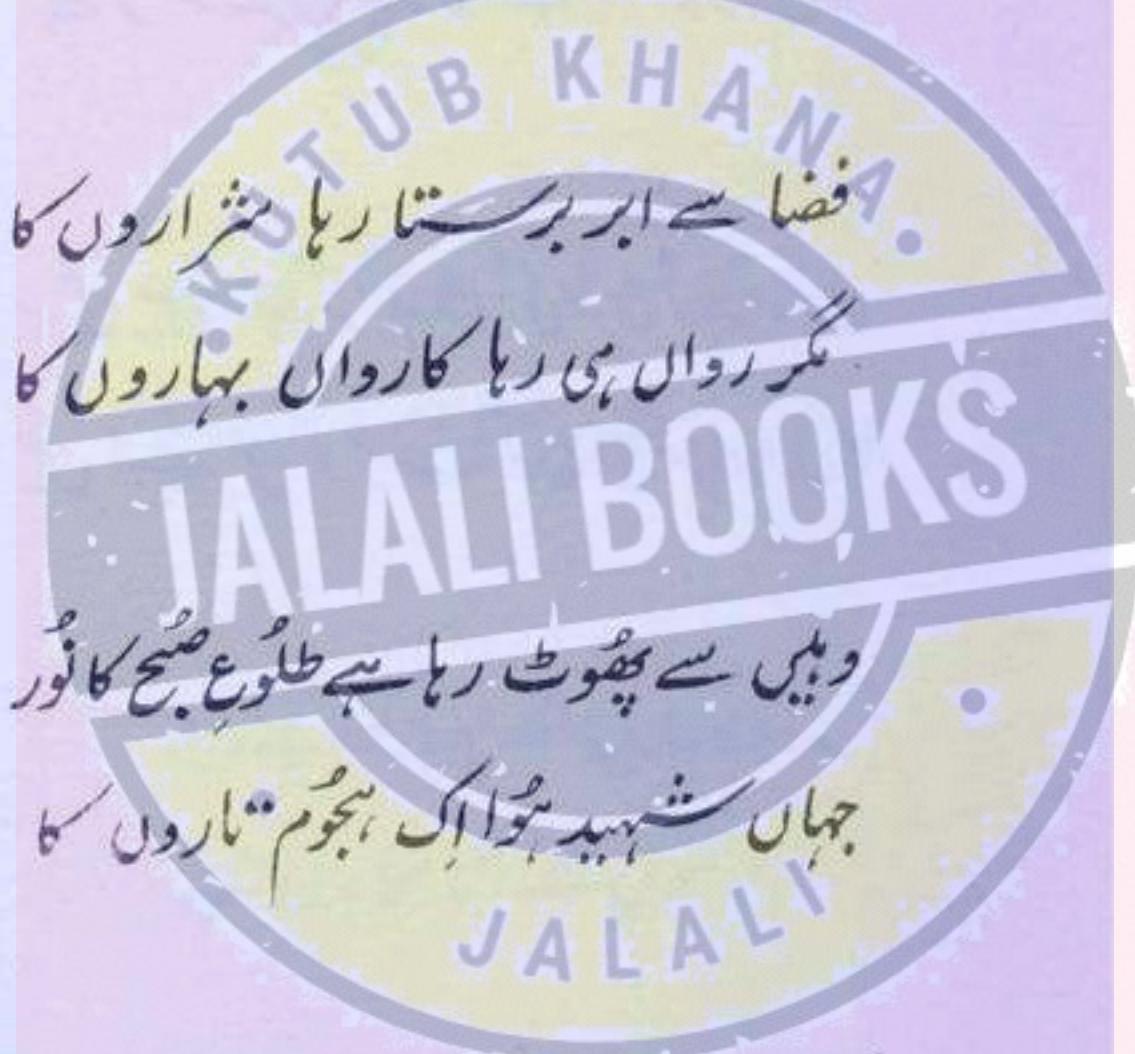
کھلے ہُوئے ہیں جہاں پھول سے نقوشِ قدم
وہیں سے قافلہ گزرا ہے میرے یاروں کا

رُکے ہُوئے ہیں جو دریا، اُنھیں رُکا نہ سمجھ
کلیجہ کاٹ کے نکلیں گے کوہساروں کا

اسی کو کہتے ہیں تاریخ داں شعورِ وطن
جو آج ایک میں ہے ولولہ ہزاروں کا

مجھے تو پھول کھلانے ہیں، وہ لہو کے سہی
مجھے تو قرض چکانا ہے شاخساروں کا

یہ جی میں ہے کہ شہیدوں کی طرح زندہ رہوں
میں اپنے فن کو بناؤں دیا مزاروں کا

اکتوبر ۱۹۶۵ء

کشمیر

ہر گُل کی جبین پُر شکن ہے
کشمیر لُٹا ہُوا چمن ہے

پھُولوں نے چھُپا رکھا ہے ورنہ
زخموں سے اَٹا ہُوا بدن ہے
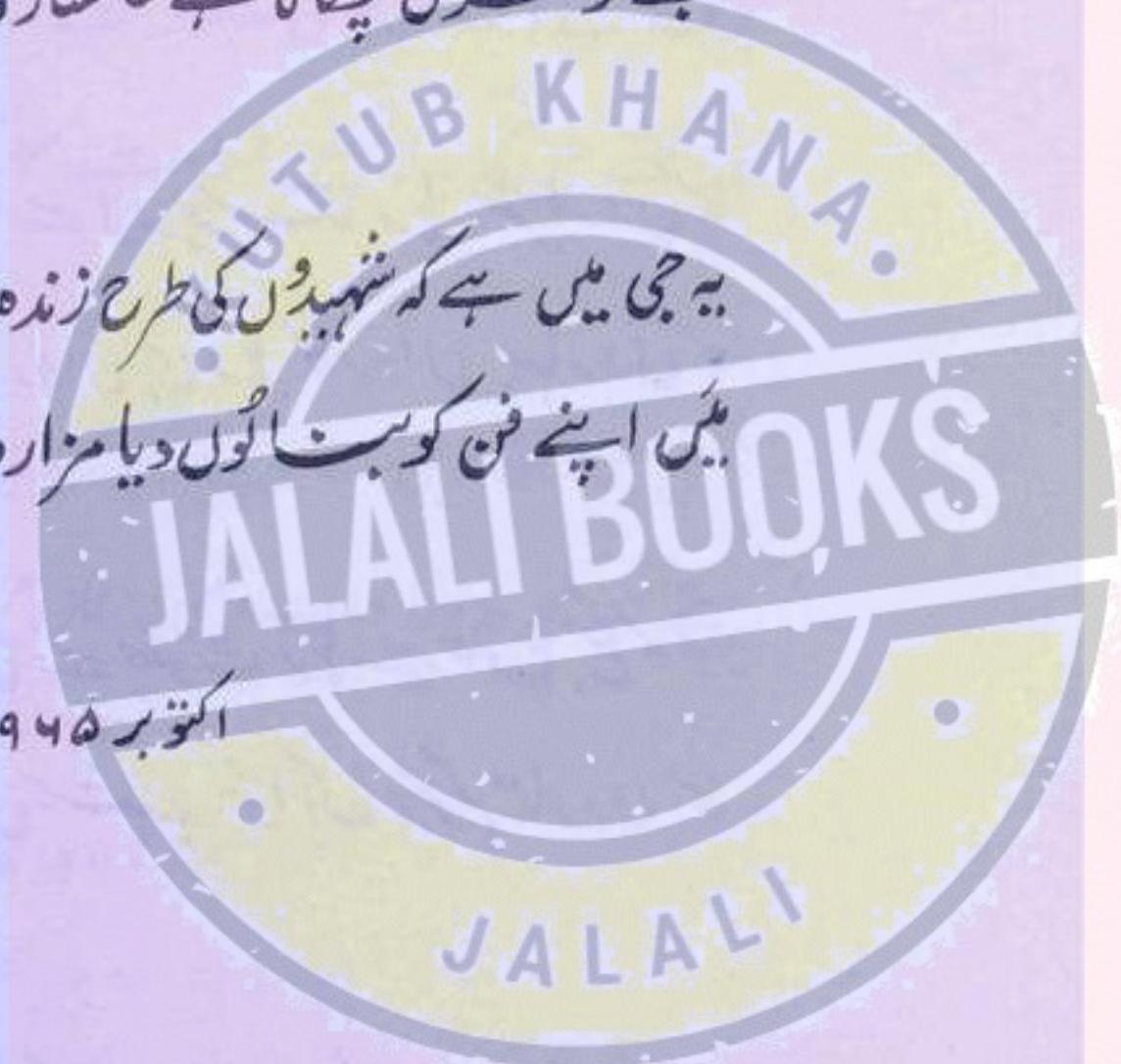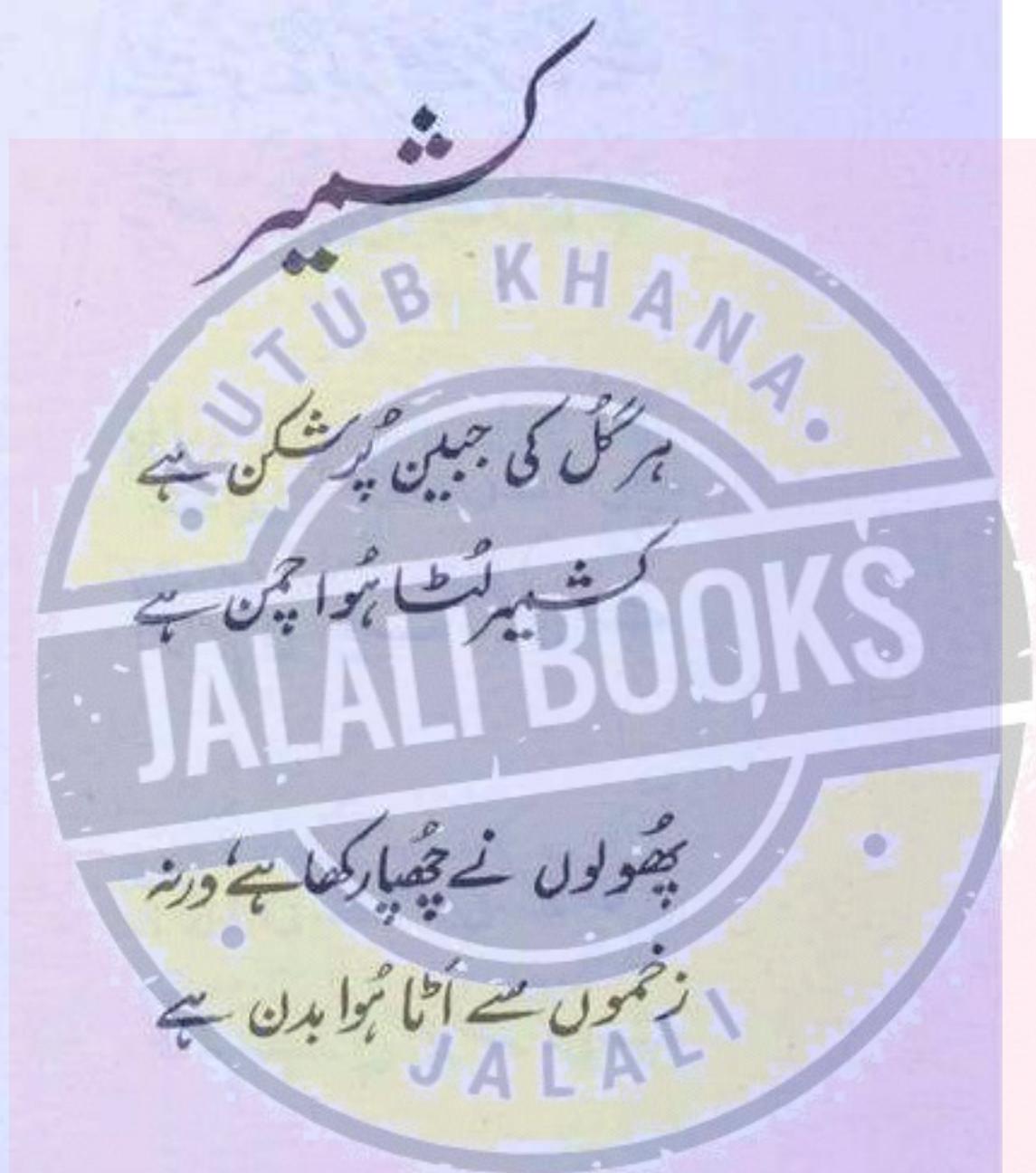
ہونٹوں پہ رُکے ہُوئے ہیں شعلے
آنکھوں میں جمی ہُوئی جلن ہے

ہر فرد ہے غم کا اِک صحیفہ
ہر چہرہ، حکایتِ محن ہے

پھیلا ہُوا ہاتھ برہمن کا
اس چاند کا مستقل گہن ہے

جلتے ہوئے گھر، چھنے ہُوئے کھیت
ہر شخص وطن میں بے وطن ہے

سُنتے ہیں۔ سمندروں کے اُس پار
اقوام کی ایک انجمن ہے

آج اس کے اصُول کے مطابق
ظالم ہے وہی، جو خستہ تن ہے

آج اس کی روایتوں کی رُو سے
رہبر ہے وہی، جو راہزن ہے

آج اس کی بلند مسندوں پر
ہر چور کے ہاتھ میں کفن ہے
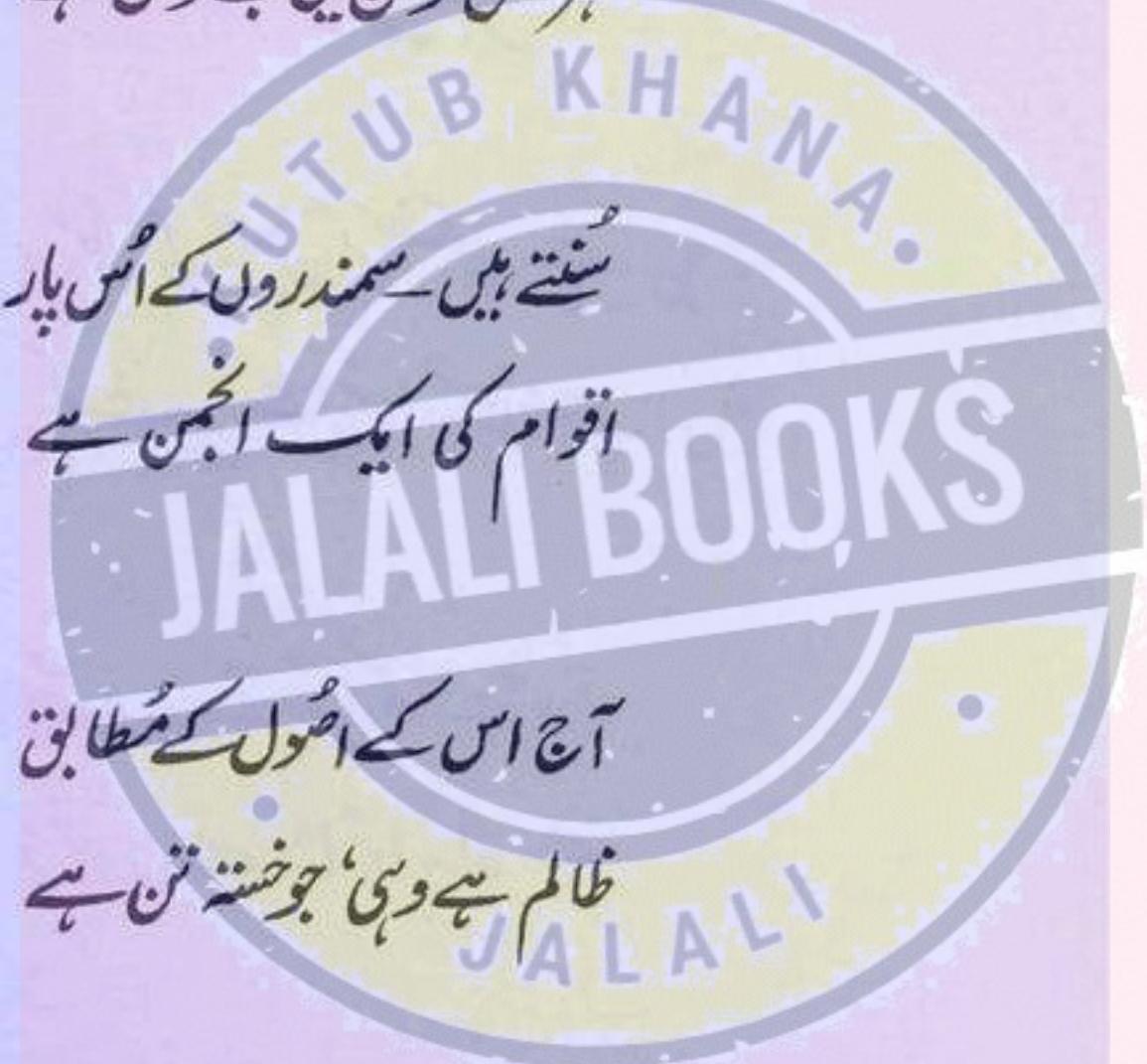
حق بات تو خیر، جُرم ٹھہرا ہی
حق مانگنا بھی دوانہ پن ہے

سچ کہتی ہیں سب غریب قومیں
یہ بزم بھی بزمِ اہرمن ہے

تاریخ اُلٹ رہی ہے اوراق
کشمیر کی برف شعلہ زن ہے

تسلیم — کہ ظالموں کے نزدیک
کشمیر دریدہ پیرہن ہے

کشمیر کی مفلسی ہیں، لیکن
اب کیسا بلا کا بانکپن ہے

زخموں سے اَٹے ہُوئے بدن پر
یزداں کا جلال ضوفگن ہے

ہیں برق فشاں، سِلے ہُوئے لب
کاٹا ہُوا ہاتھ، تیغ زن ہے

ہر سمت پہاڑ کٹ رہے ہیں
ہر فرد شبیہِ کوہ کن ہے

ہر دل میں گڑا ہُوا ہے تیشہ
لیکن یہی عشق کا چلن ہے

جو موت ہو زندگی کی خاطر
وہ زندگی کا کمالِ فن ہے

ستمبر ۱۹۶۵ء

٦ ستمبر

چاند اُس رات بھی نکلا تھا، مگر اُس کا وجود
اِتنا خوں رنگ تھا، جیسے کسی معصوم کی لاش
تارے اُس رات بھی چمکے تھے، مگر اِس ڈھب سے
جیسے کٹ جائے کوئی جسمِ حسیں، قاش بہ قاش
اتنی بے چین تھی اُس رات، مہک پھولوں کی
جیسے ماں، جس کو ہو کھوئے ہوئے بچّے کی تلاش
پیڑ چیخ اُٹھتے تھے امواجِ ہوا کی زد میں
نوکِ شمشیر کی مانند تھی جھونکوں کی تراش
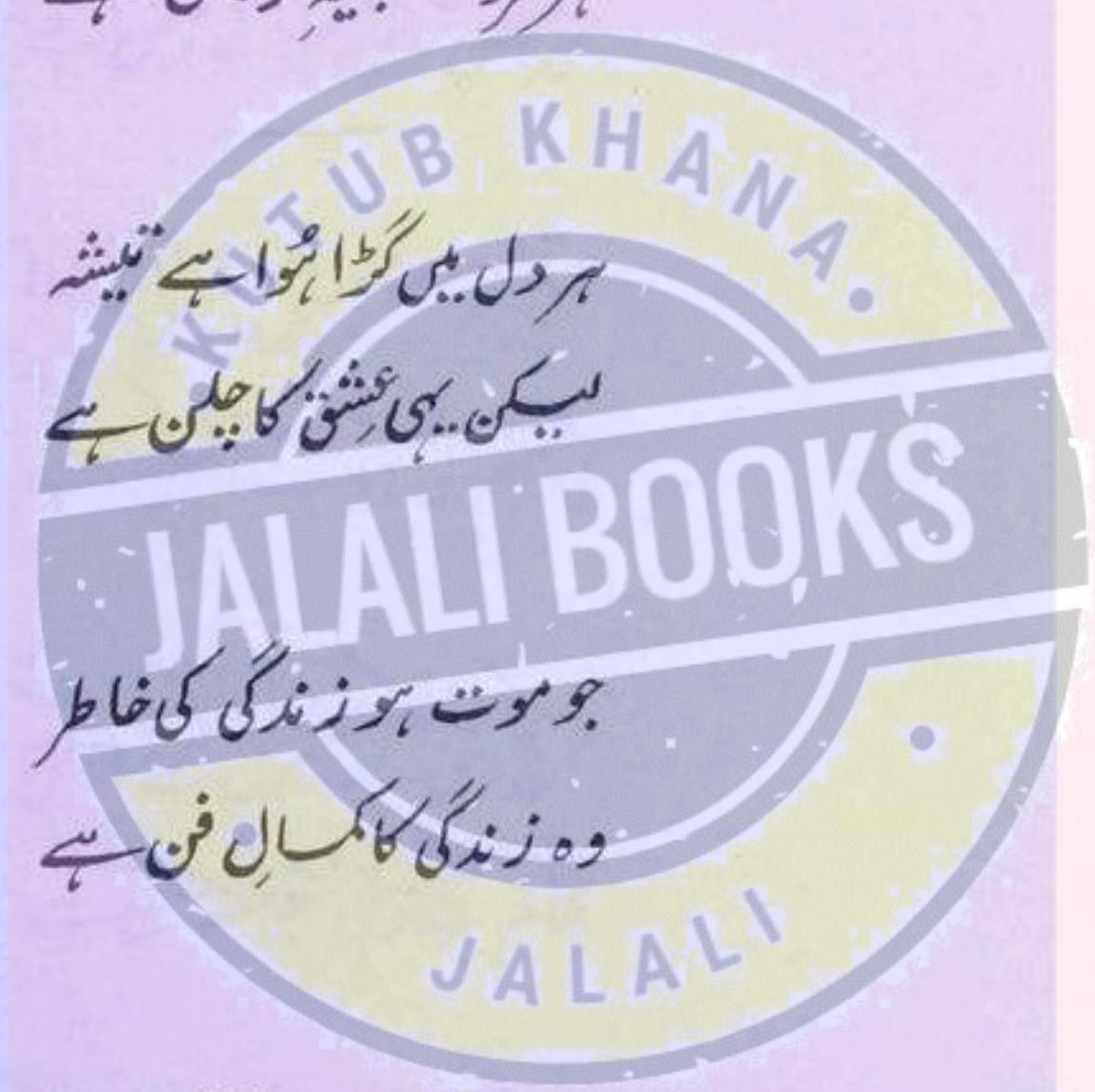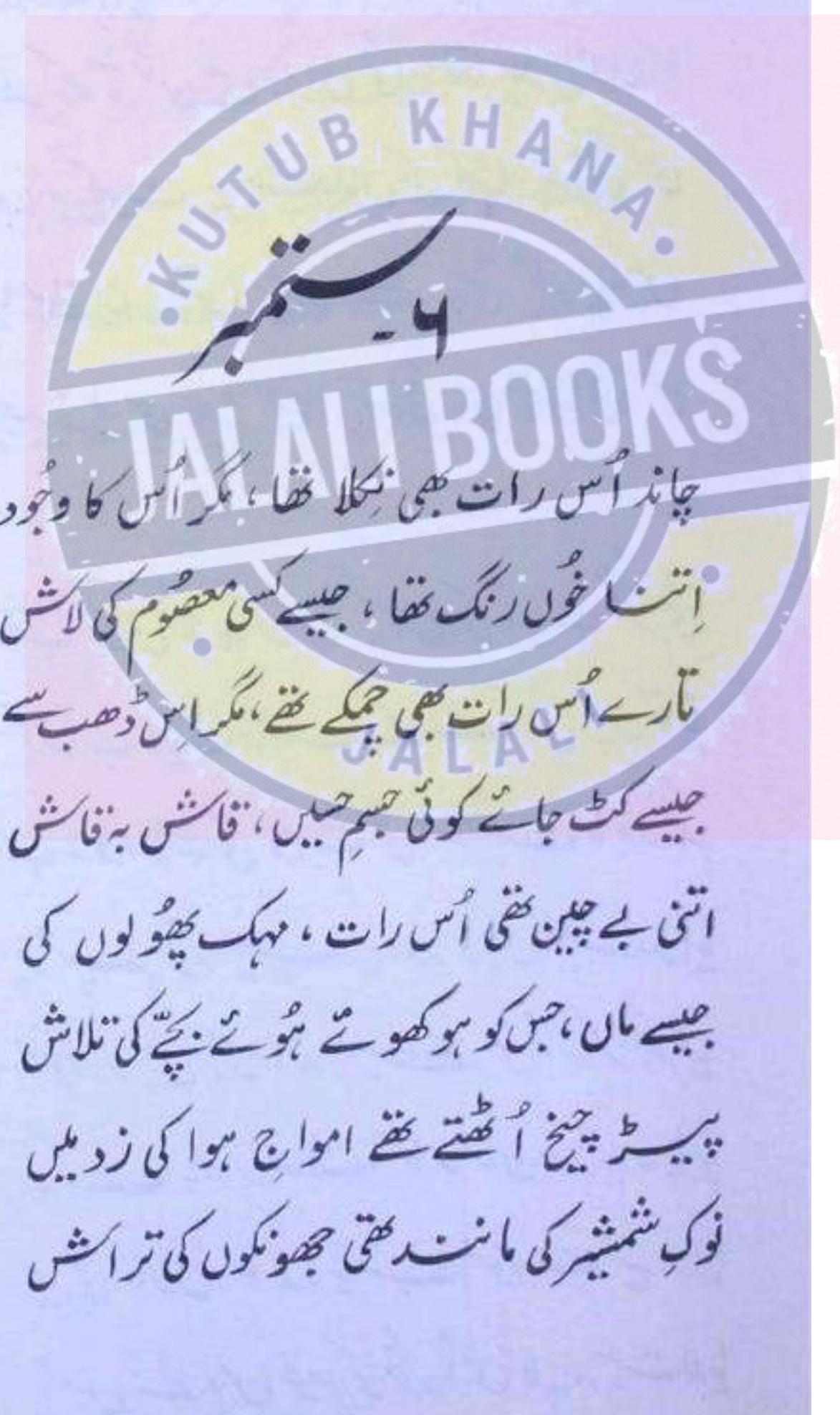
اتنے بیدار زمانے میں یہ سازش بھری رات
میری تاریخ کے سینے پہ اُتر آئی تھی
اپنی سنگینوں میں اُس رات کی سفاک سپاہ
دُودھ پیتے ہوئے بچّوں کو پرو لائی تھی
گھر کے آنگن میں رواں خُون تھا گھر والوں کا
اور ہر کھیت پہ شعلوں کی گھٹا چھائی تھی
راستے بند تھے لاشوں سے پٹی گلیوں میں
بِھیڑ سی بِھیڑ تھی، تنہائی سی تنہائی تھی

تب کراں تا بہ کراں صُبح کی آہٹ گُونجی
آفتاب ایک دھماکے سے اُفق پر آیا
اب نہ وہ رات کی ہیبت تھی، نہ ظلمت کا وہ ظلم
پرچمِ نُور یہاں اور وہاں لہرایا
جتنی کرنیں بھی اندھیرے میں اُتر کر اُبھریں
نوک پر رات کا دامانِ دریدہ پایا
میری تاریخ کا وہ بابِ منوّر ہے یہ دن
جس نے اِس قوم کو خُود اُس کا پتہ بتلایا

آخری بار اندھیرے کے پجاری سن لیں،
مَیں سحر ہوں، مَیں اُجالا ہوں، حقیقت ہوں مَیں

مَیں محبّت کا تو دیتا ہوں محبّت سے جواب
لیکن اعدا کے لیے قہر و قیامت ہوں مَیں

امن میں موجۂ نکہت مرا کردار سہی
جنگ کے دَور میں غیرت ہوں، حمیّت ہوں مَیں

میرا دشمن مجھے للکار کے جائے گا کہاں
خاک کا طیش ہوں، افلاک کی دہشت ہوں مَیں

ستمبر ۱۹۶۵ء

حصارِ فصلِ گُل

(صدرِ پاکستان کے انتخابات کے بعد کراچی کے فسادات کے پس منظر میں)

محصُور ہو گئے ہیں عجب فصلِ گُل میں ہم
کلیوں کے دل فگار ہیں، پھُولوں کے سَرِ قلم

اِک پل میں ہم پر ایک صدی سی گزُر گئی
لمحوں سے ناپتے رہے احباب طُولِ غم

اب حُسنِ فت رس کس سے کرے منّتِ روا
اہلِ حرم نے چاک کیا پردۂ حرم

ستاروں کا قتل پردۂ شب میں ہُوا، مگر
دستِ سحر سے خُون تو ٹپکے گا، صُبحدم

چُپ چاپ پی گئے ہیں لہُو کی پُکار کو
دانش وری کے یُوں تو بڑے مدّعی ہیں ہم

۶- فروری
۱۹۶۵ء

صدائے بے صدا

اظہارِ مدّعا کی اجازت کا شکریہ
لیکن مری زبان تو واپس دلائیے
الفاظ سے صدا کی صفت کس نے چھین لی
اِس رہزنی کا کھوج تو پہلے لگائیے
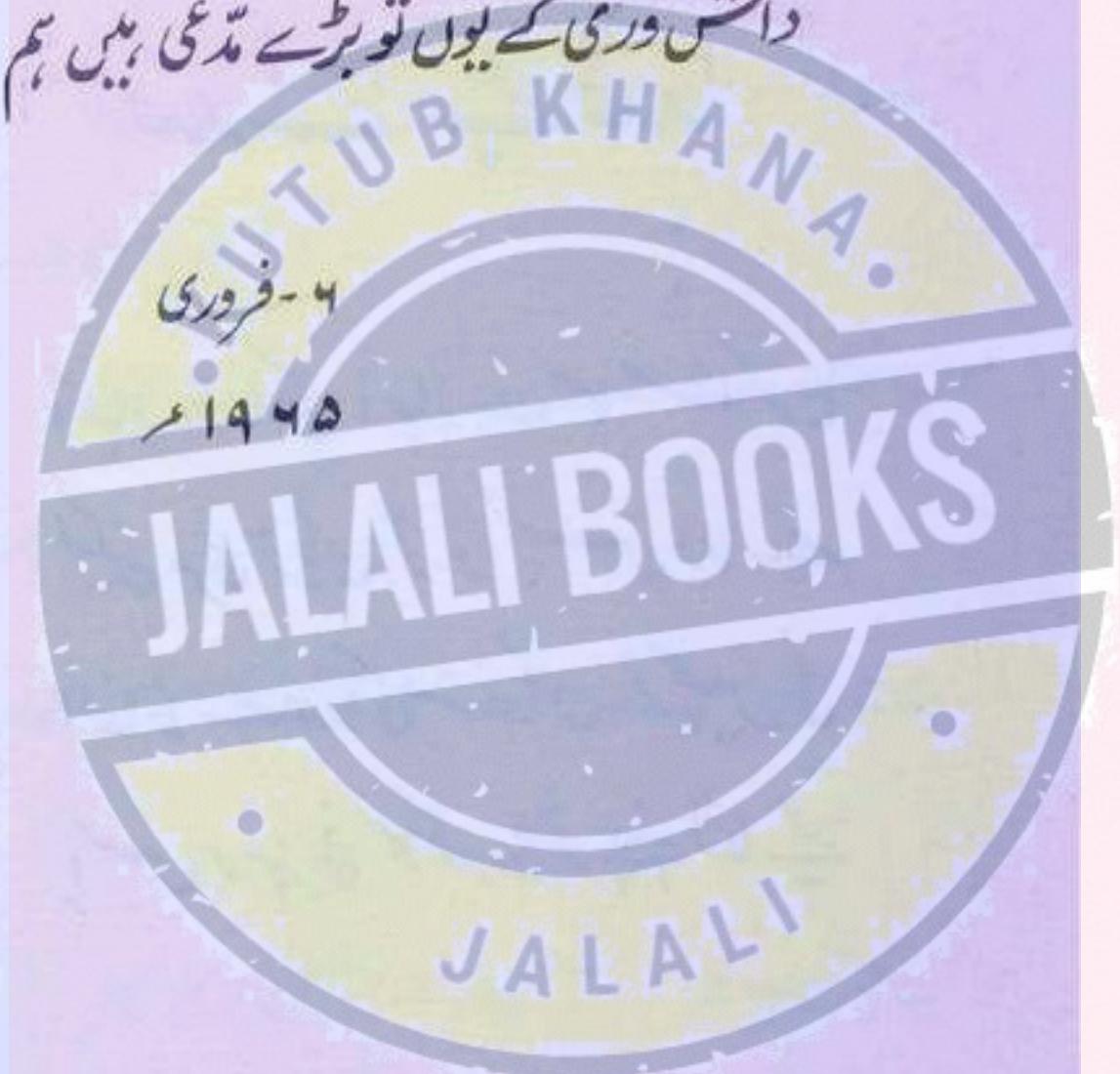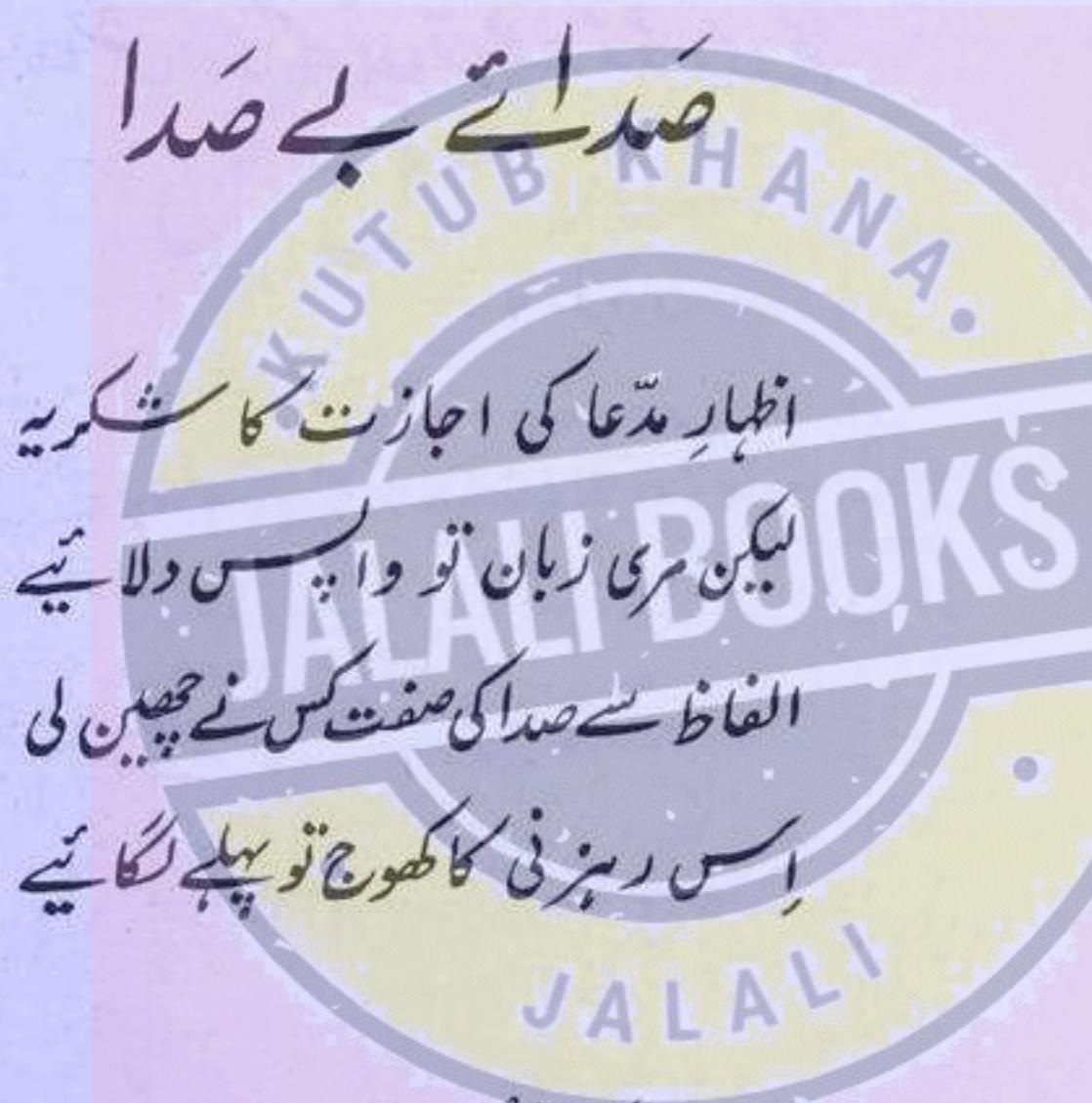
جب مِل گیا مُجھے مری آواز کا سراغ
جنباں رہیں گے کُنجِ لحد میں بھی میرے لب
یُوں بولنے کو بول تو دُوں آج بھی، مگر
تاروں کے ٹوٹنے سے نہ ٹُوٹا سکُوتِ شب

۲۴- جنوری ۱۹۶۵ء

نِیلام

تم میں وہ کون ہے جو یوسفِ کنعاں کے لیے
آخری بولی دے گا ؟
سب غلام ایک سے ہوتے تو یہ نیلام بھلا
کس لیے بر پا ہوتا
اور یہ یوسفِ کنعاں تو ہے صورت گرِ کونین کا معیارِ جمال

دامن و جیب کو تم سیم و زر و لعل و جواہر
سے تو بھر لائے ہو
وہ مگر اور ہی دولت ہے جو درکار ہے
یوسف کے خریداروں کو
تم اسے کچھ بھی کہو، سوت کی انٹی کہ تہی دستِ محبت کا ملال

جنوری ۱۹۶۵ء

یہ عجب شب ہے

یہ عجب شب ہے، کہ روشن بھی ہے، تاریک بھی ہے
اتنی روشن ہے! کہ دن اس کے مقابل شب ہے
اور تاریک بھی اتنی! کہ ترے دھوکے میں
مَیں نے چند اور حسیناؤں کے لب چُوم لیے
اتنی روشن! کہ ترے پیار کے اُس پار، مجھے
جتنے چہرے نظر آئے، مرے اغیار کے تھے
اتنی تاریک! کہ ان چہروں میں ہر چہرے پر
مجھے خود اپنے ہی چہرے کے گماں گزرے تھے

تُو مرے پاس رہا، پھر بھی بہت دُور رہا
آج مَیں نے ترا ایک اور بھی پہلو دیکھا

جنوری ۱۹۶۵ء

○

اذانِ صبح سے شب کا علاج کیا ہو گا
مجھے تو تیرا ہی چہرہ سحر نما ہو گا

اس انتظار میں تکمیلِ کفر ہو نہ سکی
کبھی تو میرا خدا بھی مرا خدا ہو گا

بہار کتنی ہی بے رنگ ہو — بہار تو ہے
جو گُل نہیں تو کوئی زخم ہی کِھلا ہو گا

وہ تیرگی ہے، کہ راہِ وفا سے پُوچھتا ہُوں
تجھے تو اپنے مسافر کا کُچھ پتا ہو گا

مَیں آج تیرے تصوّر میں مُسکرا تو دیا
مگر یہ فکر ہے، کس کس کا دِل جلا ہو گا

ہے میرے لمس میں اب تک ترے بدن کی مہک
تری جدائی کا حق مجھ سے کیا ادا ہو گا

ترے فراق میں بھی تجھ سے ربط قائم ہے
کہ میری یاد میں تُو بھی تو جاگتا ہو گا

مرے دیار کی مانند، تیرے شہر میں بھی
اُداس رات کا سنّاٹا رو رہا ہو گا

فضا میں تیر رہے ہوں گے کتنے فق چہرے
افق کی دھار پہ مہتاب کٹ گیا ہو گا
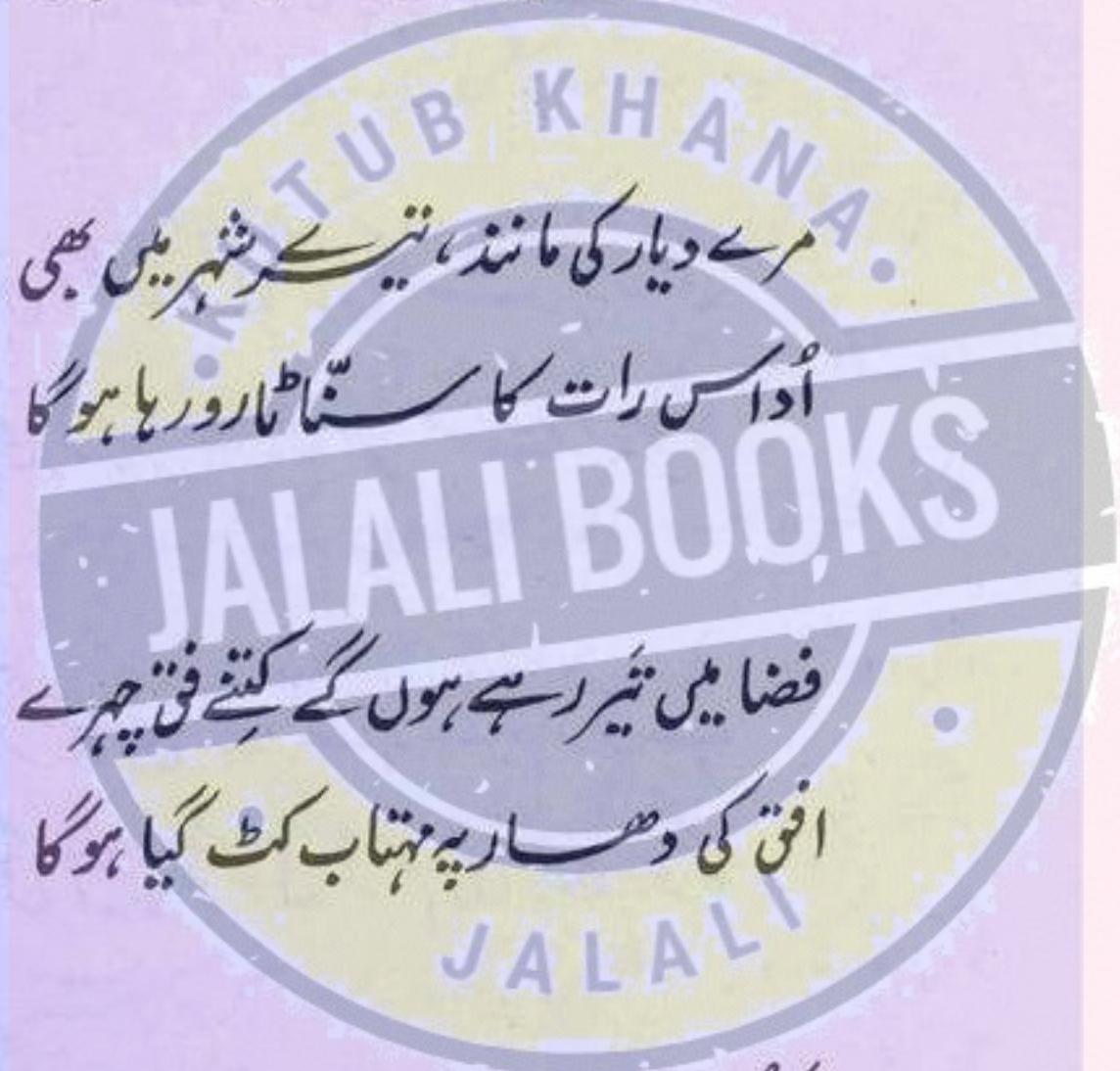
میں کھُل کے رو نہ سکا جب، تو یہ غزل کہہ لی
بچھڑ کے مجھ سے مگر تُو نے کیا کِیا ہو گا

جنوری ۱۹۶۵ء

اظہار

تجھے اظہارِ محبت سے اگر نفرت ہے
تُو نے ہونٹوں کو لرزنے سے تو روکا ہوتا

بے نیازی سے، مگر کانپتی آواز کے ساتھ
تُو نے گھبرا کے مرا نام نہ پُوچھا ہوتا

تیرے بس میں تھی اگر مشعلِ جذبات کی لَو
تیرے رُخسار میں گلزار نہ بھڑکا ہوتا

یُوں تو مجھ سے ہُوئیں صرف آب ہوا کی باتیں
اپنے ٹُوٹے ہُوئے فقروں کو تو پرکھا ہوتا

یونہی بے وجہ ٹھٹکنے کی ضرورت کیا تھی
دمِ رخصت میں اگر یاد نہ آیا ہوتا

تیرا غمّاز بنا خود ترا اندازِ خرام
دل نہ سنبھلا تھا تو قدموں کو سنبھالا ہوتا

اپنے بدلے مری تصویر نظر آ جاتی
تُونے اُس وقت اگر آئنہ دیکھا ہوتا

حوصلہ تجھ کو نہ تھا مجھ سے جُدا ہونے کا
ورنہ کاجل تری آنکھوں میں نہ پھیلا ہوتا

۱۹۶۴ء

محبّت

محبّت ایک عجب پیارا پیارا حادثہ ہے
کبھی یہ فخر کہ وہ نرم ہاتھ چھُو تو لیا
کبھی یہ فکر کہ بازار سے گزرتے ہوئے
کسی نگاہوں نے اُس کا بدن ٹٹولا ہے
وہ میرے سامنے، مانا، کہ مُسکرایا ہے
مگر یہ پھُول سے لب ایسے منجمد تو نہیں
کہ لاکھ چاہیں مگر مُسکرا سکیں نہ کہیں
ابھی جو مَیں نے سُنی تھی غزل نما آواز
وہ جس میں نغمہ بھی تھا، درد بھی تھا، حُسن بھی تھا
کِسی کا نام، کِسی کا مزاج پُوچھے گی!
صبا کی طرح سے بیگانۂ نشیب و فراز
کبھی خرامِ صبا کو کسی نے روکا ہے؟

محبّت ایک عجب اُلجھا اُلجھا تجربہ ہے

کبھی یہ زعم — وہ میرا ہے، صرف میرا ہے

کبھی یہ سوچ، وہ اوروں سے سرگراں تو نہیں

کسی کے پاس، کسی بزم میں، کہیں نہ کہیں

مرے خیال سے بیگانہ، اپنے آپ میں مست

وہ اک مجسمۂ حسن بن کے بیٹھا ہے

وہ میرے ایسے ہزاروں سے روشناس بھی ہے

مگر، نہ جانے، جنوں کا یہ کیسا مرحلہ ہے

کہ اس فریبِ تخیّل میں مبتلا ہوں مَیں

وہ مجھ سے دور بھی ہے، اور میرے پاس بھی ہے

وہ مجھ کو بھول کے، میرے لیے اُداس بھی ہے

غرض، یہ وہم و یقیں کا عجیب سلسلہ ہے

اگست ۱۹۶۴ء

مجبُوری

خدا سے عقل نہ ملتی، تو کیا پڑی تھی مجھے
کہ اقتدار کی نیّت کا تجزیہ کرتا

مجھے جبلّتِ پرواز نے خراب کیا
وگرنہ میرا ستاروں سے کیا تعلّق تھا

یہ سب گدازِ دل و ذہن کا نتیجہ ہے
کہ عُمر بھر مَیں کِسی کے لیے اُداس رہا

خدا نے مجھ کو بصارت اگر نہ دی ہوتی
تو حُسن مجھ پہ بھلا اتنے حشر کیوں ڈھاتا

فقط شعورِ تناسب ہے، اور جمال ہے نام
کسی کے لمس کی حسرت ہے، ورنہ عشق ہے کیا

رگوں میں خون کی گرمی کا معجزہ ہے تمام
وگرنہ آدمی پتھر سے مختلف تو نہ تھا

تو میری فکر میں جلتے ہوئے الاؤ تو دیکھ
بُرا نہ مان مری تیز و تُند باتوں کا!

زباں ملی تو مجھے بولنا پڑا — ورنہ
خدا کی طرح، میں تا روزِ حشر، چُپ رہتا

جولائی ۱۹۶۴ء

لمحے اور صدیاں

ملاقات کے چند لمحے
فقط چند لمحے نہ تھے
چند صدیاں تھیں
جن میں محبت کی تاریخ ترتیب پاتی رہی
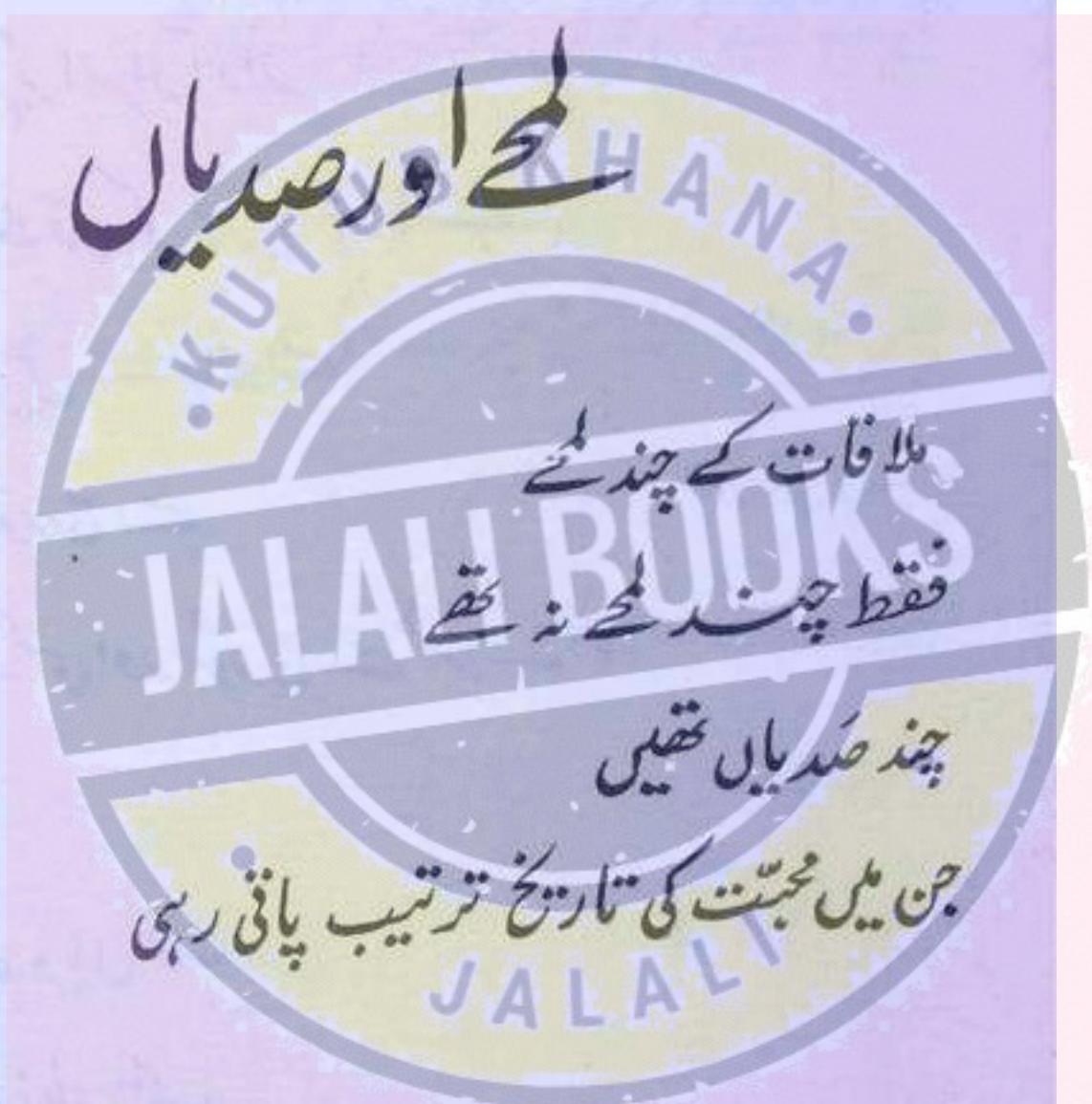
تُو نے پہلے تو اِک اجنبی کی سی حیرت سے
پھر ایک دل دوز اپنائیت سے
مری سمت دیکھا
تو لمحوں کے پَر جھڑ گئے
تیری زلفوں کی زنجیر سارے بدن پر سجائے ہوئے

وقت گرد سا گیا

چند لمحے جو صدیوں کی مانند پھیلے

تو میَں نے سُنی

باغِ جنّت سے حوّا و آدم کے رختِ سفر باندھنے کی صدا

اور پھر وہ پُراسرار آواز

جس سے خلاؤں کو لبریز ہونا ہے

جب یہ زمیں — چاند سے

چاند — سُورج سے

سُورج — کسی اور سُورج سے ٹکرائے گا

یہاں سے وہاں تک

زمیں سے زماں تک

مجھے تیری آنکھیں نظر آ رہی تھیں

سمندر تلاطم میں تھے

اور لہریں مرے دل کے ساحل سے ٹکرا رہی تھیں

ابھی تیری آنکھوں سے مانوس ہونے میں کچھ دیر تھی

جب ترے لب ہلے
پھر افق تا افق
پھول ہی پھول تھے
تیری باتوں کی مہکار تھی
تیرے لہجے میں کلیاں چٹکنے کی جھنکار تھی

پھر اک دم، ترا حسن میرے لہو میں اترنے لگا
زندگی پر مجھے
ایک مدت کے بعد
آخری بار
پیار آگیا

اور پھر میں نے دیکھا
کہ میں تو ازل سے تجھے جانتا ہوں

خدا جانے پھر کیا ہوا
چند صدیاں گزرنے کے بعد

اب خدا کے سوا کون جانے
کہ پھر کیا ہُوا
تیری آنکھوں کی، تیرے لبوں کی قسم
مَیں تو بس اس قدر جانتا ہُوں
کہ تجھ سے ملاقات کے چند لمحے
فقط چند لمحے نہ تھے
چند صدیاں تھیں
جو چند لمحوں میں گزریں

اپریل
۱۹۶۴ء
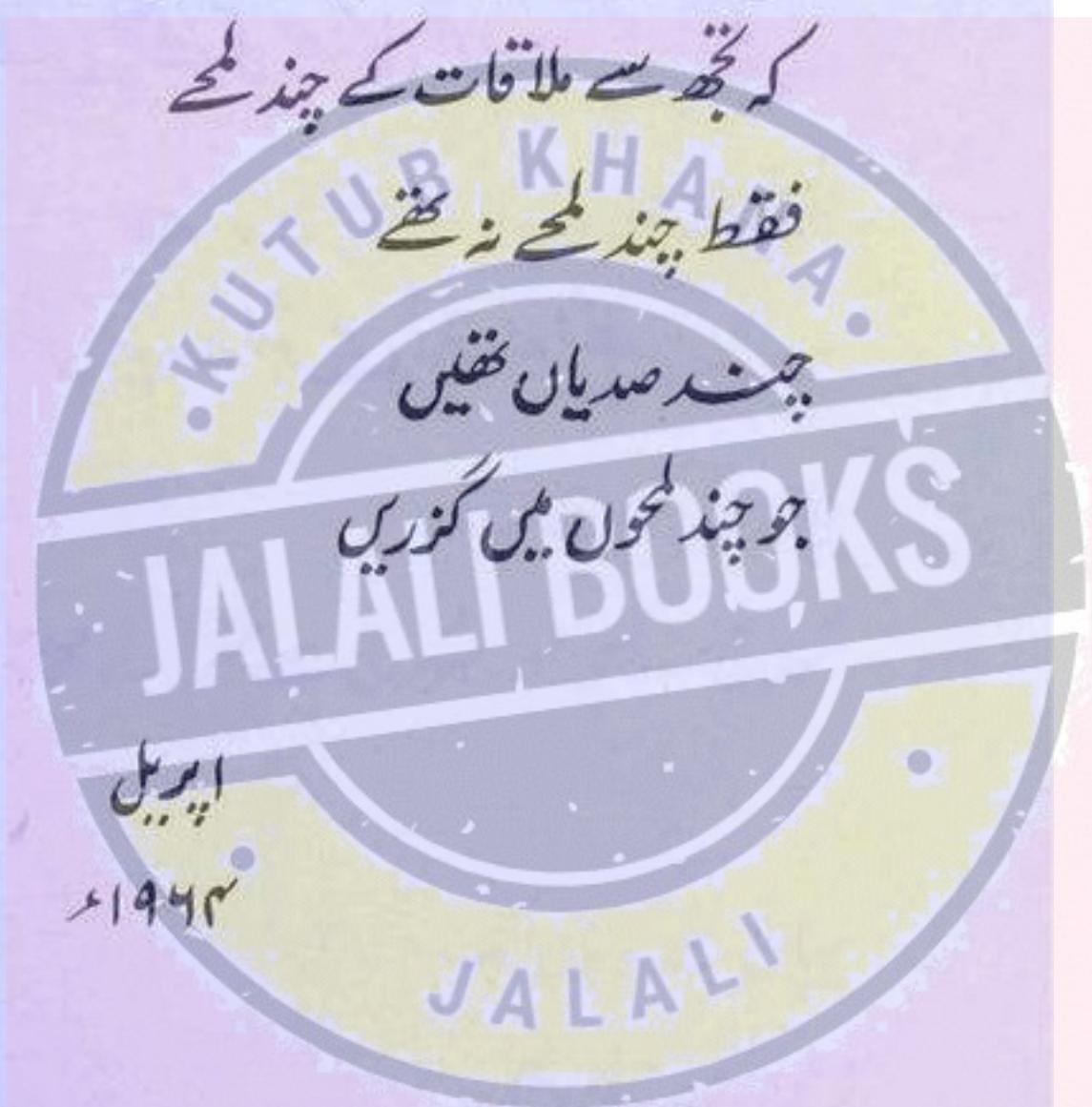
جنگل

اب کے مخدوش نہیں ہے جنگل

شیر غاروں میں پڑے اونگھتے ہیں
اور ہر غار کے منہ پر ہے چٹان

ان چٹانوں سے ذرا سا ہٹ کر
سنگ و فولاد کے ابھرے ہیں مچان

اِن مچانوں پہ چڑھے بیٹھے ہیں
گھنے جنگل کے کئی پشتیبان

کوئی ساونت ہے، کوئی بلوان

آہٹیں چار طرف سونگھتے ہیں
پتّہ کھڑکے تو سنبھل جاتے ہیں

جھونکا شاخوں سے اگر بات کرے
رنگ چہروں کے بدل جاتے ہیں

کوئی چڑیا بھی اگر بول پڑے
ان کے ہتھیار مچل جاتے ہیں

تیر چٹکی سے نکل جاتے ہیں

یہ ہے وہ موڑ جہاں آتے ہی
بھول جاتے ہیں برسنا بادل

آنچ آ جائے نہ ظلمت پہ کہیں
اپنے سینے میں چھپا لے مشعل
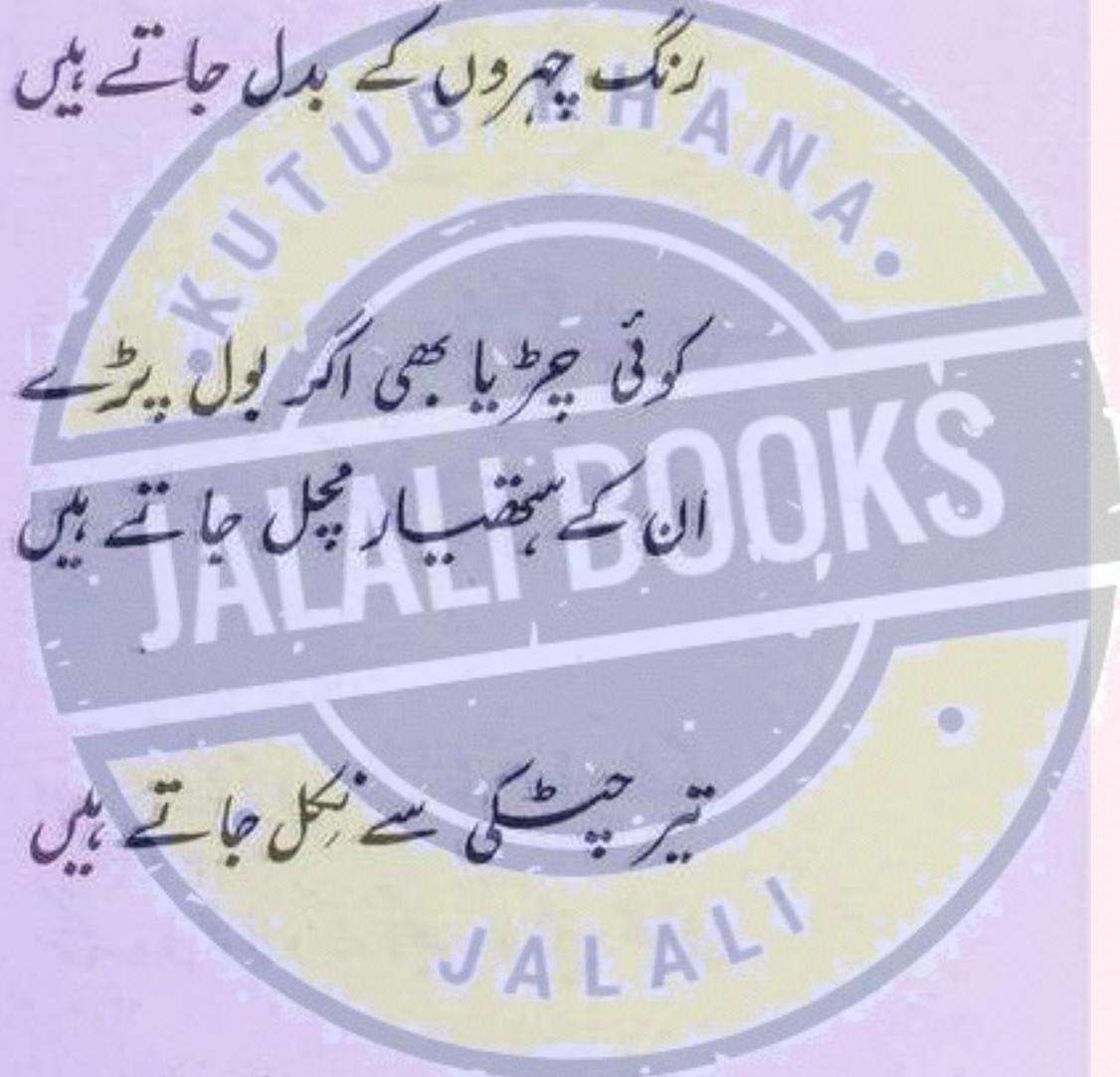
وقت کی طرح گزر جا چُپ چاپ
یُوں سمجھ لے کہ ترے پاؤں ہیں شل

سانس کو روک کے چل، سر کے بل
اب کے مخدوش نہیں ہے جنگل

دسمبر
۱۹۶۴ء
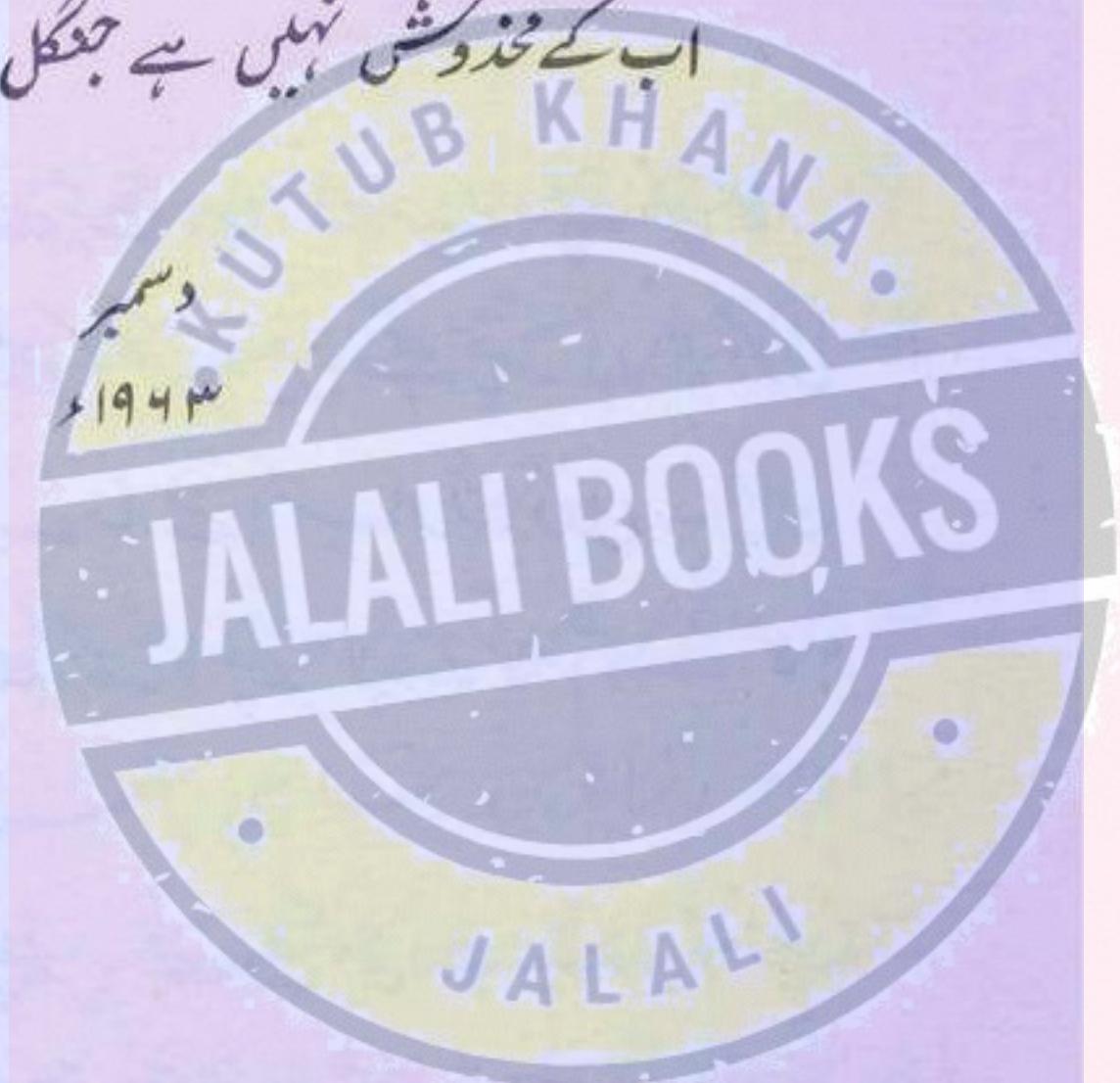
پتّھر

ریت سے بُت نہ بنا، اے مرے اچھے فن کار
ایک لمحے کو ٹھہر، مَیں تجھے پتّھر لا دُوں
مَیں ترے سامنے انبار لگا دُوں — لیکن
کون سے رنگ کا پتّھر ترے کام آئے گا؟

سُرخ پتّھر؟ جسے دل کہتی ہے بے دل دُنیا
یا وہ پتھرائی ہُوئی آنکھ کا نیلا پتّھر
جس میں صدیوں کے تحیُّر کے پڑے ہوں ڈورے؟

کیا تجھے رُوح کے پتّھر کی ضرورت ہو گی؟
جس پہ حق بات بھی پتّھر کی طرح گرتی ہے

اِک وہ پتّھر ہے، جسے کہتے ہیں تہذیب سفید
اس کے مرمر میں سیہ خُون جھلک جاتا ہے
ایک انصاف کا پتّھر بھی تو ہوتا ہے، مگر
ہاتھ میں تیشۂ زر ہو تو وہ ہاتھ آتا ہے

جتنے معیار ہیں اس دَور کے، سب پتّھر ہیں
جتنے افکار ہیں اس دَور کے، سب پتّھر ہیں

شعر بھی، رقص بھی، تصویر و غنا بھی پتّھر
میرا الہام، ترا ذہنِ رسا بھی پتّھر
اس زمانے میں تو ہر فن کا نشاں پتّھر ہے
ہاتھ پتّھر ہیں ترے، میری زباں پتّھر ہے

ریت سے بُت نہ بنا، اے مرے اچھے فن کار

دسمبر ۱۹۶۳ء
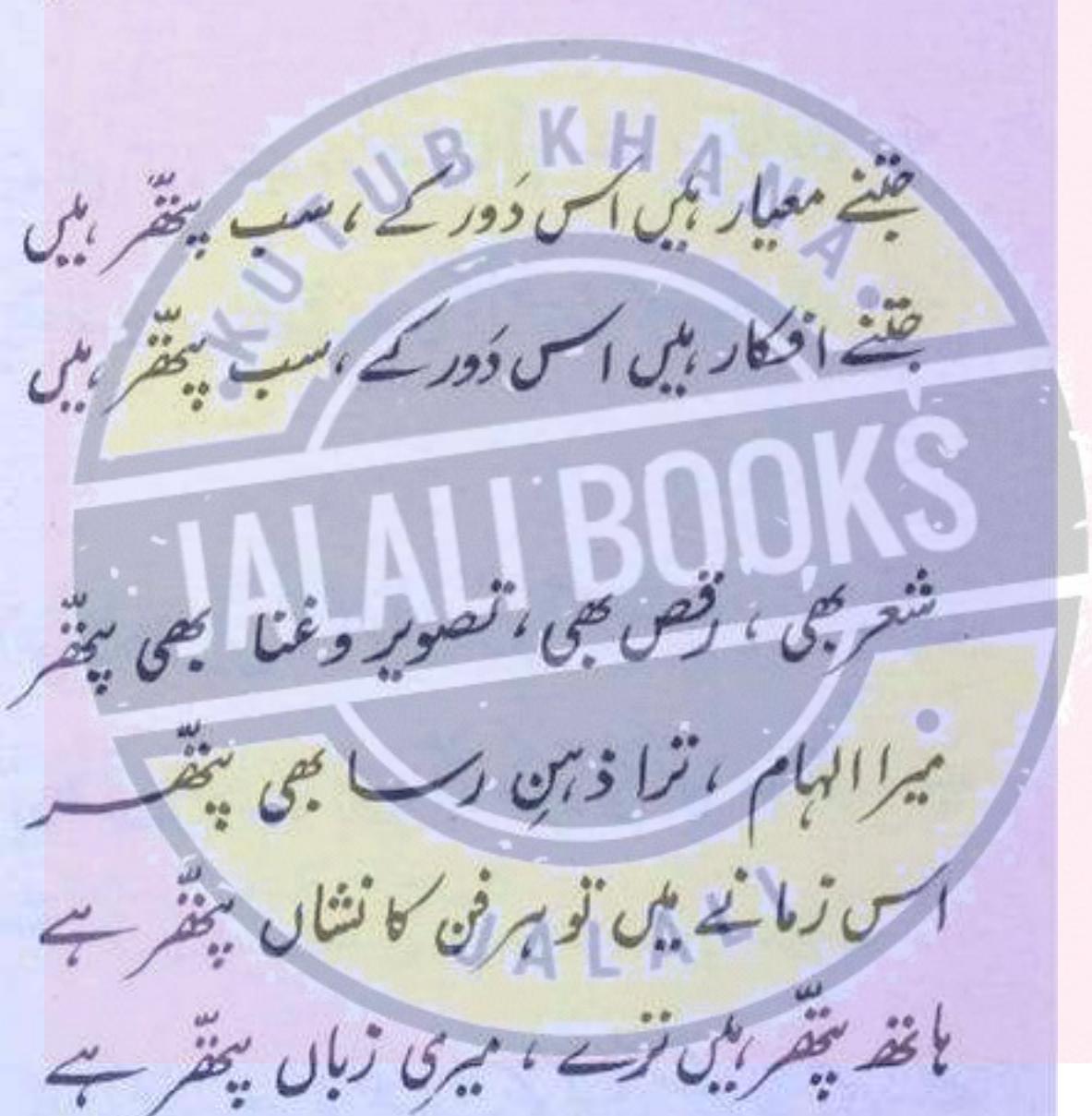
اشعار

زندگی حسن ہے، رعنائی ہے، دلداری ہے
یہ حقیقت مرے خوابوں کی طرح پیاری ہے

اتنی مدّت میں تو کلیاں بھی نہیں مُرجھائیں
اِدھر آئے ہو، اُدھر کوُچ کی تیاری ہے

شب کٹی ہے تو سحر کو کوئی سوُرج بھی ملے
کتنے برسوں سے گجردم کا سماں طاری ہے

نومبر
۱۹۶۳ء

معیار

شاعر اب تک تو یہ کہتا تھا، کہ میرا محبوب
کچھ اس انداز سے چپ چاپ مرے پاس آیا
جیسے پھولوں پہ اُترتی ہے سُبک پا شبنم
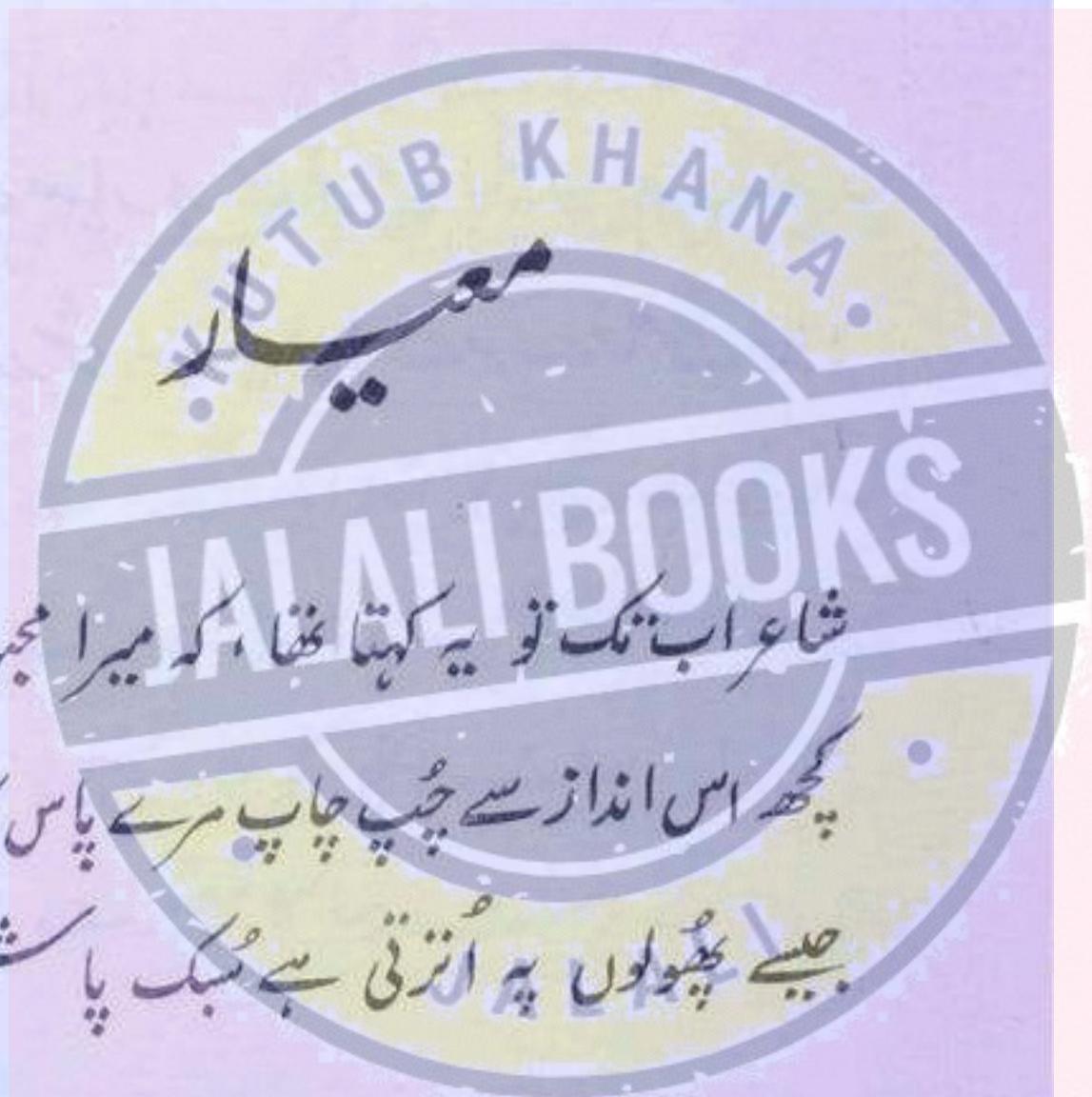
لیکن اس دَور کو، کیا جانیے، کیا روگ لگا
اب تو محبوب کی آمد بھی نہیں حشر سے کم
ایک اِک سانس میں ہیں کتنے چھناکے برپا

اب تو مس کرتی ہے جب اوس، عذارِ گل سے
ایسی آواز سے گونج اٹھتی ہے گلشن کی فضا
جیسے جلتے ہوئے جنگل پہ برس جائے گھٹا

فن کے معیار بدلتے تو ہیں، لیکن اب کے
اس قدر شور ہے کیوں! اے مرے خاموش خدا!

نومبر ۱۹۶۳ء

دُوسرا رُخ

جھونکا گلی کے موڑ سے نِکلا، تو دفعتہً
پیپل کی ایک شاخ کے پتّے اُلٹ گئے
پتّوں کو سامنے سے تو دیکھا ہزار بار
لیکن اِس انقلاب کی مجھ کو خبر نہ تھی

اِک رُخ سے دیکھیے تو فقط ایک رنگ ہے
لیکن اِک اور رنگ بھی ہے ماورائے رنگ
جس کا سُراغ صِرف انھی کو مِلا، جنھیں
موجِ ہَوا کے دستِ رسا کا شعور ہے

انسان ہو، خدا ہو، حقیقت ہو یا گماں
محسوس ہو رہا ہے کہ اِک رُخ پہ ہیں رواں
لیکن ہَوا کی زد میں جب آتی ہے اُن کی ذات
اک اور رُخ پہ گھومنے لگتی ہے کائنات

اپریل ۱۹۶۳ء

ہوا

ہوا کی بات سُنائی نہ دے سکی سب کو
کسے خبر کہ یہ درماندۂ بساطِ حیات
جو دشت گرد بھی ہے اور چمن نورد بھی ہے
کہاں سے چل کے — کدھر سے گزر کے آئی ہے
قبا میں کتنے زمانے سمیٹ لائی ہے

ہوا کی بات سُنائی تو دے — مگر احباب
کہاں سے لائیں وہ لمحے جو گزریں ختم ختم کر
کہ لمحے، تنکے ہیں سیلِ ہوا میں اُلجھے ہُوئے
اگر یہ سیل کسی غار میں اُتر جائے
تو لمحہ لمحہ بکھر جائے، وقت مر جائے

فروری ۱۹۶۳ء

دشتِ وفا

انتساب

اِک کُشتۂ غم پہ مہرباں ہو
تم کتنے عجیب حکمراں ہو

تم حُسن کا نقشِ جاوداں ہو
تم میری وفا کا امتحاں ہو
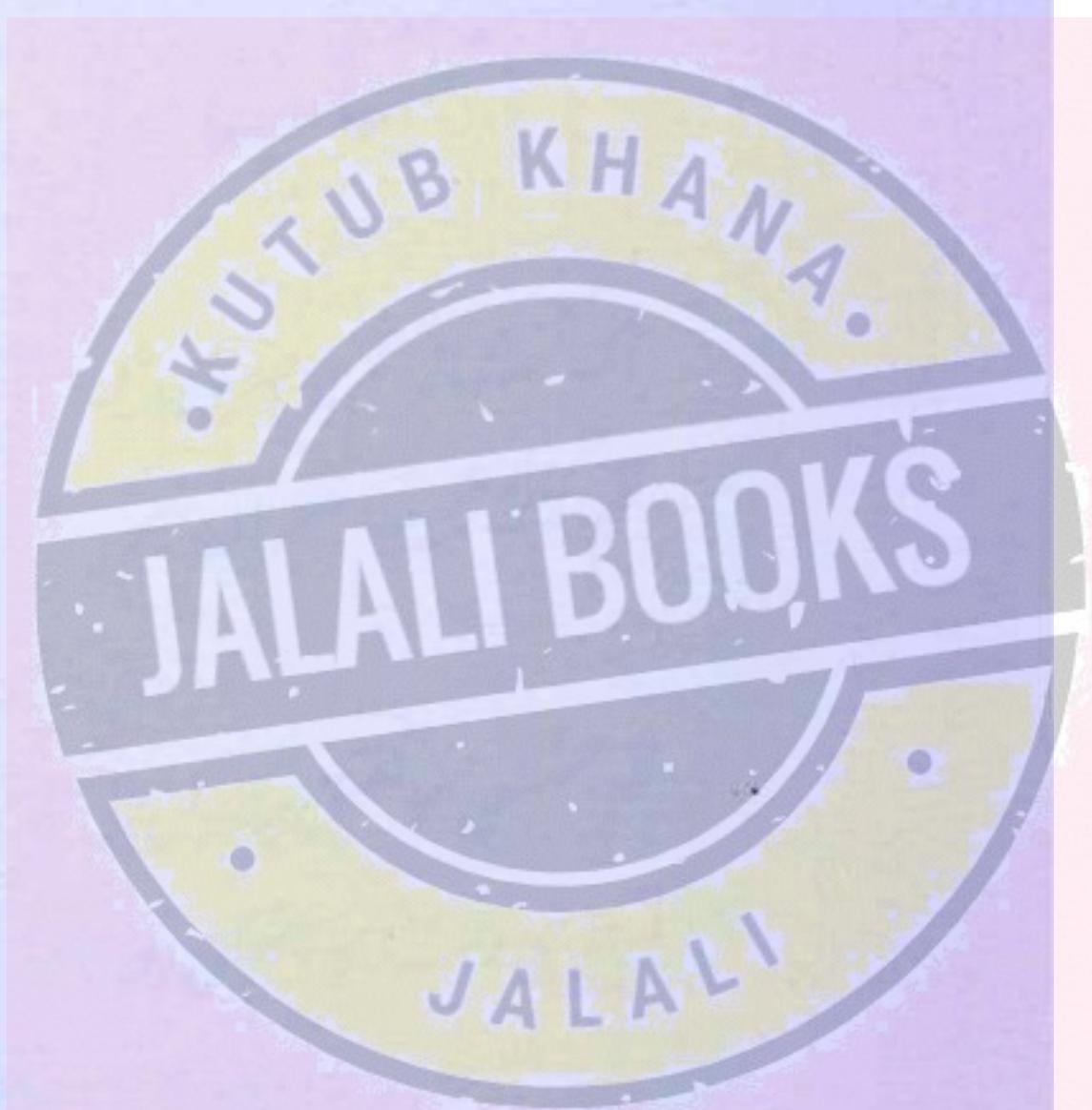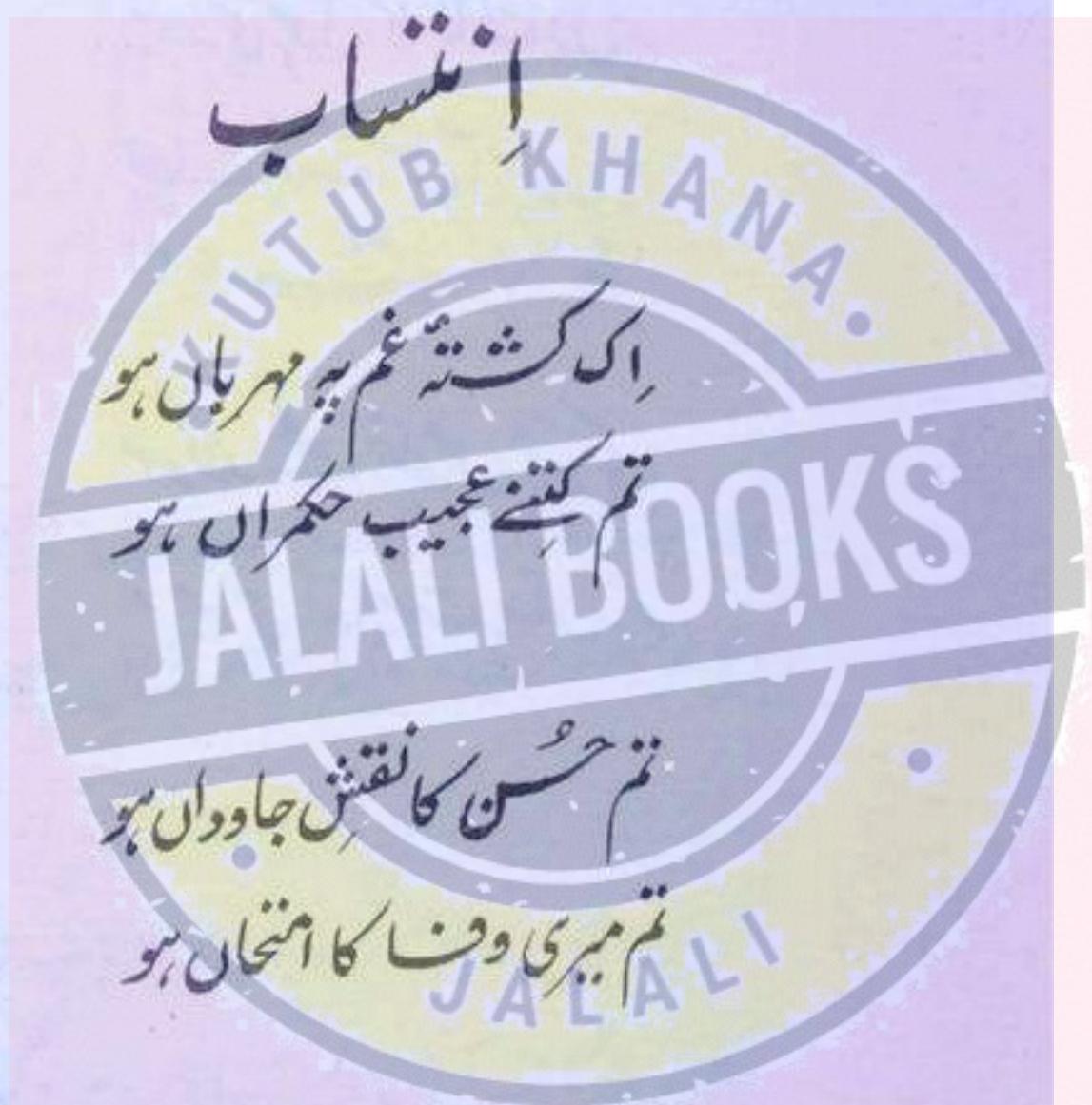
تم میرے یقیں ہو یا گُماں ہو
میرے ہو، مگر مرے کہاں ہو

ہو لالۂ دشتِ نارسائی
لیکن مرے خون میں رواں ہو

برسوں کی جُدائی کی قسم ہے
تم وقت کی طرح بیکراں ہو

بِکھری ہُوئی کائناتِ دل پر
چھائے ہُوئے مثلِ آسماں ہو

سوگند مجھے خلوصِ فن کی
تم میری نفاستِ بیاں ہو

٭

دشتِ وفا

دوست کہتے ہیں ـــ "ترے دشتِ وفا میں کیسے
اِتنی خوشبو ہے، مہکتا ہو گلستاں جیسے؟"

گو بڑی چیز ہے غم خواریِ اربابِ وفا
کتنے بیگانۂ آئینِ وفا ہیں یہ لوگ

زخم در زخم محبّت کے چمن زار میں بھی
فقط اِک غنچۂ منطق کے گدا ہیں یہ لوگ
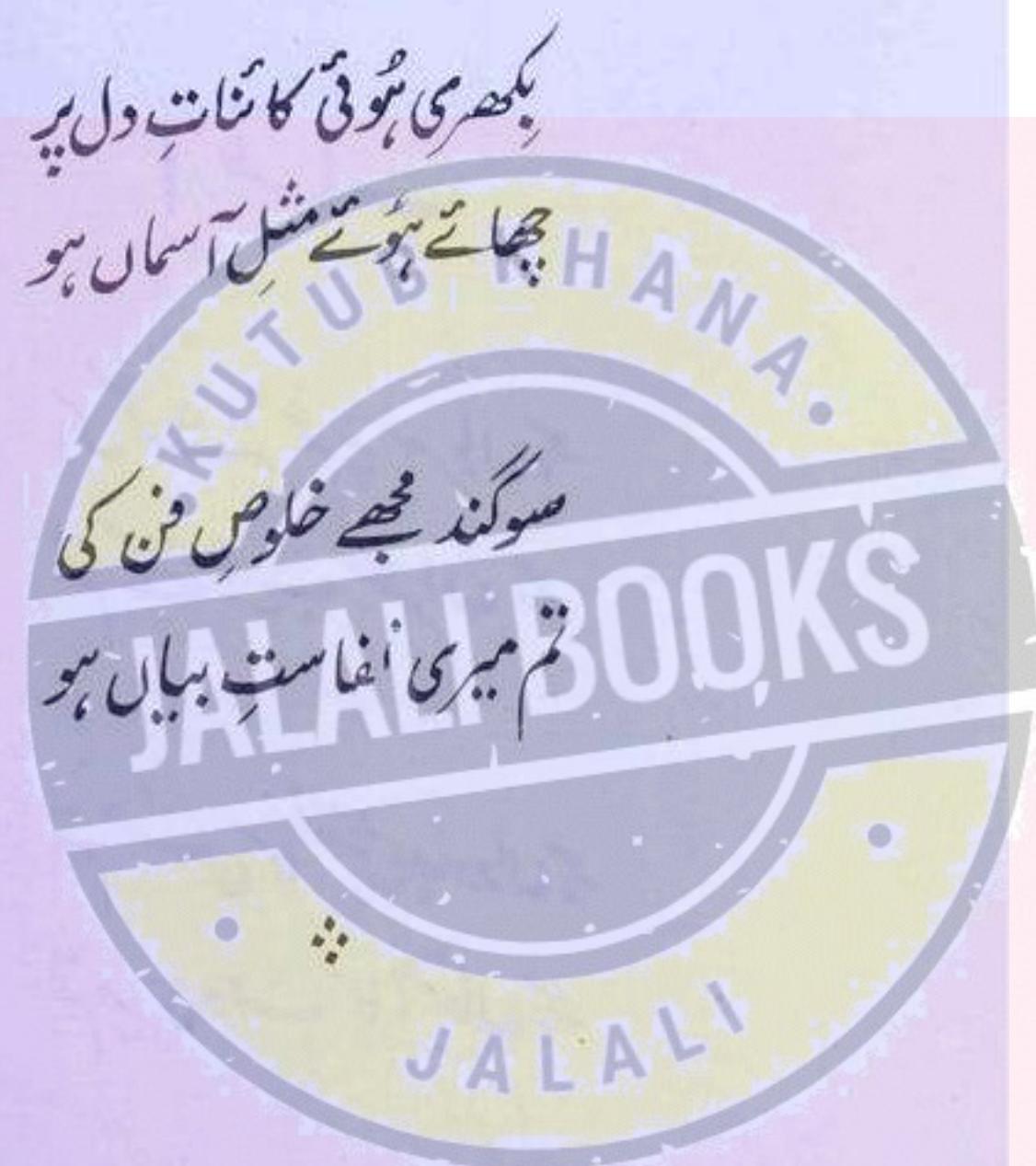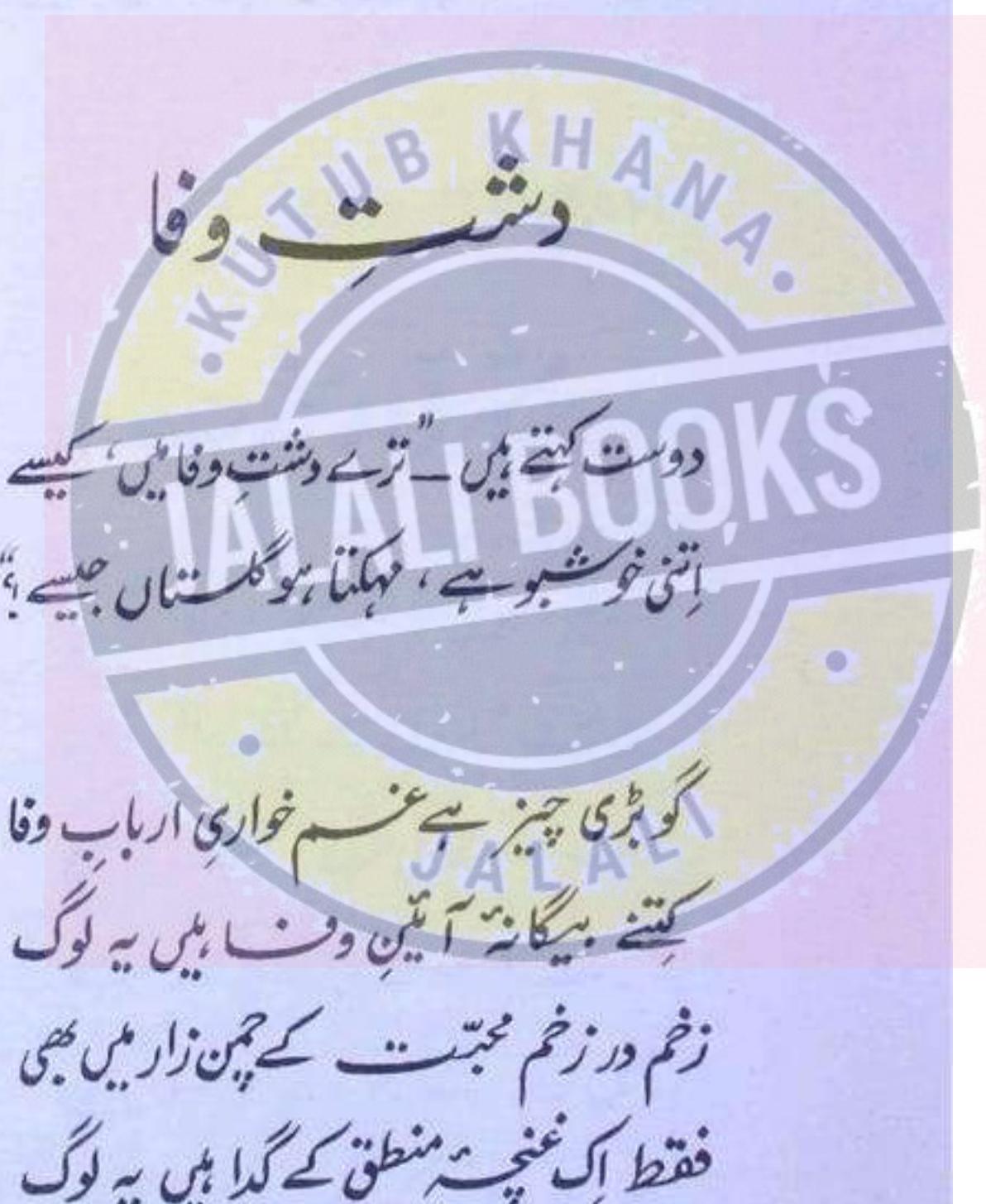
مَیں اُنھیں گلشنِ احساس دکھاؤں کیسے
جن کی پروازِ بصیرت پرِ بلبل تک ہے

وہ نہ دیکھیں گے کبھی حدِّ نظر سے آگے
اور مری حدِّ نظر، حدِّ تخیّل تک ہے

دل کے بھیدوں کو بھی منطق میں جو اُلجھاتے ہیں
یوں سمجھ لیں — کہ ببولوں میں بھی پھول آتے ہیں

دسمبر ۱۹۵۹ء

مشرق و مغرب
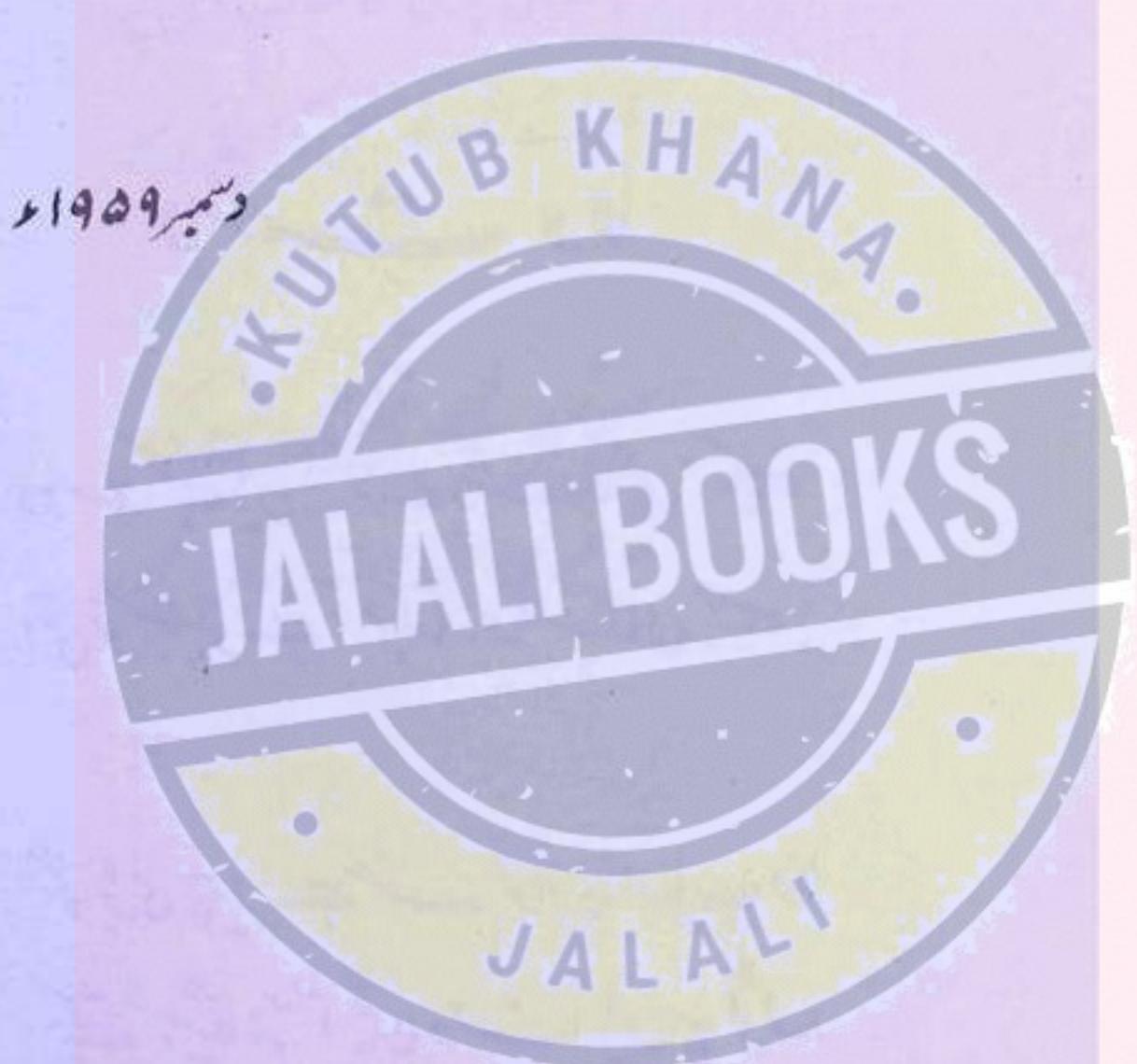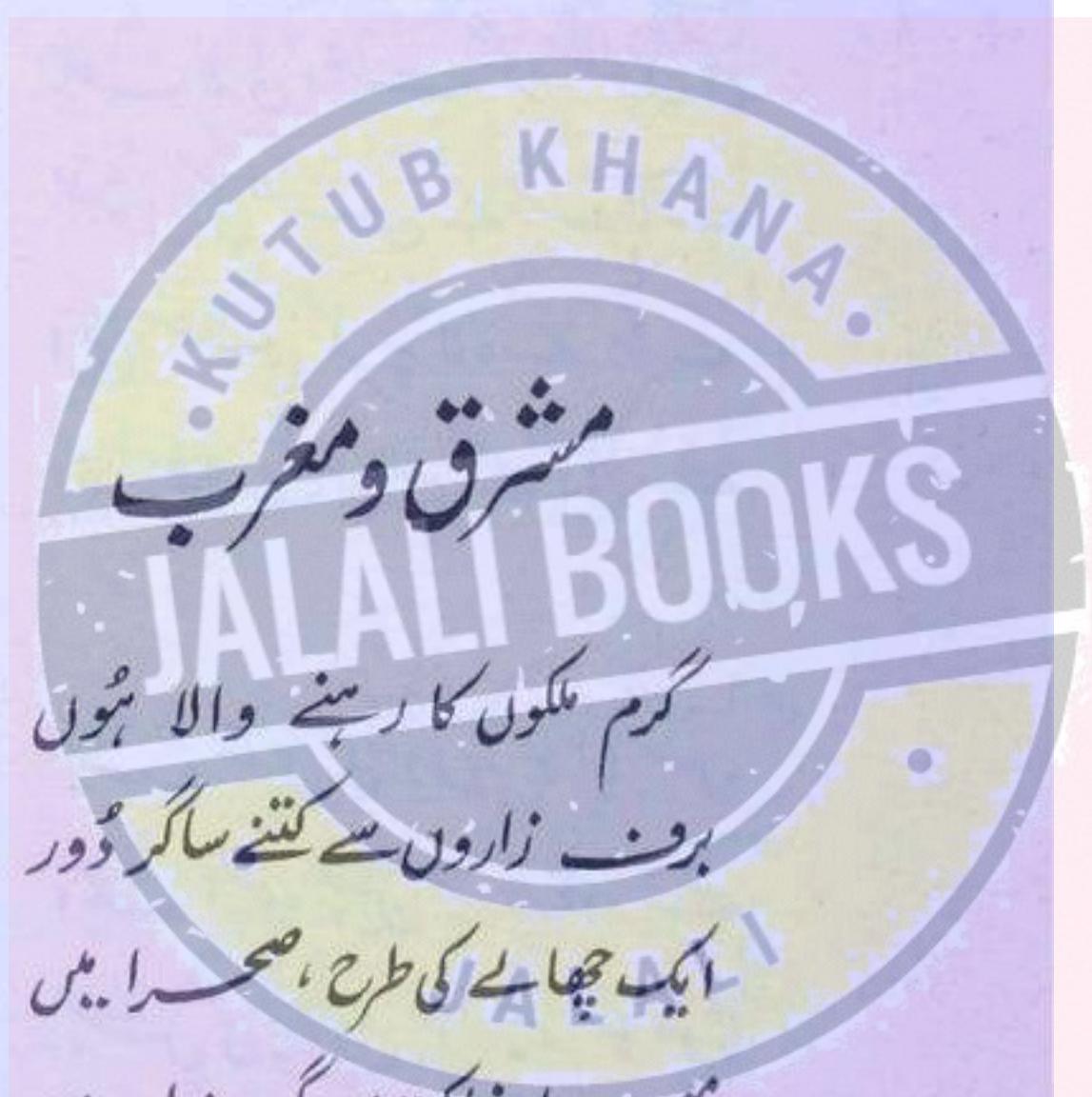
گرم ملکوں کا رہنے والا ہُوں
برف زاروں سے کتنے ساگر دُور
ایک چھالے کی طرح، صحرا میں
میرا خاکستری گھروندا ہے
جس کے چٹخے ہوئے کواڑوں میں
جس کی دہلیز کے نشیب کے پاس
فنِ تعمیر کا پُرانا بن
ایک ویرانہ بن کے بیٹھا ہے

چاندنی رات سرد ملکوں کی
نیلی برفوں میں منعکس ہو کر
اپنی کرنوں کی جھالروں میں چھپی
ایک رُومان بن کے آتی ہے

چاندنی رات گرم ملکوں کی
محنتوں کی تھکن کے سنّاٹے
اپنی ننگی کمر پہ لادے ہُوئے
ایک طوفان بن کے آتی ہے

سرد ملکوں کی دوپہر کا لباس
ایک ایسی مہین چادر ہے
جس کی پرتوں میں جسم کا سونا
قمقمے بن کے مُسکراتا ہے
—— اور اپنا لباس عریانی
جس پہ سُورج، شعاعوں کے کوڑے
اس قدر طیش سے لگاتا ہے
راکھ کا ڈھیر چھوڑ جاتا ہے

گرم ملکوں میں حسن کی قدریں
کتنی اندھی، قدیم صدیوں سے
آگ بھڑکا کے اپنے پیکر کی
اپنے ہی گیسوؤں کا بن کے دُھواں
زندگی کے اداس آنگن میں
اک الاؤ لگائے بیٹھی ہیں
اور اس گردبادِ آتش میں
جل رہی ہیں گلاب کی کلیاں

گرم ملکوں کے عشق پیشہ جواں
دُھوپ کی چلچلاتی نگری میں
ہل چلاتے ہیں، بیج بوتے ہیں
اور پھر عاقبت کو روتے ہیں
ان کی محنت پہ وجد کرتے ہُوئے
موتیوں سے لدے ہُوئے خوشے
جتنے بھرپُور ہوتے جاتے ہیں
اتنے ہی دُور ہوتے جاتے ہیں

سرد ملکوں میں حُسن و عشق کی رَو
زندگی سے قدم ملائے ہُوئے
آسماں کی طرح، فضا کی طرح
روز و شب پر محیط رہتی ہے
گھر ہیں، معبد ہیں، یا سرِ راہے
ہر طرف، ہر مقام پر، ہر وقت
جب بھی حُسن اور عشق مِلتے ہیں
گرم بوسوں کے پھُول کھِلتے ہیں

سرد ملکوں میں کِتنی گرمی ہے
جسم کی، رُوح کی، خیالوں کی
گرم ملکوں پہ سرد و مُردہ سکوت
ایک آسیب بن کے طاری ہے
سرد ملکوں میں زندگی کا شعور
ایک ذرّے کو بھی سنوارتا ہے
گرم ملکوں میں موت کا احساس
ٹھوکریں زندگی کو مارتا ہے

سرد ملکوں کے رہنے والے دوست
مَیں کھنڈر کے ستون کی مانند
سوچتا ہُوں — کہ اس خرابے میں
مَیں اگر بس وہی ہُوں جو کچھ ہُوں
مَیں اگر ولولوں کا ملبہ ہُوں
مَیں اگر حوصلوں کا مرقد ہُوں
میرے جینے کا پھر جواز ہے کیا
آخر اس بے بسی کا راز ہے کیا

سوچتا ہُوں — (مَیں سوچ لیتا ہُوں)
چاند جو میرے گھر میں نکلا ہے
تیرے ایوان میں بھی جھانکے گا
جس زمیں پر میں ایستادہ ہُوں
نیلے نیلے سمندروں کے تلے
دبتی، اُٹھتی، لچکتی جاتی ہے
اور بن کر ترے وطن کی زمیں
تیرے قدموں کو تھپتھپاتی ہے

سوچتا ہُوں — کہ میری حالتِ زار
کیا فقط رنگ کی شرارت ہے
کیا فقط اس لیے حقیر ہُوں مَیں
کہ یہاں دُھوپ چلچلاتی ہے
کیا فقط اس لیے عظیم ہے تُو
کہ تری کھڑکیوں کے شیشوں سے
جب کرن آفتاب کی جھانکے
برف اس کی ہنسی اُڑاتی ہے؟

رنگ اور رُت نہیں مدارِ حیات
رنگ سُورج کا ایک زاویہ ہے
رُت فقط ایک رُخ ہے دھرتی کا
میرے چہرے کا رنگ میری دُھوپ
تیرے چہرے کا رنگ، برف تری
تو مری دُھوپ کو ترستا ہے
مَیں تری برف کے لیے بے چین
دو مسافر ہیں — ایک رستہ ہے

(نامکمل)
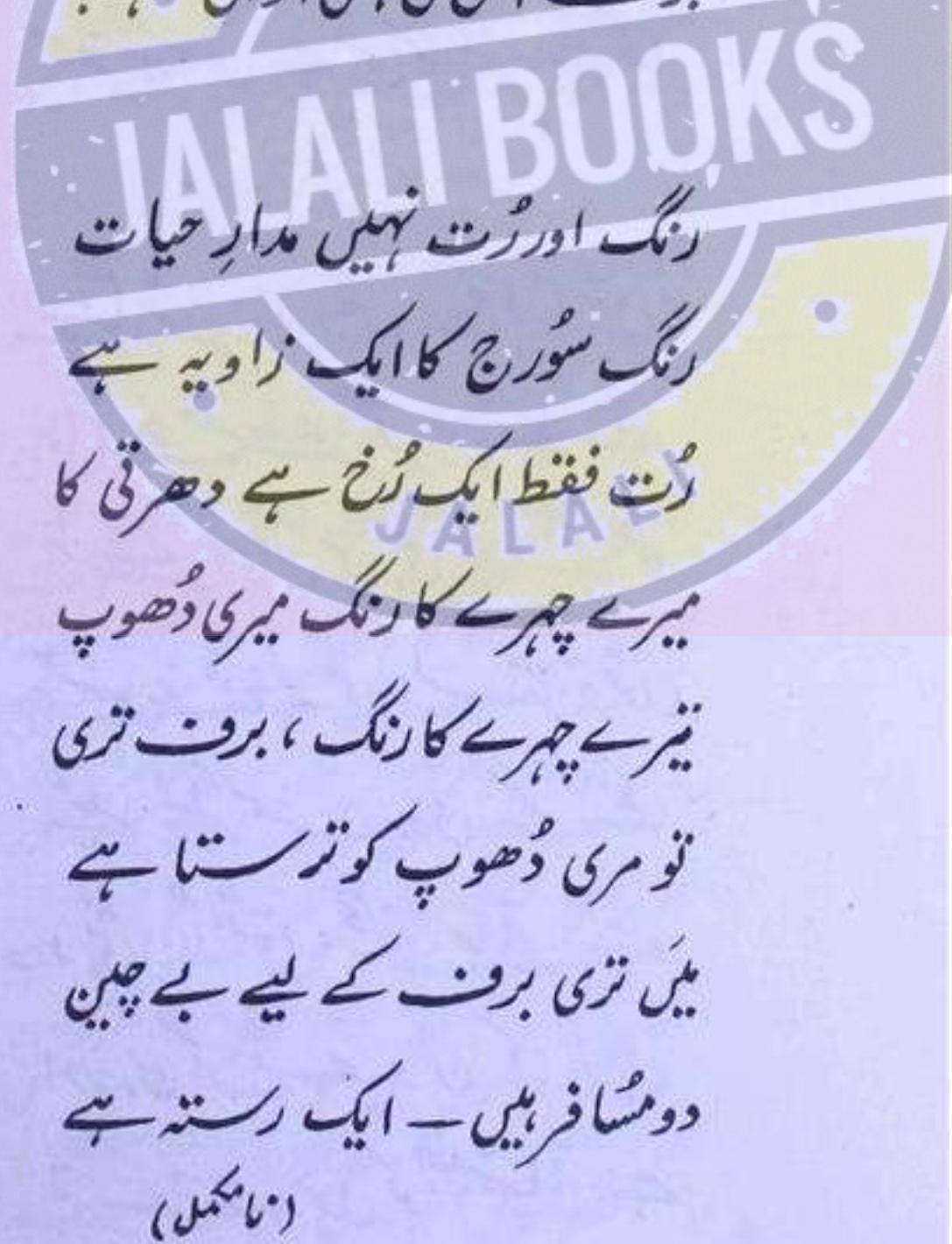
ہجر و وصال

شب، ترے جسم کو چھُو کر مجھے محسوس ہُوا

دل کے جنگل میں نہ پہنچے گی ترے لمس کی آگ

نہ وہ لرزش تھی بدن میں، نہ لہو میں دم تھا

تیری نبضیں تھیں کہ اک سلسلۂ ماتم تھا

وقت نے لُوٹ لیا تھا ترے پیکر کا سہاگ

اب کہ تو شب کی طرح میری رسائی میں نہیں

میری رگ رگ میں ترے لمس کے شعلے ہیں رواں

میرے ہاتھوں کی یہ پوریں ہیں کہ شمعوں کی لویں

میرے ہونٹوں میں تپاں ہیں تری سانسوں کی رویں

میری آنکھوں میں بسا ہے تری زُلفوں کا دُھواں

جانے یہ کون سی منزل ہے تری چاہت کی
تیرے ملتے ہی بدل جاتا ہے معیارِ جمال
تیرے چھنتے ہی مرا عشق جواں ہوتا ہے
رات پر بھی تری آنکھوں کا گماں ہوتا ہے
یہ فراقِ تن و جاں ہے کہ غبارِ مہ و سال

جولائی ۱۹۶۲ء
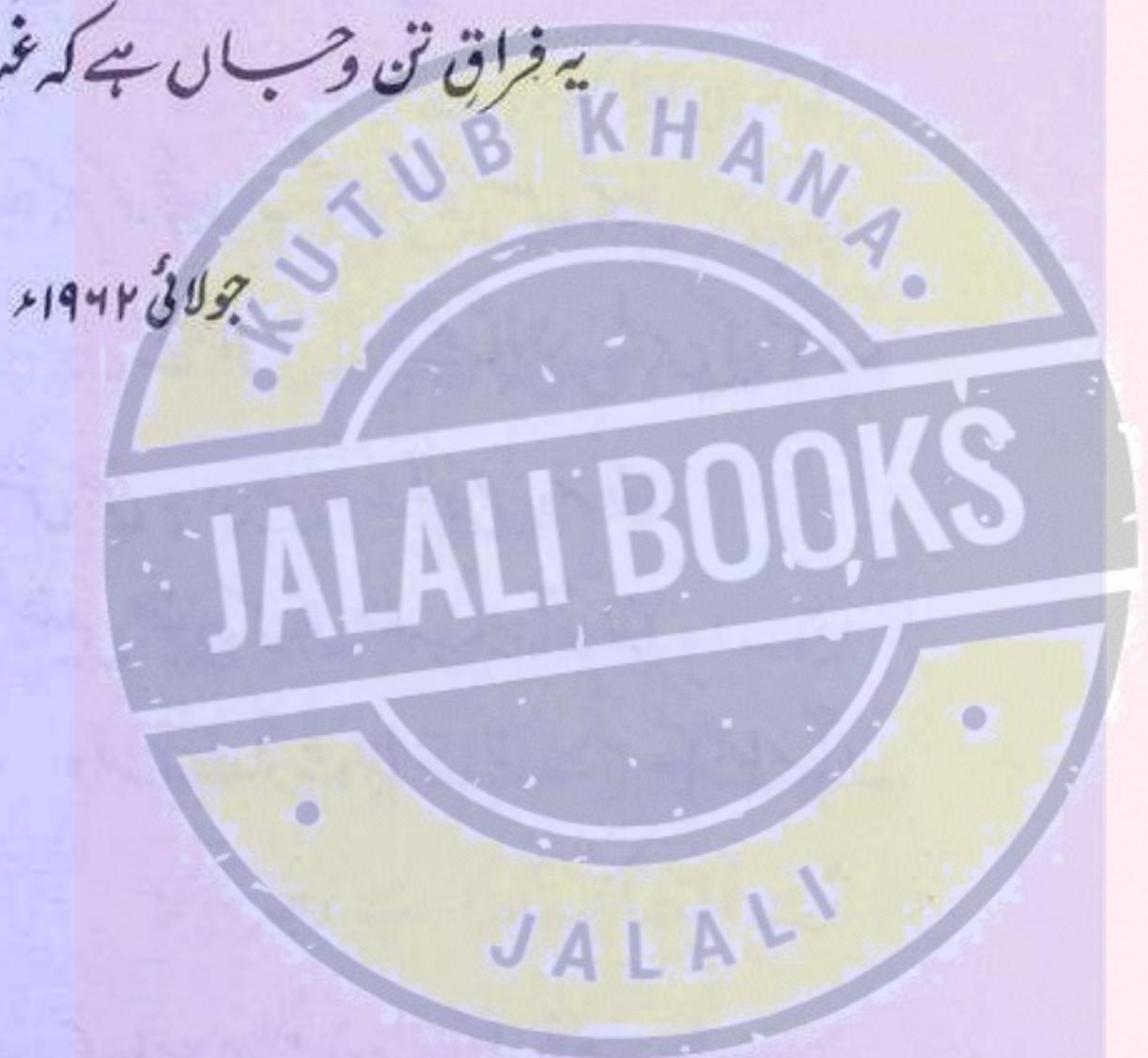
جواز

عِلم بڑھتا ہے تو بڑھ جاتی ہے ہر چیز کی پیاس
پیاس ہے اصل میں تاریکیِ دوراں کا چراغ
ہے اسی پیاس پہ شادابیِ عالم کی اساس
جتنا ویراں ہو شکم، اتنا مہکتا ہے دماغ
کِس قدر پھُول کھِلے ہیں سرِ راہِ افلاس
بدلا بدلا نظر آتا ہے نظامِ کونین
جیسے انسان ہوں مسرور، فرشتے ہوں اداس
علم بڑھتا ہے تو بڑھ جاتی ہے ہر چیز کی پیاس

اب یہ عالم ہے کہ تنہائیِ شب میں اکثر
کبریائی کی بھی سُنتا ہوں صدائے انفاس

میری وحشت سے ڈریں دہر کے وہ علم فروش

ہر حقیقت کو جو کر لیتے ہیں پابندِ لباس

علم بڑھتا ہے تو بڑھ جاتی ہے ہر چیز کی پیاس

اب تو ہر درد کا درماں ہے نئے درد کی ٹیس

اب تو ہر زخم کسی زخم کا ہے درد شناس

اب تو کہلاتا ہوں میں مملکتِ دل کا رئیس

جام خالی ہے مگر دولتِ احساس ہے پاس

رہ گئی تشنگیِ لب، تو حقیقت یہ ہے!

علم بڑھتا ہے تو بڑھ جاتی ہے ہر چیز کی پیاس

مئی ۱۹۶۲ء
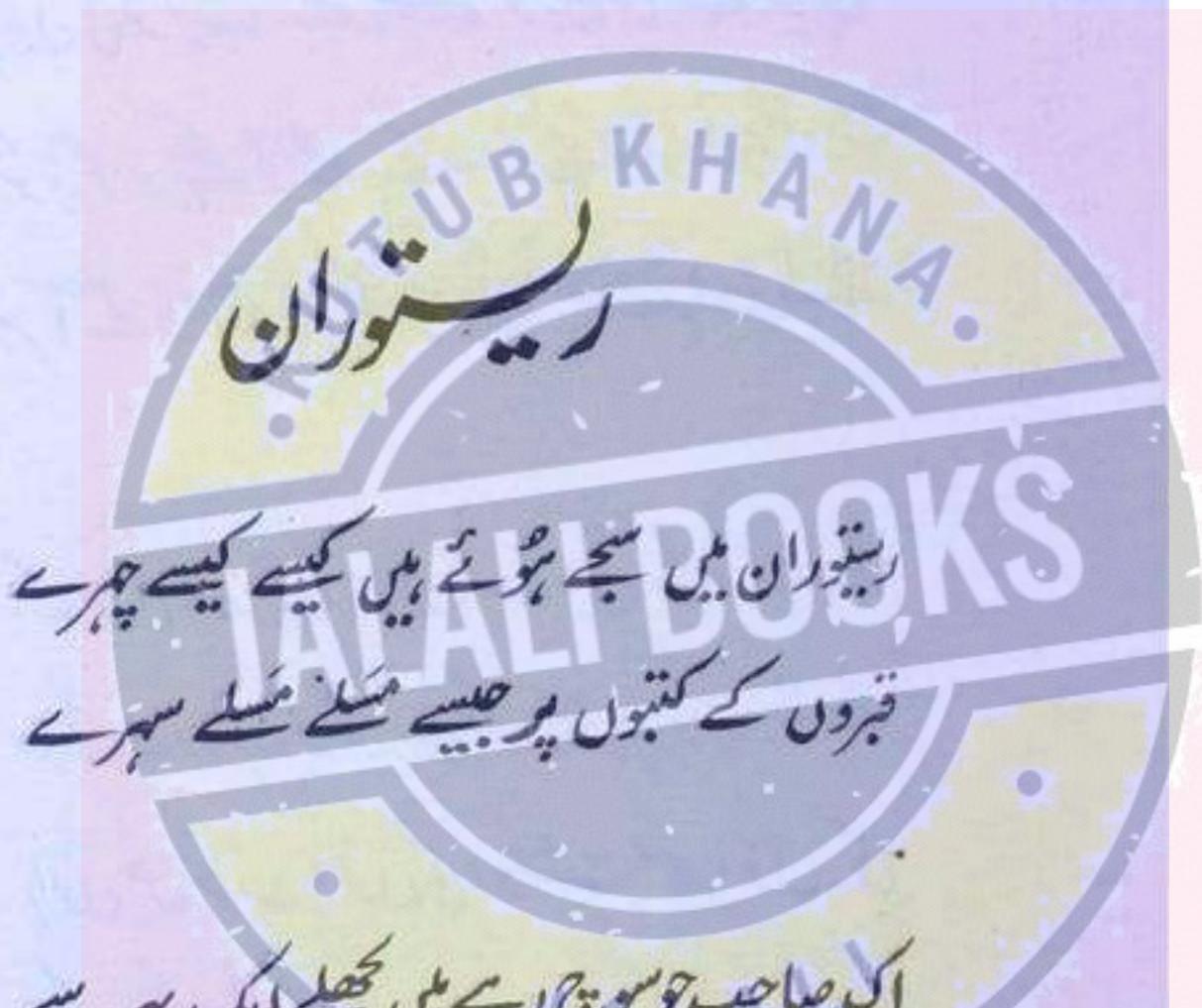
ریستوران

ریستوران میں سجے ہوئے ہیں کیسے کیسے چہرے
قبروں کے کتبوں پر جیسے مسلے مسلے سہرے

اِک صاحب جو سوچ رہے ہیں پچھلے ایک پہر سے
یُوں لگتے ہیں جیسے بچّہ رُوٹھ آیا ہو گھر سے
کافی کی پیالی کو لبوں تک لائیں تو کیسے لائیں
بیرے تک سے آنکھ ملا کر بات نہ جو کر پائیں

کِتنی سنجیدہ بیٹھی ہے یہ احباب کی ٹولی
کِتنے اوجِ بلاغت پر ہے خاموشی کی بولی

ساری قوّت چوس چکی دن بھر کی شہر نوردی
ماتھوں میں سے جھانک رہی ہے مرتی دھوپ کی زردی

لمبی لمبی پلکیں جھپکے اک شرمیلی بی بی
بالوں کی ترتیب سے جھلکے ذہن کی بے ترتیبی
شوہر کو دیکھے تو لجائے — لاج کو اوٹ بنائے
ہر آنے والے پر اِک بھرپور نظر دوڑائے

اک لڑکی اور تین جوان آئے ہیں کسے کسائے
سانولے روپ کو گورے ملکوں کا بہروپ بنائے
باتوں میں نخوت باغوں کی، وحشت صحراؤں کی
آنکھوں بیچ چولھوں میں بھری ہے راکھ تمنّاؤں کی

اپنی اپنی اُلجھن سب کی، اپنی اپنی رائے
سب نے آنسو روک رکھے ہیں کون کسے بہلائے
ہر شے پر شک ہو تو جینا ایک سزا بن جائے
محور ہی موجود نہ ہو تو گردش کس کام آئے

قہقہے، جیسے خالی برتن لڑھک لڑھک کر ٹوٹیں
بحثیں، جیسے ہونٹوں میں سے خون کے چھینٹے چھوٹیں

حسن کا ذکر کریں یوں، جیسے آندھی پھول کھلائے
فن کی بات کریں یوں، جیسے بنیا شعر سنائے

سکڑی سمٹی رُوحیں، لیکن جسم ہیں دوہرے تہرے
ریستوران میں سجے ہوئے ہیں کیسے کیسے چہرے

مئی ۱۹۶۲ء

طوائف

صدیوں پہلے کا ذکر ہے، جب لوگ
خوف کو دیوتا سمجھتے تھے
سُرخ کوندوں، سیہ گھٹاؤں کو
چیختی، پیٹتی ہواؤں کو
اپنے اپنے خُدا سمجھتے تھے
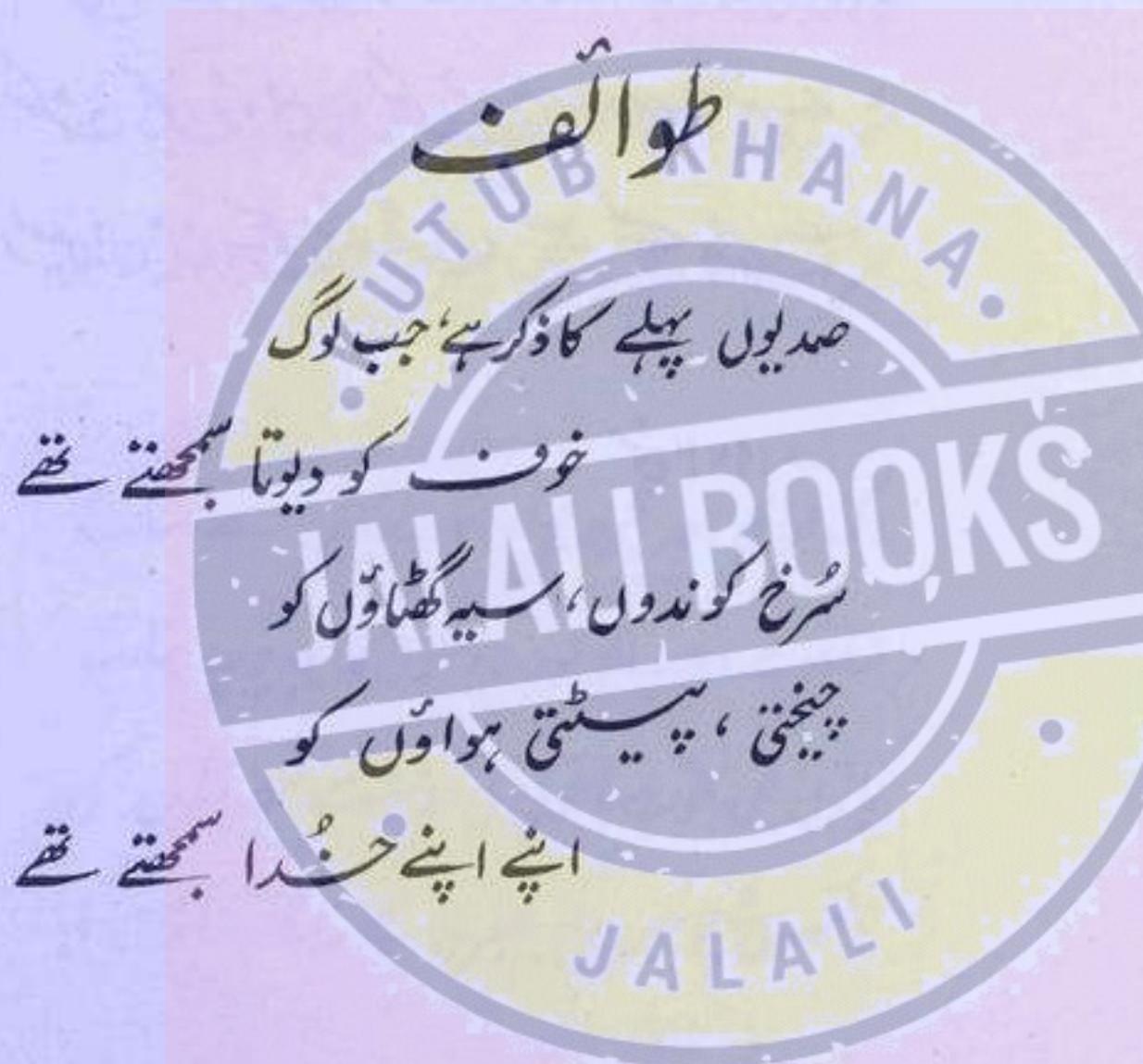
قصرِ شاہی سے ایک شہزادی
بُت کدے کی طرف روانہ ہُوئی
پتلیوں میں جواں لہو کی چمک
اور اچھوتے لبوں میں رس کی دمک
رُت بدلنے کا اِک بہانہ ہُوئی

دیوتاؤں کے پاؤں پر اُس نے

خُون چھڑکا بھری جوانی کا

جذبے معصُوم، تجربے کم سِن

رُوح تِلملا کے رہ گئی، لیکن

جِسم آغاز تھا کہانی کا

اِک پجاری نے اس کا دشتِ بدن

چھُو کے دیکھا تو غنچے کھِلنے لگے

کونپلوں میں نمو کا رس مچلا

جسم کا جذبۂ ہوس مچلا

ابر اُمڈے، پہاڑ ہِلنے لگے
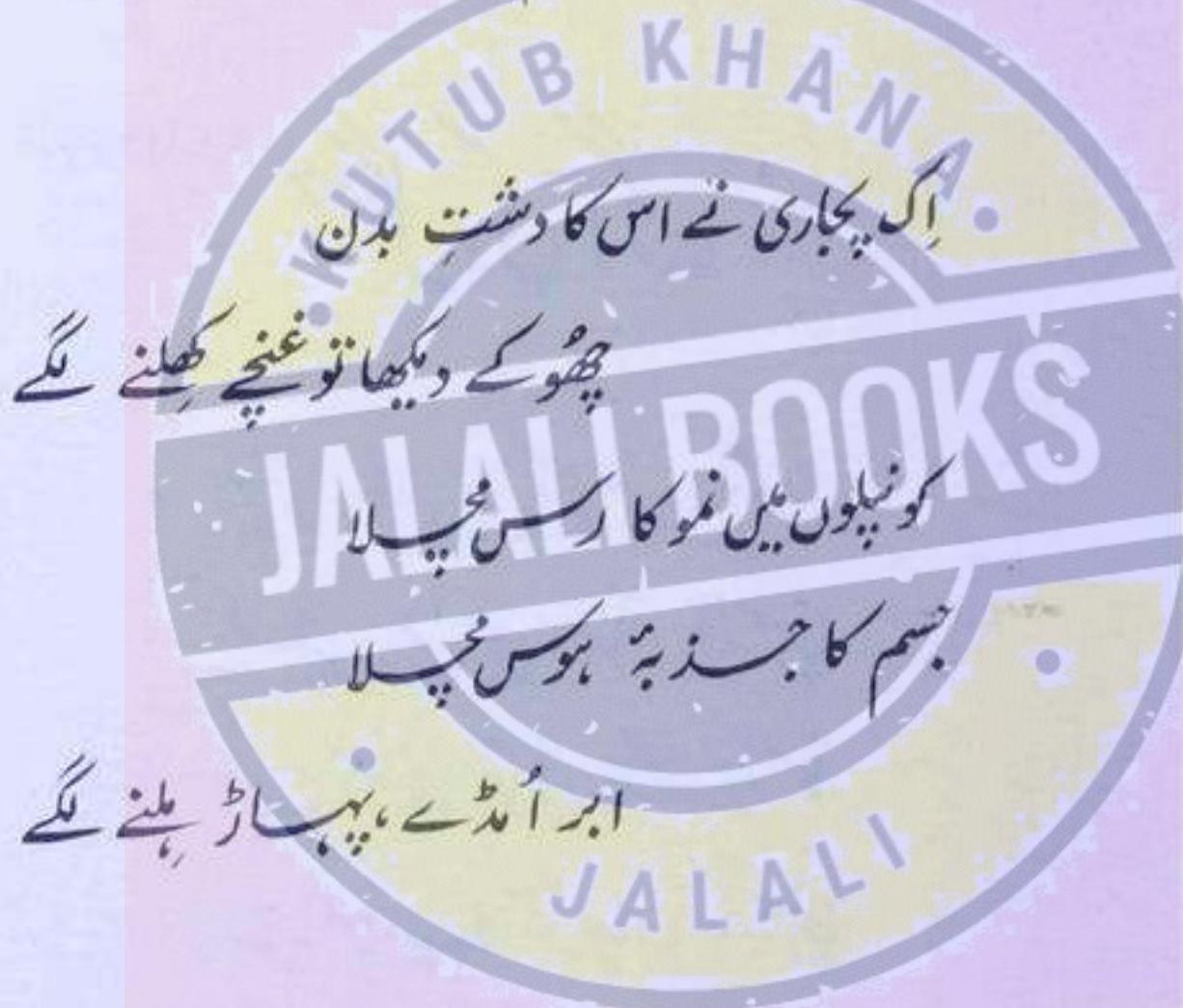
کل کی اِک سربلند شہزادی

آج سب کی نظر میں ہیٹی ہے

یُوں تو بن ٹھن کے آئی ہے سرِ بام

اور "بنت الہوا" ہے اس کا نام

کپنخنی دیوتا کی بیٹی ہے

مئی ۱۹۶۲ء

جنگل کی آگ

آگ جنگل میں لگی تھی ، لیکن
بستیوں میں بھی دھواں جا پہنچا
ایک اُڑتی ہوئی چنگاری کا
سایہ پھیلا تو کہاں جا پہنچا
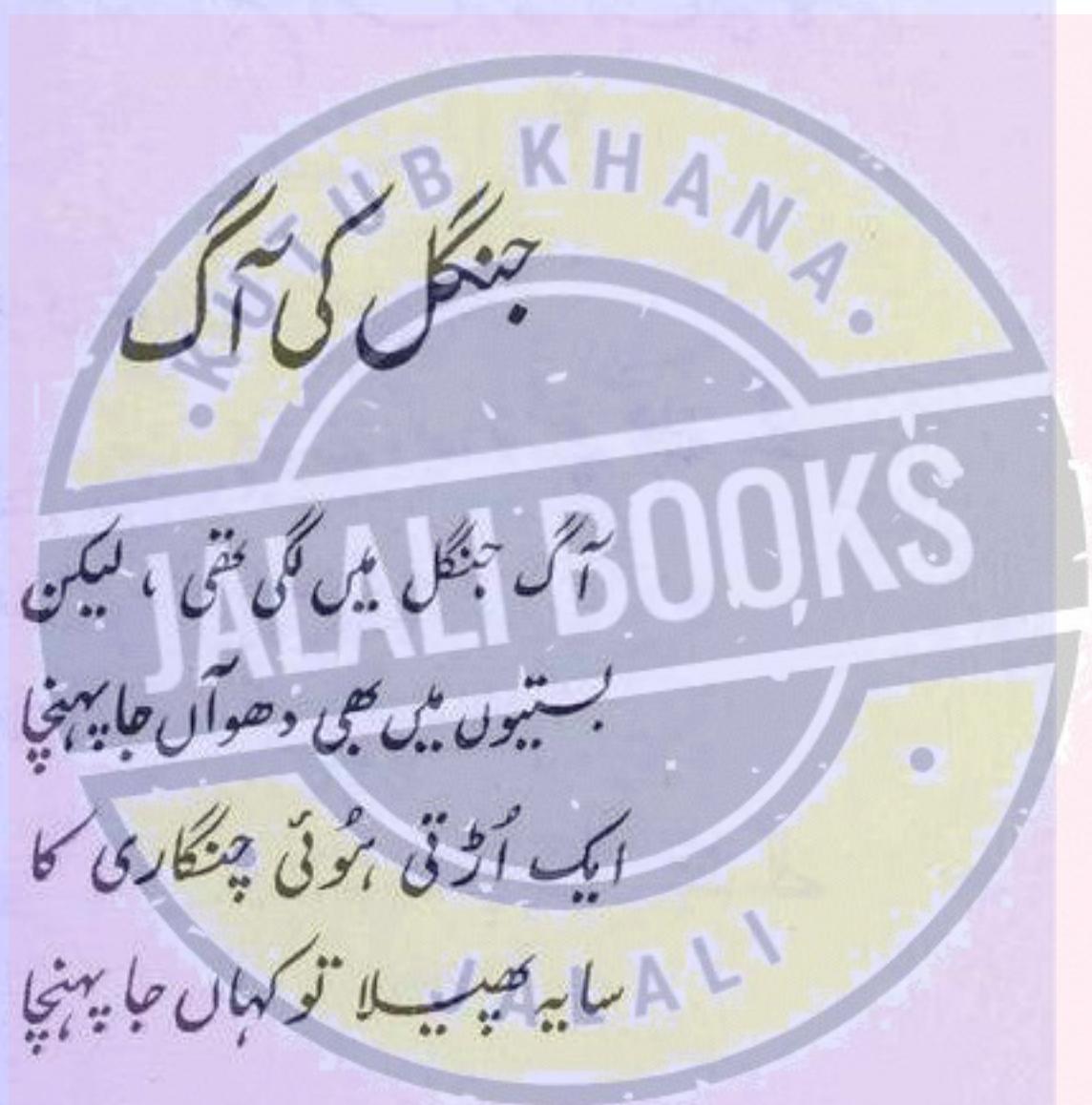
تنگ گلیوں میں اُمڈتے ہوئے لوگ
گو بچا لائے ہیں جانیں اپنی
اپنے سر پر ہیں جنازے اپنے
اپنے ہاتھوں میں زبانیں اپنی

آگ جب تک نہ بجھے جنگل کی
بستیوں تک کوئی جاتا ہی نہیں
حُسنِ اشجار کے متوالوں کو
حُسنِ انساں نظر آتا ہی نہیں

فروری ۱۹۶۲ء
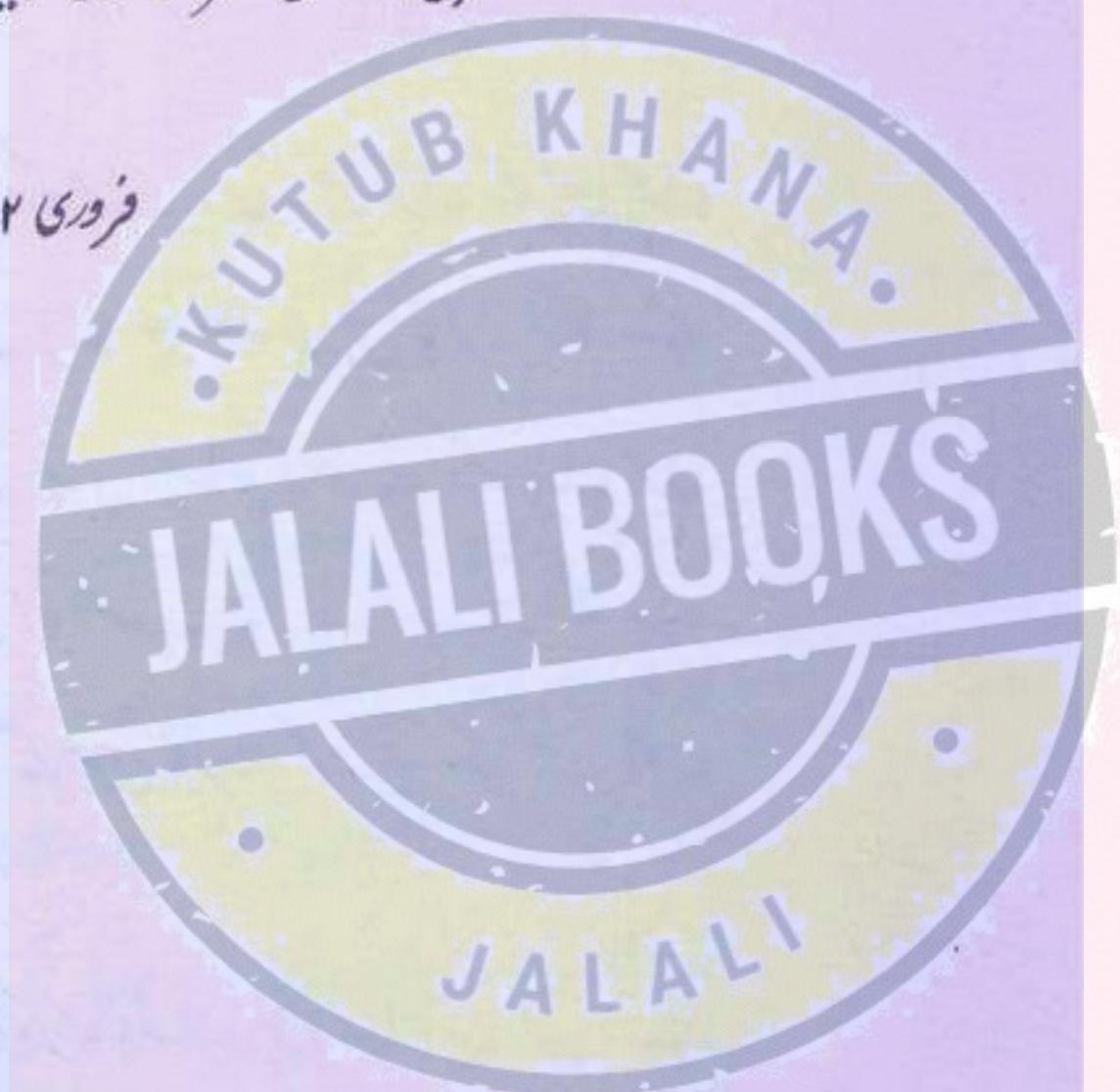
سوداگریِ حُسنِ سخن

آنکھوں کے سمندر ہوں کہ ہونٹوں کے چمن ہوں
ہر چیز کا ہر شہر میں بازار لگا ہے
مرمر کے ہوں اجسام کہ سونے کے بدن ہوں
ہر جنس کا ہر موڑ پہ انبار لگا ہے
صندل کے ہوں تابُوت کہ ریشم کے کفن ہوں

اس دور کا انسان بڑا صاحبِ فن ہے
اے صاحبِ فن، شعر پہ اُچٹی سی نظر کیوں
یہ فن بھی تو سوداگریِ حُسنِ سخن ہے
شاعر کی برستی ہوئی آنکھوں سے حذر کیوں
آنسُو فقط آنسُو ہی نہیں، دُرِّ عدن ہے

جنوری ۱۹۶۲ء

کون سُنے

فرازِ دار سے تا پستیٔ حفاظتِ ذات
کوئی نہیں کہ جو احساس کی صدا سُن لے
اسی لیے تو ہر انساں کے لب پہ ہے یہ دُعا
'خدا کرے مری بپتا مرا خدا سُن لے'
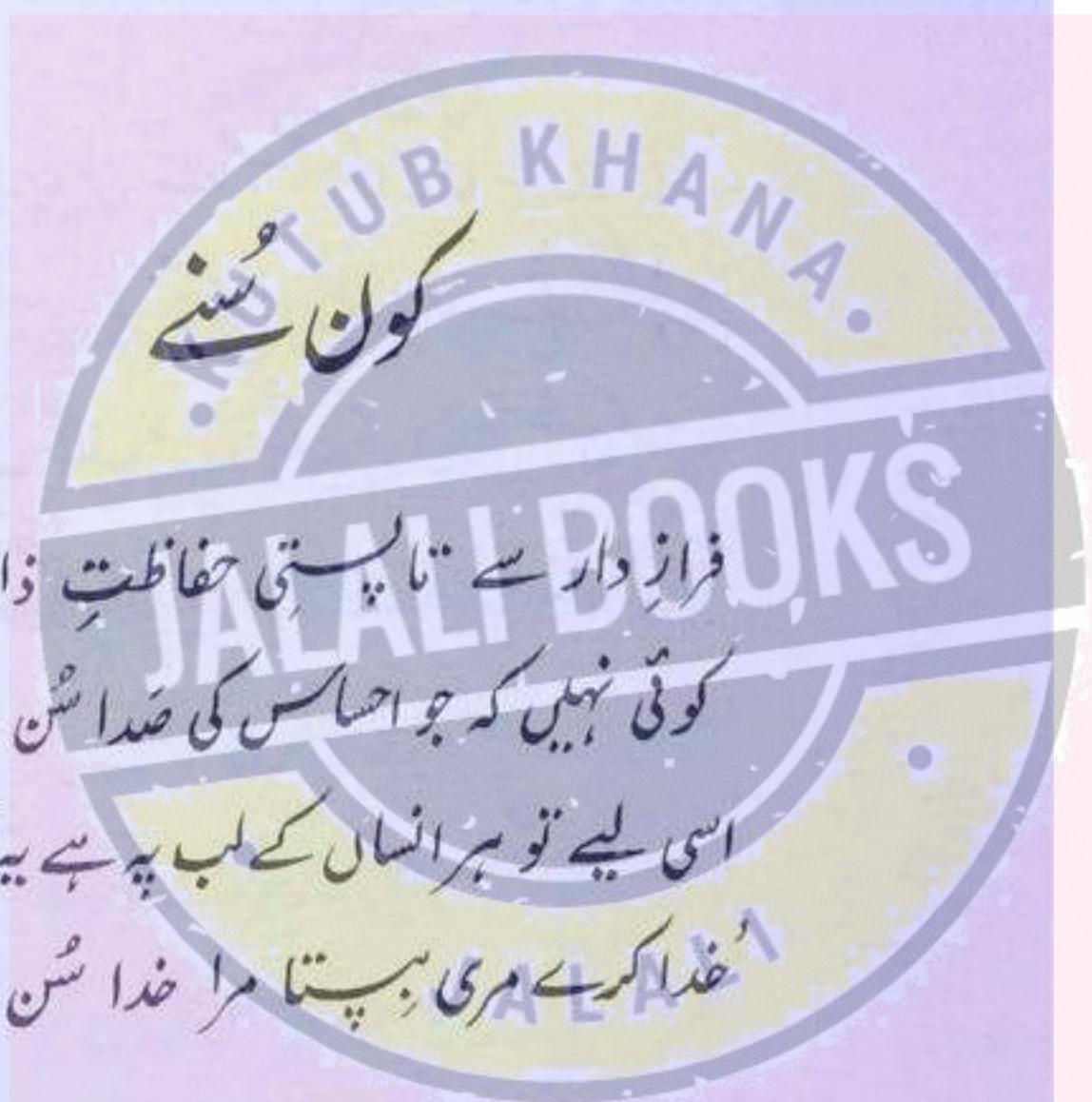
مطالبہ ہے یہ ہم عصر حق پرستوں کا
فضا میں چیخ سنائی بھی دے، دکھائی بھی دے
یقیں سے کون کہے، نغمے ہیں کہ فریادیں
افق افق اگر اک شور سا سُنائی بھی دے

بُجھی بُجھی مری آنکھیں، لُٹا لُٹا مرا رُوپ
کٹے کٹے مرے بازُو، پھٹے پھٹے مرے لب
اب اس پہ بھی اگر اظہارِ درد لازم ہے
تو کِس سے جا کے کہوں اپنی خامشی کا سبب

چٹانیں بپاس سے لٹکی ہوئی زبانیں ہیں
کوئی نہیں جو سُنے ان کا نوحہ سنگیں
وہ لوگ سنگ میں آہنگ کیوں تلاش کریں
جنھیں گِلہ ہی رہا — پھُول بولتے ہی نہیں

نومبر ۱۹۶۱ء

فنونِ لطیفہ

کلی چٹکتی ہے جیسے کماں کڑکتی ہے
لہو میں ڈوب کے کھلتے ہوئے چمن کی قسم
گلوں کے روپ میں بکھرے ہوئے ہیں تن پارے
فصیلِ رنگ ہے لاوے کی موجِ آتش بار
ہری ہری روشیں ہیں کہ زہر کے دھارے
گھرے ہیں کیسی قیامت کی فصلِ گل میں ہم
کچھ اس طرح سے ہیں گم سُم، ہرے بھرے اشجار
کھڑے ہوں اُجڑے ہوئے مندروں میں جیسے صنم
سکوت، خلوتِ کنجِ چمن میں گریاں ہے
ٹھہر گئی ہے زمیں، وقت پا بجولاں ہے
لرز رہے ہیں مگر زندگی کے لب کم کم

کوئی نہیں کہ جو فن کی گرفت میں لائے

اس ایک پل کو جو ہے خیمہ زنِ قرن بہ قرن

کوئی نہیں کہ جو چھُو لے کٹار کی سی کرن

کوئی نہیں کہ جو اپنے لہو میں کر لے ضم

اس ایک پل کو، جو اک پل بھی ہے، صدی بھی ہے

جو اہلِ رقص ہیں، شل ہو چکے ہیں ان کے قدم

جو اہلِ نَے ہیں، وہ ہیں نَے سے برسرِ پیکار

مصوّروں نے کئی رنگ گھول کر دیکھے

نہ کر سکے مگر اک چشمِ شاہکار کو نم

کچل گیا ہے چٹانوں میں دب کے سنگ تراش

اُتر گیا ہے قلم کار کے جگر میں قلم

اکتوبر ۱۹۶۱ء

رُوح لبوں تک آ کر سوچے

رُوح لبوں تک آ کر سوچے — کیسے چھوڑوں قریۂ جاں
یوسف، قصرِ شہی میں بھی، کب بھولا کنعاں کی گلیاں

موت قریب آئی تو دُنیا کتنی مقدّس لگتی ہے
کاہشِ دل بھی خواہشِ دل ہے، آفتِ جاں بھی راحتِ جاں

میری وحشت کو تو بہت تھی گوشۂ چشمِ یار کی سیر
یوں تو عدم میں وسعت ہو گی عرش بہ عرش، کراں بہ کراں

غنچے اب تک رنگ بھرے ہیں، اب تک ہونٹ امنگ بھرے
ٹُوٹی پھُوٹی قبروں سے ہیں پتھرائی آنکھیں نگراں

صرف اک نگہِ گرم سے ٹوٹیں، شعلوں میں پروان چڑھیں
ہائے یہ نازک نازک رشتے، ہائے یہ بزمِ شیشہ گراں

دشت و دمن میں، کوہ و کمر میں بکھرے ہوئے ہیں پھول سی پھول
روئے نگارِ گیتی پر ہیں ثبت، مرے بوسوں کے نشاں

آنکھ کی اک جھپکی میں بیتا کتنے برس کا قربِ جمال
عشق کے اک پل میں گزرے ہیں کتنے قرن، کتنی صدیاں

ساری دنیا میرا کعبہ، سب انساں میرے محبوب
دشمن بھی دو ایک تھے، لیکن دشمن بھی تو تھے انساں

دردِ حیات کہیں اب جا کر بننے لگا تھا حسنِ حیات
کس کو خبر تھی، محو رہے گی قطعِ سفر میں عمرِ رواں

جنت کی تخ بستگیوں کو گرمائے گا اس کا خیال
صبحِ ابد تک جمی رہے یہ انجمنِ آتش نفساں

اکتوبر ۱۹۶۱ء

جدید انسان

آج اِک انسان سے مِل کر مجھے محسوس ہوا
جیسے محصُور ہُوں مَیں سیکڑوں انسانوں میں

اس کے چہرے پہ چمکتی تھیں ہزاروں آنکھیں
جس طرح دیو، اساطیر کے رومانوں میں

اس کے باوصف اس انسان نے یوں باتیں کیں
جیسے تاریکیِ شب، گُونج اُٹھے کانوں میں

فقط اتنا سا تغیّر ہے کہ اس دَور کے لوگ
جھانکتے پھرتے ہیں غیروں کے گریبانوں میں

جن کو یہ بھی نہیں معلوم، کہ کل کیا ہوگا
اب بھی انسان کی گنتی ہے اُن اَن جانوں میں

لاکھ راہوں میں گزرنے کی کوئی راہ نہیں
منزلیں کھو گئیں تاریخ کے ویرانوں میں

جاگتے جاگتے کس طرح کٹے عُمر کی رات
آنکھ مے خانوں میں لگتی ہے نہ غم خانوں میں

جن کو صدیوں کی عبادت سے بھی نفرت ہی ملی
مَیں بھی شامل ہُوں انہی سوختہ سامانوں میں"

ستمبر ۱۹۶۱ء

مراجعت

(خلا میں انسان کی پرواز)

میری لب بستگی پہ نہ جاؤ
میرے دل میں قیامت بپا ہے
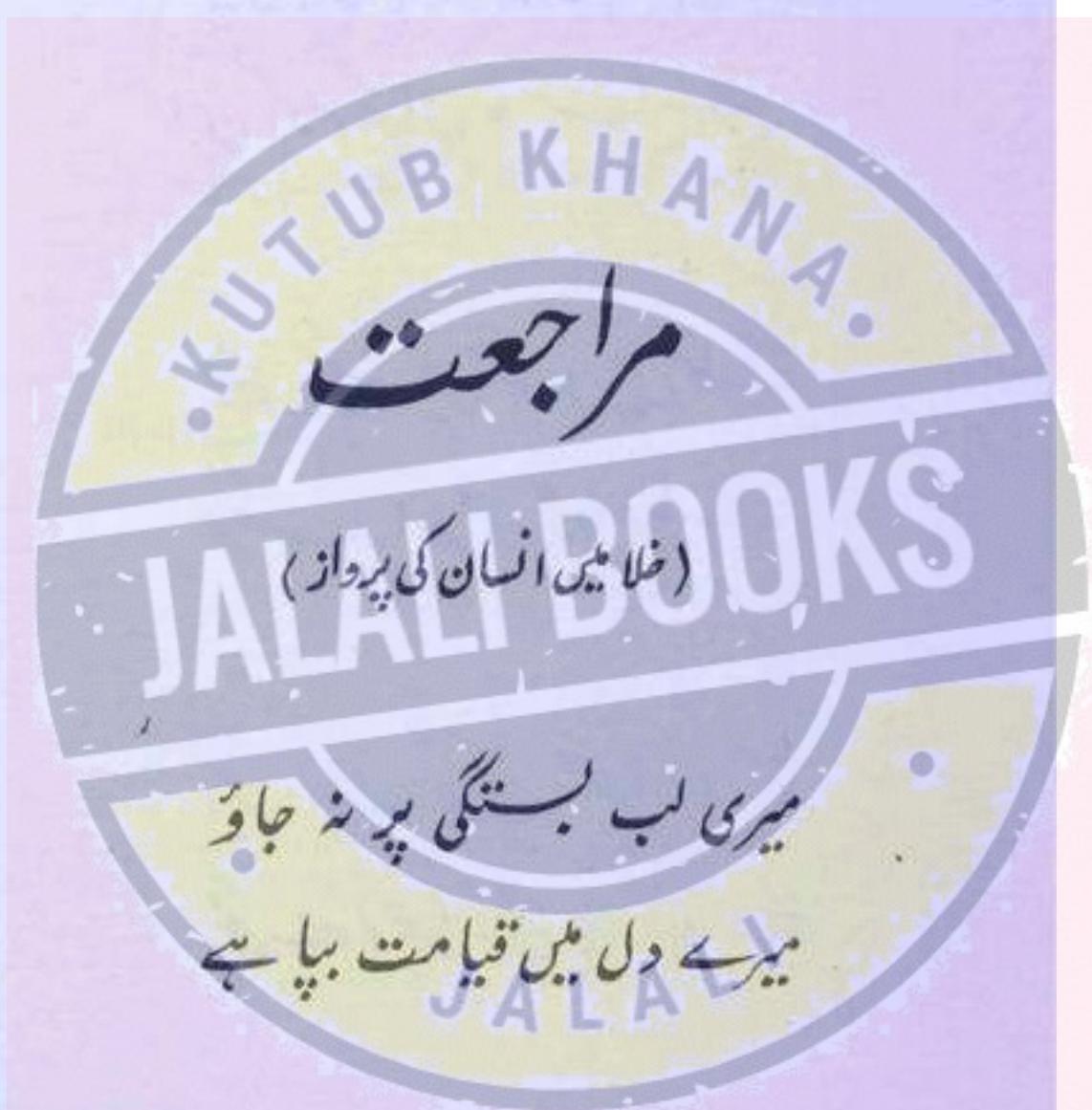
جانے کیا کیا ہیں میرے ارادے
ذہن چھلکا چلا جا رہا ہے

کیا بتاؤں، کہ لمحہ گزر کر
میرے کانوں میں کیا کہ گیا ہے

یُوں دما دم قدم اُٹھ رہے ہیں
وقت حیراں کھڑا سوچتا ہے

طیش میں لاکھ آئیں عناصر
ابنِ آدم کہاں مانتا ہے

جتنے چُبھتے ہیں تلووں میں کانٹے
حوصلہ اور بھی بڑھ رہا ہے

ایک چُپ چاپ صحرا ابد کا
مُجھ سے پوچھو، اُفق پار کیا ہے

کیوں لرزنے لگے ہو ستارو
یہ تو پرواز کی ابتدا ہے

آسماں میری منزل نہیں ہے
آسماں تو خلا ہی خلا ہے

اپنی گم گشتہ جنّت کو پاؤں
صرف اتنا مرا مدّعا ہے

ہوشیار اے فرشتو، کہ پھر سے
ایک سجدے کا وقت آ رہا ہے

یکم اگست ۱۹۶۱ء
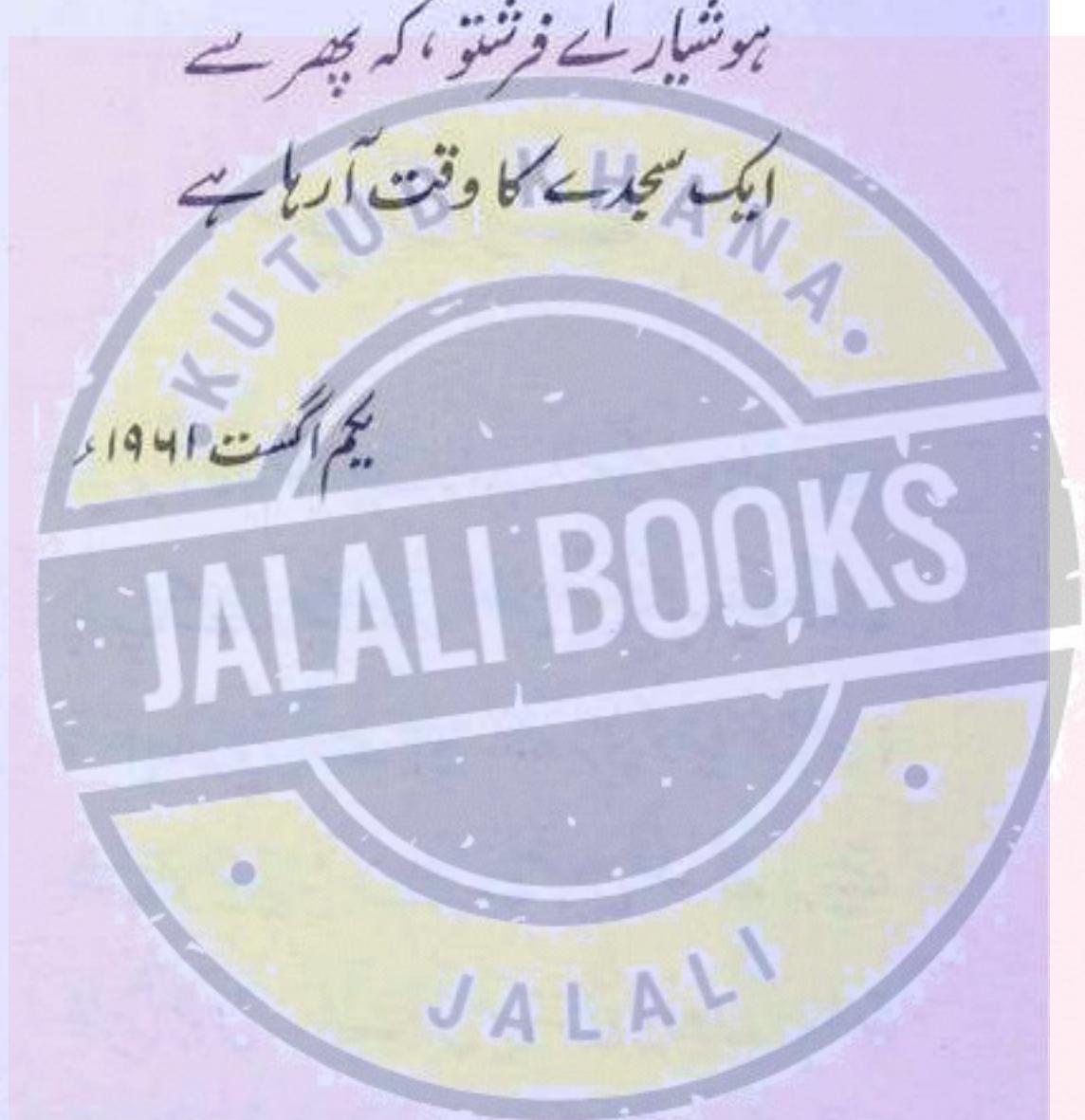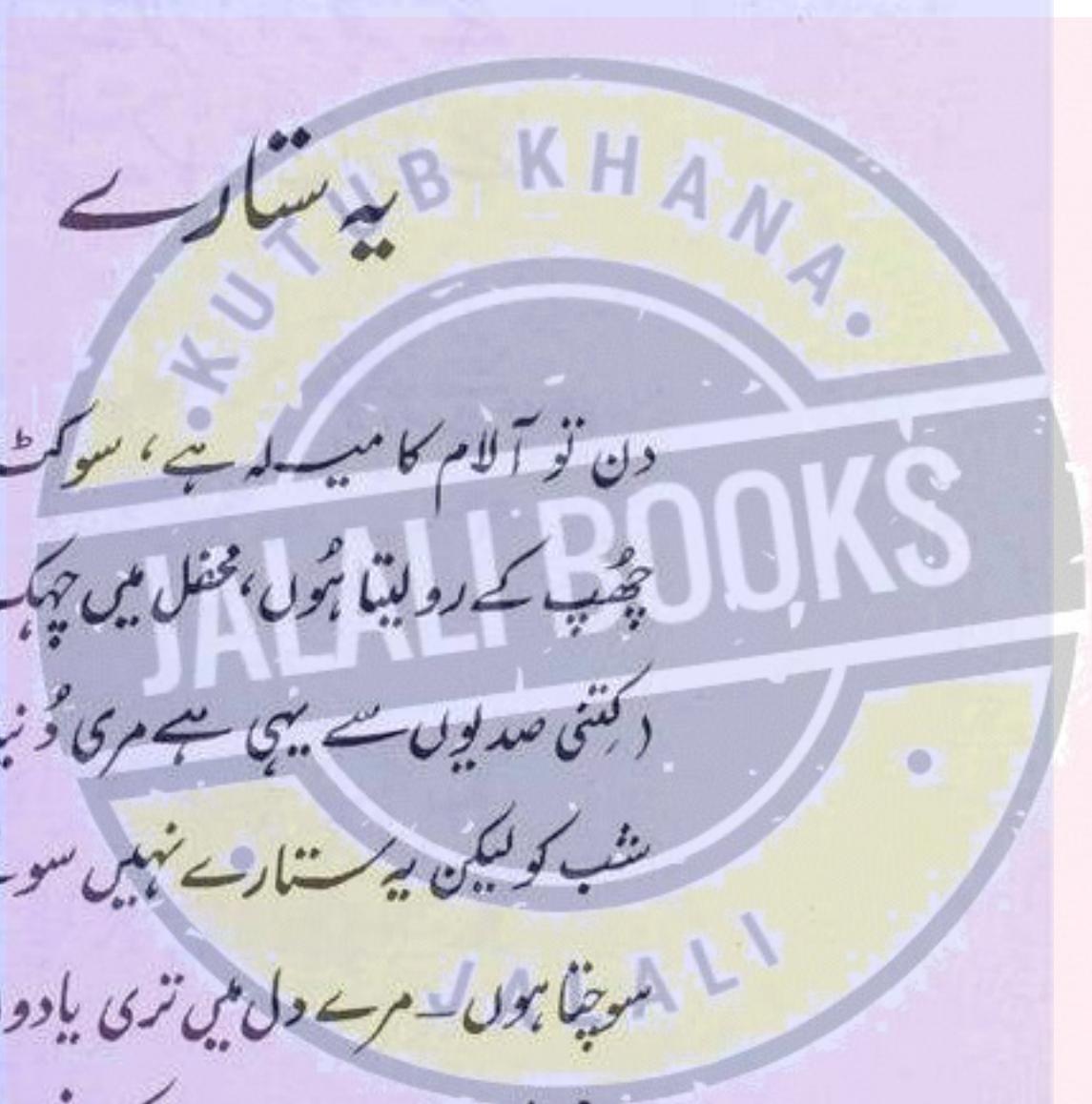
یہ ستارے

دن تو آلام کا میلہ ہے، سو کٹ جاتا ہے
چھپ کے رو لیتا ہُوں، محفل میں چہک لیتا ہُوں
(کتنی صدیوں سے یہی ہے مری دُنیا کا چلن)
شب کو لیکن یہ ستارے نہیں سونے دیتے
سوچتا ہوں ـــ مرے دل میں تری یادوں کی طرح
سینۂ شب پہ ستارے ہیں کہ زخموں کے چمن،
کون جانے کہ پسِ پردۂ ظلمات ہے کیا
اور پسِ پردۂ ظلمات ستارے ہی تو ہیں
یہ ستارے غمِ پنہاں کے اشارے ہی تو ہیں

جون ۱۹۶۱ء

بہار
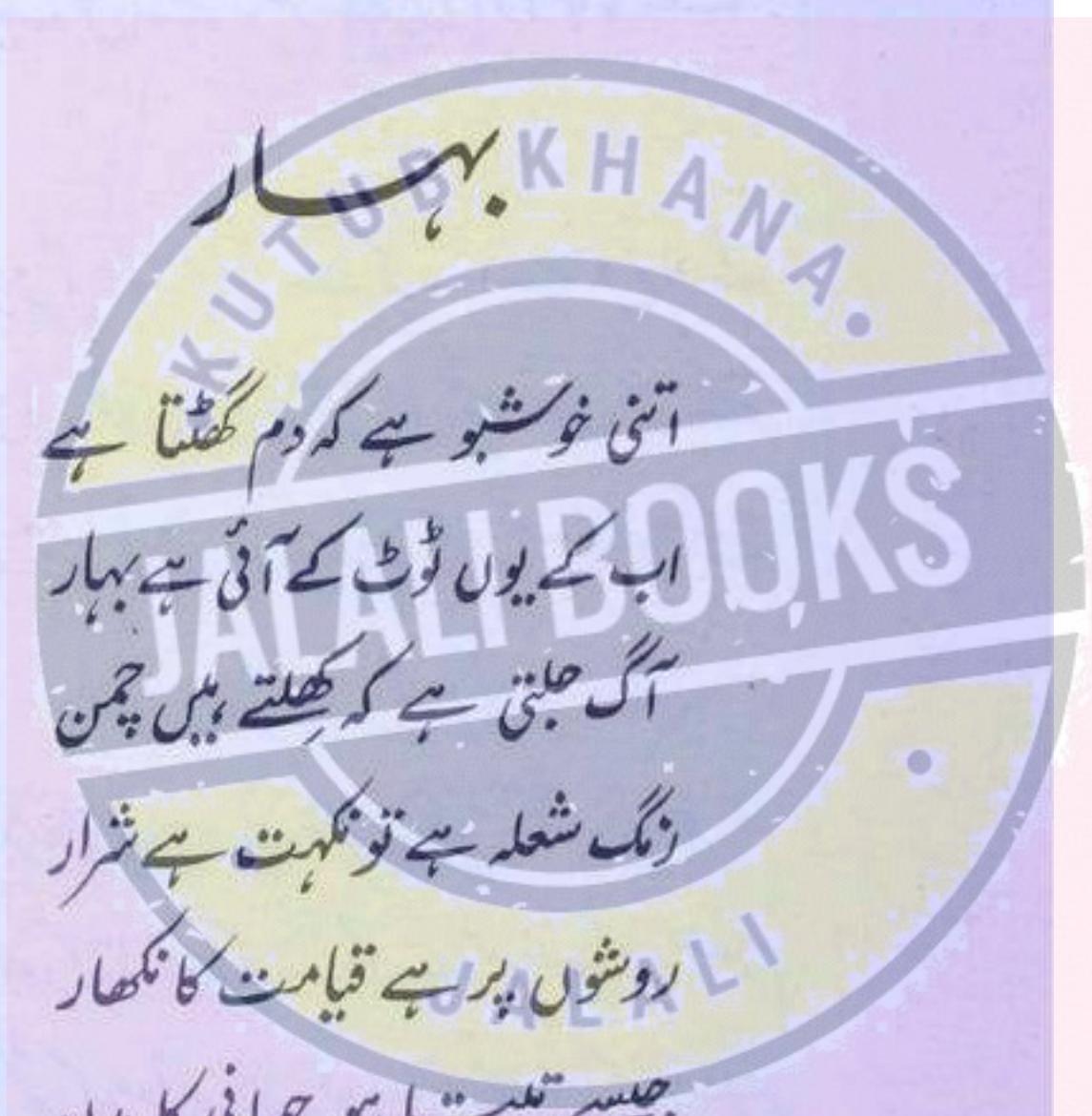
اتنی خوشبو ہے کہ دم گھٹتا ہے
اب کے یوں ٹوٹ کے آئی ہے بہار
آگ جلتی ہے کہ کھِلتے ہیں چمن
رنگ شعلہ ہے تو نکہت ہے شرار
روِشوں پر ہے قیامت کا نکھار
جیسے تپتا ہو جوانی کا بدن
آبلہ بن کے تپکتی ہے کلی
کونپلیں پھُوٹ کے لَو دیتی ہیں
اب کے گلشن میں صبا یُوں بھی چلی

جون ۱۹۶۱ء

دیوانہ

ایک دیوانۂ کامل، سرِ گلزارِ حیات
ایک انبوہ میں چُپ چاپ چلا جاتا ہے
ایک گُل ہے کہ بگولے میں اُڑا جاتا ہے
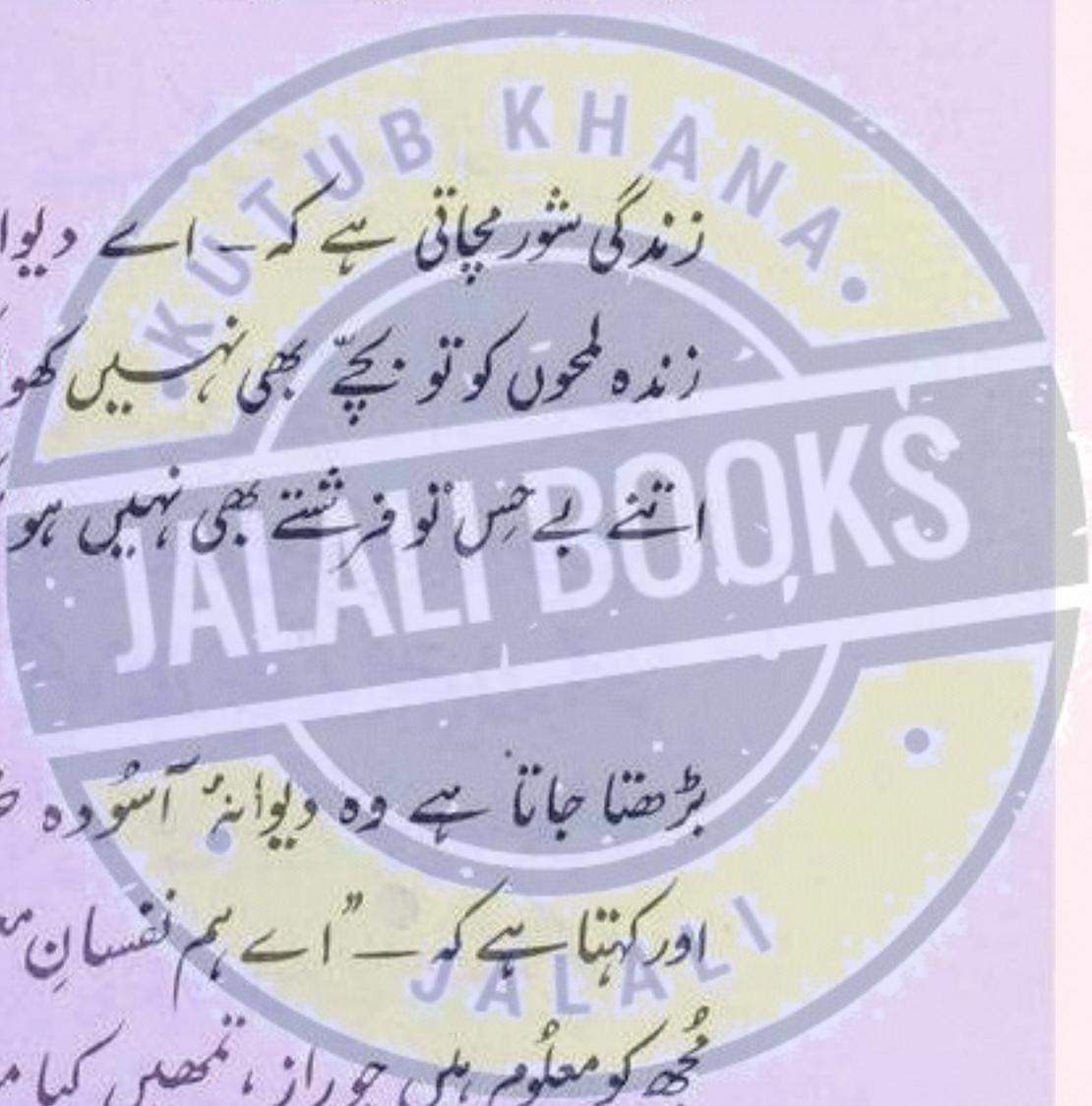
زندگی شور مچاتی ہے کہ — اے دیوانے
زندہ لمحوں کو تو بچّے بھی نہیں کھو سکتے
اتنے بے حس تو فرشتے بھی نہیں ہو سکتے

بڑھتا جاتا ہے وہ دیوانۂ آسودہ خرام
اور کہتا ہے کہ — "اے ہم نفسانِ معصُوم
مُجھ کو معلُوم ہیں جو راز، تمھیں کیا معلُوم

رُک تو جاؤں چمنستانِ جہاں میں — لیکن
میری آنکھوں سے نم آنکھیں تو ملا لو پہلے
مُٹھّیاں کھول کے پتھّر تو گرا لو پہلے"

مارچ ۱۹۶۱ء

ڈھلان

ریت پر ثبت ہیں یہ کس کے قدم؟
حُسن کی نرم خرامی کی قسم
سرِ ساحل مری تخئیلِ جواں گزری ہے
یا کوئی انجمنِ گُل بدناں گزری ہے
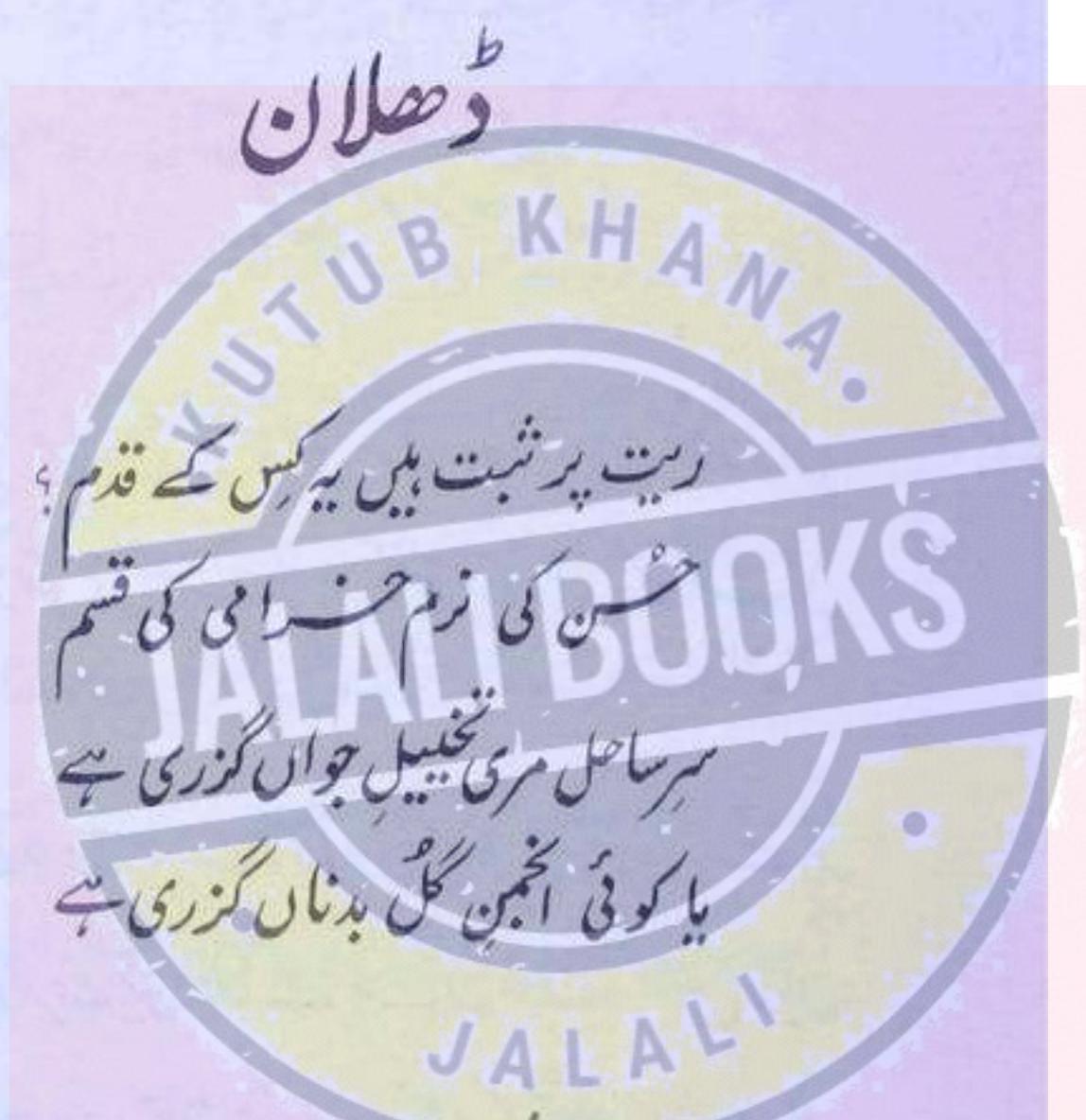
موج نے نقشِ قدم چاٹ لیے
میری تخئیل کے پر کاٹ لیے
لوگ دریاؤں کے انجام سے ڈر جاتے ہیں
اب تو رستے بھی سمندر میں اُتر جاتے ہیں

مارچ ۱۹۶۱ء

تین سرزمینیں

سرزمینِ دل پہ ماضی کے رواں ہیں کارواں
چار سُو آراستہ ہیں کتنی یادوں کے نشاں

اِک طرف چہرے، کتابوں کی طرح رازوں سے پُر
اِک طرف تیور، تقاضے! — اِک طرف آنکھیں، زباں
اِک طرف جلتے ہُوئے ہونٹوں کی شمعیں شعلہ بار
اِک طرف اُڑتا ہُوا گیسوئے مشکیں کا دھواں
اِک طرف صرف ایک چٹکی میں گزرتے رات دن
اِک طرف وہ پل کہ غش کھا جائے عمرِ جاوداں
اِک طرف ہے وسعتِ گیتی، مگر محصُور ہے
اِک طرف ہے حلقۂ آغوش، لیکن بے کراں

سرزمینِ ذہن پر ہیں حال کے لشکر رواں
چار سُو آراستہ ہیں کتنے زخموں کے نشاں

اِک طرف اُمّید کے پیڑوں پہ بور آیا ہُوا
اِک طرف گھِرتی، اُمڈتی، دندناتی آندھیاں
اِک طرف ڈرتے عقیدے، اِک طرف مرتے یقیں
اِک طرف صف بستہ ملبوسِ حقیقت میں گماں
اِک طرف دشمن کو بھی دشمن پہ پیار آیا ہُوا
اِک طرف نفرت کے نرغے میں خلوصِ دوستاں
اِک طرف انسان خود اپنی نظر میں اجنبی
اِک طرف ذرّوں کی مرّیخ و زحل سے شوخیاں

سرزمینِ حال پر ہے رُوحِ مستقبل رواں
چار سُو آراستہ ہیں کتنے خوابوں کے نشاں

اِک طرف ویران رستوں پر چہکتے ہم سفر
اِک طرف ملبے کے ڈھیروں پر لچکتی کہکشاں

اِک طرف افراد کے رشتوں میں آہنگِ نسیم
اِک طرف قوموں کی باتوں میں گُلوں کی نرمیاں
اِک طرف تارے عروجِ آدمی کے مستقر
اِک طرف گھر کی منڈیروں پر حدودِ لامکاں
اِک طرف حسن و محبّت ، اِک طرف تقدیس و خیر
اِک طرف حرفِ آدمیّت ، اِک طرف ہفت آسمان

جنوری ۱۹۶۱ء
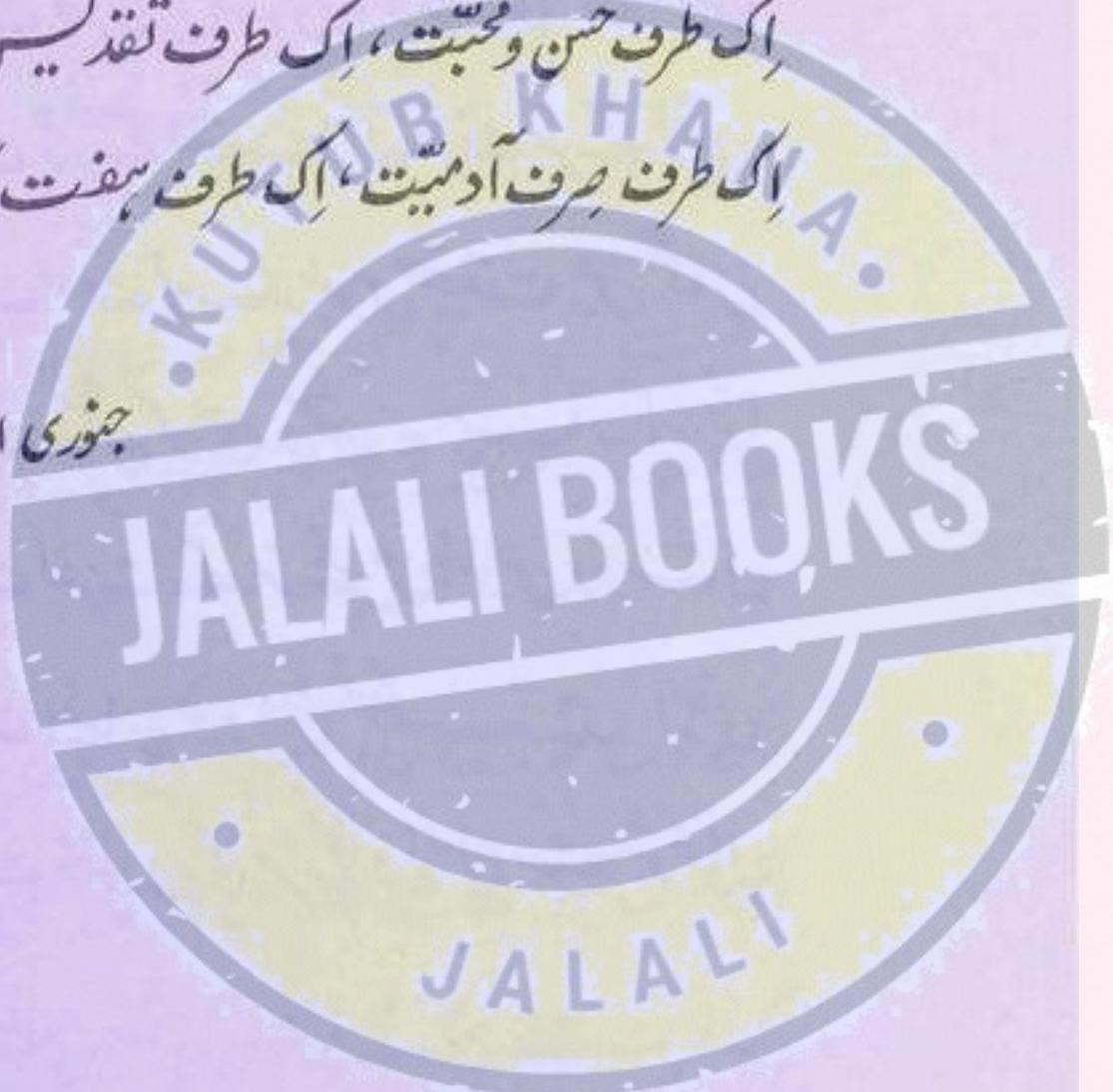
خدیجہ زہرہ

جس کا جسم الجزائر کے شہر عرفہ میں اُس وقت فرانسیسی گولیوں سے چھلنی کر دیا گیا جب وہ فرانسیسی استبداد کے خلاف ایک مظاہرے میں حصّہ لے رہی تھی۔

جون ڈی آرک[۱] کے پیکر سے نکلتی لَو نے
کتنے خاکے رسن و دار کے دکھلائے ہیں
کتنی پوشیدہ صلیبوں کے لگائے ہیں سراغ
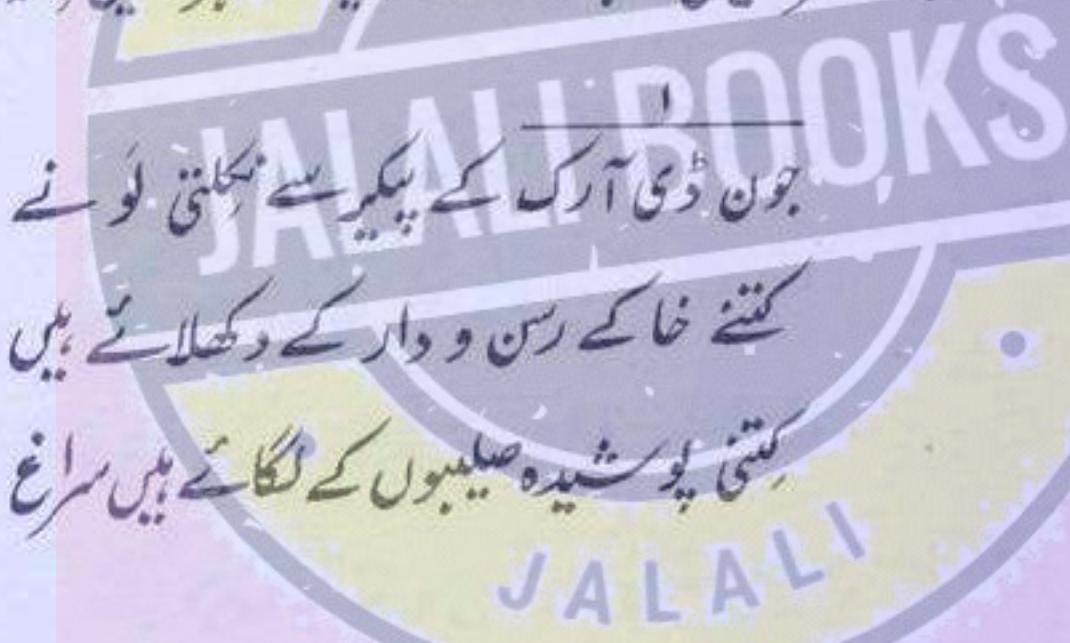
جب کہیں قافلۂ عشق رواں ہوتا ہے
جونؔ کا شعلۂ بیباک جواں ہوتا ہے
بھڑک اُٹھتے ہیں سُلگتی ہوئی آنکھوں کے چراغ

۱۔ فرانس کی بہادر بیٹی جو اپنے وطن پر انگریزی تسلّط کے خلاف لڑی۔

خون کی تیرگیِ درد چمک اُٹھتی ہے
جون کی چاپ سے تاریخ کھنک اُٹھتی ہے
الجزائر میں دمک اُٹھتے ہیں روآن[1] کے داغ

کیا کبھی عظمتِ پیرس نے یہ سوچا بھی ہے؟
جون ڈی آرک، جمیلہ[2] بھی خدیجہ بھی ہے

جنوری ۱۹۶۰ء
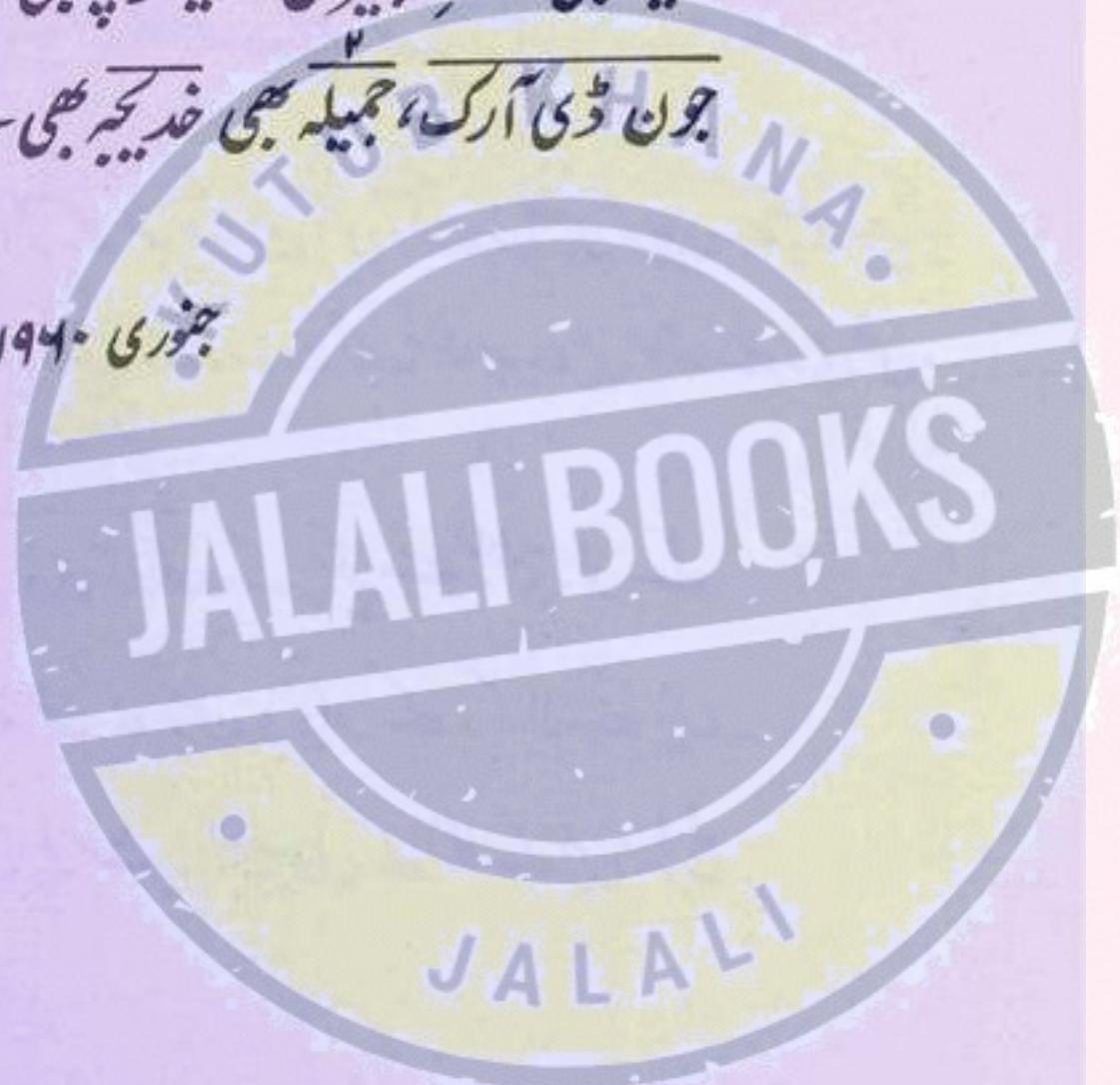
۱۔ فرانس کا وہ مقام جہاں جون ڈی آرک کو نذرِ آتش کیا گیا تھا۔

۲۔ الجزائر کی مشہور مجاہد خاتون جو عالمی احتجاج کے باعث موت کی سزا سے تو بچ گئی۔ مگر تادمِ تحریر محبوس ہے۔

سچ

سقراط سے گلیلیو تک، سچ کے زہر سے
کتنی عقیدتوں کے جگر چاک ہو گئے
کتنے عظیم قوّت و حشمت کے دیوتا
سیلِ شعور کے خس و خاشاک ہو گئے
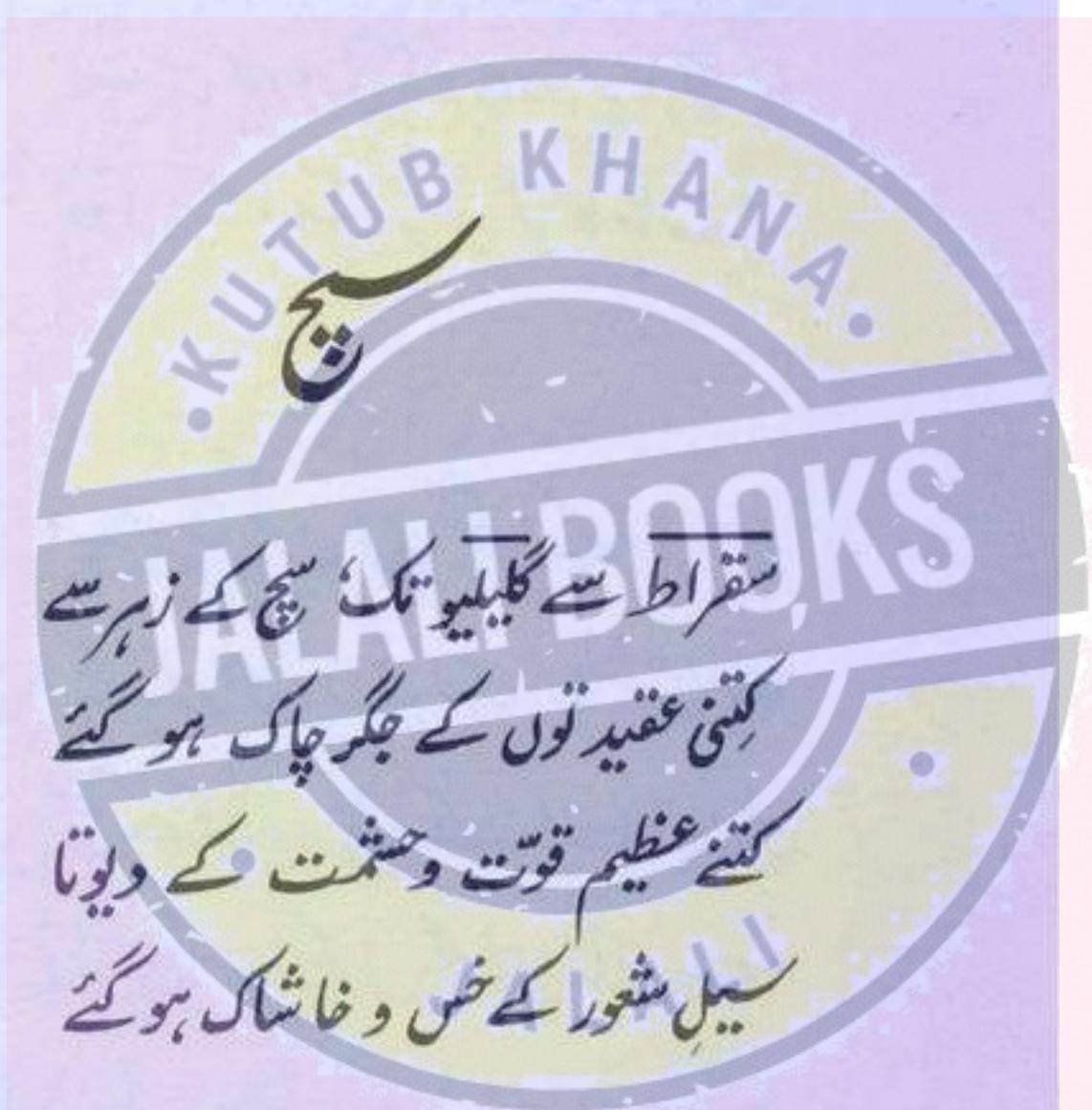
سچ کو بسا کے دل میں، سفر پر چلا تھا میں
اِک شانِ بے رُخی سے، بساطِ حیات پر
کوسوں تک ایک بھی مجھے انساں نہ مل سکا
کتنا غرور تھا مجھے عرفانِ ذات پر

اُٹھتا رہا خیال میں طوفانِ زُلفِ یار
سقراطؔ یاد آتا رہا بات بات پر

روندے کچھ ایسے اپنی جبلّت کے بتکدے
محمودؔ جیسے ٹوٹ پڑے سومنات پر

جب میں خودی کی آخری حد پر پہنچ گیا
خود اپنا سایہ پھیل گیا کائنات پر

اب سوچتا ہُوں اپنی تھکن کے غبار میں
سچ زہر ہی سہی مگر اس میں نشہ بھی ہے
سچ کے کھنڈر پہ چڑھ کے صدا دے رہا ہُوں میں
دُنیا میں کیا کوئی مجھے پہچانتا بھی ہے؟

اکتوبر ۱۹۶۰ء

تہذیب

پھر مرتّب ہُوئے تہذیب و ثقافت کے اصُول
دُور تک پھیل گئے ریگِ رواں کے ٹیلے

آج کی بات نہ کر، آج تو جو کچھ ہے، سو ہے
مَیں تو یہ سوچتا ہُوں، کل اسی ٹیلے کی ببول
اَن گنت نقرئی خاروں میں پرُوئے ہُوئے پھُول
جانے اِس دشت کے کِس گوشۂ تنہائی میں
کِسی ٹیلے کی منوں ریت کے نیچے دب کر
جب کوئی راہ نہ پائے گی تو چِلّائے گی
"ہائے مَیں، ہائے مرے پھُول وہ پیلے پیلے"

پھر مرتّب ہُوئے تہذیب و ثقافت کے اصُول
دُور تک پھیل گئے ریگِ رواں کے ٹیلے

اکتوبر ۱۹۶۰ء

توحید

دہر کو تشنگیِ نازِ بتاں ہے اب تک
تو مری یاد میں کیوں سوختہ جاں ہے اب تک

تجھ کو اک مجھ سے، فقط مجھ سے محبت کیوں ہے
یہ تو میں مانتا ہوں، تو مری جاں ہے اب تک

کیوں مسرّت سے ہے محروم تری شانِ جمال
کیوں مرا غم ترے چہرے سے عیاں ہے اب تک
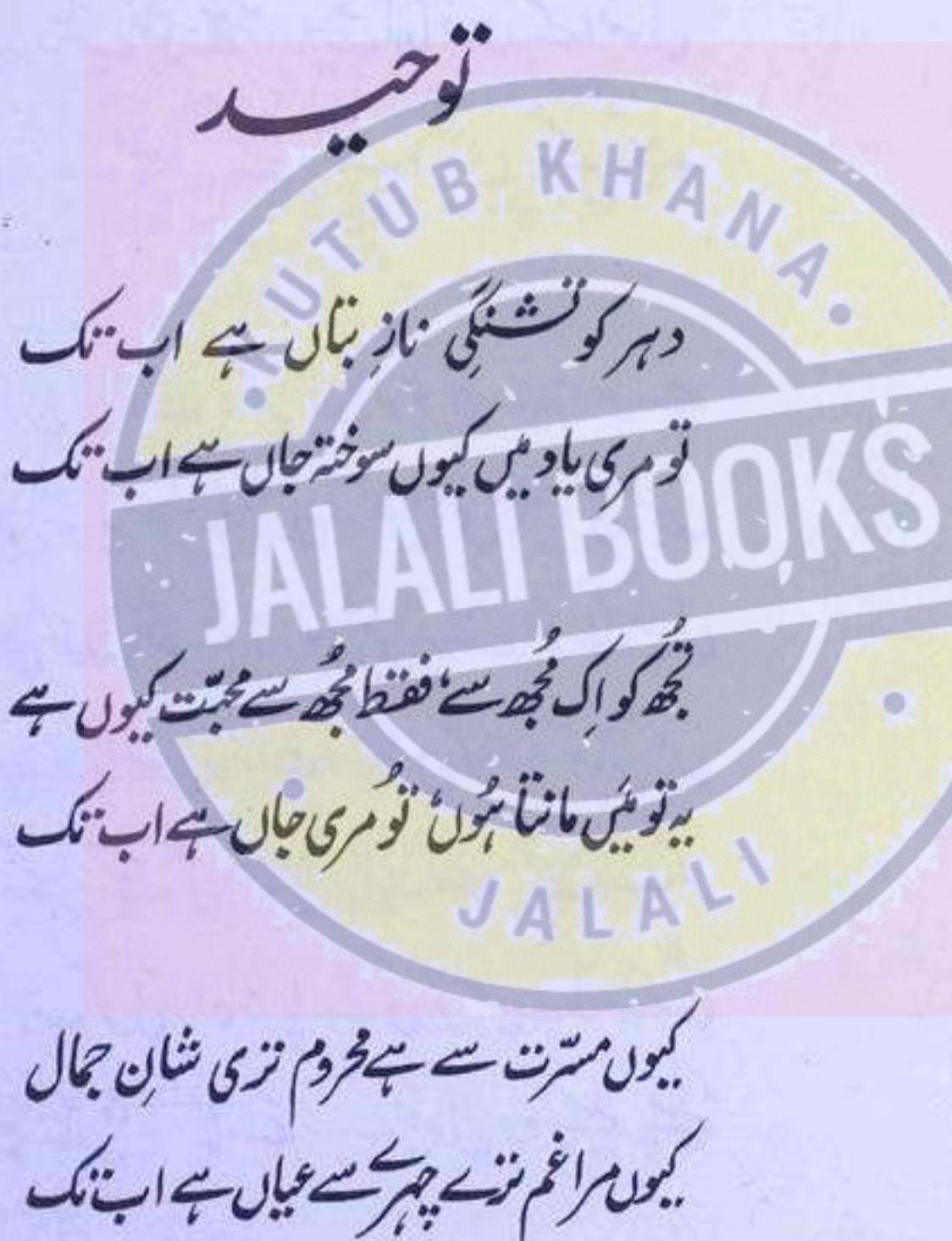
میرا معیارِ وفا ہے ترے دم سے قائم
ہر گھڑی تو مری جانب نگراں ہے اب تک

مَیں محبّت میں بھی توحید کا قائل ہُوں، مگر
ظلم ہے حُسن پہ پابندیٔ آدابِ وفا

حسن ہے صحنِ چمن، عشق ہے صحرائے بسیط
جس سے کترا کے نکل جاتی ہیں امواجِ صبا

اس کے باوصف، بھرے شہر کی تنہائی میں
آج بھی مَیں نے سُنی ہے تری آہوں کی صدا

رسمِ رسم سے جکڑی ہُوئی اِس دُنیا میں
حسن بھی عشق کرے گا، مُجھے معلُوم نہ تھا

اکتوبر ۱۹۶۰ء

شامِ فراق
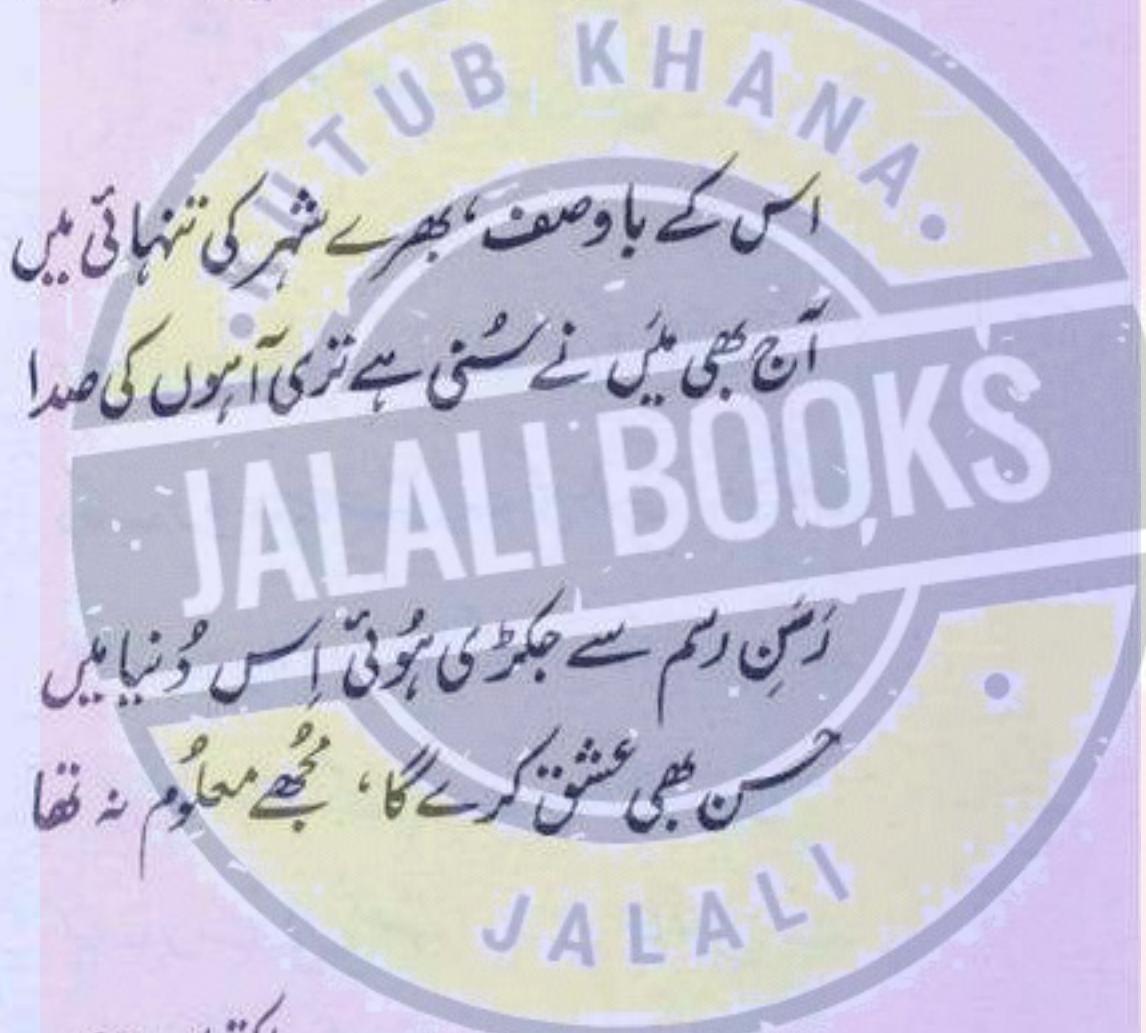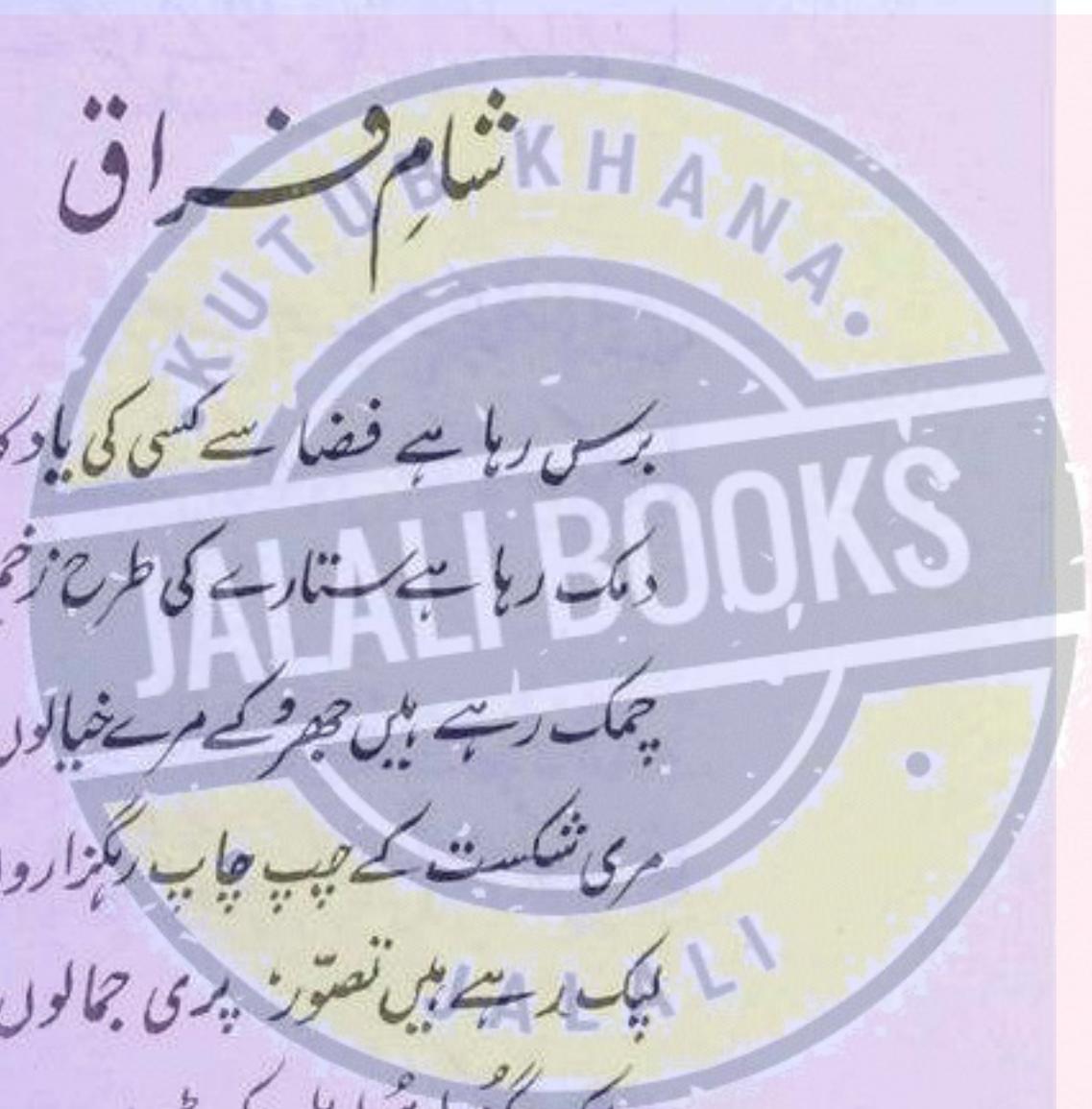
برس رہا ہے فضا سے کسی کی یاد کا نور
دمک رہا ہے ستارے کی طرح زخمِ جگر
چمک رہے ہیں جھروکے مرے خیالوں کے
مری شکست کے چپ چاپ رہگزاروں پر
لپک رہے ہیں تصوّر پری جمالوں کے
ہر ایک گزرا ہُوا پل، کروڑوں روپ لیے
غبارِ وقت سے یوں جھانکنے لگا، جیسے
امڈ رہے ہیں افق سے، پرے غزالوں کے
وہ روشنی ہے کہ ہر چیز ہے برہنہ بدن
وہ ایک فرد کا غم ہو کہ روحِ عصر کا درد

جو راز دفن رہے مدّتوں، قرن بہ قرن
کچھ ایسے فاش ہوئے جا رہے ہیں پے در پے
کسی شہید کی نظروں میں جس طرح ٹوٹے
غرورِ جبر و تشدّد، طلسمِ دار و رسن

کلیم ہوں، مری شامِ فراق میرا طُور
برس رہا ہے فضا سے کسی کی یاد کا نُور

ستمبر ۱۹۶۰ء

نذرِ فن کارانِ وطن

کیوں تیرگیِ ذہن کا الزام خدا پر
تُو خود ہی دُھواں بن کے مسلّط ہے فضا پر

خوابوں کی یہ باتیں ہیں، کہ جب ظلمتِ شب میں
مشعل کا گماں تھا تری ایک ایک صدا پر

جب نشّۂ تخلیق میں تُو نے کبھی دیکھا
پھُولوں کے سفینے تھے رواں موجِ صبا پر

اب تک ہیں مجھے تیرے خیالوں کے سفر یاد
جلتے تھے دِیے جب ترے نقشِ کفِ پا پر

دریوزۂ جذبات کے باوصف، بظاہر
صرف اپنی لکیریں تھیں ترے دستِ دُعا پر

یہ ذہن کے فردوس ترے فن کے نشاں تھے
یہ بھی کبھی سوچا کہ قدم تیرے کہاں تھے

اس شان سے بدلا ہے چلن عصرِ رواں کا

اب چاند بھی اِک پھول ہے گلزارِ جہاں کا

تقدیر کے روکے بھی ابد تک نہ رُکے گا

انساں ہے اب اِک تیرِ مشیّت کی کماں کا

اب فاصلے کچھ ہیں تو روایاتِ کہن ہیں

اب حدِّ نظر پر بھی گماں ہے رگِ جاں کا

اس درجہ بصارت کے افق پھیل گئے ہیں

تاروں پہ بھی دھوکا ہے رُخِ برق وشاں کا

وہ دل کا پھپھولا ہو، کہ داغِ رُخِ خورشید

محتاج ہے فن کار کی چشمِ نگراں کا

گو وقت، شب و روز کے چکر میں رواں ہے

جب بھی نظر اُٹھتی ہے، گجر دم کا سماں ہے

رہ رہ کے مجھے اب یہ خیال آنے لگا ہے

صدیوں کے اصولوں کو زوال آنے لگا ہے

مرمر کے دریچوں پہ ہیں ظلمات کے پہرے

مٹی کے گھروندوں پہ جمال آنے لگا ہے

ہے دُھول سے لبریز اُدھر ساغرِ جمشید
گردش میں اِدھر جامِ سفال آنے لگا ہے

بہتر ہے کہ انجم حدِ امکاں سے نکل جائیں
انساں کو مقدر پہ جلال آنے لگا ہے

کیا خلد کی میراث پہ کچھ حق نہیں میرا
آدم کے لبوں پر یہ سوال آنے لگا ہے

سوئی ہوئی کس دُھن میں نری غیرتِ فن ہے
جاگا ہُوا انساں بھی تو موضوعِ سخن ہے

اگست ۱۹۶۰ء

اے مشیت تری قوت کو سلام
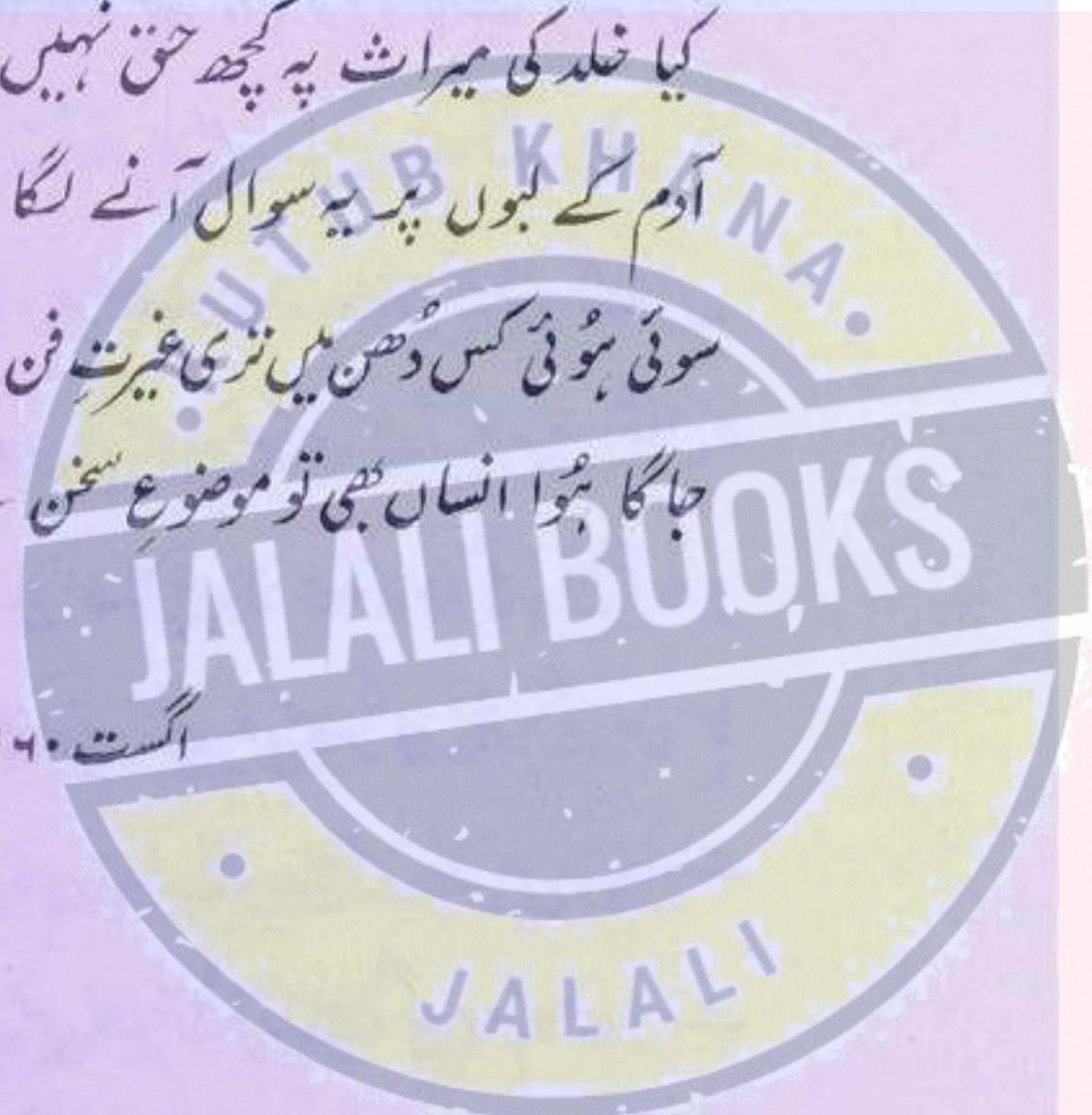
تیری مٹھی میں ہے مہر و مہ و انجم کا نظام
ارض و مریخ ترے دم سے ہیں گردش میں مدام
مجھ سے کافر کو بھی کب ہے تری عظمت میں کلام
اے مشیت! تری قوت کو سلام

نہ ازل ہے کوئی نقطہ، نہ ابد کوئی لکیر
وقت بھی ہے ترے پیکانِ قضا کا نخچیر
ان حصاروں سے ہے اونچا ترا معیارِ دوام
اے مشیت! تری قوت کو سلام

کتنی قرنوں سے خلا میں ہے زمین آوارہ
وقت کی دھول سے آزاد ہے یہ سیّارہ
وہی خوابیدہ لیالی ، وہی بیدار ایّام
اے مشیّت ! تری قوّت کو سلام
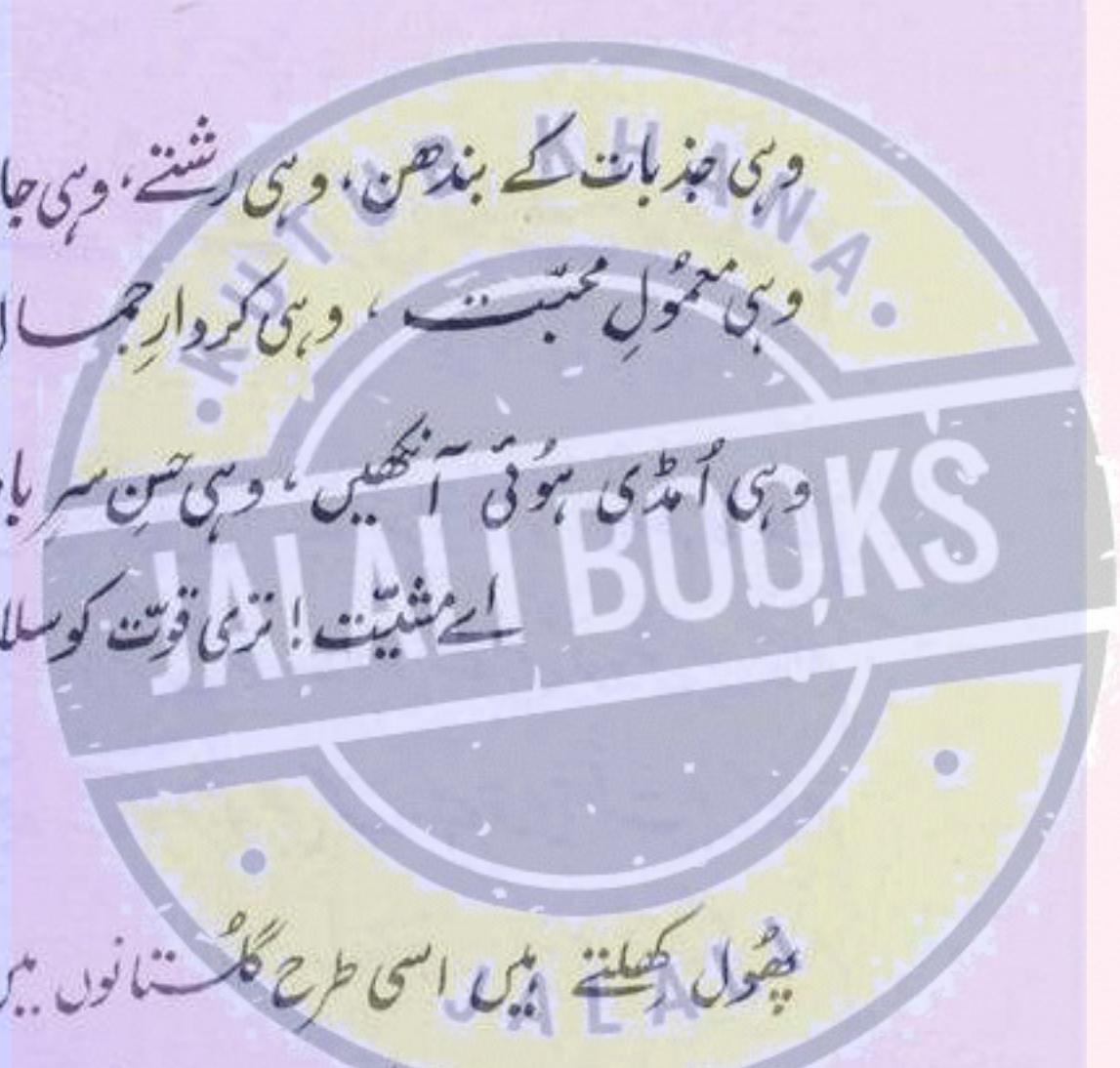
وہی جذبات کے بندھن ، وہی رشتے ، وہی جال
وہی معمولِ محبّت ، وہی کردارِ جمال
وہی اُمڈی ہوئی آنکھیں ، وہی حسنِ سرِ بام
اے مشیّت ! تری قوّت کو سلام

پھول کھلتے ہیں اسی طرح گلستانوں میں
اسی نرمی سے ہوا چلتی ہے میدانوں میں
سرِ ساحل ہے وہی موج کا اندازِ خرام
اے مشیّت ! تری قوّت کو سلام

اب بھی انسان ہے اسباب و نتائج کا اسیر
قصر کے سائے میں اب تک ہے وہی جرمِ غفیر

وہی جینا ہے مصیبت ۔ وہی مرنا ہے حرام
اے مشیّت! تری قوّت کو سلام

جنوری ۱۹۶۰ء

یاد کا چاند

کل سرِ راہے، تجھ سے ملتا جلتا خواب نظر آیا
یوں میرے ویرانۂ شب میں یاد کا چاند اُبھر آیا

آنکھیں جیسے ٹوٹتی نیندیں، کچھ خوابیدہ، کچھ بیدار
پلکوں میں وہی اٹکا اٹکا گزرے ہوئے لمحوں کا خمار
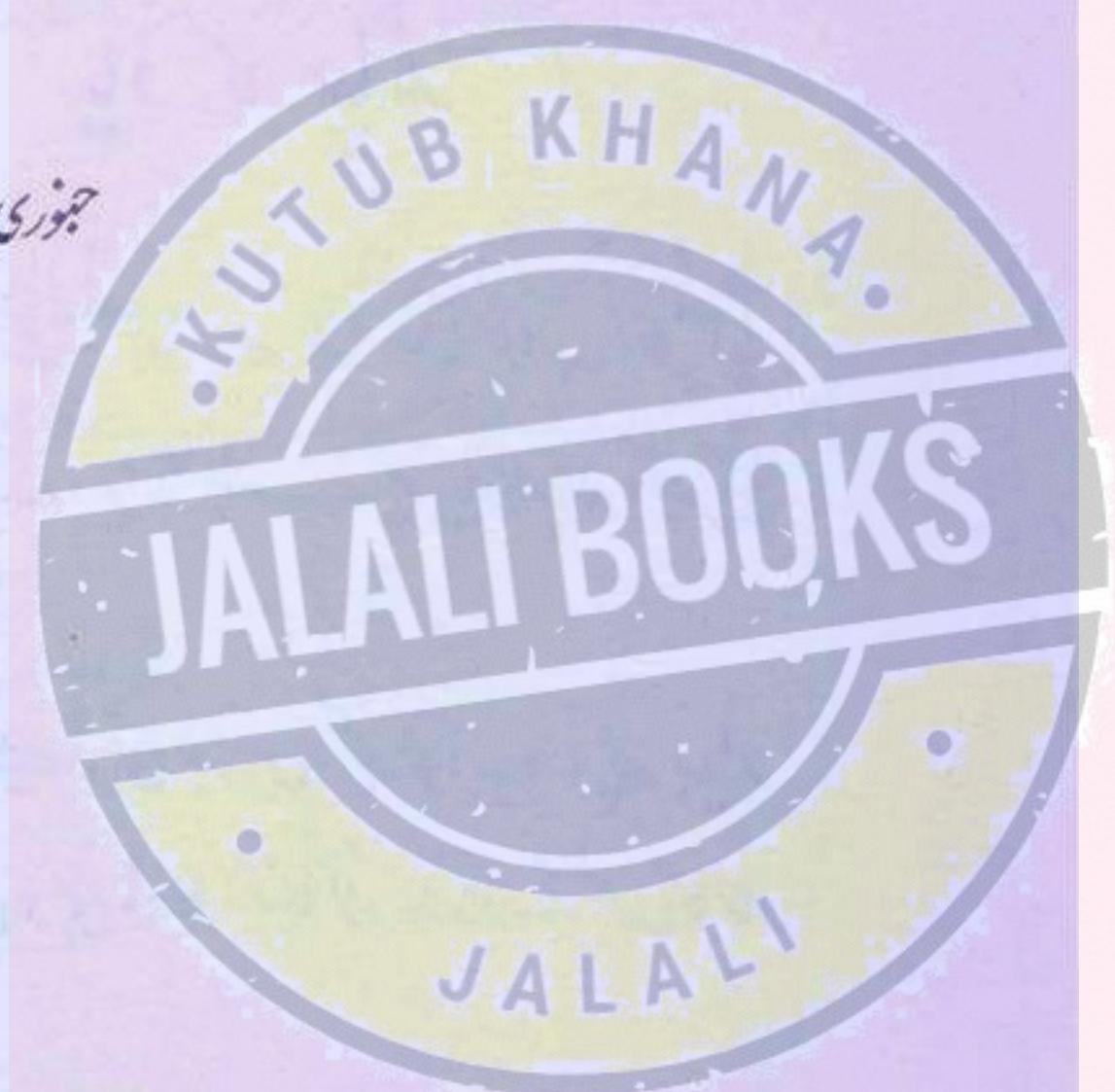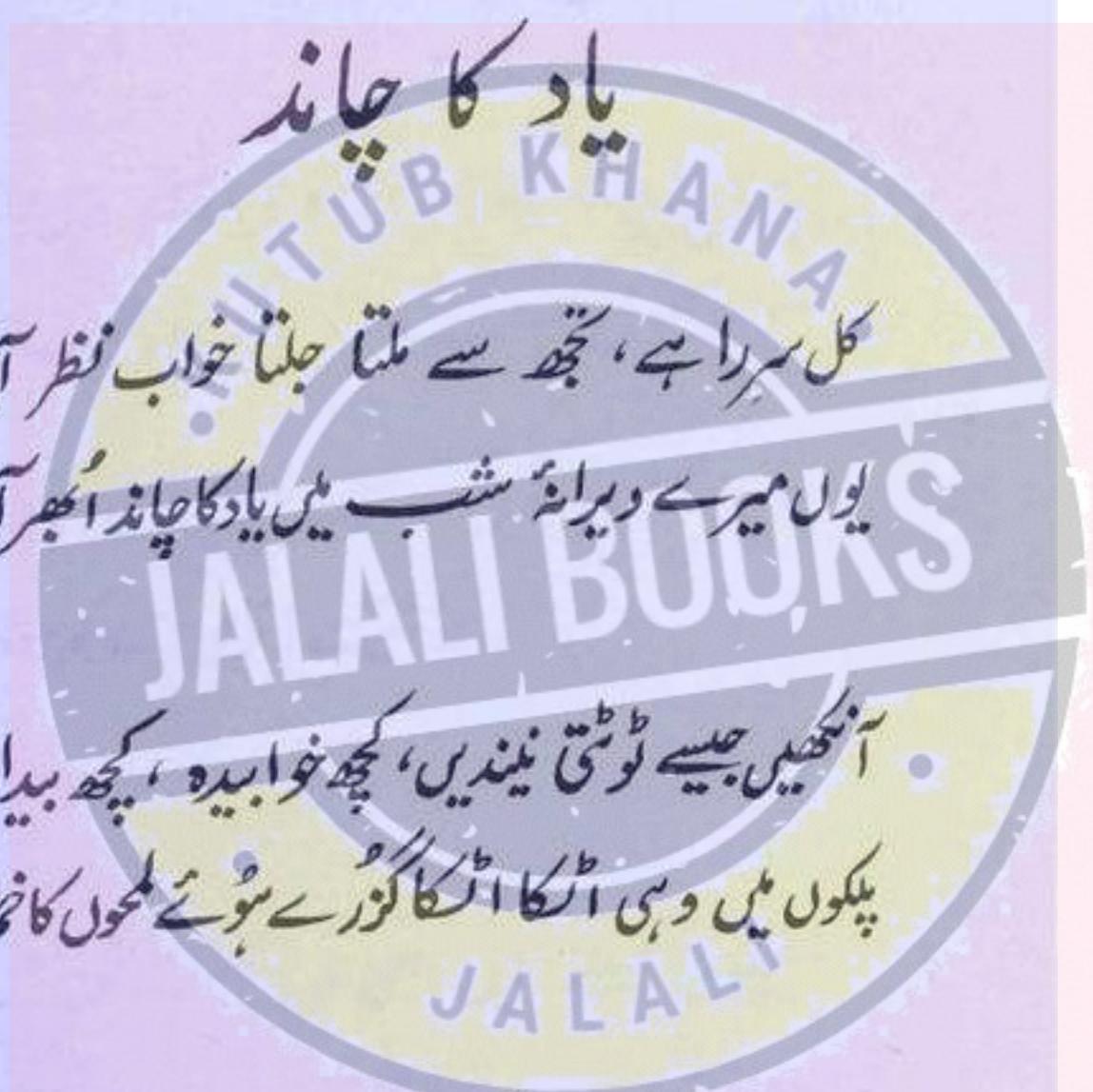
گالوں پر بل کھاتی لٹ کچھ اس ڈھب سے لہرائی ہوئی
جیسے اک آوارہ بدلی چاند کی زد میں آئی ہوئی

ہونٹ، چٹکتی کلیاں جو معصوم بھی تھیں، پُرکار بھی تھیں
ظاہر میں نم ناک، مگر باطن میں آتش بار بھی تھیں

نیلی نیلی رگیں بھی وہی تھیں گردن کے مرمر میں رواں
جسم کی ساری تراش وہی تھی، جیسے میرا شعرِ جواں

میرا ماضی چار طرف سے گھر کر مجھے بلانے لگا
اِک اِک پل چِلاّ چِلاّ کر شورِ حشر اُٹھانے لگا

میں نے پلٹ کر دیکھا، لیکن سارا کھیل خیالی تھا
جسم کا حُسن وہی تھا لیکن پیار کے حُسن سے خالی تھا

مئی ۱۹۶۰ء

نیا سال
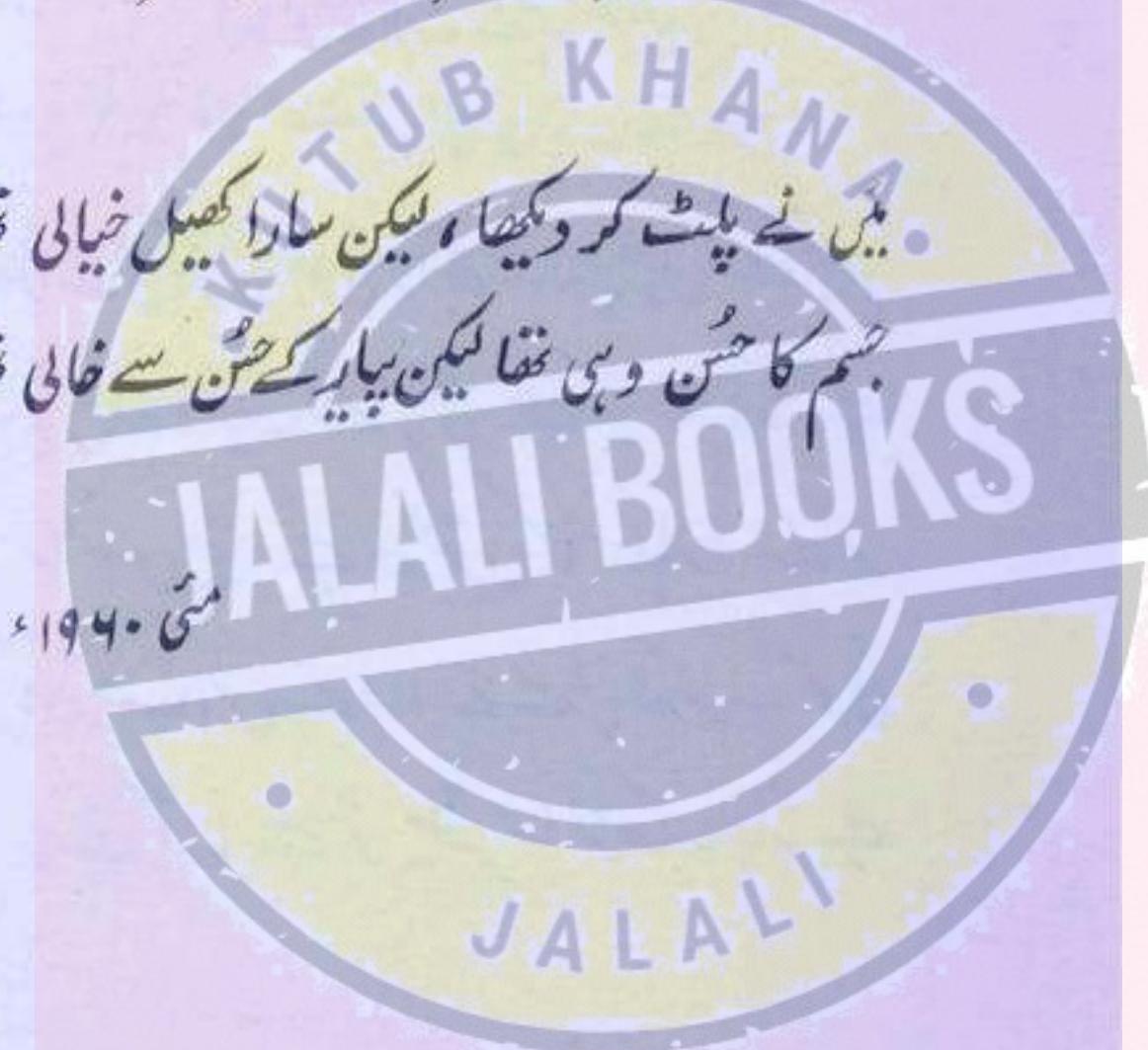
(عالمی حالات کے پس منظر میں)

رات کی اُڑتی ہُوئی راکھ سے بوجھل ہے نسیم
یُوں عصا ٹیک کے چلتی ہے کہ رحم آتا ہے
سانس لیتی ہے درختوں کا سہارا لے کر
اور جب اس کے لبادے سے لپٹ کر ــ کوئی
پتّہ گرتا ہے تو پتّھر سا لڑھک جاتا ہے

شاخیں ــ ہاتھوں میں لیے کتنی ادھوری کلیاں
مانگتی ہیں فقط اِک نرم سی جنبش کی دعا

ایسا چُپ چاپ ہے سنولائی ہُوئی صبح میں شہر
جیسے معبد کسی مُرجھائے ہُوئے مذہب کا

سر پہ اپنی ہی شکستوں کو اُٹھائے ہُوئے لوگ

اک دوراہے پہ۔ گروہوں میں کھڑے ہیں تنہا

یک بیک فاصلے تانبے کی طرح بجنے لگے

قدم اُٹھتے ہیں تو ذرّے بھی صدا دیتے ہیں

"درد کے پیرہنِ چاک سے جھانکو تو ذرا

مردہ سُورج پہ لٹکتے ہُوئے میلے بادل

کسی طوفان کی آمد کا پتا دیتے ہیں"

یکم جنوری ۱۹۶۰ء
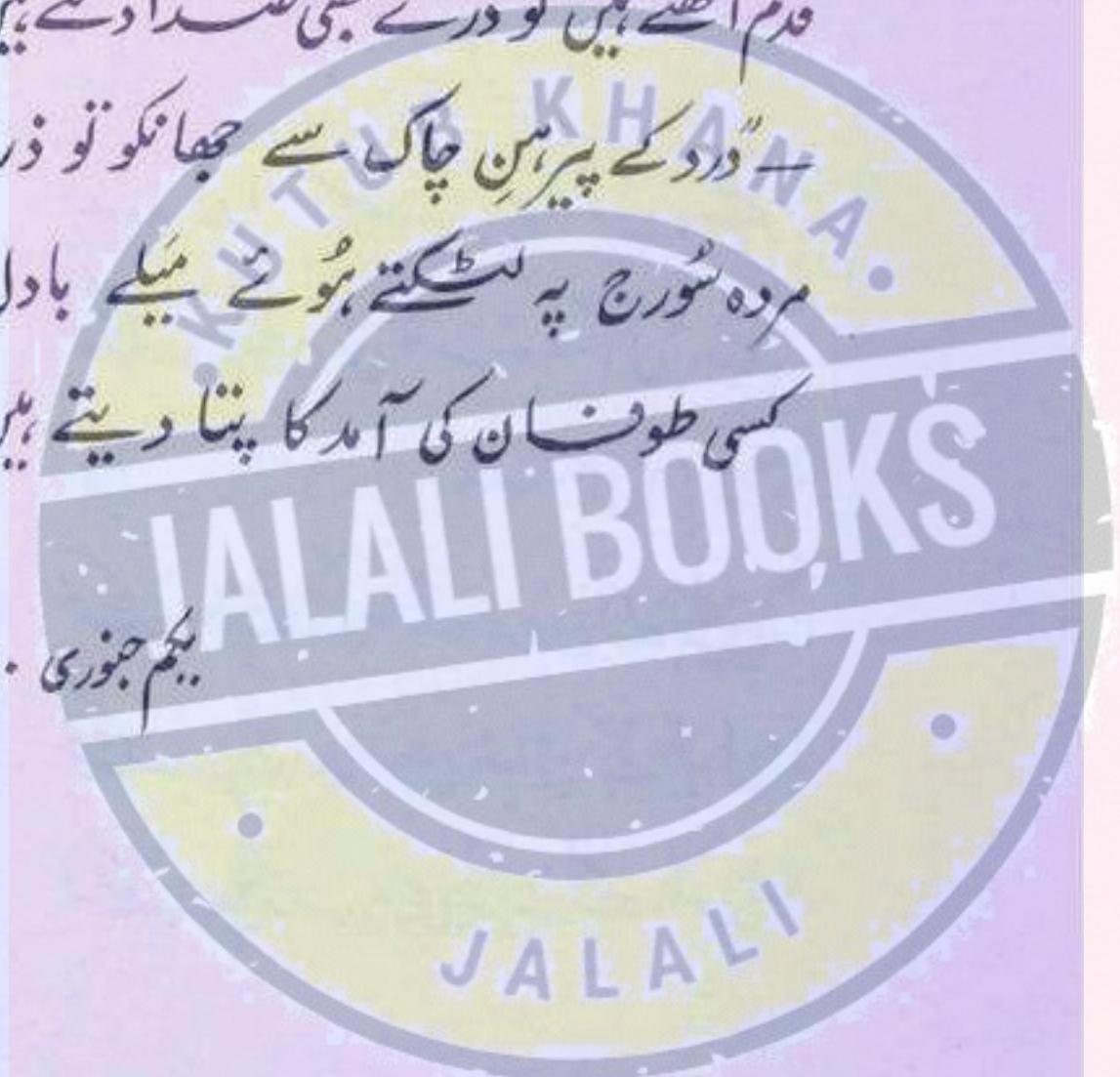
خشک پتّے

جب ذرا تیز ہوا آتی ہے
خشک پتّوں کی صدا آتی ہے

خشک پتّے — مرے عمروں کے رفیق
خشک پتّے — مری تنہائی کے پھول
خشک پتّے — مری غیرت کے اصول

گوشۂ گلشنِ ویراں کا سکوت
اتنا پُر ہول — جیسے اِک لاش
شب کی باہوں میں لٹک کر رہ جائے
چاندنی اس کا کفن ہو گویا

چار جانب سے اُبلتی ہُوئی موت
سانس کو روک کے چلتی ہُوئی موت
یک بیک ذہن پہ دستک دے کر
خشک پتّوں نے پکارا مجھ کو

باغ اُجڑا ہو کہ آباد رہے
ذہن اس فکر سے آزاد رہے
کہ یہاں اب نہ چلیں گے جھونکے
اور جو چیز جہاں رکھی ہے
حشر کے دن بھی وہیں دیکھو گے"
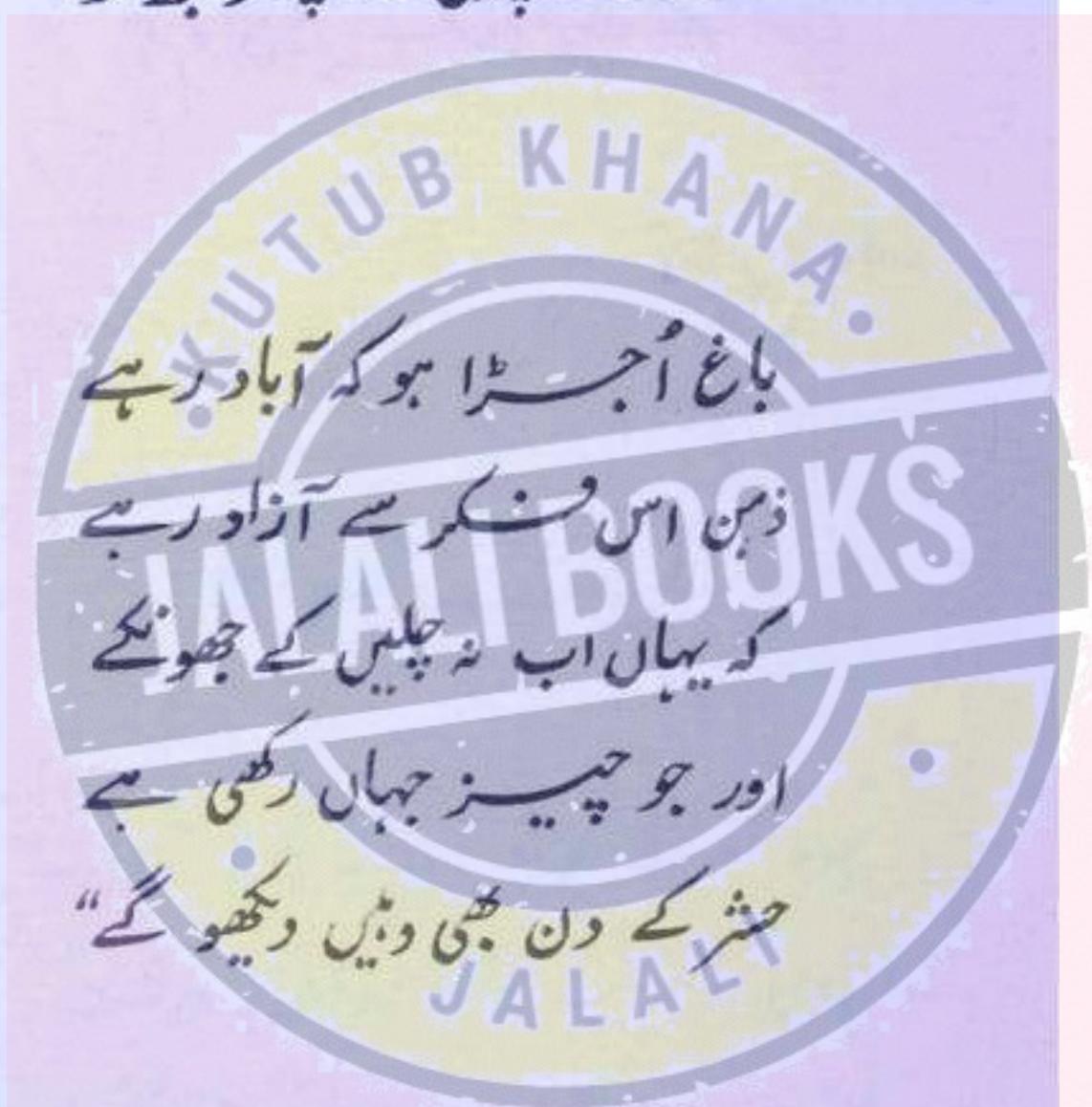
فصلِ گُل ہو کہ خزاں کی رُت ہو
جب ذرا تیز ہوا آتی ہے
وقت کی آہٹیں گُونج اُٹھتی ہیں
خشک پتّوں کی صدا آتی ہے

"ہم ترے پاس بھی ہیں، ساتھ بھی ہیں
ہم وہی ہیں — ترے عمروں کے رفیق
ہم وہی ہیں — تری تنہائی کے پھول
ہم وہی ہیں — تری غیرت کے اصول"

اکتوبر ۱۹۵۹ء

ایک جھونکا
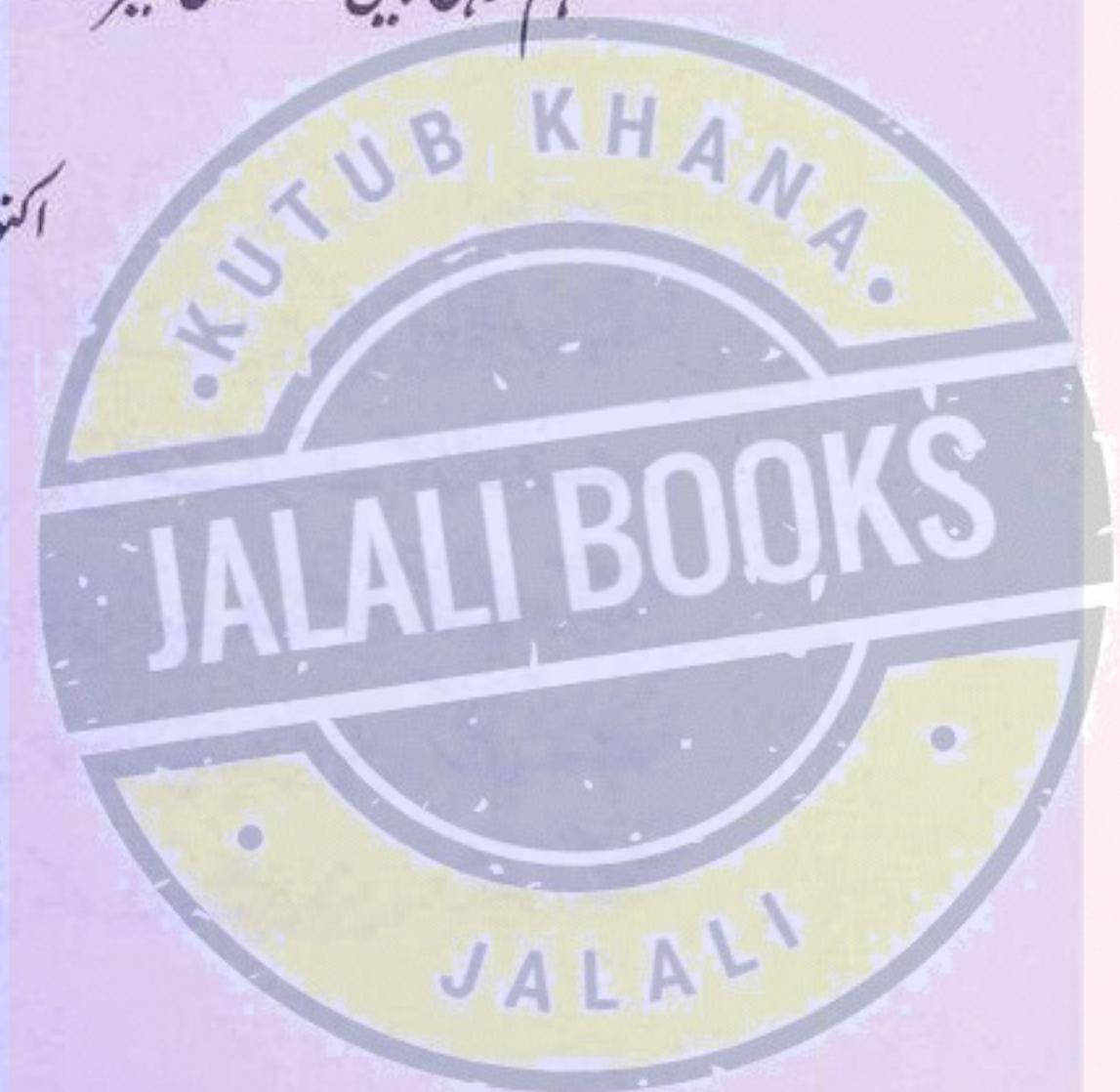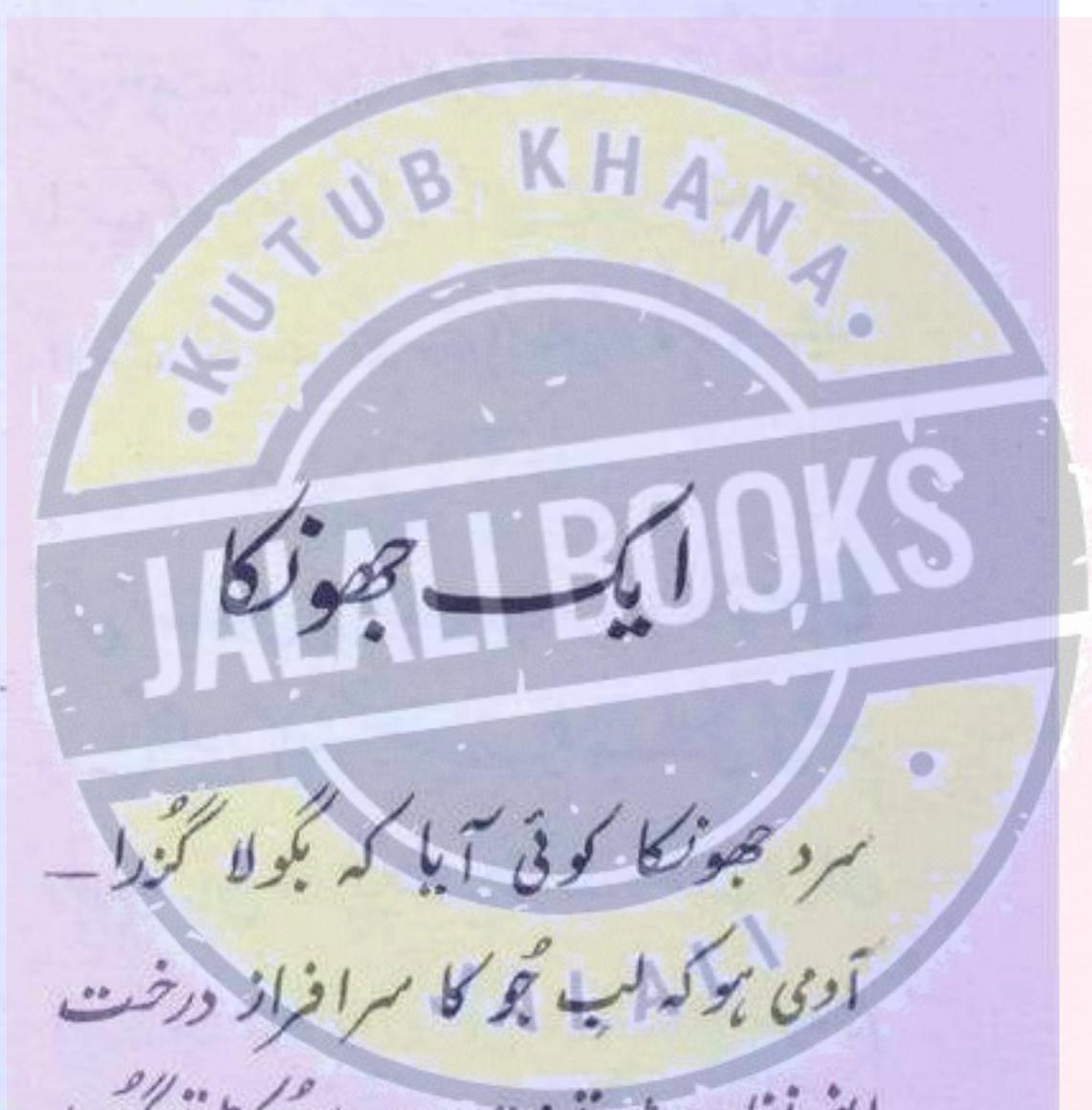
سرد جھونکا کوئی آیا کہ بگولا گزرا
آدمی ہو کہ لبِ جُو کا سرافراز درخت
اپنی نظروں میں تو قدموں سے اُکھڑتا گزرا
سر جھکاتے ہوئے، سوئے ہوئے گُل یوں چونکے
جیسے بھونچال میں جاگ اُٹھتے ہیں پیڑوں پہ پرند
اور چلاّتے ہیں یوں گونجتی خاموشی میں
جیسے بستی سے بپھرتا ہوا دریا گزرا

دُھوپ جھلّا کے نکلتی ہے تو ابر آتا ہے
مینہ برستا ہے تو بڑھ جاتا ہے ماحول کا حبس
شب کی تو بات ہی کچھ اور ہے، آخر شب ہے
دن کو ہر چیز کا ملبوس اُتر جاتا ہے
میری تہذیب کا پردہ، مری قدروں کا نقاب
سانپ کی کینچلی بن کر، کسی چورا ہے پر
آدھے جاگے ہُوئے انسان کو دہلاتا ہے

کن تضادوں میں تپاں ہے مری پروازِ خیال
دستِ تخلیق کی زنجیرِ طلائی کی قسم
ابھی انساں سے پوشیدہ ہے انساں کا جمال
ایک کہتا ہے غزل، ایک بناتا ہے بم
ایک کو دل بھی بہت، ایک کو آفاق بھی کم
اور پسِ ظلمتِ تہذیب، کئی صدیوں سے
چاند بننے کو ہمکتے ہیں محبت کے ہلال

مئی ۱۹۵۹ء

پس پردہ

کیسا بپھرا ہُوا سنّاٹا ہے

ہانپتے ہونکتے جھونکوں کی قسم

تیرہ و تار افق، بر اشجار

رقص کرتے ہُوئے جنّات کے خم

گڑ گئی سینۂ آفاق میں رات

کٹ گئے وقت کے بے چین قدم

چمک اے چودھویں شب کے مہتاب

عالم افروز ہیں تیرے دم خم
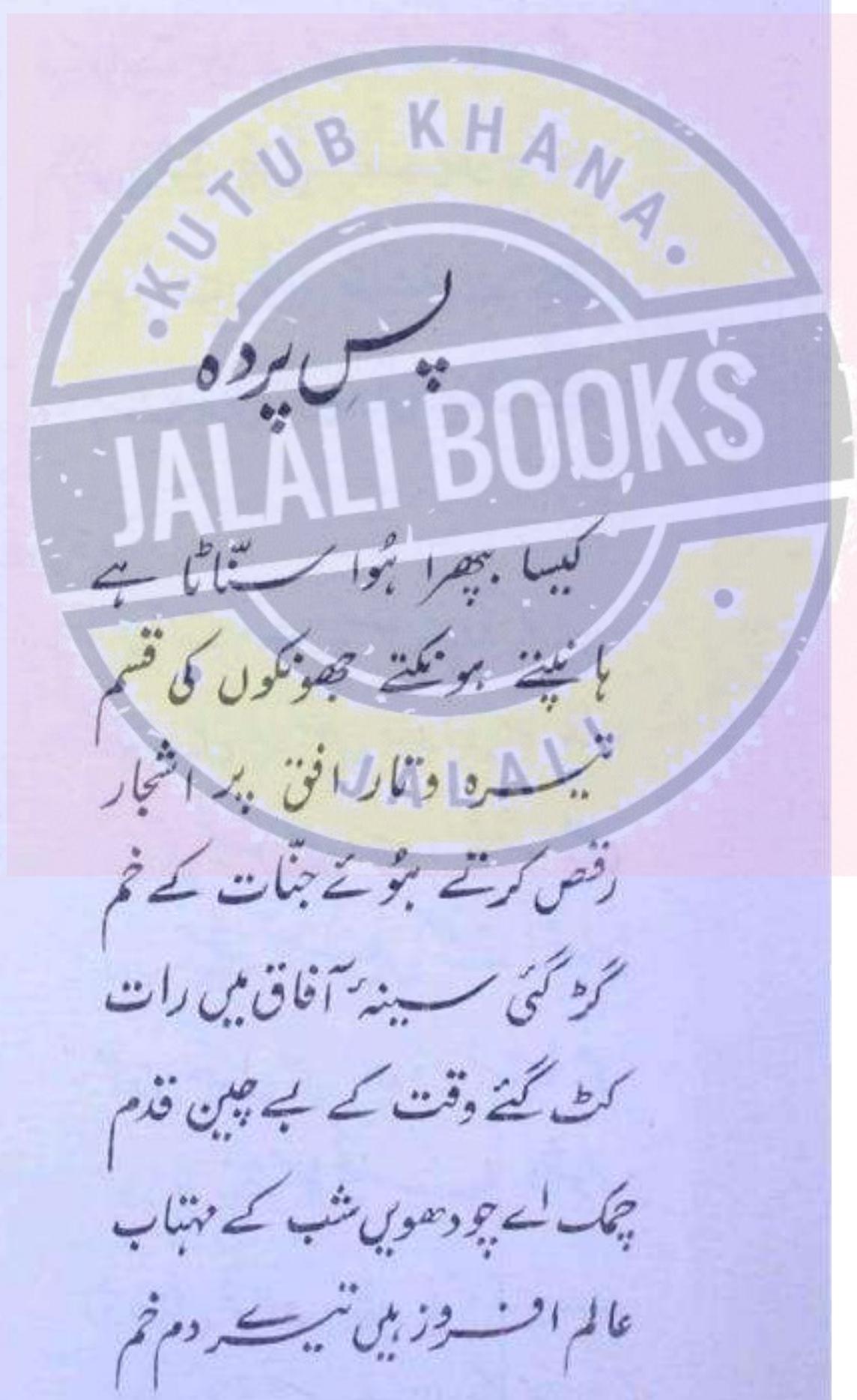
چاند کہتا ہے پسِ پردۂ ابر
کون ظلمات کی دلدل میں پھنسے
ہیں کوئی لالۂ صحرا تو نہیں
کون سنسان فضا میں چمکے

کون آسیب سے رشتہ باندھے
کون ٹوٹی ہوئی قبروں پہ ہنسے
کیوں مرا خُونِ جگر مُفت بہے
چاندنی کیوں مری بیکار لُٹے

ذہن کہتا ہے پسِ پردۂ کرب
"ایک پل پر نہیں صدیوں کا مدار
زندگی جھیل بھی ہے، چشمہ بھی
اور چشمے نہیں تھمتے زنہار
آدمی پھول بھی ہے، کانٹا بھی
اور کانٹے کا لچکنا دشوار
ڈھال فولاد بنے یا تہذیب
خالی جاتا نہیں تاریخ کا وار"
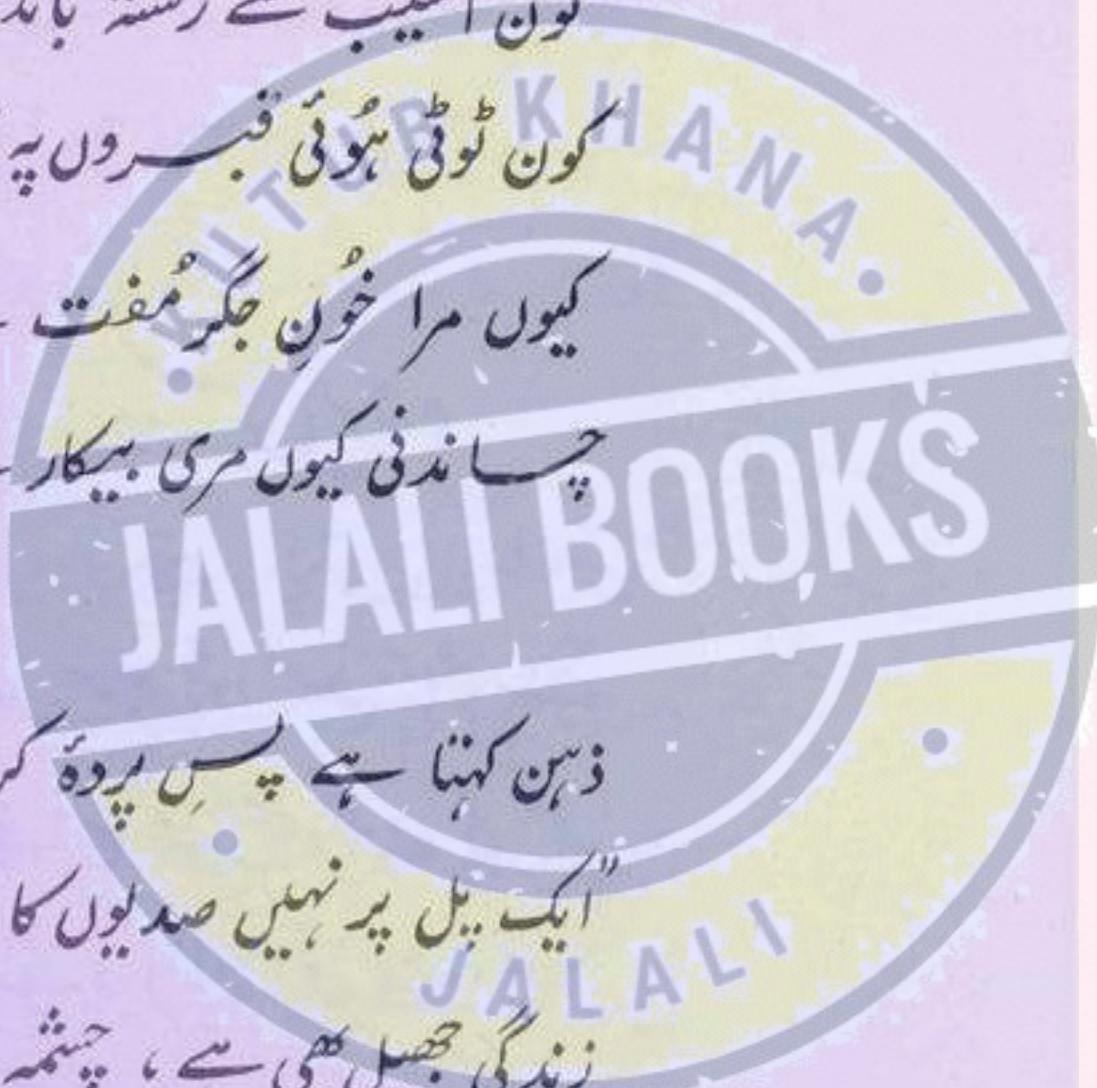
سوچتا ہوں میں پسِ پردۂ شب
گنگناتے ہوئے جھونکوں کی قسم

خواب آلود اُفق پر اشجار
رقص کرتی ہوئی لیلاؤں کے خم

سینۂ ارض کو۔۔ بوسوں کے گلاب
دے گئے۔۔ وقت کے بے چین قدم

ابر پر چاند کی میت اُبھری
صُبح نے لوٹ لیے سب دم خم

اپریل ۱۹۵۹ء
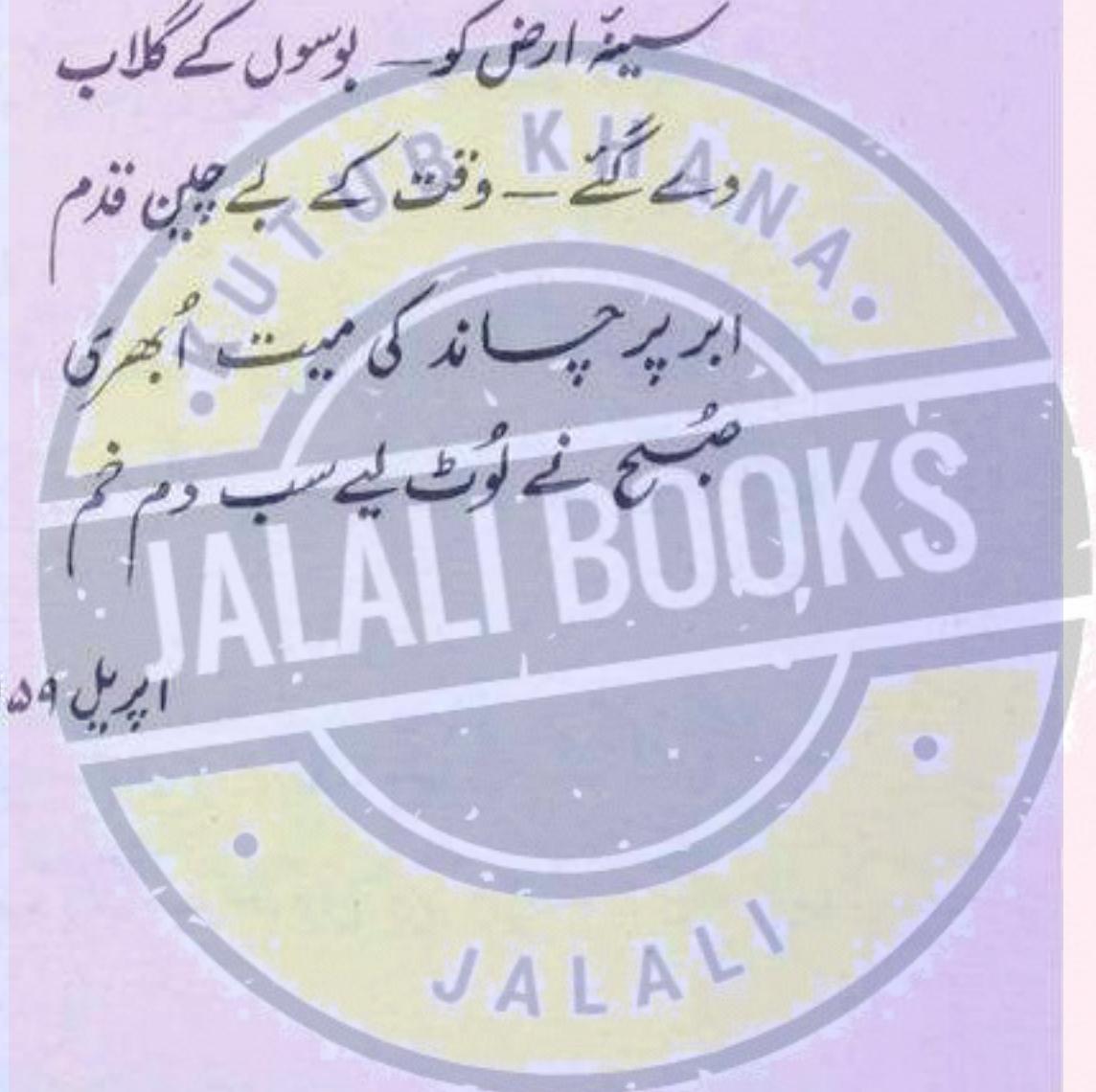
صبحِ آگہی

ایک ایسے دَور میں پیدا ہُوئی ہے پود اپنی
کہ ایک پل میں زمانے گزُرتے دیکھے ہیں

فنا کے دام میں اُلجھے ہُوئے غریب انسان
نظامِ شمس پہ یلغار کرتے دیکھے ہیں

بصیرتوں پہ رہی برق بار جن کی چمک
وہ آفتاب خلاؤں میں مرتے دیکھے ہیں

جنھیں فقط دلِ آدم کی تھی فضا محبوب
وہ زخم سینۂ مہ پر بکھرتے دیکھے ہیں

جو نصف شب کو سُنی ہے صدائے پائے سحر
تو دوپہر کو ستارے اُبھرتے دیکھے ہیں

زمین پر وہ قیامت کا دَور آیا ہے
کہ ہر بسیطِ حقیقت ہے جاں کنی سے دوچار

بساطِ ذہن پہ صرف ایک پھول کھلنے سے
ہٹی ہیں کتنی فصیلیں، کٹے ہیں کتنے حصار

بجھی ہیں کتنے بڑے فلسفوں کی قندیلیں
ملا ہے خاک میں کتنے علوم کا پندار

وہ آدمی جو نکالا گیا تھا جنّت سے
اُٹھا ہے بن کے قمر افگن و ستارہ شکار

ہیں لمحہ لمحہ کی زد میں صدی صدی کے اصول
کہ ہو رہی ہے نئی صبحِ آگہی بیدار

جنوری ۱۹۵۹ء

اشعار

ہم دن کے پیامی ہیں مگر کشتۂ شب ہیں
اس حال میں بھی رونقِ عالم کا سبب ہیں

ظاہر میں ہم انسان ہیں مٹی کے کھلونے
باطن میں مگر تند عناصر کا غضب ہیں

ہیں حلقۂ زنجیر کا ہم خندۂ جاوید
زنداں میں بسائے ہوئے اِک شہرِ طرب ہیں

چٹکی ہوئی یہ حسنِ گریزاں کی کلی ہے
یا شدّتِ جذبات سے کھلتے ہوئے لب ہیں

آغوش میں مہکو گے، دکھائی نہیں دو گے
تم نکہتِ گلزار ہو، ہم پردۂ شب ہیں

جنوری ۱۹۵۹ء

ایک رات

کل نصفِ شب کی تیرگیوں میں ترا خیال
ماضی کے بھُول کنجِ قفس میں سجا گیا
جس پر ٹھٹک گیا تھا مرا دل، ترا جمال
حالات کا وہ موڑ مجھے یاد آگیا
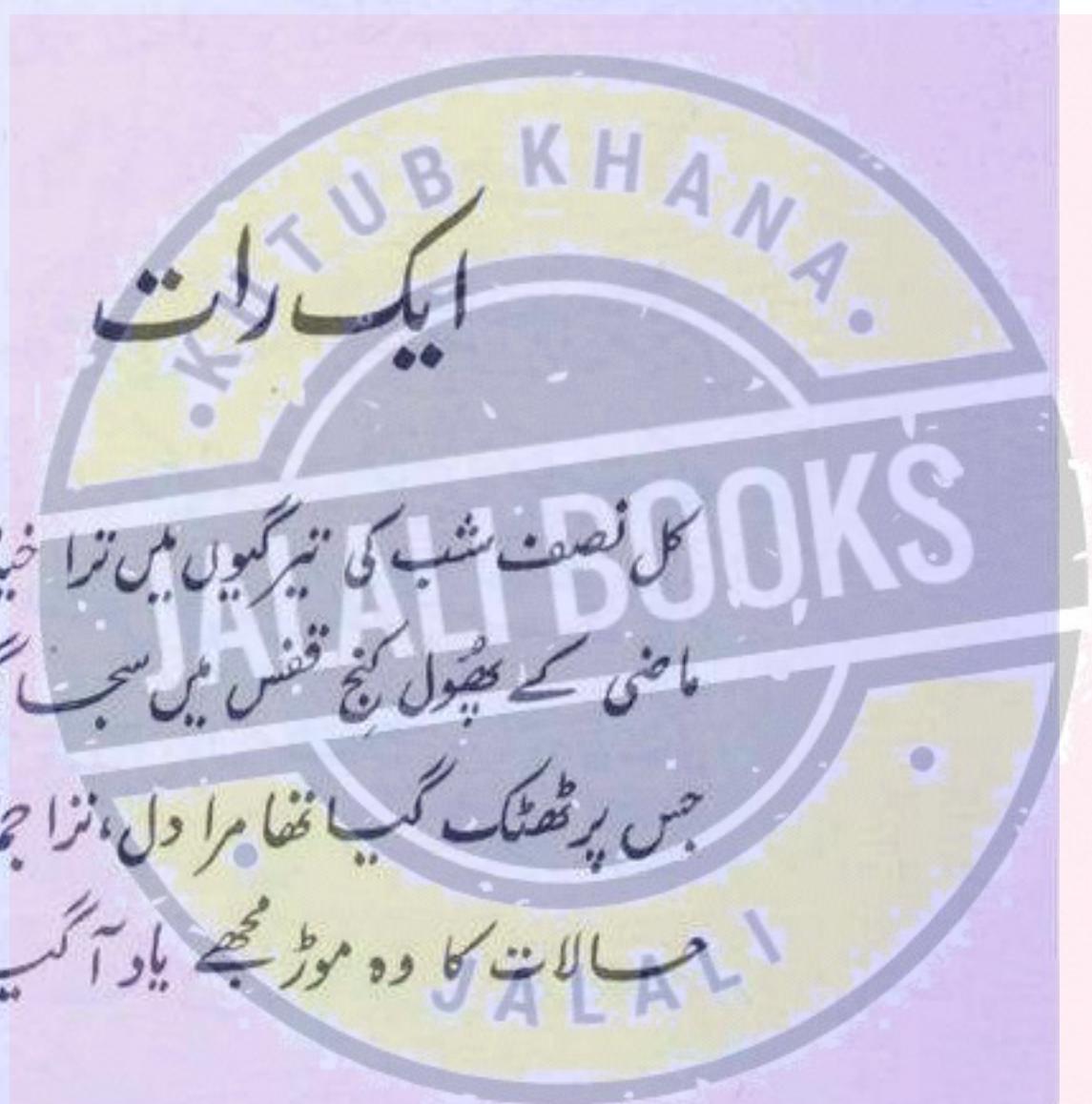
کِتنی لطیف تھی تری آنکھوں کی روشنی
کِتنی بسیط تھی مرے جذبات کی فضا
اتنا حواس گیر تھا وہ لمحۂ جمیل
تیرے سوا خدا کی خدائی میں کچھ نہ تھا

برسوں کے بعد آج بھی اے مبدۂ حیات
تو میری دوست بھی ہے، مری ہم سخن بھی ہے
تو میرا شعر، میرا افسانہ، مری زباں
تو میرا فن بھی ہے، مرا موضوعِ فن بھی ہے

جب بھی میں اپنے ذہن سے چھوتا ہوں تیرا جسم
مٹھی میں دیکھتا ہوں طنابیں حیات کی
ہو قفل کی کراہ کہ زنجیر کی پکار
کڑیاں ہیں اِک شکستہ و درماندہ رات کی

جنوری ۱۹۵۹ء
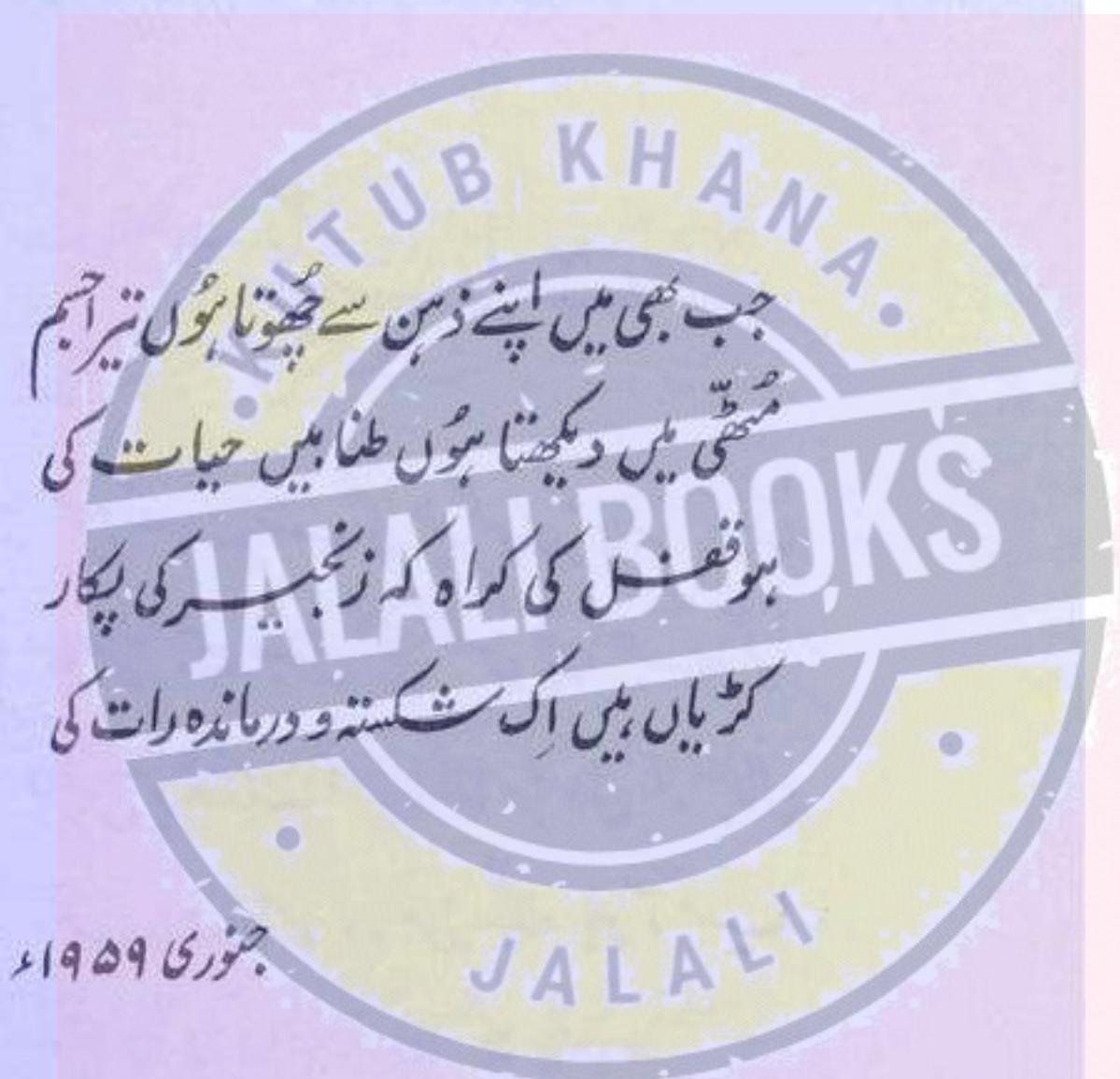
بارش

رات، بارش نے سقفِ زنداں پر
اس تسلسل کے ساتھ دستک دی
کہ اندھیرے کے انجماد کو بھی
یہ صدا گونج بن کے چیر گئی

ہر طرف پھیلتی، سمٹتی ہوئی
سر کشیدہ فصیل کی سوگند
میں تو سمجھا تھا، کنجِ زنداں میں
زیست کی ہیں تمام راہیں بند

آج لیکن حیات گاتی ہے
بند قفلوں کے اس دیار میں بھی
حسن فن کار کو پکارتا ہے!
سنگ و آہن کے اِس حصار میں بھی

دسمبر ۱۹۵۸ء

تضاد

کتنے کوسوں پہ جا بسی ہے تُو
ہَں، تجھے سوچ بھی نہیں سکتا

اِتنا بے بس ہُوں، تیری سوچ کو مَیں
ذہن سے نوچ بھی نہیں سکتا
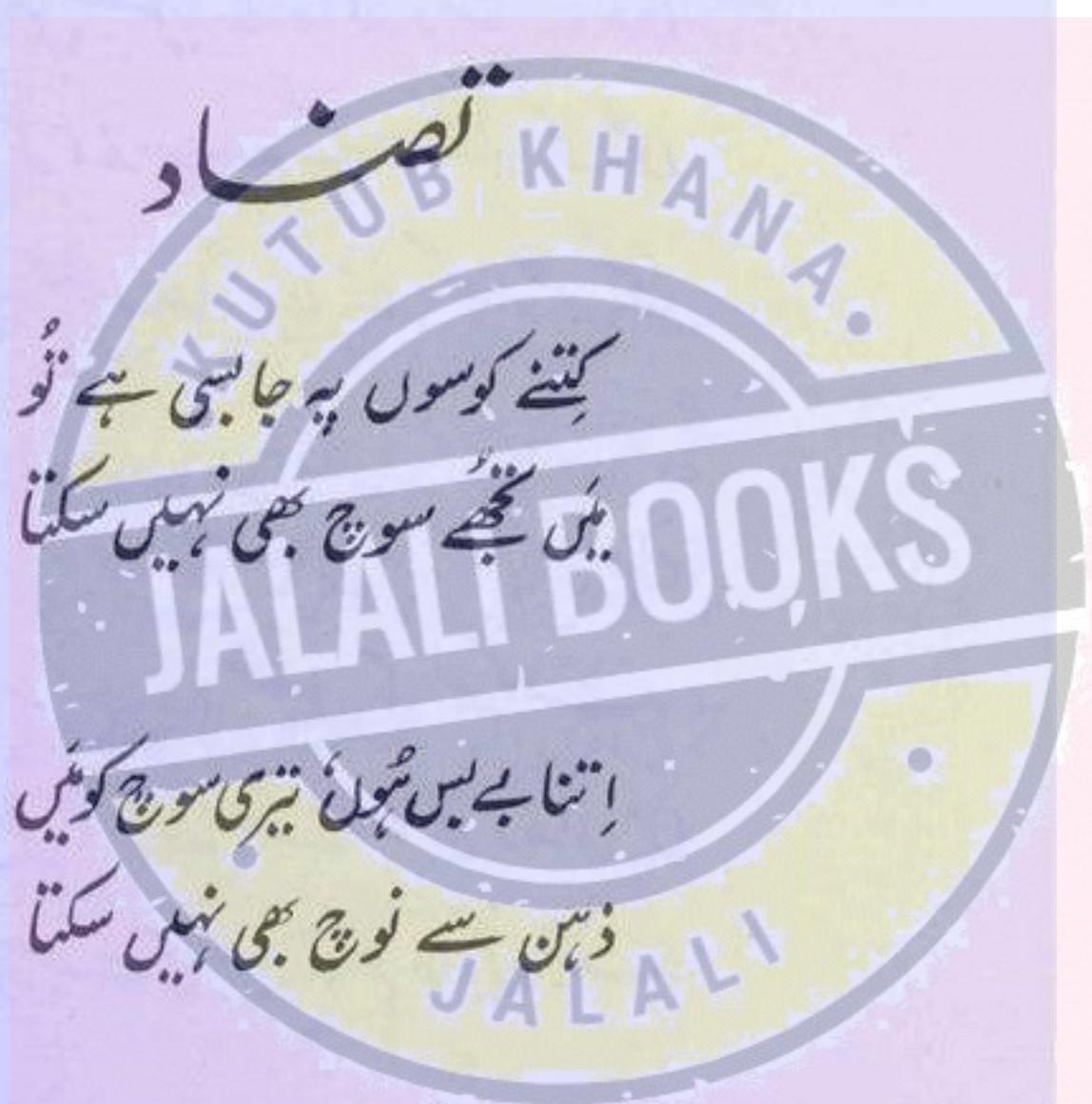
مُجھ سے تُو دُور بھی ہے، پاس بھی ہے
اور مُجھے یہ تضاد راس بھی ہے

اکتوبر ۱۹۵۸ء

دعوت

اے میری پرستشوں کی حقدار
آ، مَیں ترے حُسن کو نکھاروں

چہرے سے اُڑا کے گردِ ایّام
آ، مَیں تری آرتی اُتاروں!
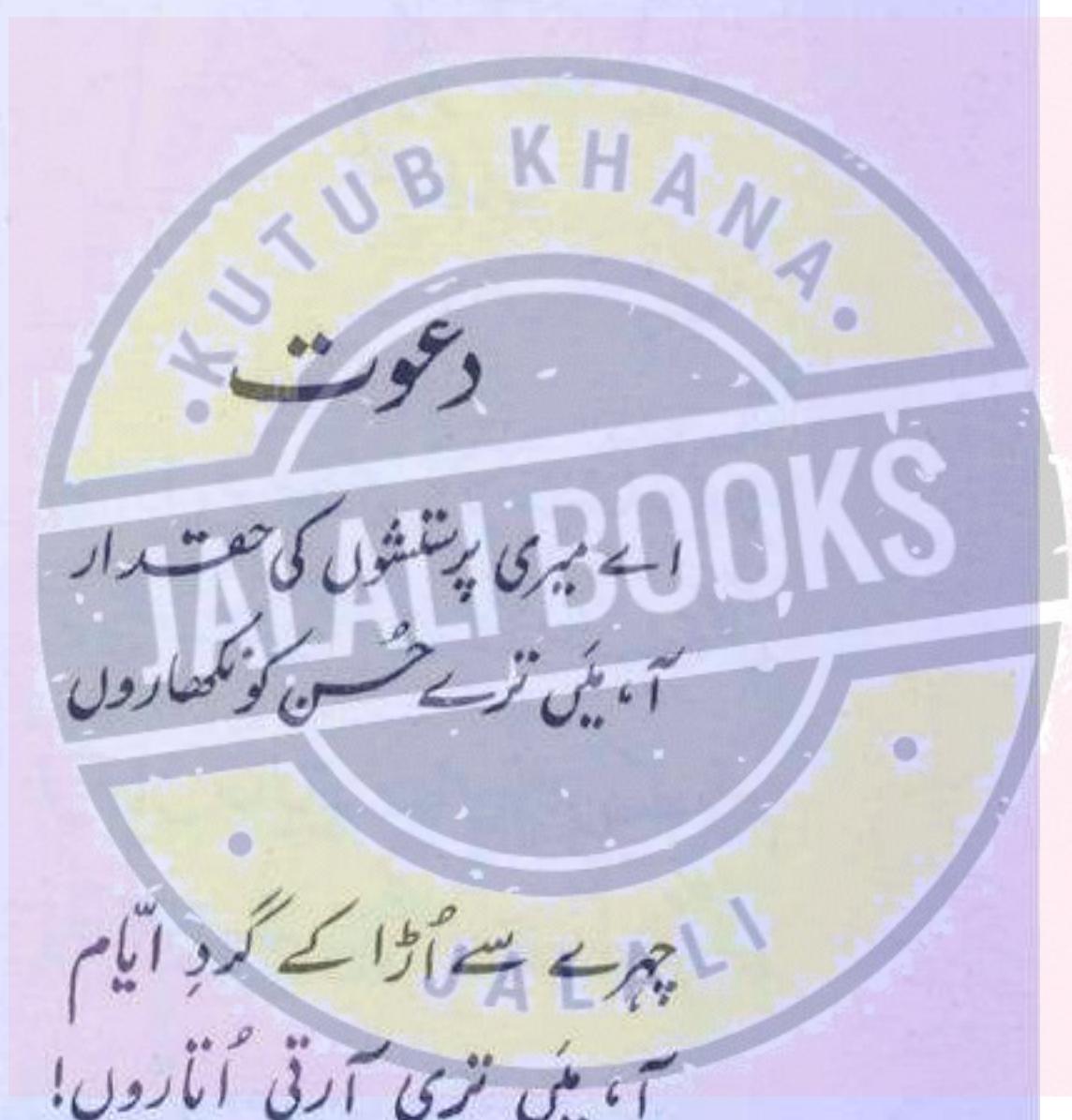
تُو میری زمیں بھی، آسماں بھی
مَیں تجھ کو کہاں کہاں پکاروں

اکتوبر ۱۹۵۸ء

کھنڈر

غنچۂ دل جو کھلا بھی، تو سرِ شام کھلا
کون ظلمت میں نکلتا ہے پئے نظارۂ گُل

تُو کہاں تھا کہ ترے دامنِ رنگیں کے لیے
ہاتھ پھیلائے رہی نکہتِ آوارۂ گُل
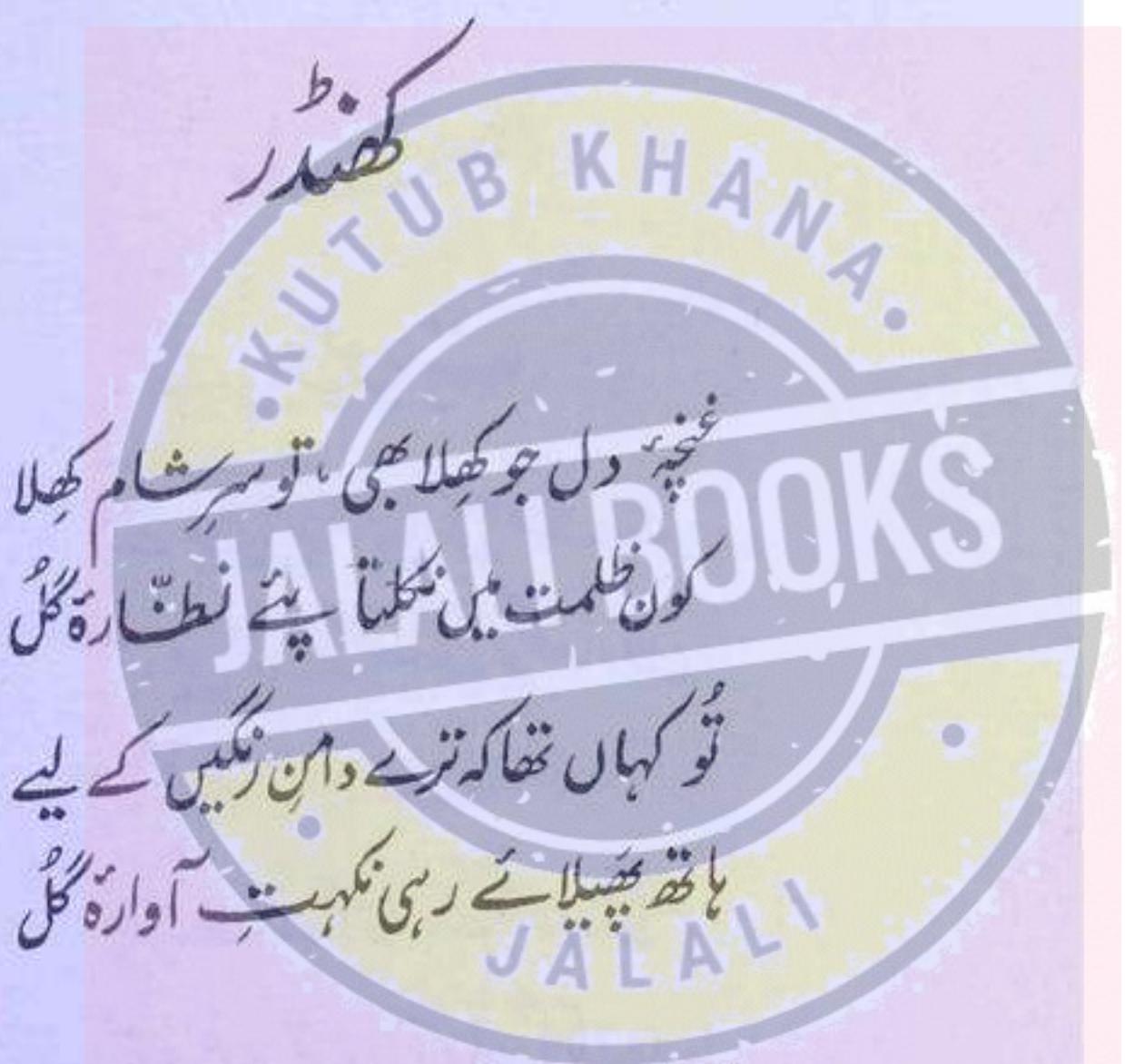
گردشِ وقت کو سُوجھی ہے نرالی تمثیل
جل رہی ہے مرے ماضی کے کھنڈر میں قندیل

اکتوبر ۱۹۵۸ء

ایک منظر

گنجان صنوبروں کے پیچھے
اِک چاند، ہزار چاند بن کر
تاروں کی طرح بکھر گیا ہے

اس سیلِ جمال کے سہارے
ماضی کے نشیب بھر گئے ہیں
ویرانۂ جاں سنور گیا ہے
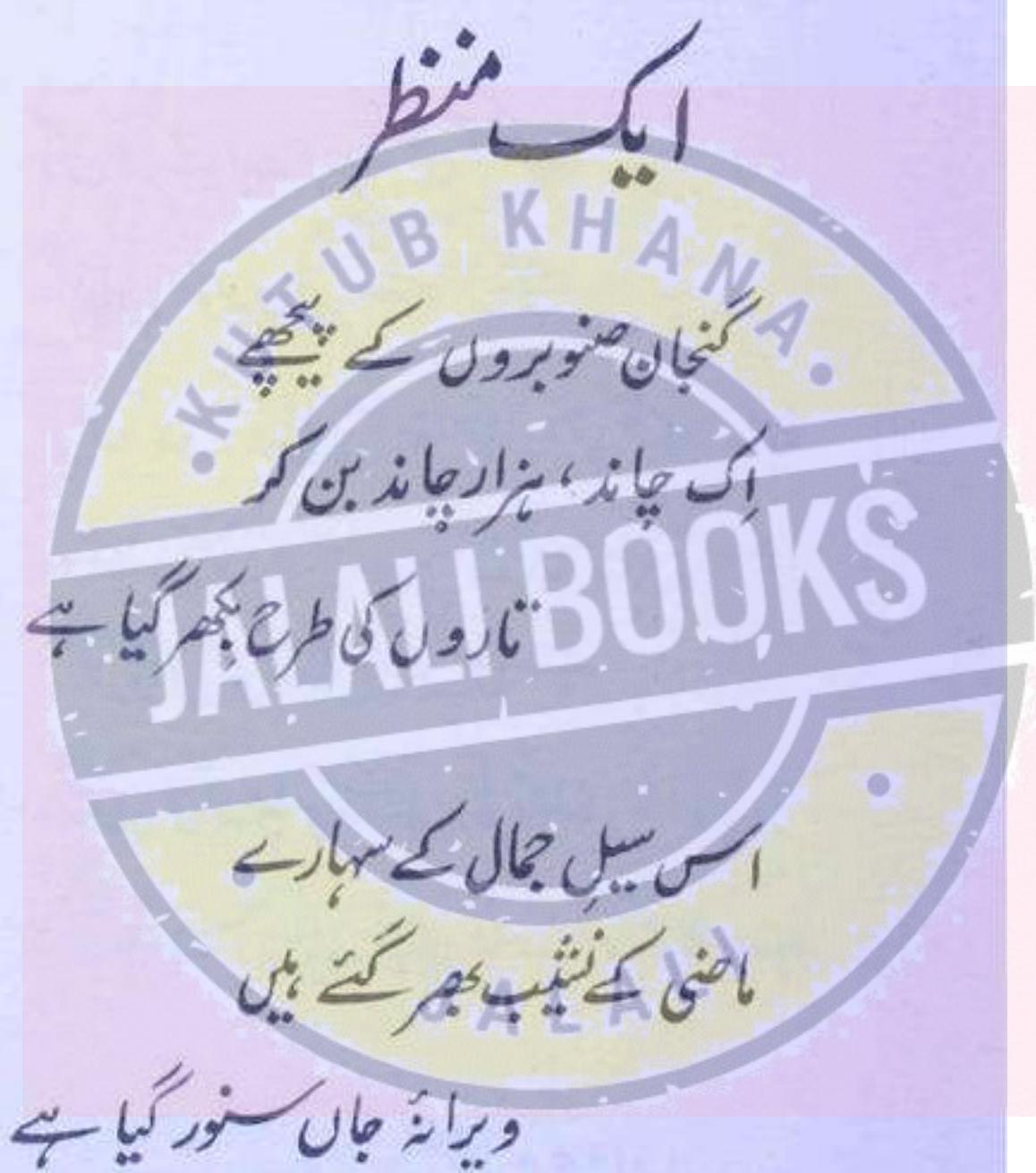
خوشبوئے حنا کا ایک پیکر
جلتی ہُوئی انگلیوں کی لَو سے
چھُوتا ہے لبوں کے جب کنارے

گھُل جاتے ہیں مصلحت کے اصنام
ہٹ جاتے ہیں قصرِ دل سے پہرے
آتے ہیں خیال پیارے پیارے

اِک عُمر کے بعد جب کھُلی آنکھ
گنجانِ صنوبروں کے پیچھے
چاند آخر کار اُتر چُکا ہے

گردش تو فضا میں گونجتی ہے
لمحوں کی تو چاپ سُن رہا ہُوں
میرے لیے وقت مر چُکا ہے

ستمبر ۱۹۵۸ء

ہم

بادا کشِ حق میں زینتِ زنداں ہمیں تو ہیں
اِس تیرگی میں شمعِ فروزاں ہمیں تو ہیں

جس کا اُفق غروب کی لَو سے ہے تابناک
اے صُبحِ نو، وہ شامِ غریباں ہمیں تو ہیں
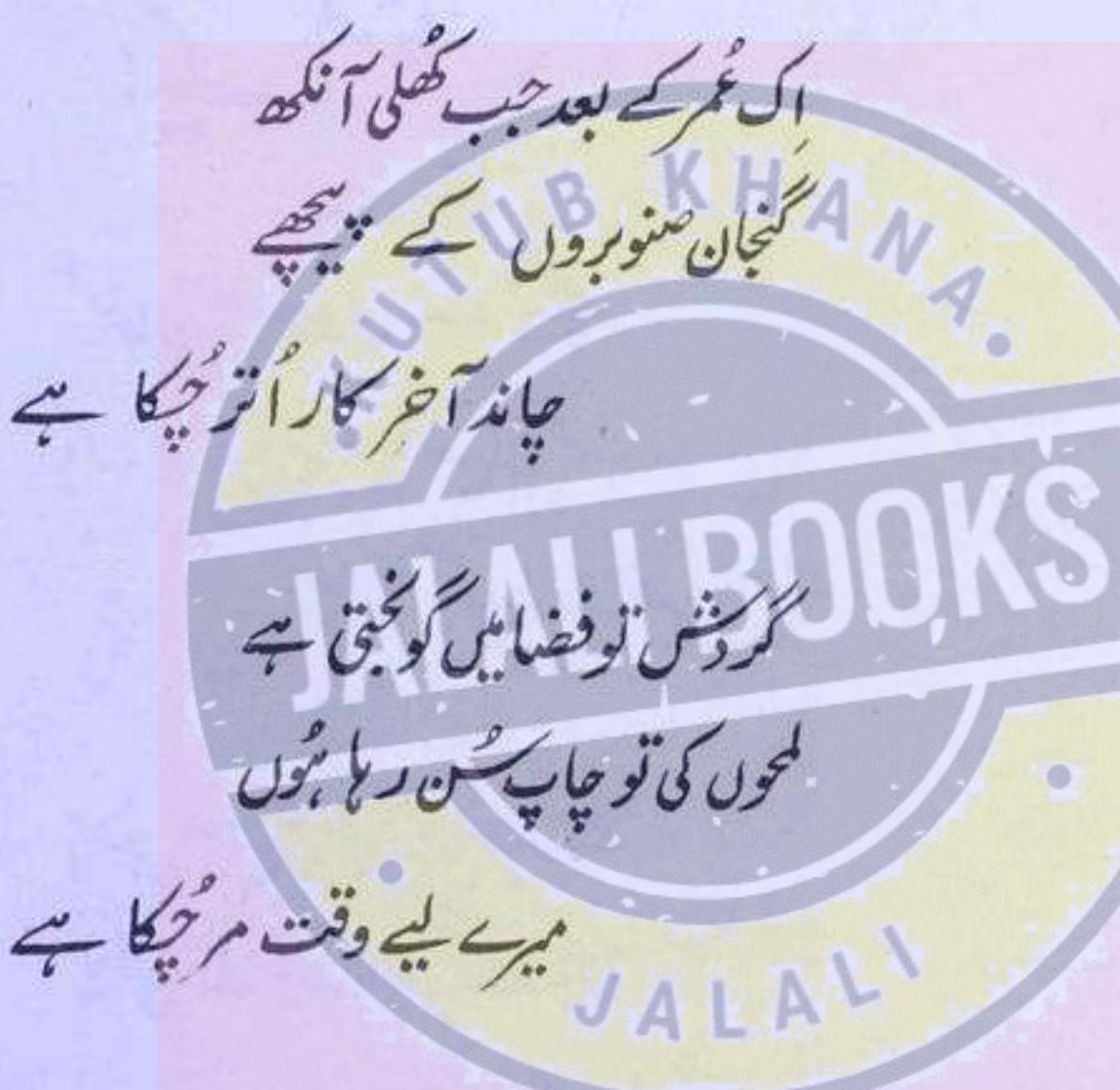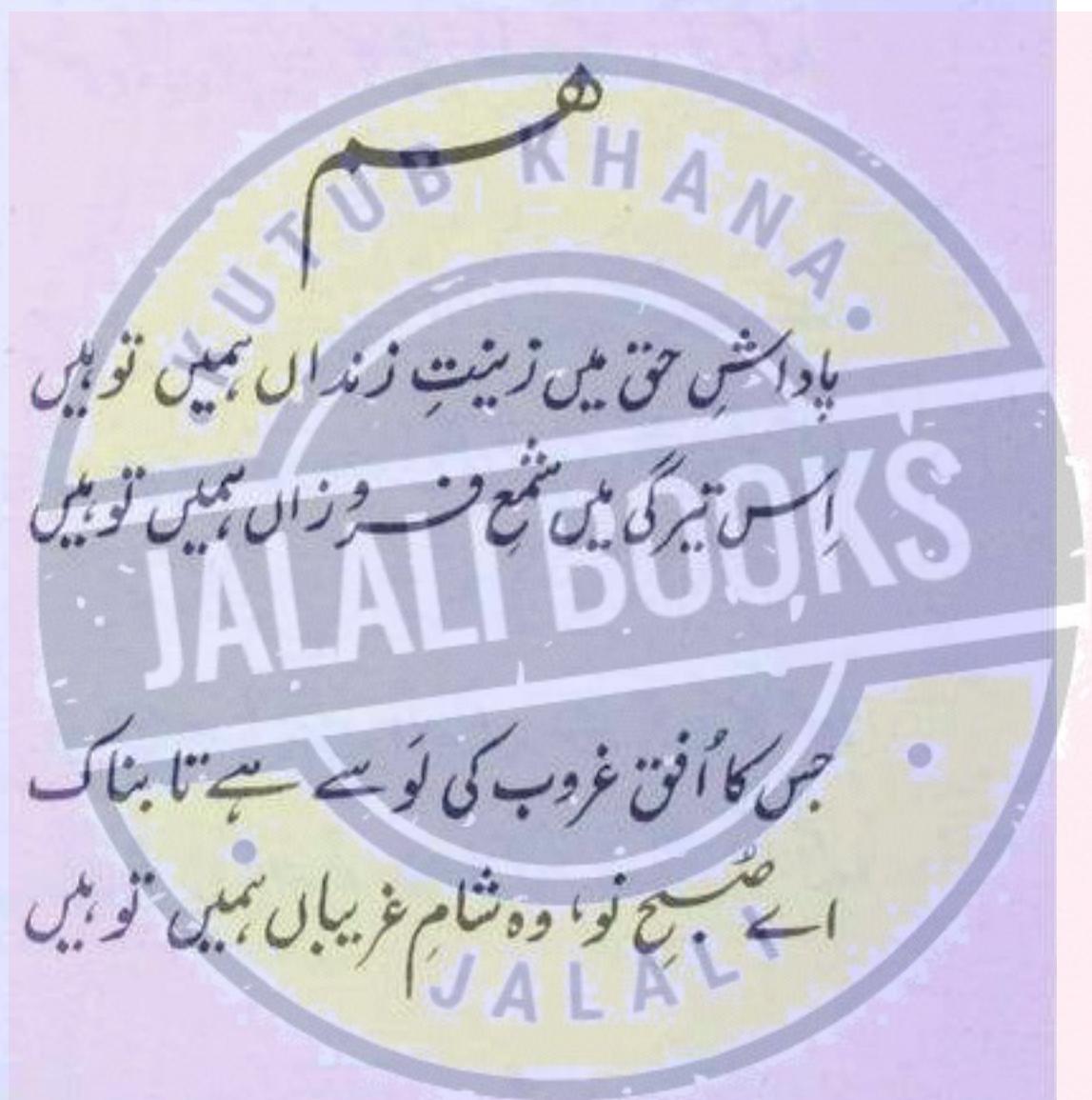
صدیوں سے، زندگی کے لباسِ حریر کا
جو چاک ہو رہا ہے، وہ داماں ہمیں تو ہیں

جو بھائیوں کی حرصِ تجارت میں بِک گئے
اے نظمِ نو، وُہ یُوسفِ کنعاں ہمیں تو ہیں

کہتے پھریں غبارِ سفر ہم کو اہلِ دہر
لیکن جبینِ دھر کی افشاں ہمیں تو ہیں

ہم جل رہے ہیں اپنی امنگوں کی آگ میں
اس جشنِ حریّت کا چراغاں ہمیں تو ہیں

جس میں لہو کی بُوند گراں تر ہے تخت سے
تھامے ہُوئے وہ عدل کی میزاں ہمیں تو ہیں

آئینۂ صباحتِ انساں ہے جن کا فن
اے روحِ عصرِ نو، وہ غزل خواں ہمیں تو ہیں

اگست ۱۹۵۸ء

یاد

کتنا تاریک ہے اس شب کا گھنا سناٹا

چاند نکلا ہے مگر چاند کی ایک ایک کرن
نوکِ نشتر کی طرح دل میں اتر جاتی ہے
اور جب حد سے گزر جاتی ہے سینے کی جلن
چاند بجھ جاتا ہے اور چاندنی مرجاتی ہے
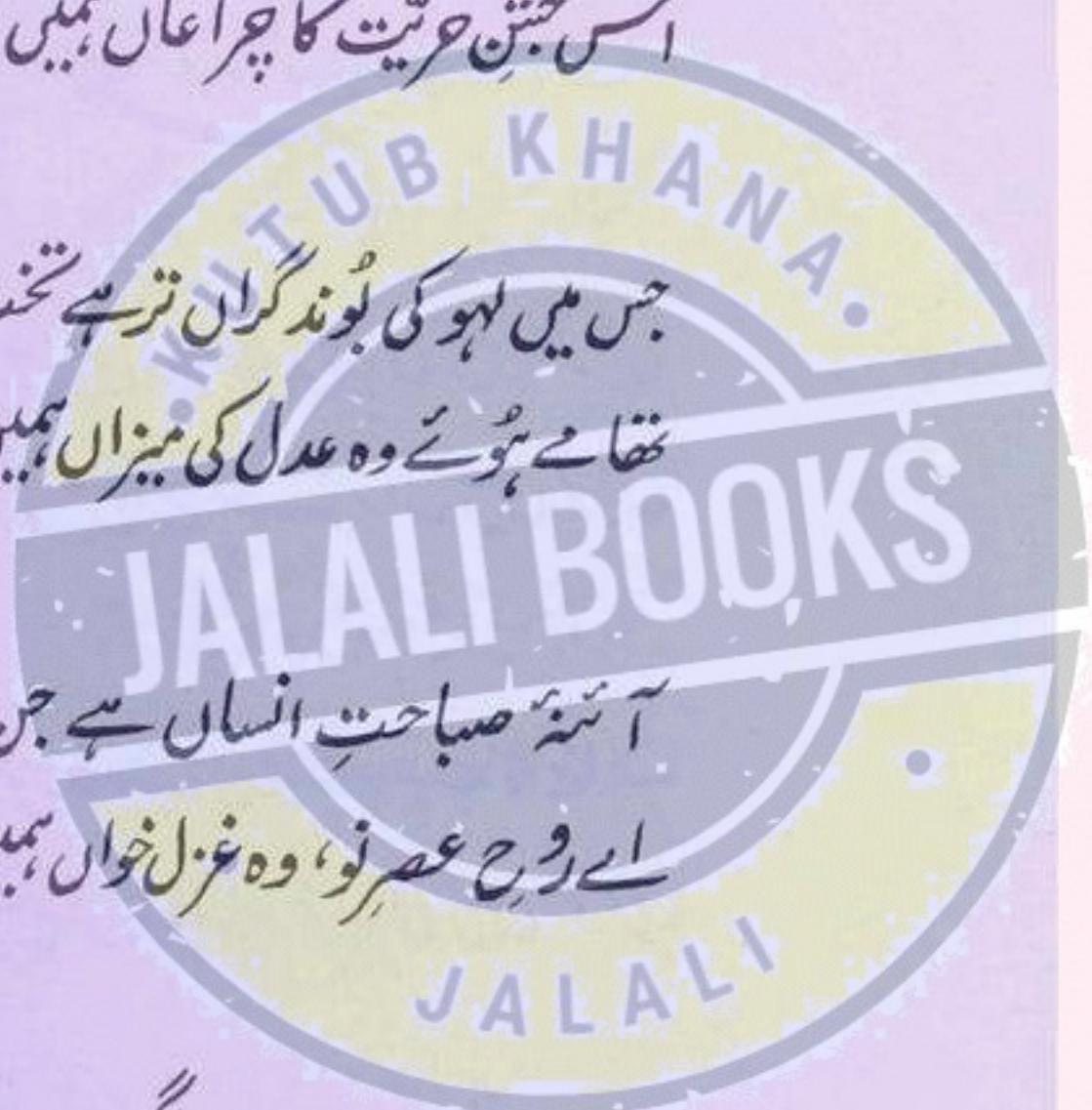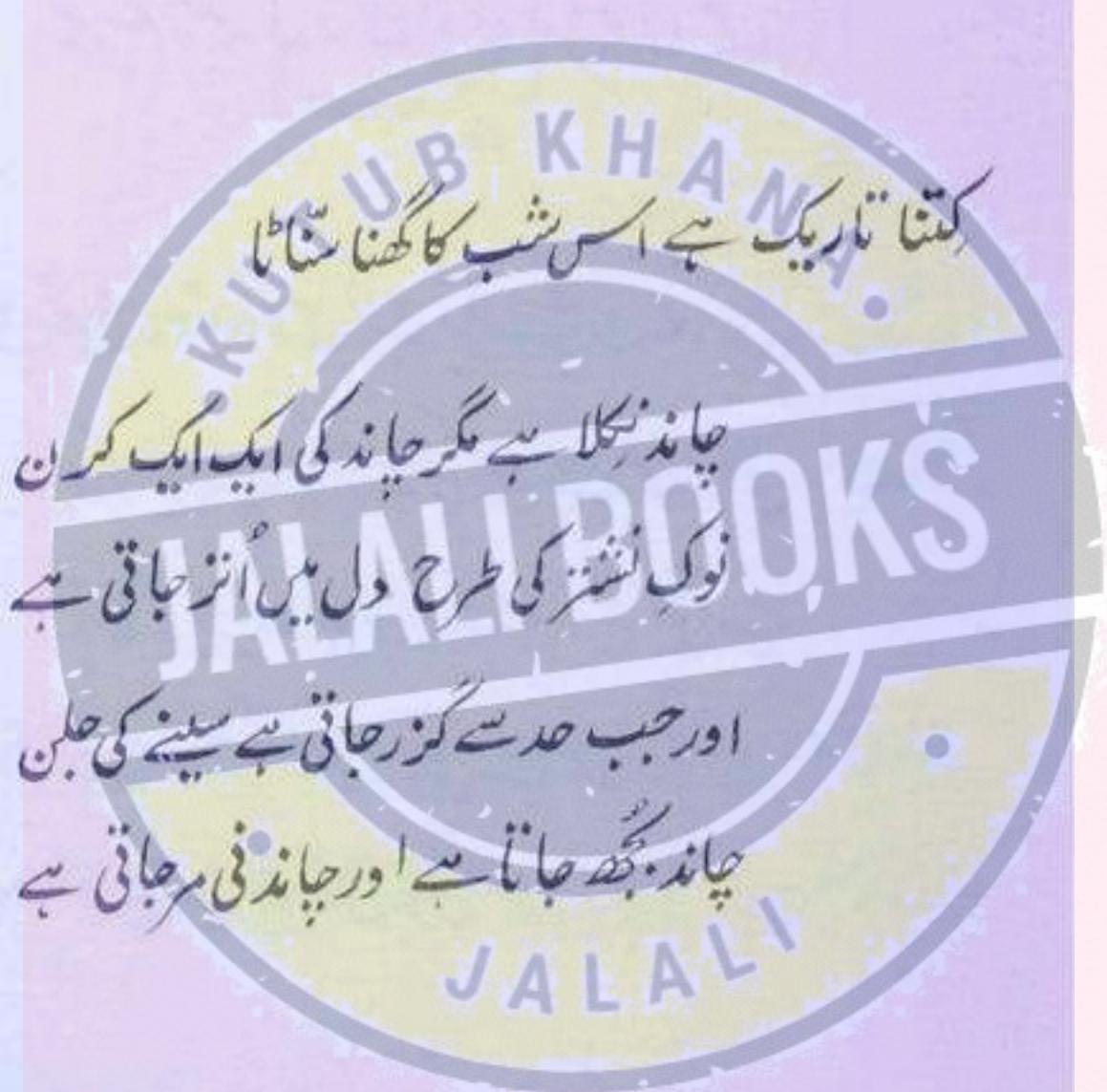
دشتِ دل سے جو نکلتی ہے گزرگاہِ خیال
اپنے سینے پہ سجائے ہوئے یادوں کے نشاں
آج اک زخم کی مانند ابھر آئی ہے
ایک اک پل میں سمٹ آئی ہیں کتنی صدیاں
ایک اک سانس مرا عالمِ تنہائی ہے

یوں تو ہر دَور میں جذبات کی رُت آتی ہے

جب تری یاد سے بھر جاتا ہے پیمانۂ جاں
تیری آہٹ اُمڈ آتی ہے مرے خوابوں میں
سرِ سجدہ نظر آتا ہے مرا شعرِ جواں
تیرے پیکر کی دمکتی ہوئی محرابوں میں

یوں تو کاٹے ہیں کڑے کوس تری فرقت کے

درد میں اب جو چمک ہے کبھی پہلے تو نہ تھی
آج تو تیرے خیالوں سے بھی آنچ آتی ہے
آج تو تیرا تصوّر بھی ہے گلدستۂ خار
آج تو یاد بھی اِک ہُوک سی بن جاتی ہے

آج کی شب، کہیں وہ شب ہی نہ لوٹ آئی ہو

اُٹھ سکی جس میں نہ خود وقت کے قدموں کی صدا
جس میں اِک عمر سے گُم ہے ترا پیمانِ وفا
جس میں جب چاند بھی اُبھرا تو دُھواں پھیل گیا
پاس جس کے، مری آنکھوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا

اگست ۱۹۵۶

ایشیا

ہر گئے دَور کا احتساب ایشیا، ہر نئے دَور کا اضطراب ایشیا
ظلمتِ شب کا دارالحساب ایشیا، صبحِ تہذیب کا آفتاب ایشیا

مدّتوں تک بر و بحر کے حکمراں، ایشیا ہی کے ٹکڑوں پہ پلتے رہے
یُوں تو مغرب کی نظروں میں ہے آج بھی صرف اِک خیمۂ بے طناب ایشیا
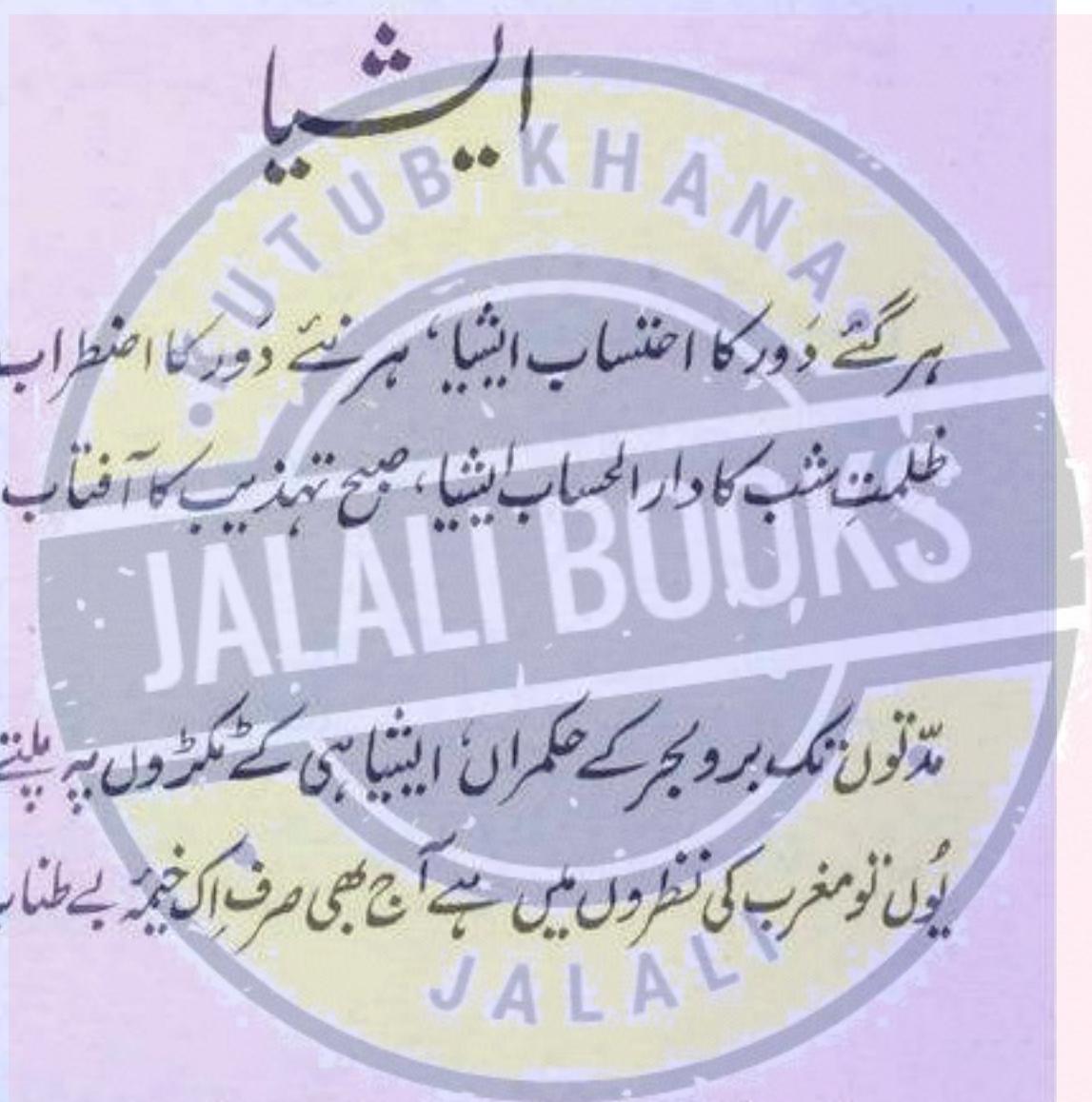
ابروؤں کے یہ خم، چِتونوں کے یہ بل، "صاحبوں" کے یہ انداز ہیں بے محل
جو سوال اسکی غیرت سے پُوچھے گئے، دے رہا ہے انہی کا جواب ایشیا

اے "جنونِ مکافات" کے ناخُدا، یاد گزرے ہُوئے وہ زمانے کرو
جب لہُو اس کے دل سے نچڑتا رہا۔ اور کھاتا رہا پیچ و تاب ایشیا

خلوتِ خاص میں ہے یہ کہرام کیوں، قصرِ عالی ہے لرزہ براندام کیوں
دیکھتا ہے خود اپنے کھنڈر میں اگر، عظمتِ آدمیت کا خواب ایشیا

گو بظاہر ابھی پیرہن چاک ہے، اس کے ہاتھوں میں میزانِ افلاک ہے
اب جو مانگو تو برگِ گلاب ایشیا، اور چھینو تو موجِ سرابِ ایشیا

جنسِ ناموسِ آدم کے سوداگرو، یہ صدی ہے مرے ایشیا کی صدی
چترِ شاہنشہی تھا منے کے عوض اب نہیں بیچتا خونِ ناب ایشیا

کل بھی تہذیبِ اخلاق کی مشعلیں پرتوِ ایشیا سے فروزاں رہیں
برق و جوہر کے اس دورِ تاباں میں بھی نوعِ انساں کا عہدِ شباب ایشیا

اگست ۱۹۵۸ء

جمیلہ

پا بہ زنجیر ہُوئی وقت کی رفتار کہاں !
جو کبھی کٹ نہ سکے، ایسی شبِ تار کہاں !

اے مرے جسم کو کانٹوں میں پرونے والے
ہے غلامی سے بھی بڑھ کر کوئی آزار کہاں !

مَیں نے جس راز کو سینے میں چھُپا رکھا ہے
سرِ دربار نہ کھولا تو سرِ دار کہاں !

وہ، جسے سایۂ سر بھی نہیں بہلا سکتا
اِس جنوں کو ہوسِ سایۂ دیوار کہاں !

---

٥ الجزائر کی مجاہدہ

سینچتے ہیں جنھیں خود اپنے لہو سے ہم لوگ
جا کے بِکتے ہیں وہ گُلشن سرِ بازار کہاں!

باندھے جاتے ہیں زبانوں پہ جہاں انگارے
وا ہُوا بھی تو ہمارا لبِ اظہار کہاں!

اے طلبگارِ صباحت! مرے گھر کی سرحد
ساحلِ قُلزمِ خوں ہے، خطِ گلزار کہاں!

مجھ پہ اُٹھا ہُوا خنجر ترے دل میں اُترا
جا کے ٹُوٹا ہے، ستمگر، ترا پندار کہاں!

فروری ۱۹۵۸ء

حُسن
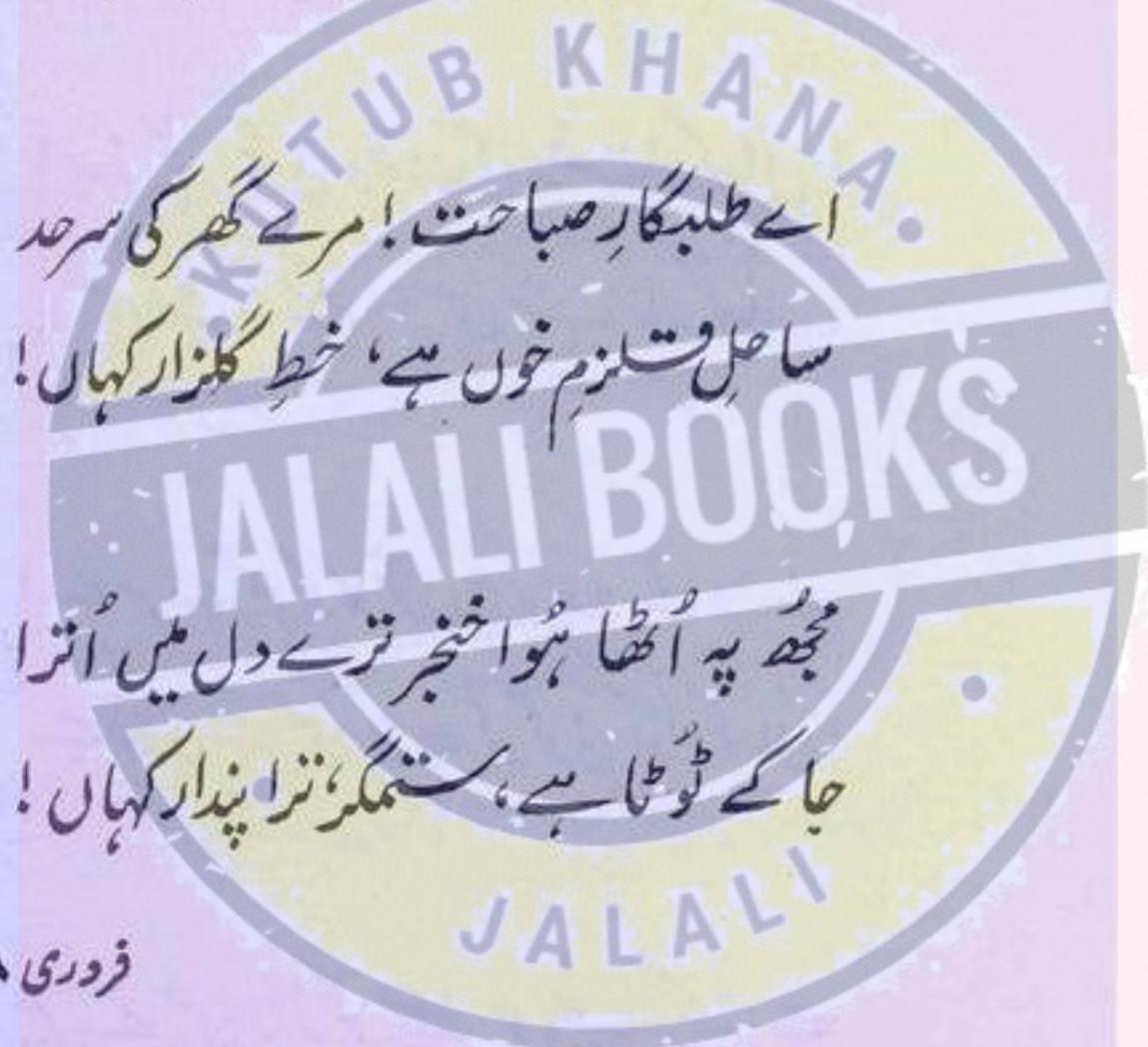
آج کس چیز سے بہلے مرا احساسِ جمال

کون چُومے یہ خراشوں میں نہائے چہرے

گھاؤ چُومے نہیں جاتے ہیں، بھرے جاتے ہیں

ہائے اِس دورِ جراحت کی یہ محبُوبائیں

مُسکراتی ہیں کہ زخموں کے دہن کھولتی ہیں

وہ بصد ناز، اِک انداز سے جب بولتی ہیں

ہڈیاں بجتی ہیں وجدان کے شمشانوں میں

اور اُفق تا بہ اُفق گونجتا ہے ایک سوال

آج کِس چیز سے بہلے مرا احساسِ جمال
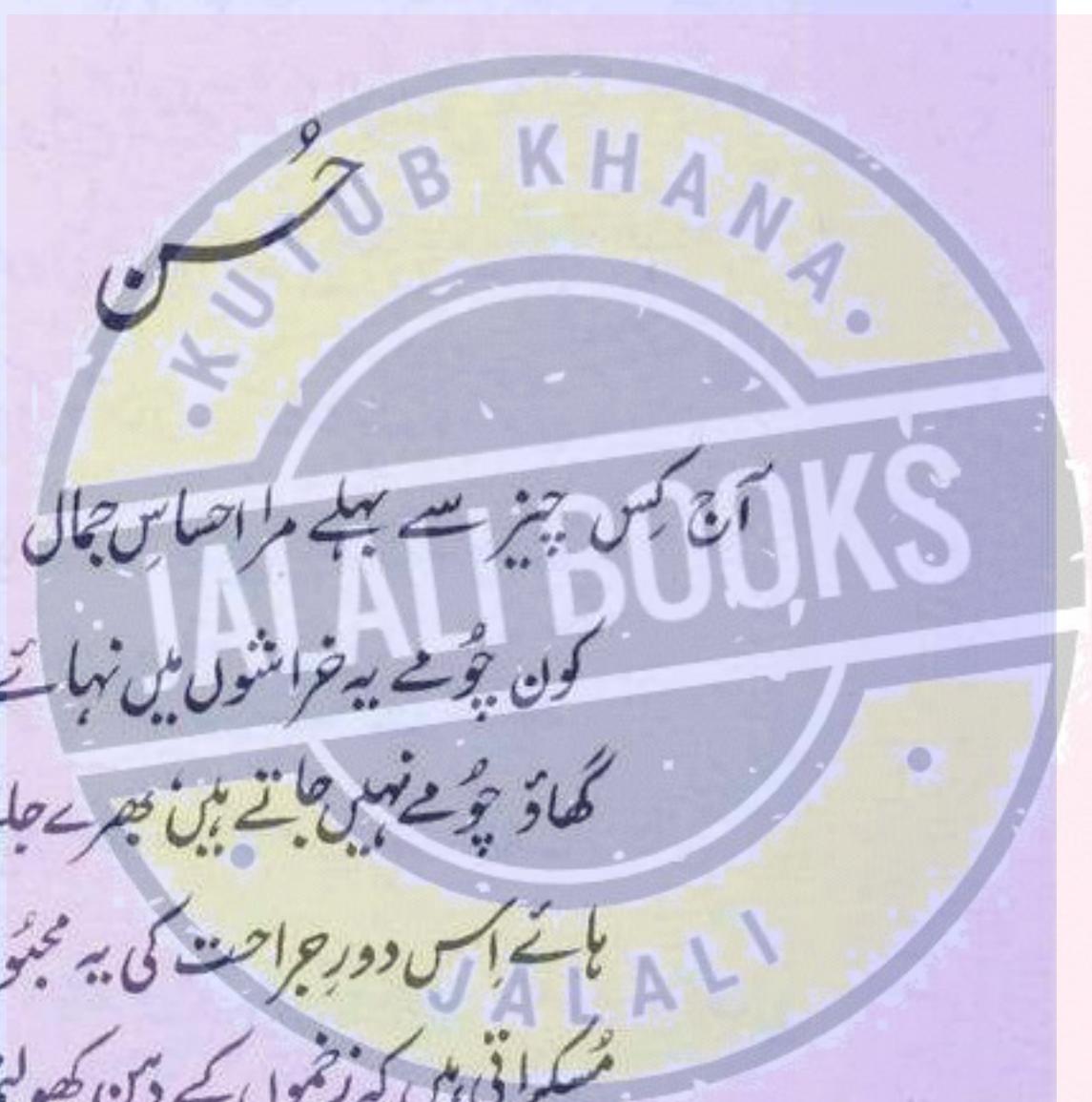
جسم پر خون سے چپکا ہُوا پیراہن ہے
جس کو لوگوں نے دیا چُستیٔ ملبوس کا نام

ان کی رفتار میں برسات کے نالے کا خروش
دندنا کر جسے چُپ چاپ اُتر جانا ہے

ان کے بازُو ہیں کہ چلتی ہُوئی تلواریں ہیں
جن کی دھاروں سے ہَوا تک بھی نہیں کٹ سکتی

ان کی گردن کا تناؤ ہے کہ فطرت کا اصُول
جو لچک جائے تو دُنیا میں قیامت آجائے

اور لچکے تو زمانے کو پتہ بھی نہ چلے
ان کا معیارِ حیا ہے کہ سرِ عرصۂ جنگ

اپنے ہی خون میں ڈوبے ہوئے سلطان کی ڈھال
آج کِس چیز سے بہلے مرا احساسِ جمال

حُسن ہی حُسن ہے اب تک مرے فن کی پُونجی
رُخِ معصُوم پہ اُمڈے ہُوئے جذبات کا حُسن

جس طرح صبح کو احساسِ طلوعِ خورشید
آنکھوں آنکھوں میں تمنّاؤں کے اظہار کا حُسن

ذہنِ شاعر میں کھِلے جیسے نئے شعر کا پھُول
لمس کی آگ میں دہکے ہُوئے رُخسار کا حُسن

وہ اٹکتے ہُوئے لہجے میں ادھوری باتیں
رنگ میں ڈوبا ہُوا جیسے مصوّر کا قلم
اپنی ہر جنبشِ موہوم پہ اِتراتا ہے

آج یہ حُسن کی تصویر ہے صرف ایک خیال
آج کِس چیز سے بہلے مرا احساسِ جمال

حُسن، تہذیب کی جاں، حُسن تمدّن کا نقیب
حُسن، سرمایۂ آسُودگیِ قلب و نظر

حُسن ہے کعبۂ فن، حُسن ہے انساں کا وقار
حُسن مٹ جائے تو اِس کارگہِ عالم پر

ایک اک لمحہ صدی بن کے مسلّط ہو جائے

کتنی صدیوں سے مَیں اس سوچ میں غلطاں ہُوں کہ لوگ

حُسن کے خول سے کس طرح بہل جاتے ہیں

خود فریبی کی مسرّت پہ یہ جینے والے

کیوں نہیں ڈھونڈتے کھلتے ہُوئے ہونٹوں میں نمی

پی چکی ہے جسے اِک عمر سے ماحول کی دُھوپ

کیوں نہیں دیکھتے آنکھوں میں جوانی کے چراغ

بُجھ کے ہر سمت دھُواں چھوڑ گئیں جن کی لویں

کیوں نہیں سوجھتی چہروں پہ بکھرتی ہُوئی بھوک

اور اُبھرتے ہُوئے خیرات کے قدموں کے نشاں

ہائے اس دورِ جراحت کی یہ محبُوب باتیں

مَیں انھیں دیکھ کے آنکھیں تو بھگو سکتا ہُوں

لیکن احساس کی وہ آنچ نہیں پا سکتا

جس میں تپ کر ہی نکھر سکتی ہے رعنائیِ فن

وہ مری غیرتِ فن کے لیے مہمیز تو ہیں

حسن کی پیاس مگر اور بڑھا جاتی ہیں
افقِ فن پہ اڑا جاتی ہیں اس فکر کی دھول

کیا یہی ہے مری پاکیزہ نگاہی کا مآل ؟
کیا یہی ہے مری تہذیب کی عالمگیری !

کیا یہی ہے مرے بے مثل تمدّن کا کمال ؟
آج کس چیز سے بہلے مرا احساسِ جمال !

فروری ۱۹۵۸ء

گجر بجا دو

(اسپوتنک ۲ کی پرواز کے روز)
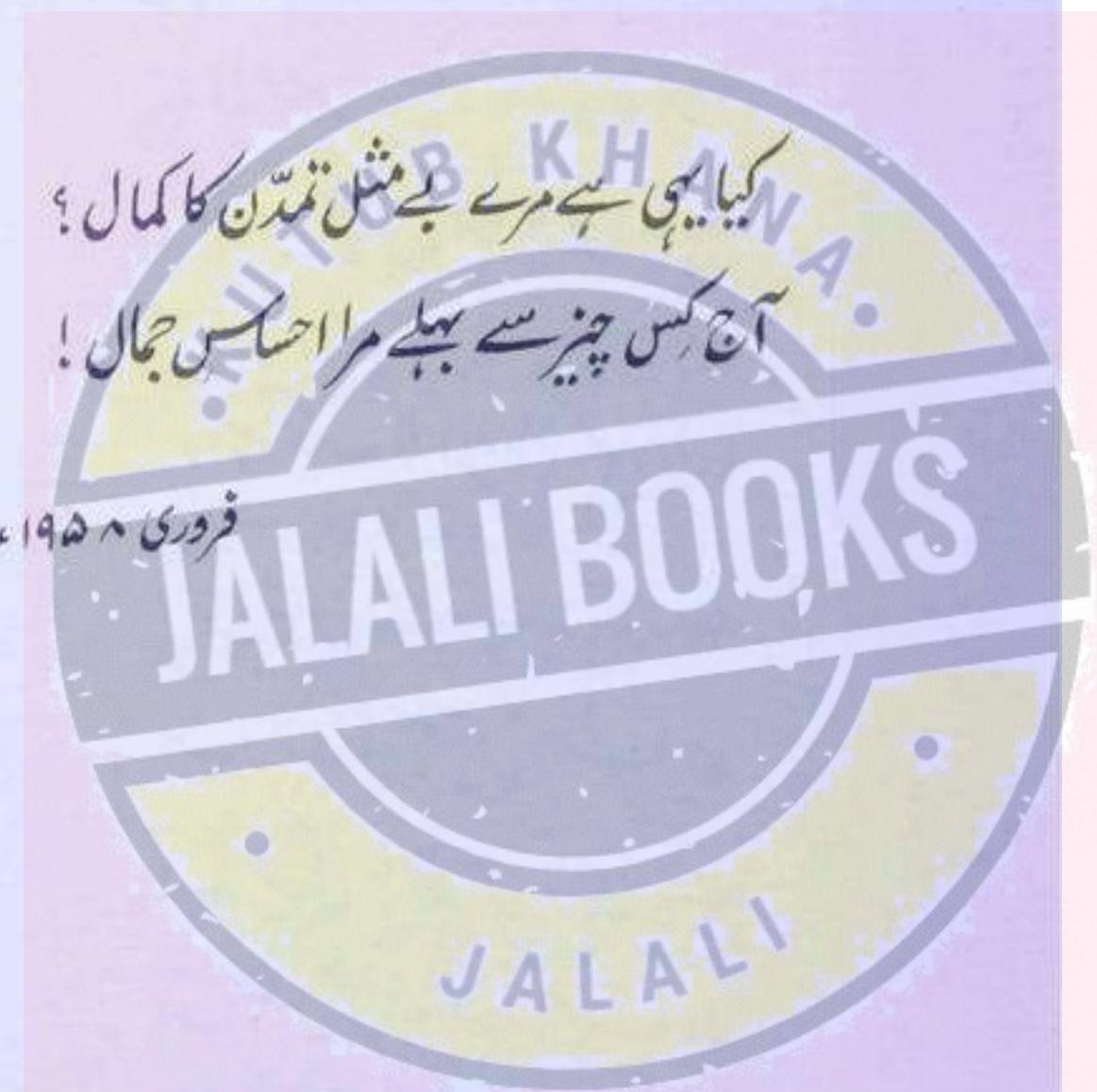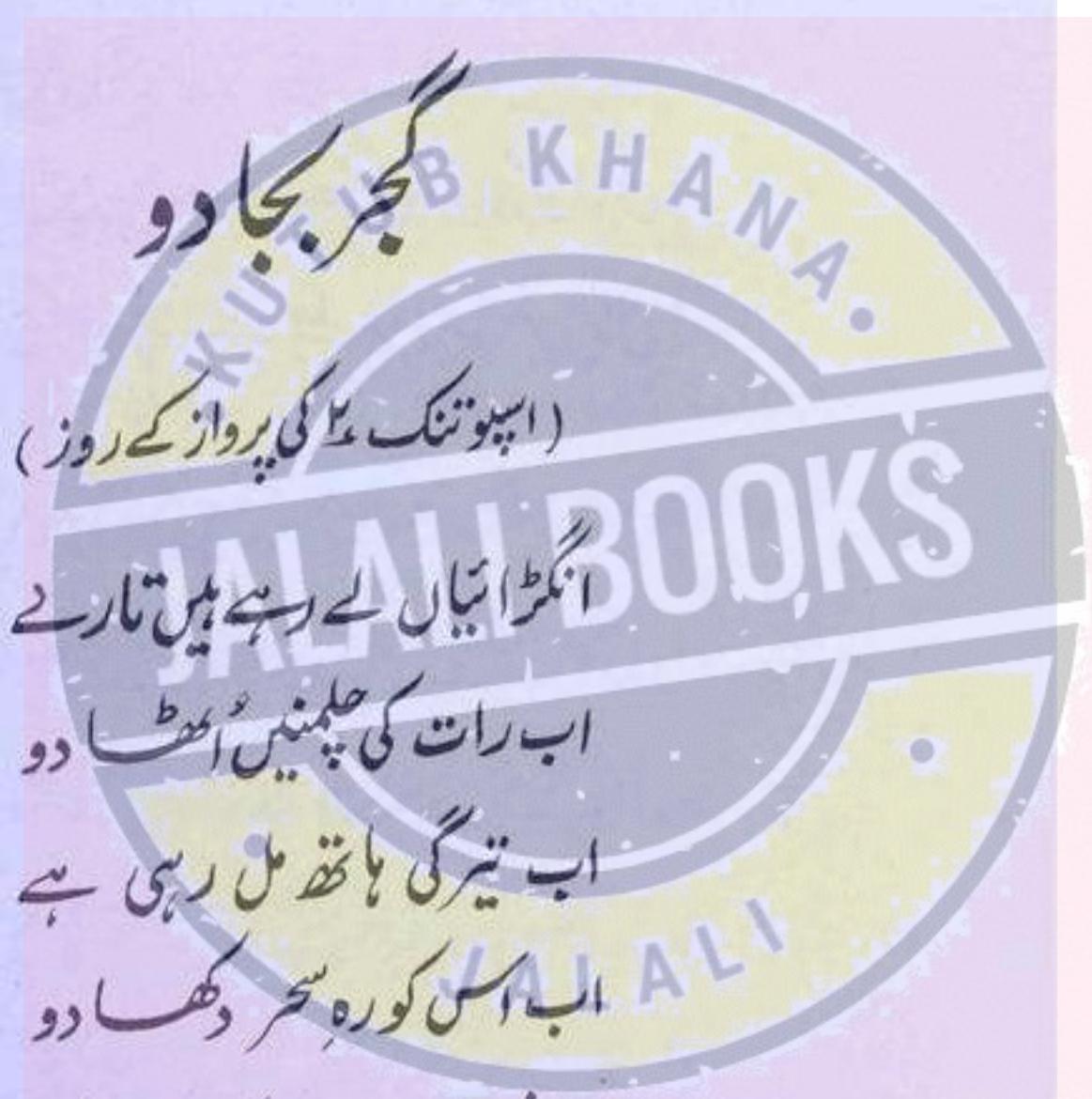
انگڑائیاں لے رہے ہیں تارے
اب رات کی چلمنیں اُٹھا دو
اب تیرگی ہاتھ مل رہی ہے
اب اس کو رہِ سحر دکھا دو
اُونچے پیڑوں کی خامشی کو
جھونکوں کے سُر میں بہا دو
مشرق کا اُفق چمک اُٹھا ہے
مغرب کے غبار کو بتا دو

سورج کا اب انتظار کیسا
پو پھٹنے لگی۔ گجر بجا دو

اب اوج پہ ہے جمالِ انساں
اب چرخ کو آئینہ بنا دو
جو ہاتھ ترس گئے حنا کو
اب ان کو شفق کا رنگ لا دو
شبنم کی طرح جو رو رہے ہیں
تاروں کی طرح انھیں ہنسا دو

اُڑتے ہوئے پل نہیں تھمیں گے
اکڑی ہوئی گردنیں جھکا دو
ماضی کے مزار سے نکل کر
فردائے حیات کو صدا دو
اب حدِّ نظر کی مشعلوں کو
تا حدِّ خیال جگمگا دو

قرنوں سے تنی ہُوئی خلا کو
انسان کا فیصلہ سُنا دو
یہ فرش ہے عرشِ قدسیوں کا
اس وہم کو واقعہ بنا دو
اے جنّتِ گم شدہ کے رازو
آدم اُبھرا ہے، راستا دو
اے حوصلو، میرا ساتھ دو تم
اے ولولو، تم مجھے دعا دو

۳۔ نومبر ۱۹۵۷ء

راستے

ریگِ صحرا سے نکل آنے کے بعد
جاگ اُٹھا ہے کتنی سمتوں کا شعور

راستوں سے کٹ گئے ہیں راستے

یُوں گِھرا طوفانِ بیداری میں ذہن
اور یُوں ٹُوٹے مرے خوابوں کے پھُول

پتّھروں سے پٹ گئے ہیں راستے
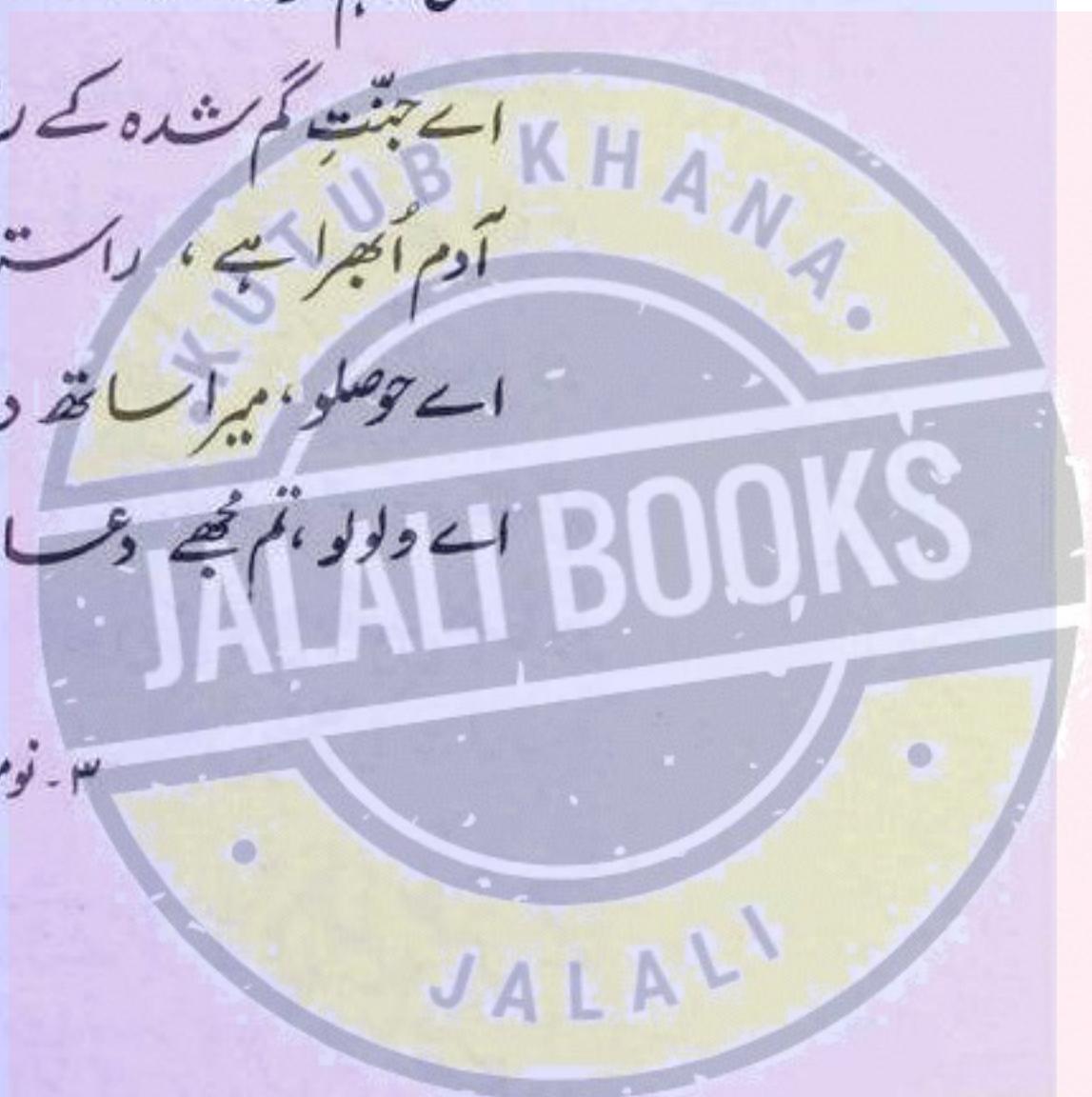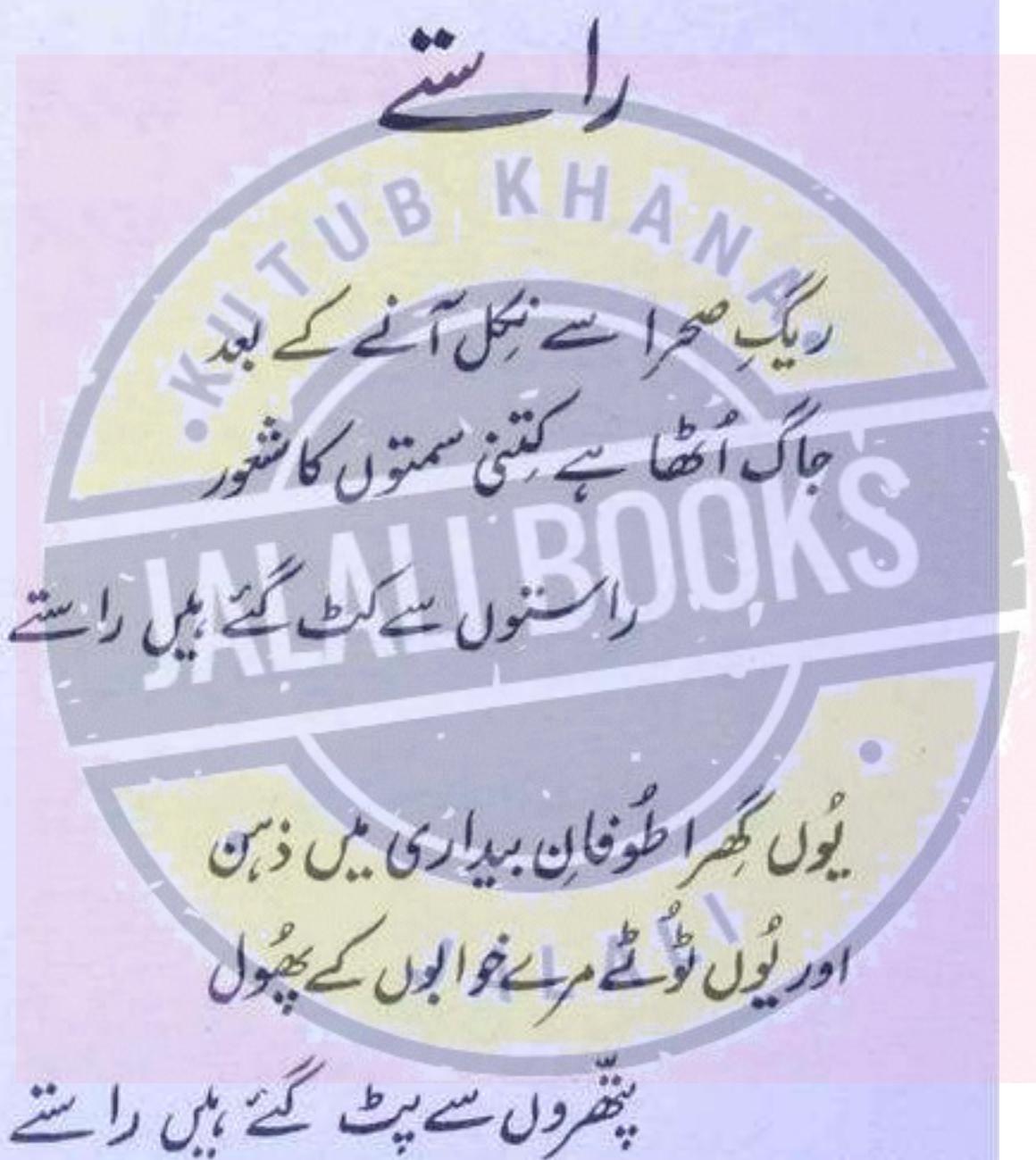
راستوں پر ہر طرف بکھرے ہُوئے
یُوں تو ہیں صدیوں کے قدموں کے نقوش

میّتوں سے اَٹ گئے ہیں راستے

سوچنا بھی جُرم بن کر رہ گیا
مَیں تو بس پل بھر کو ٹھِٹکا تھا، مگر
دُور افق تک ہٹ گئے ہیں راستے

پھر وہی صحرائے ناپیدا کنار
پھر وہی سنسان ٹیلوں کا طواف
دائروں میں بٹ گئے ہیں راستے

اکتوبر ۱۹۵۷ء
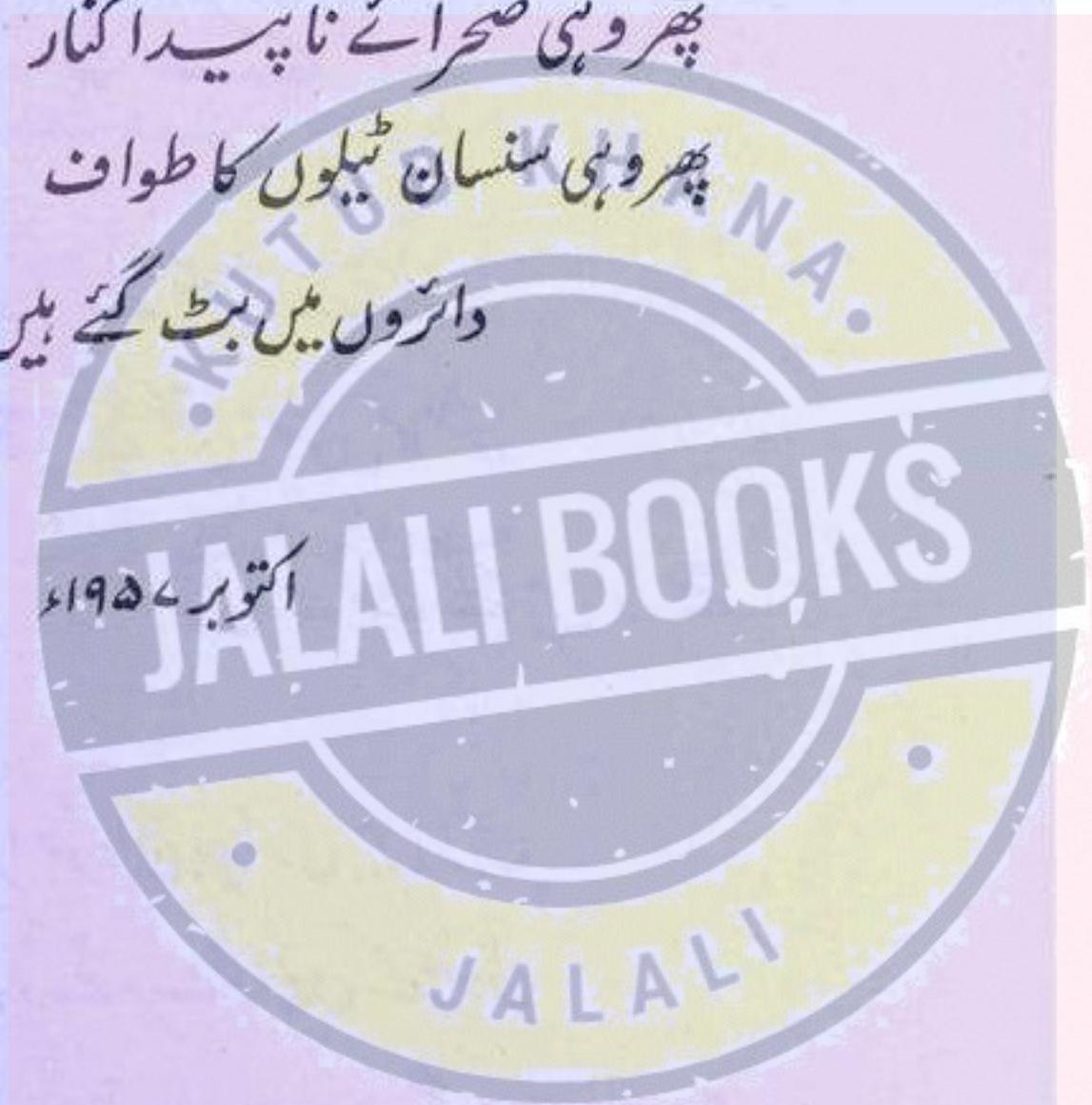
سفر اور ہمسفر

جنگل جنگل آگ لگی ہے، بستی بستی ویراں ہے
کھیتی کھیتی راکھ اُڑتی ہے دُنیا ہے کہ بیاباں ہے

سنّاٹے کی ہیبت نے سانسوں میں پکاریں بھر دی ہیں
ذہنوں میں مبہوت خیالوں نے تلواریں بھر دی ہیں

قدم قدم پر جھلسے جھلسے خواب پڑے ہیں راہوں میں
صُبح کو جیسے کالے کالے دیئے عبادت گاہوں میں

ایک اِک سنگِ میل میں کتنی آنکھیں ہیں پتھرائی ہُوئی
ایک اِک نقشِ قدم میں کتنی رفتاریں کفنائی ہُوئی

ہم سفرو، اے ہم سفرو، کچھ اور بھی نزدیک آ کے چلو
جب چلنا ہی مقدّر ٹھہرا، ہاتھ میں ہاتھ ملا کے چلو

جنوری ۱۹۵۷ء

اِمکان

وقت کے دامنِ صد چاک میں اب کیا ہوگا
ایک فردا ہے تو فردا پہ بھی ڈالیں گے کمند
اتنی ہیبت سے ستاروں کی طرف مت دیکھو
یہ تو اِمکان کے پرچم ہیں خلاؤں میں بلند

چاند ابھی دُور سہی، چاند کی باتیں نہ کرو
یہ ستارہ تو بس اک مرحلۂ شب ہوگا
اب تو ذہنوں کو ستاتا ہے فقط ایک سوال
عرش سے پار تک انساں کا سفر کب ہوگا

نومبر ۱۹۵۶ء

حُسن وجمال کا واسطہ

(ایک شاعر سے خطاب)

اب تو وجدان بھی اِک جنسِ تجارت بن کر
بِک رہا ہے ترے کردار کے ساتھ
اِک کھنکتی ہُوئی زنجیر بھی شامل کر لی
تُو نے گاتے ہُوئے افکار کے ساتھ

حُسنِ محبُوب کا نیلام اُٹھانے والے
معبدوں کو تو نہیں بیچتے لوگ
مانتا ہُوں، غمِ افلاس پُرانا غم ہے
غمِ انساں سے ہیں کمتر سب روگ

رنگِ گلزار ہو یا نغمۂ بنتِ کہسار
کون بازار میں لائے گا انھیں
نیلگوں بحر کی وسعت ہو کہ صحرا کا سکوت
کون آئینہ دکھائے گا انھیں
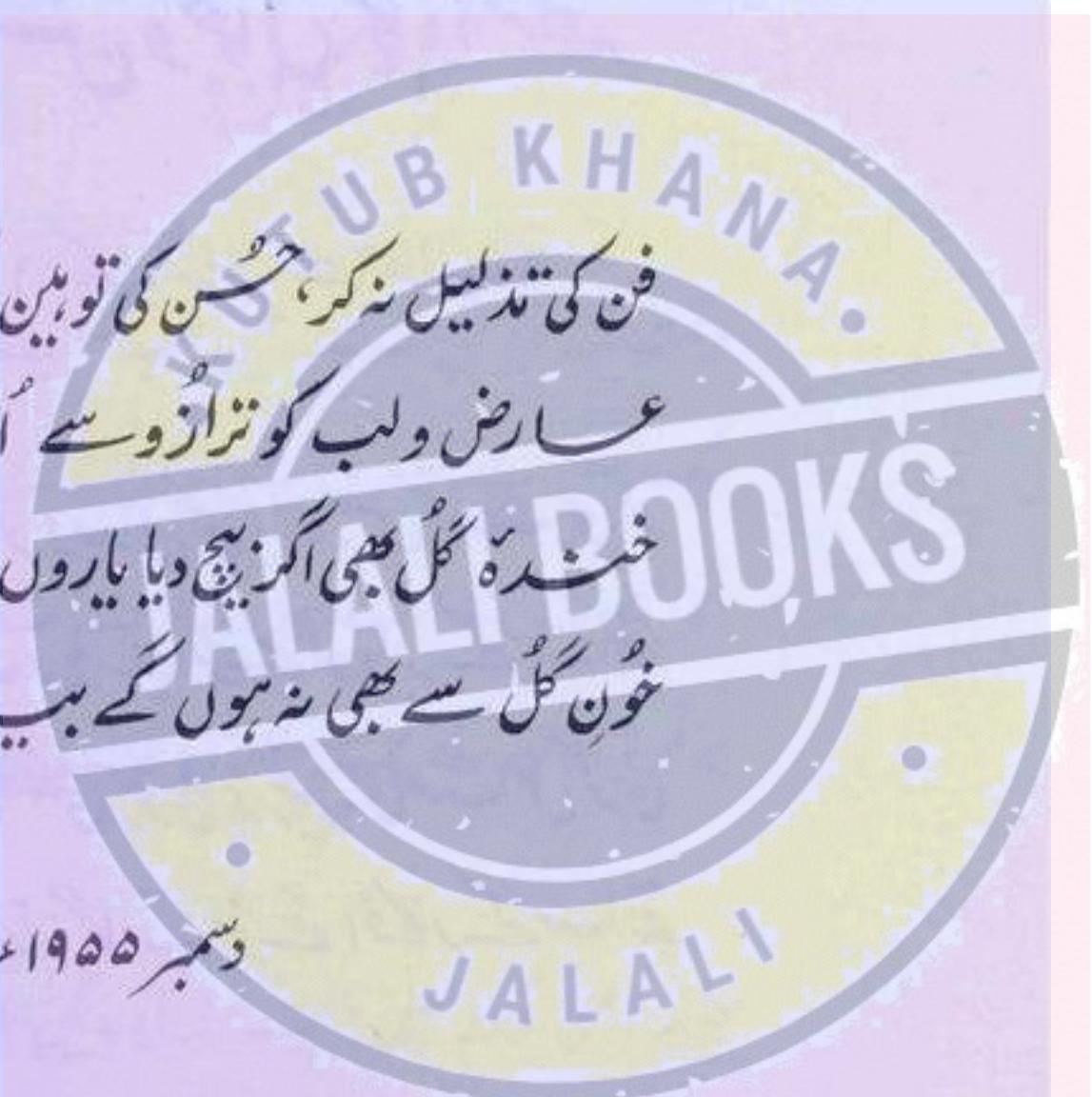
فن کی تذلیل نہ کر، حسن کی توہین نہ کر
عارض و لب کو ترازو سے اُتار
خندۂ گل بھی اگر بیچ دیا یاروں نے
خونِ گل سے بھی نہ ہوں گے بیدار

دسمبر ۱۹۵۵ء

محفلِ شب

کتنی ویران ہے یہ محفلِ شب
نہ ستارے نہ چراغ

اک گھنی دھند ہے گردوں پہ محیط
چاند ہے چاند کا داغ

پھیلتے جاتے ہیں منظر کے خطوط
بُجھتا جاتا ہے دماغ

راستے گھُل گئے تاریکی میں
توڑ کر زعمِ سفر

کون تا حدِّ نظر دیکھ سکے
مٹ گئی حدِّ نظر

سیکڑوں منزلیں طے کر تو چکے
لیکن اب جائیں کدھر

آسماں ہے نہ زمیں ہے شاید
کچھ نہیں، کچھ بھی نہیں
ان خلاؤں میں پکاریں تو کسے؟
کوئی سُنتا ہی نہیں
ایک دُنیا تو ہے یہ بھی، لیکن
اپنی دُنیا سی نہیں
دوستو، آؤ، قریب آ جاؤ
آ کے دیکھو تو سہی
ایک حلقے میں بجھی آنکھوں کو
لا کے دیکھو تو سہی
شاید آواز پہ آواز آئے!
گا کے دیکھو تو سہی

غـــزل

جب سحر بر سرِ کہسار آئی!
وقت کے ہاتھ میں تلوار آئی

دن کٹا بھی تو اس اندیشے میں

پھر قیامت کی شبِ تار آئی

جس سے ٹکرا کے گزُر آئے تھے

راہ میں پھر وہی دیوار آئی

ہم نے مانا کہ بہار آئی ہے

اپنی نگری میں تو بیکار آئی

ذہن میں یُوں تو کئی پھُول کھِلے

ریگِ صحرا سے نہ مہکار آئی

○
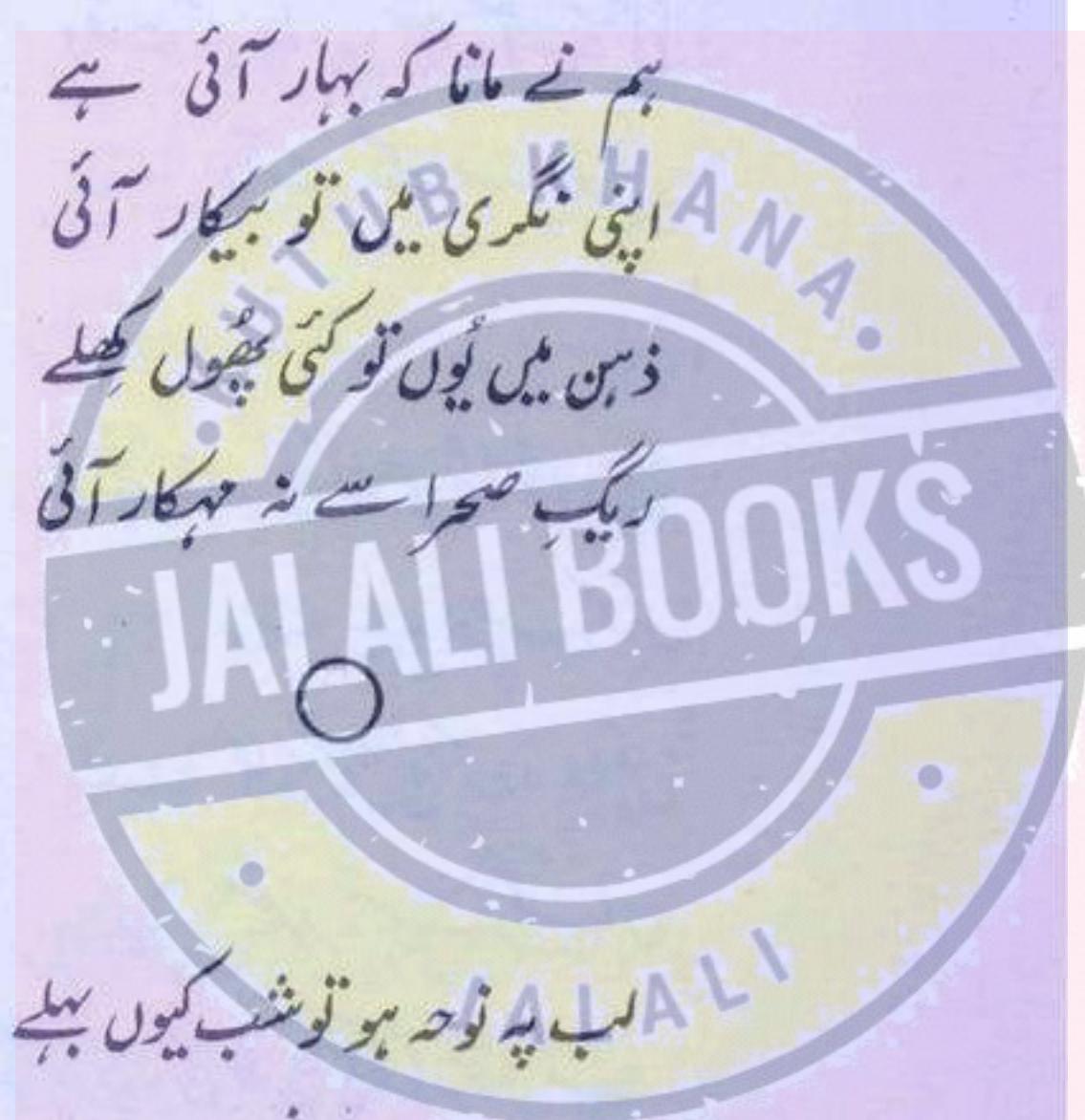
لب پہ نوحہ ہو تو شب کیوں بہلے

پھر وہی شب، وہی ہم

گیت گایا کہ لہُو ٹپکایا

اُکھڑے جاتے ہیں قدم

یہ خموشی ہے کہ اِک گنبدِ سنگ

جس میں گھُٹ جائے گا دم

بات کرنے کا بہانہ ہی سہی

داستانیں ہی کہو

آپ بیتی ہو کہ جگ بیتی ہو

یُوں مگر چُپ نہ رہو

وقت کی چاپ نہیں آئے گی

وقت کے ساتھ چلو

اُونچے پیڑوں کی گندھی شاخوں میں

رات ہے نوحہ کناں

اِتنا گاؤ کہ چٹخ کر رہ جائیں

منجمد تیرگیاں

دُھوپ کی طرح چمکتا ہُوا گیت

زندگی بخش، جواں

گیت

رات دن سلسلۂ عمرِ رواں کی کڑیاں

کل جہاں رُوح جھلس جاتی تھی
اپنے سائے سے بھی آنچ آتی تھی

آج اسی دشت پہ ساون کی لگی ہیں جھڑیاں
رات دن سلسلۂ عمرِ رواں کی کڑیاں

شب کو جو وادیاں سنسان رہیں
صبح یُوں اوس سے آراستہ تھیں
ہر طرف موتیوں کی جیسے تنی ہوں لڑیاں
رات دن سلسلۂ عمرِ رواں کی کڑیاں

توڑ کر پاؤں نہ بیٹھو، آؤ!
صُبح کے اور قریب آ جاؤ!

یوں تو ہر حال میں کٹتی ہی رہیں گی گھڑیاں
رات دن سلسلۂ عمرِ رواں کی کڑیاں

نومبر ۱۹۵۵ء

تین اشعار

اگر اس دور میں جلنا ہی مقدّر ٹھہرا
اپنی اُجڑی ہوئی محفل کے چراغوں میں جلیں

چنگ ٹوٹا، مگر آہنگ نہ ٹوٹا اپنا
ہم وہ شعلے ہیں جو بُجھ کر بھی دماغوں میں جلیں
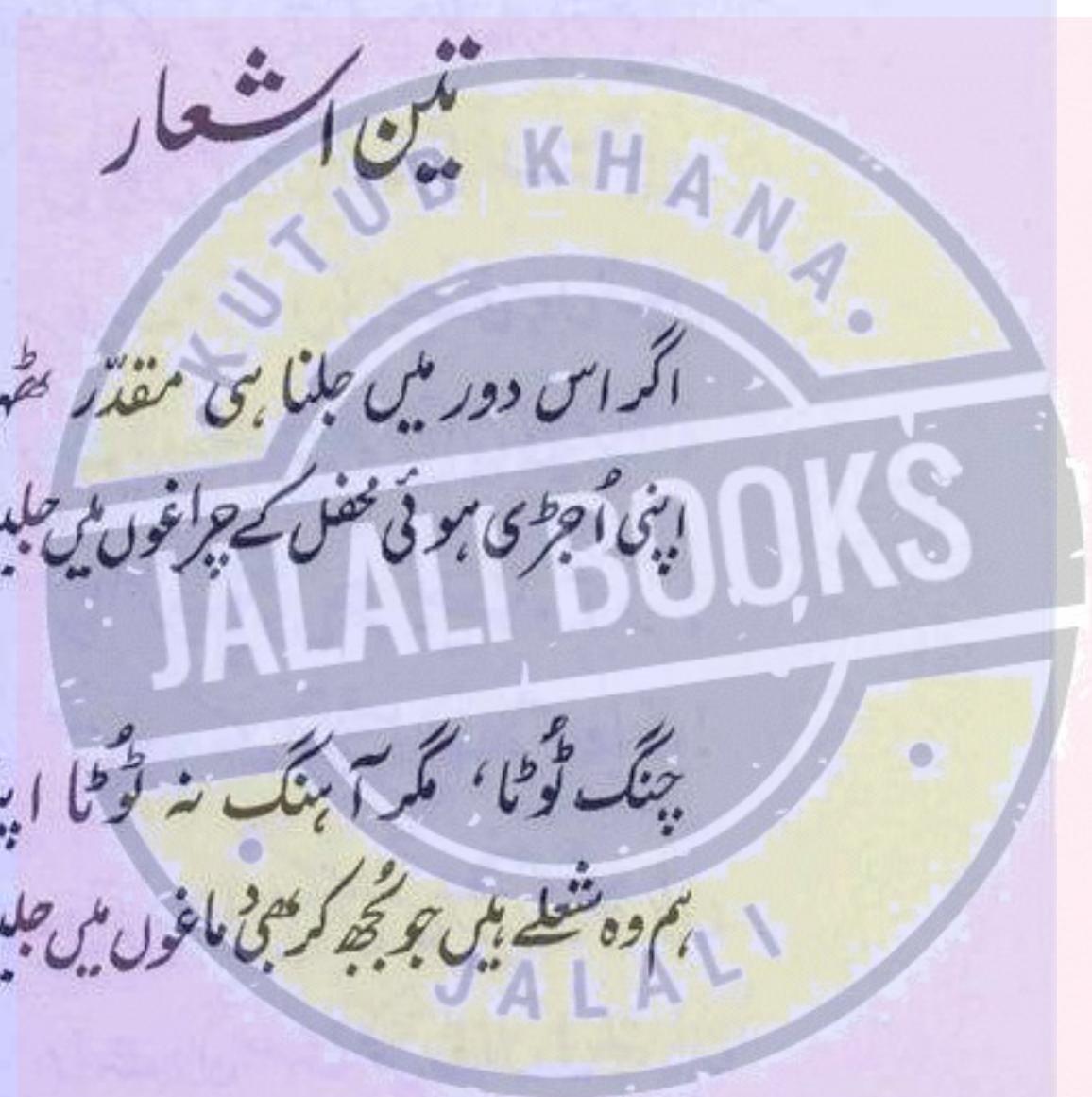
اِک نئے موسمِ گُل کا یہ تقاضا ہے کہ ہم
رنگ بن کر انہی لُٹتے ہوئے باغوں میں جلیں

اکتوبر ۱۹۵۵ء

سوچتا ہوں

میری کھڑکی کے شیشے پہ پھولوں کی اِک بیل انگڑائیاں بنتے بنتے رُکی
اِک حسینہ، سمندر کی دھوتی ہوئی ریت سے سیپیاں چنتے چنتے رُکی

اوس کے چند موتی جو پھولوں کے ماتھے پہ جھومر کی مانند رخشندہ ہیں
بیل کی بے حسی سے ہیں بے بس، مگر کتنے محجوب ہیں، کیسے شرمندہ ہیں
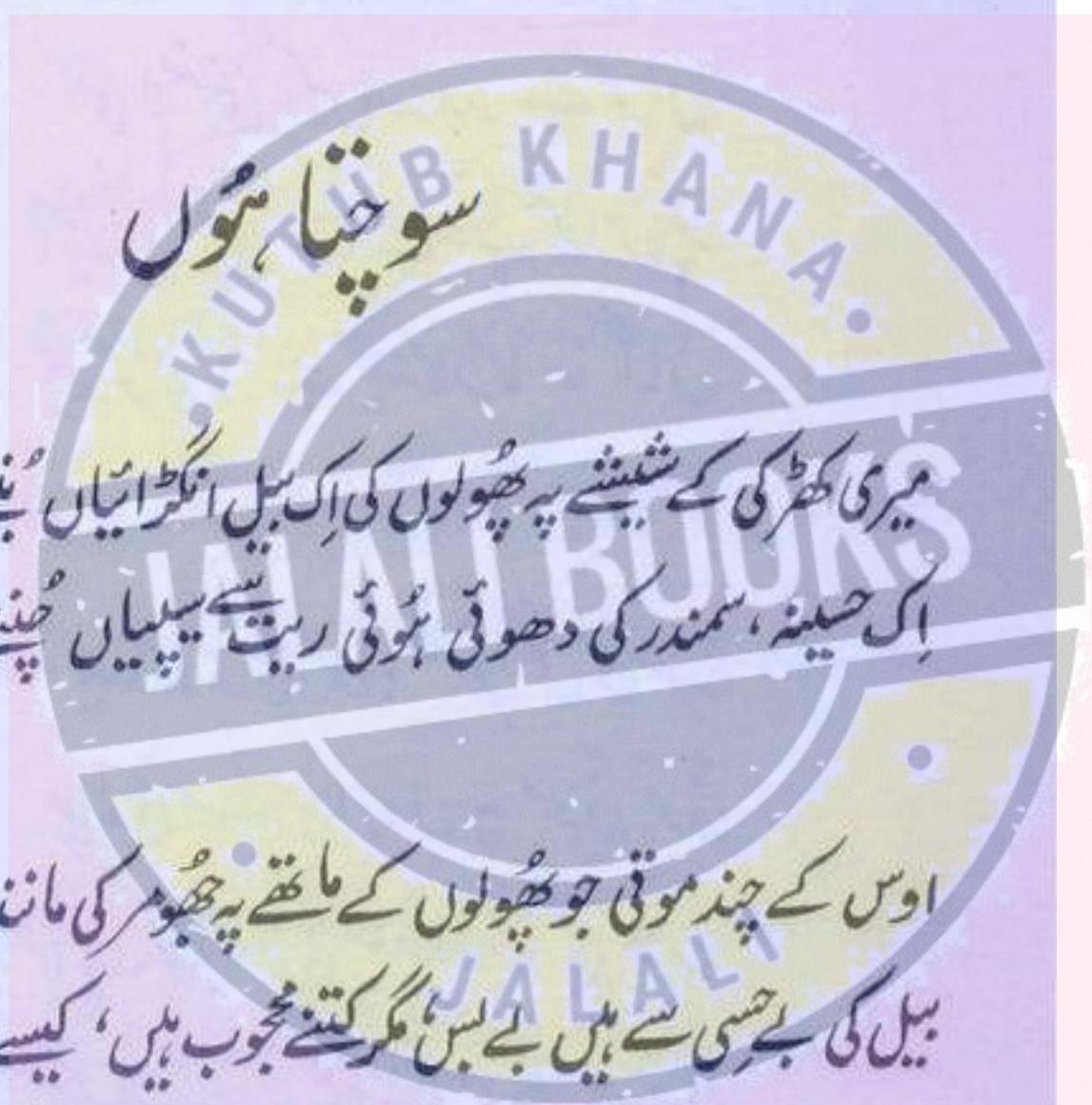
سوچتا ہوں — اگر کوئی جھونکا نہ آیا تو کیا پھول چپ چاپ مر جائیں گے؟
میرے ویران کمرے کے یہ قمقمے کیا یونہی تیرگی میں اُتر جائیں گے؟

اکتوبر ۱۹۵۴ء

شام کب آگئی

کتنی شدّت سے یہ رات خاموش ہے

کتنی لامنتہی، کس قدر بے کراں

ایک پتّہ بھی گرتا ہے جب گھاس پر

مُجھ کو ہوتا ہے جھنکار کا سا گماں

ایک روندی ہُوئی فصلِ گُل کی طرح

چاندنی شاہراہوں پہ سوئی ہُوئی

ایک لُوٹی ہُوئی سلطنت کی طرح

ایک شے دُوسری شے میں کھوئی ہُوئی

جھاڑیاں چُپ ہیں، اور دم بخود ندیاں

بکھری مانگوں کی مانند پگڈنڈیاں

اکھڑے اکھڑے سے آبادیوں کے نشاں

جیسے صدیوں کی اُجڑی ہُوئی بستیاں

مَیں تو دن کی مسافت میں مصروف تھا
جھٹپٹا کب ہُوا، شام کب آ گئی

اے مرے چاند، میرے رفیقِ سفر
میرے سُورج کو کِس کی نظر کھا گئی

کچھ تو زادِ سفر ساتھ لے کر چلوں
اے مرے فن، مجھے آگہی بخش دے

جس سے شمعیں جلیں میری ہر سانس میں
زندگی کو وہ تابندگی بخش دے
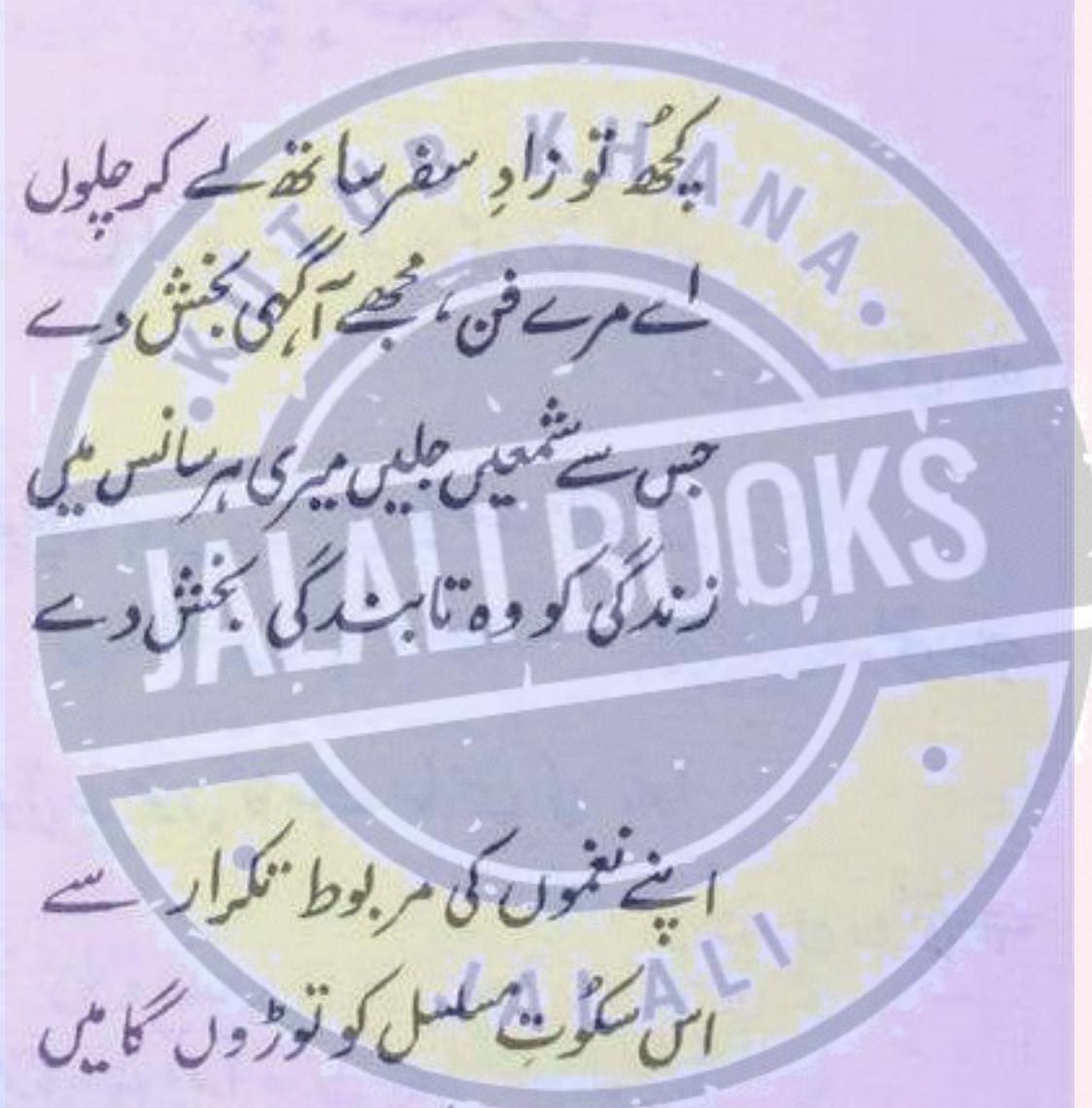
اپنے نغموں کی مربوط تکرار سے
اس سکوتِ مسلسل کو توڑوں گا میں

شب کا ماحول کتنا ہی پُر ہول ہو
چوٹ کھا کر بھی رستہ نہ چھوڑوں گا میں

میرا سرمایہ تخلیقِ فن ہی تو ہے
دن کے ریزوں کو چُن چُن کے جوڑوں گا میں

جون ۱۹۵۴ء

پابندی

میرے آقا کو گِلہ ہے کہ مری حق گوئی

راز کیوں کھولتی ہے

اور مَیں پُوچھتا ہُوں — تیری سیاست، فن میں

زہر کیوں گھولتی ہے

مَیں وہ موتی نہ بنوں گا جسے ساحل کی ہَوا

رات دن رولتی ہے

یوں بھی ہوتا ہے، کہ آندھی کے مقابل چڑیا

اپنے پَر تولتی ہے

اِک بھڑکتے ہُوئے شعلے پہ ٹپک جائے اگر

بُوند بھی بولتی ہے

اپریل ۱۹۵۴ء

یہاں سے وہاں تک
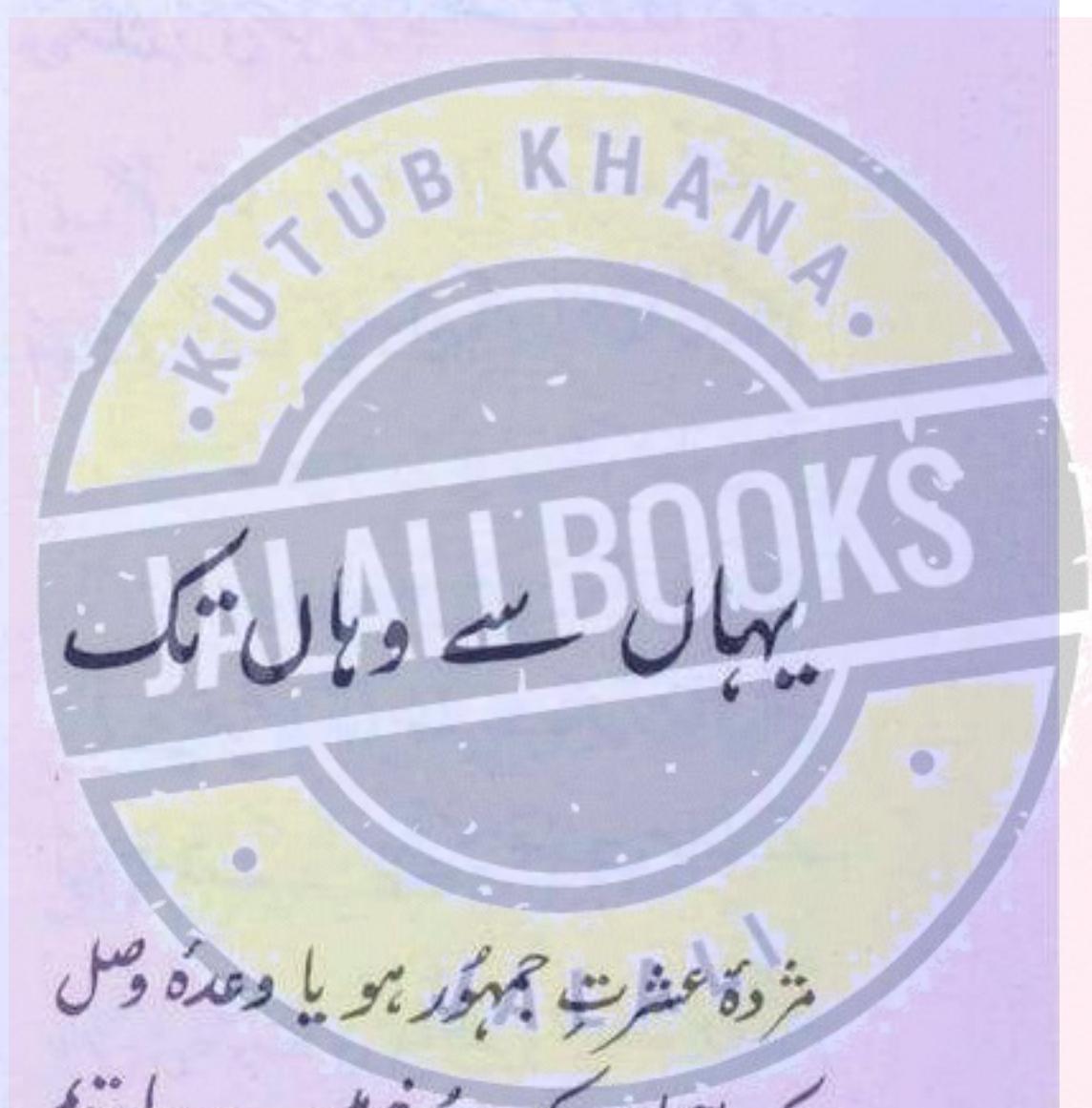
مژدۂ عشرتِ جمہور ہو یا وعدۂ وصل
ایک احساس کے دو رُخ ہیں — جدید اور قدیم

آندھیاں ہانپتی ہیں جیسے گھنے جنگل میں
گنگناتی ہے اسی طرح گلستاں میں نسیم

شب حقیقت ہے مگر اس کے بھی دو پہلو ہیں
چاند نِکلا ہے سرِ کلبۂ احزانِ ندیم

کائنات ایک لڑی ہے کئی دُنیاؤں کی
مَیں نے دیکھا ہے مگر دانۂ گندم بھی دونیم

ان کا مقصد فقط آرائشِ تن، حفظِ بدن
وہ سکندر کی عبا ہو کہ قلندر کی گلیم

ایک گُل تھا مگر اندازِ نظر کے فتنے!
ایک کو رنگ جچا، ایک کو راس آئی شمیم

عظمتِ فن کا تقاضا ہے کہ رعنائیِ فن
یُوں حقیقت کو سمیٹے کہ حقیقت ہو جائے

اس کی خلوت بھی جہانگیر ہو، جلوت بھی عظیم
اس کا اِک پل بھی مجسّم ابدیّت ہو جائے

ہُوئے کہسار میں، پتّھر کا بنا کر زینہ
پنڈلیاں کھول کے اُتری ہیں حسینائیں چند

کِس کو اپناؤں، تو کِس کو نظر انداز کروں
ایک صف میں نظر آتی ہیں تمنّائیں چند

ذہن کِس مصر کے بازار میں لے آیا ہے
ایک یُوسف کی خریدار زلیخائیں چند

اُس کی آنکھوں میں نئی صبح کا شرمیلا پن
اُس کے ہونٹوں پہ کلی جیسے چٹکنے والی
اِس کی ٹھوڑی میں ضیا بار، سحر کا تارا
اُس کے عارض میں اُفق تابِ شفق کی لالی
اِس کے ابرو ہیں کہ غالب کی غزل کا مطلع
اُس کا ملبوس ہے یا تاج محل کی جالی

ان کو دیکھوں تو قیامت، جو نہ دیکھوں تو مجھے
وسعتِ دہر نظر آتی ہے خالی خالی
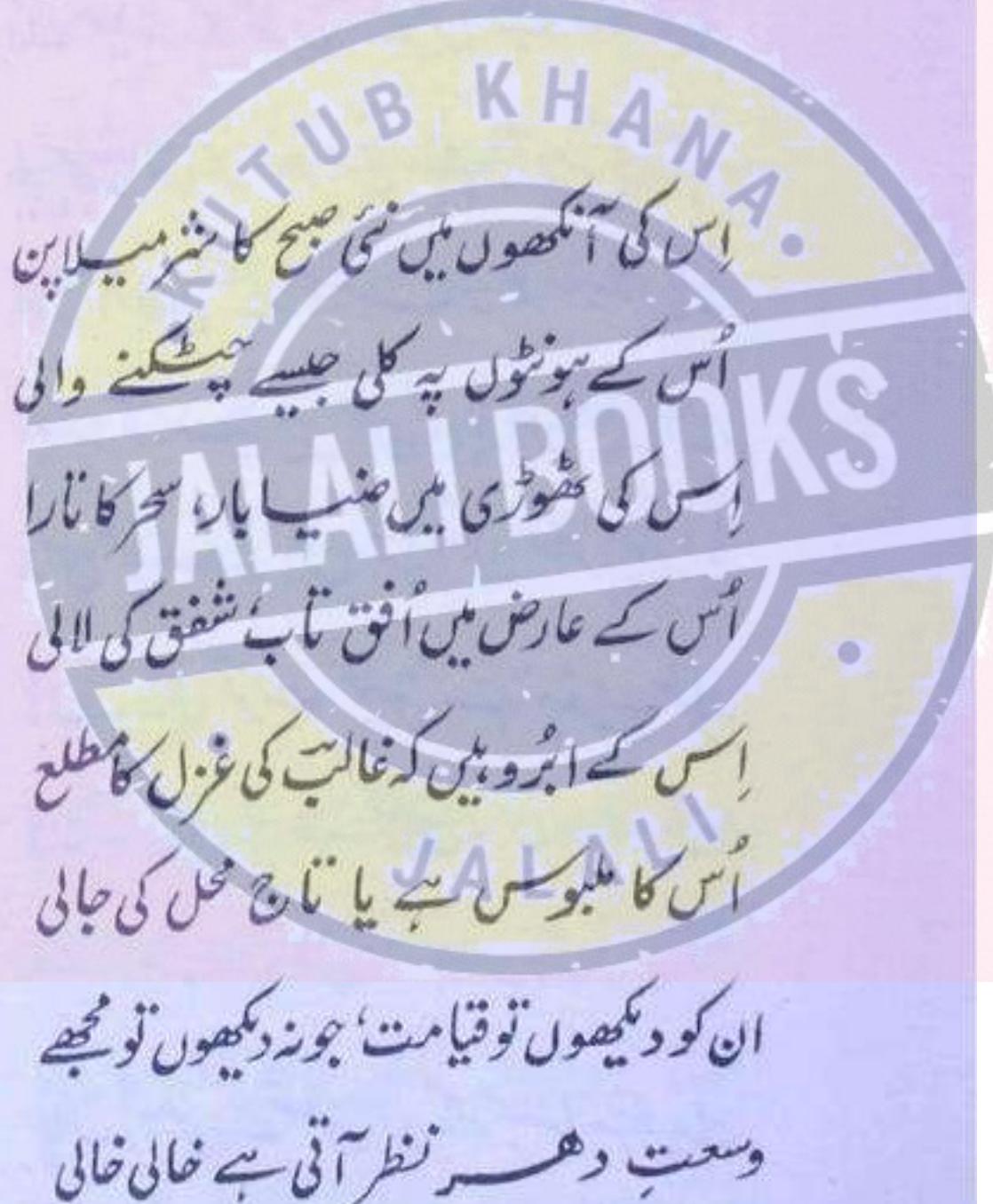
اِک حسینہ ہو کہ جمگھٹ ہو حسیناؤں کے
حسن اِدراک گدازی سے نہیں باز آتا

یہ بصارت کی بہشتیں ہیں بڑی چیز، مگر
کاش فنکار کو پرواز کا انداز آتا

یہی پرواز ــــ یہی سلسلۂ فکرِ رسا
اِک حسینہ کے گھروندے میں مجھے لے آیا
میں سمجھتا تھا کہ معراج ہے آدم کی یہی
اور انسان کے آغاز کا نقشہ پایا
حلقۂ آسیہ میں حُسن کی باہیں تھیں اسیر
اسی چکر میں مرا حُسنِ نظر چکرایا
ہاں ــ یہی قوتِ تخلیق ہے تہذیب طراز
ہاں ــ یہی قوتِ تخلیق رہی بے مایہ

چاکِ دامن سے شفق بن کے جھلکتا ہے بدن
اور ماتھے پہ فروزاں ہے ستاروں کی تھکن
بِکھرے بالوں میں ہے عنبر کے دُھوئیں کا انداز
سُرخیِ لب میں سُلگتا ہے جوانی کا چمن

چاکِ دامن کو سیوں! حُسنِ بدن کو دیکھوں!
ہائے کس طرح حقیقت کو سمیٹے مرا فن

یہ حقیقت بھی تو ہے حسن کی مانند عظیم
ہل کی ہتّھی پہ اُتر آئے ہیں ہاتھوں کے نشاں
نظر افروز ہے پکتے ہوئے کھیتوں کا شباب
اور دل دوز ہے لُٹتی ہوئی فصلوں کا سماں
یہ مسافت بھی تو فن کار کو طے کرنا ہے
کس کی محنت کا ثمر، جا کے ٹپکتا ہے کہاں

یہ مسافت — یہ حقیقت کا بتدریج ادراک
شعر کا حسن بھی ہے، حُسن کا عرفان بھی ہے
فصل سے قصر تک اُلجھے ہوئے رشتوں کا سراغ
فن کی پہچان بھی ہے، فن کا نگہبان بھی ہے
ایک پہلو میں بھی رکھتی ہے ہزاروں پہلو
میری دُنیا کہ جو گُل پوش بھی، ویران بھی ہے

سخت مشکل ہے کہ فن کار کہستاں کاٹے
اِک ذرا درد میسّر ہو تو آسان بھی ہے

گُل کو دیکھوں تو نہ بھُولے مجھے گُلکار کا حُسن
یہ لطافت مرا مقصد بھی ہے، ایمان بھی ہے

مثل خورشید ہُوئی ہے اُفقِ فن پہ طلُوع
یہ حقیقت کہ جو شاعر ہے وہ انسان بھی ہے

فروری ۱۹۵۴ء

فکر

راتوں کی بسیط خامشی میں
جب چاند کو نیند آ رہی ہو
پھولوں سے لدی خمیدہ ڈالی
لوری کی فضا بنا رہی ہو
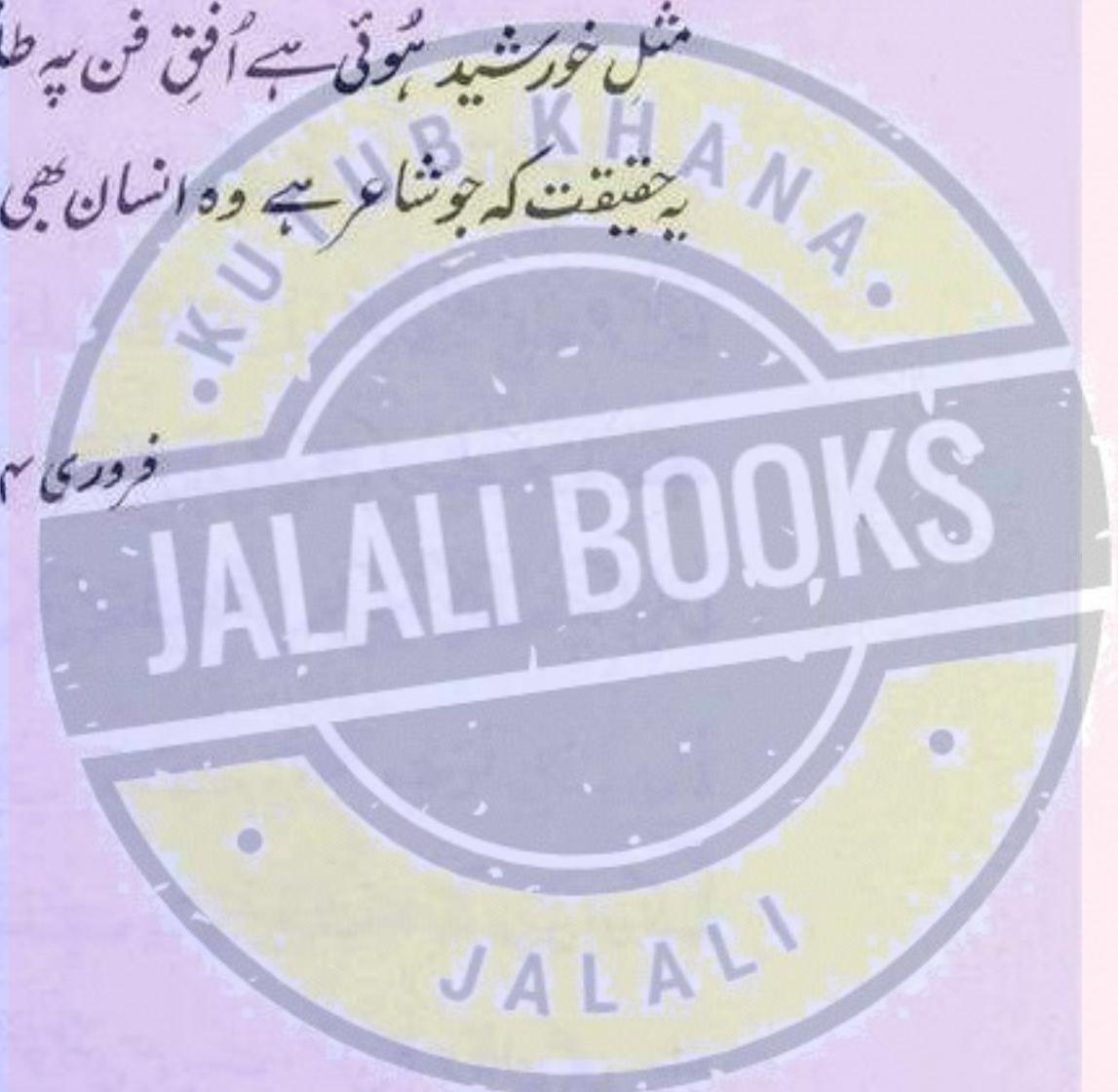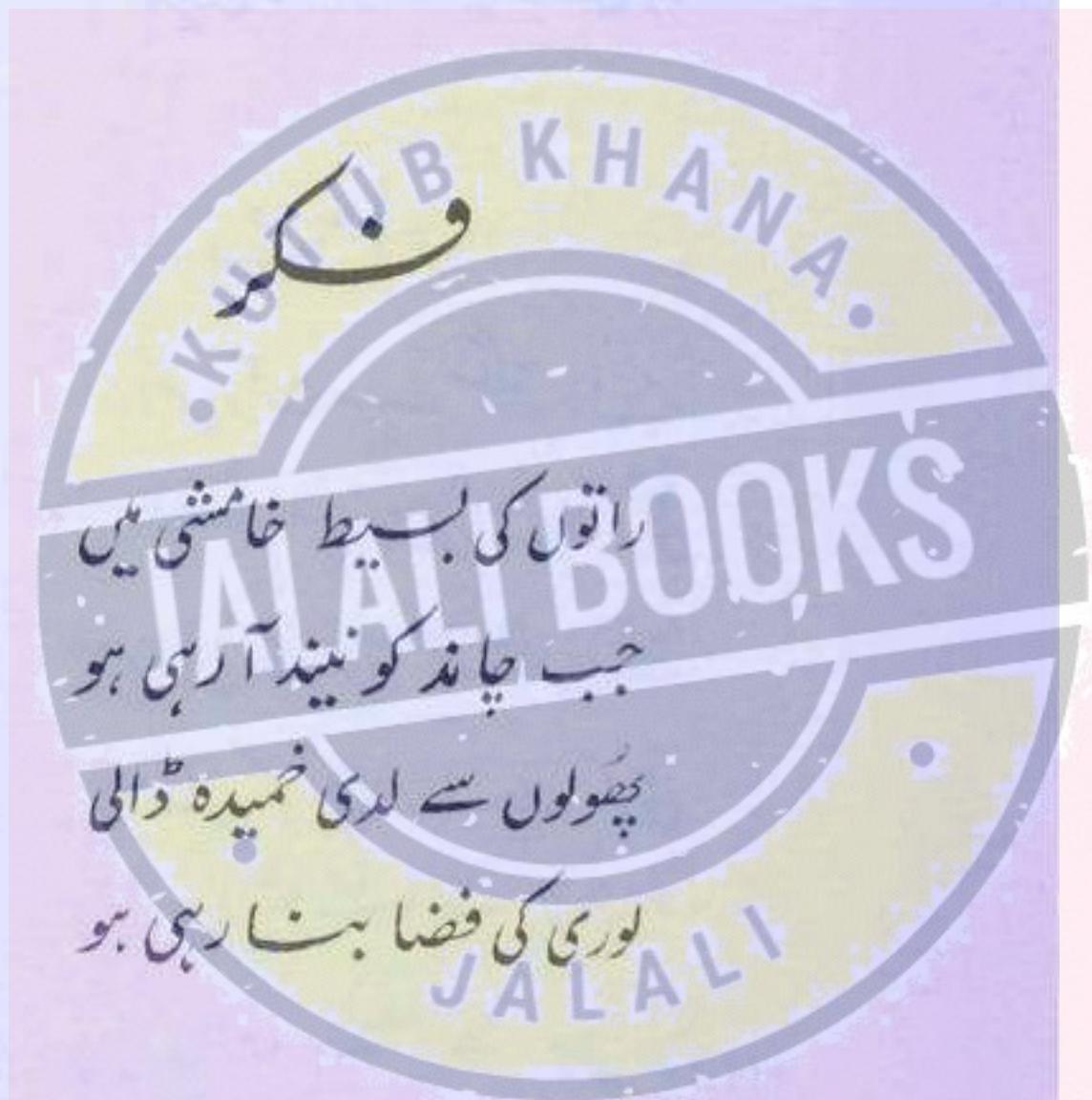
جب جھیل کے آئینے میں گھُل کر
تاروں کا خرام کھو گیا ہو
ہر پیڑ بنا ہُوا ہو تصویر
ہر پھُول سوال ہو گیا ہو

جب خاک سے رفعتِ سما تک
اُبھری ہُوئی وقت کی شکن ہو
جب میرے خیال سے خدا تک
صدیوں کا سکُوت خیمہ زن ہو

اُس وقت مرے سلگتے دل پر
شبنم سی اُتارتا ہے کوئی
یزداں کے حریم بے نشاں سے
انساں کو پُکارتا ہے کوئی

دسمبر ۱۹۵۳ء

روایت

قدموں کے نقوش ہوں کہ چہرے
قبروں کے گلاب ہوں کہ سہرے

تاریخ کے بولتے نشاں ہیں
تہذیب کے سلسلے رواں ہیں
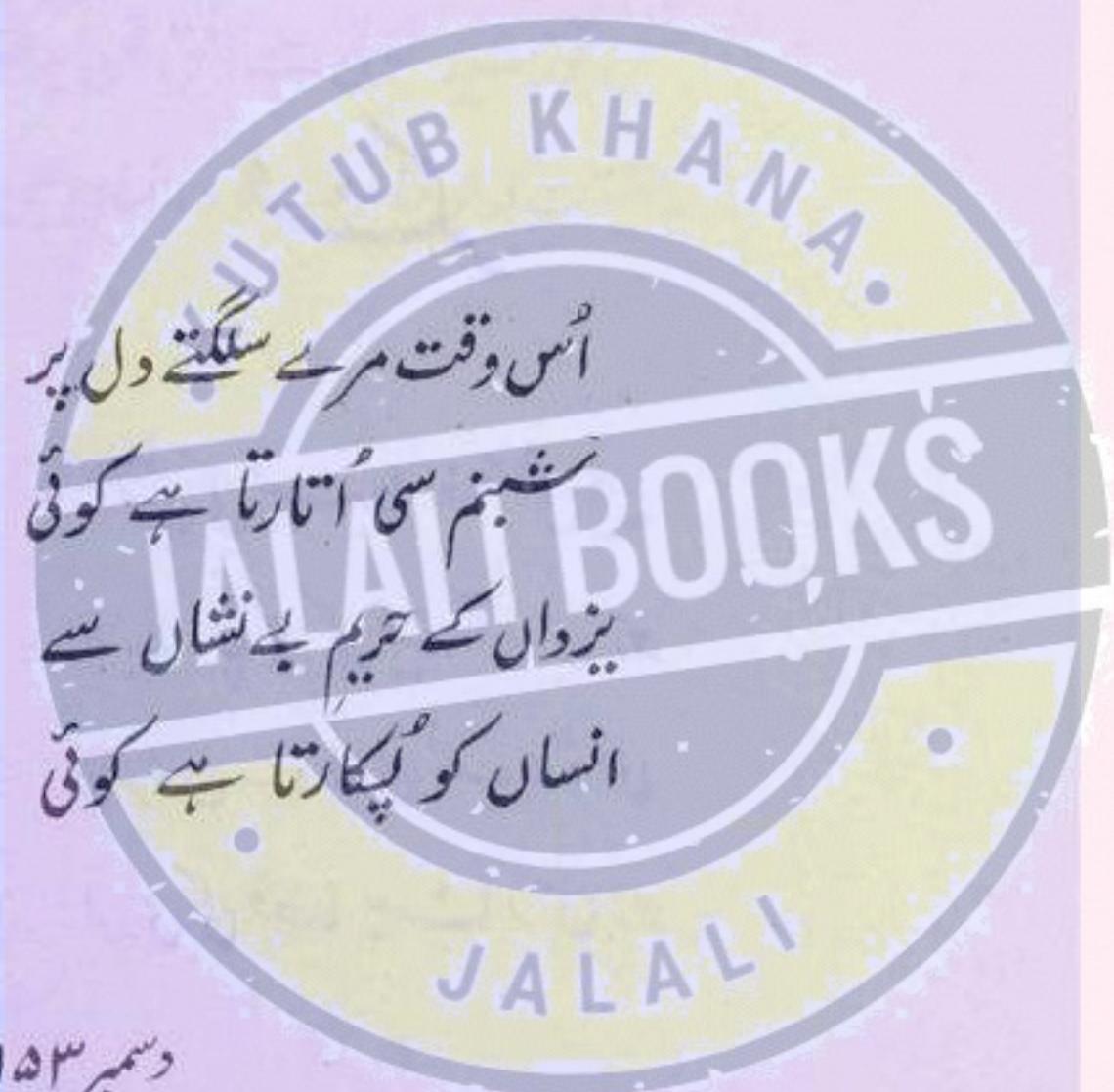
یہ رسمِ جہاں قدیم سے ہے
آدم کا بھرم ندیمؔ سے ہے

ستمبر ۱۹۵۳ء

سونا

تم کہتے ہو آفتاب اُبھرا
مَیں کہتا ہُوں، جل رہا ہے سونا

پیڑوں سے گزر رہی ہیں کرنیں
ہاتھوں سے نِکل رہا ہے سونا
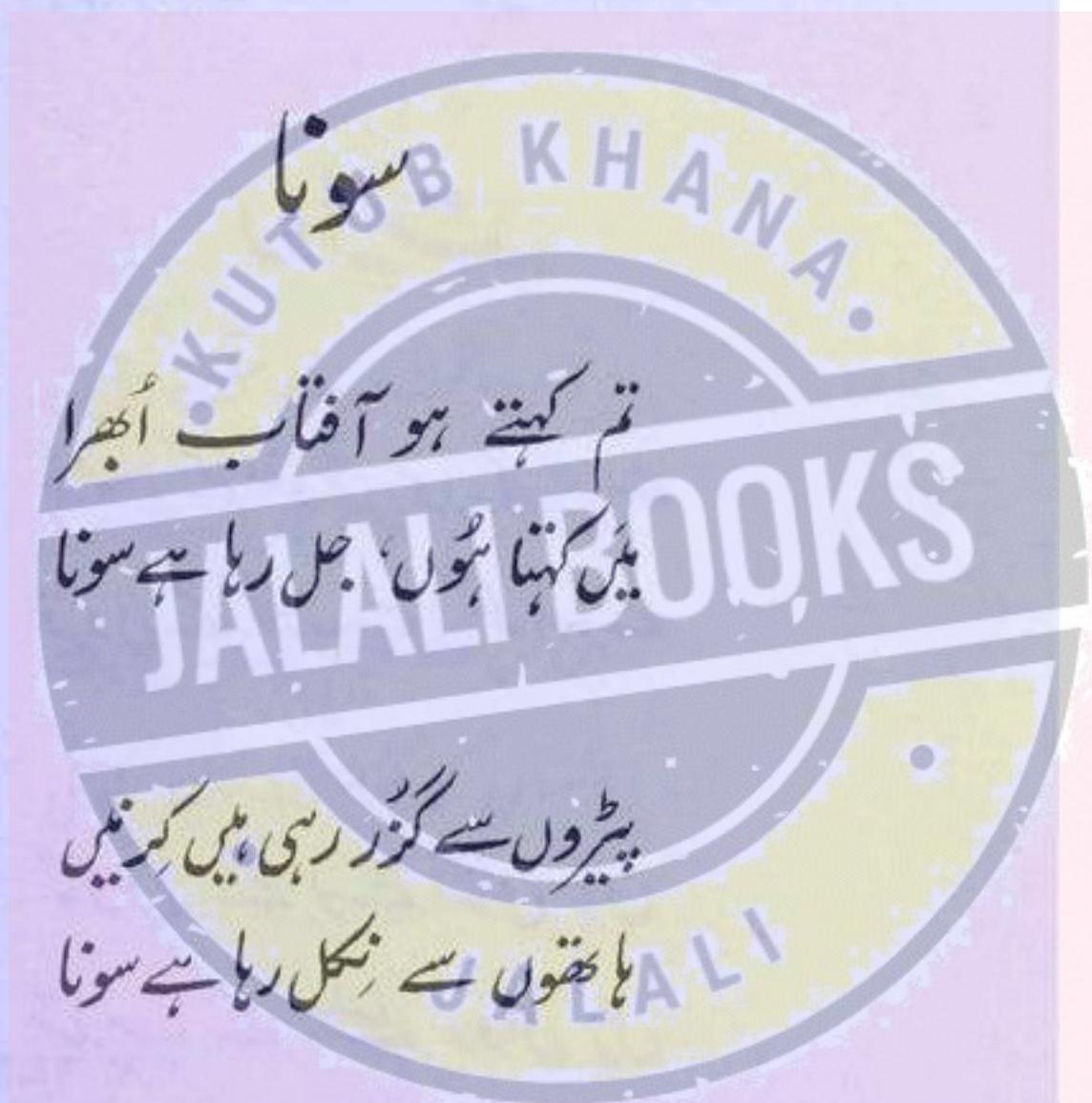
مشرق کی تمازتِ انا سے
مغرب میں پگھل رہا ہے سونا

ستمبر ۱۹۵۳ء

دردِ وطن

ہم سیاست سے، محبّت کا چلن مانگتے ہیں
شبِ صحرا سے مگر صبحِ چمن مانگتے ہیں

وہ جو اُبھرا بھی تو بادل میں لپٹ کر اُبھرا
اسی بچھڑے ہُوئے سُورج سے کرن مانگتے ہیں
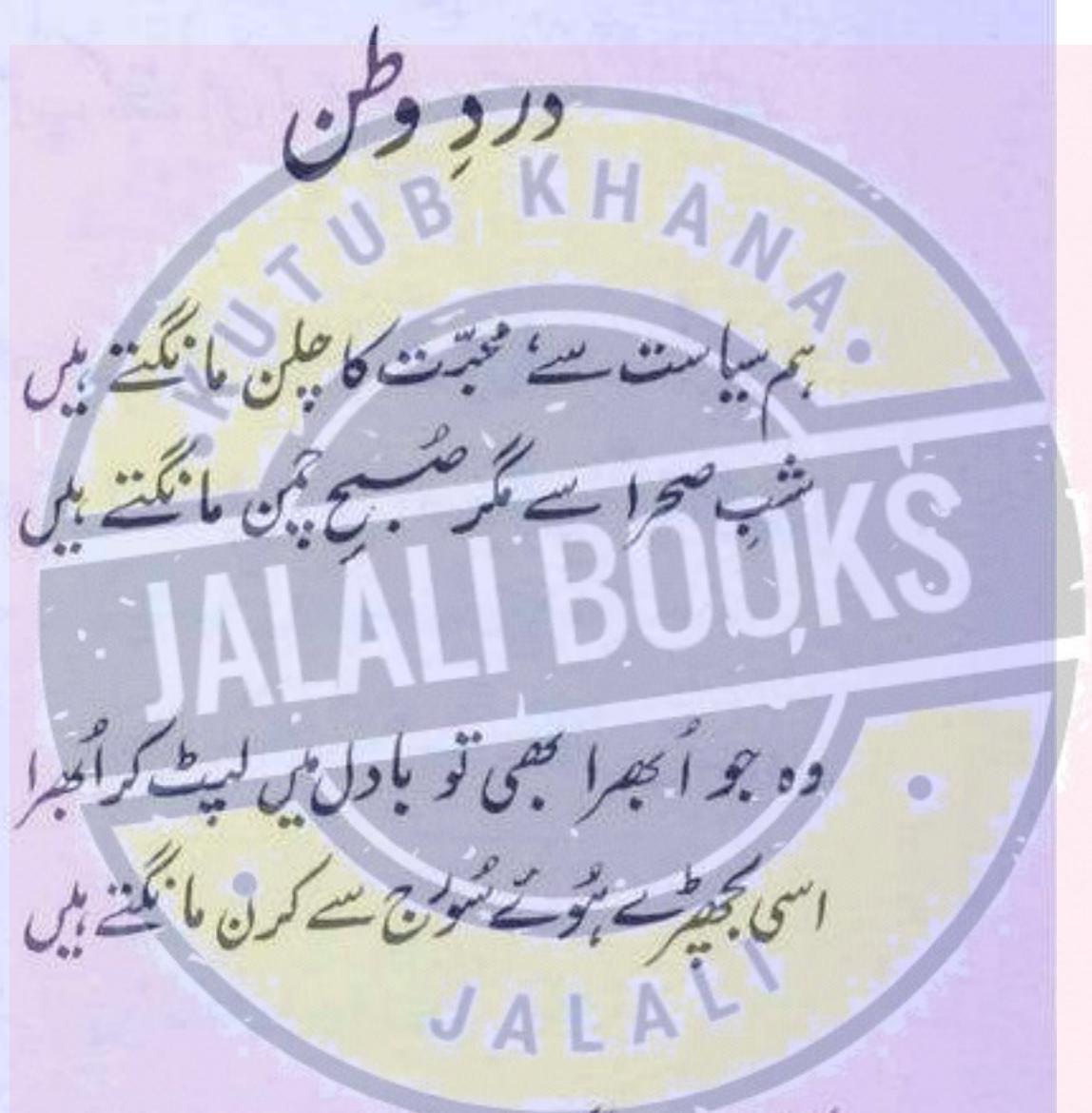
کچھ نہیں مانگتے ہم لوگ، بجز اذنِ کلام
ہم تو انسان کا بے ساختہ پن مانگتے ہیں

ایسے غنچے بھی تو گُل چیں کی قبا میں ہیں اسیر
بات کرنے کو جو اپنا ہی دہن مانگتے ہیں

فقط اِس جُرم میں کہلائے گنہ گار، کہ ہم
بہرِ ناموسِ وطن، جامۂ تن مانگتے ہیں

ہم کو مطلوب ہے تکریم قد و گیسو کی
آپ کہتے ہیں کہ ہم دار و رسن مانگتے ہیں

لمحہ بھر کو تو لُبھا جاتے ہیں نعرے، لیکن
ہم تو اے اہلِ وطن، دردِ وطن مانگتے ہیں

اگست ۱۹۵۳ء

تاریخ

راہوں پہ جُھکی ہُوئی چٹانیں
دھرتی کی جلی ہُوئی زبانیں

صدیوں کی صداؤں کو سمیٹے
عمروں کے غبار کو لپیٹے

بڑھتا مجھے دیکھ کر فضائیں
کہتی ہیں سکوت کی صدائیں
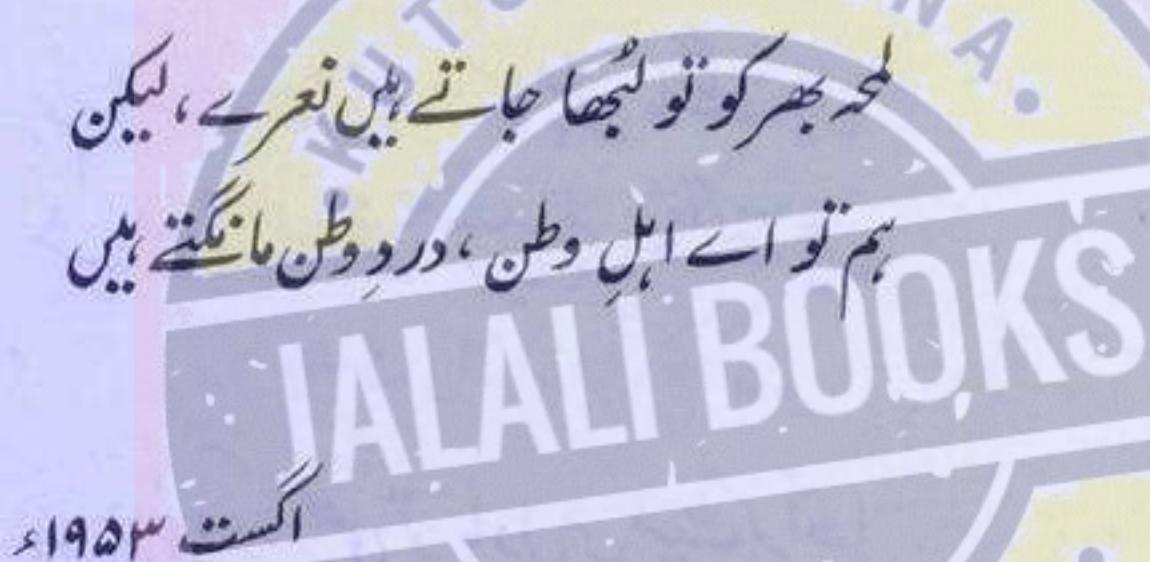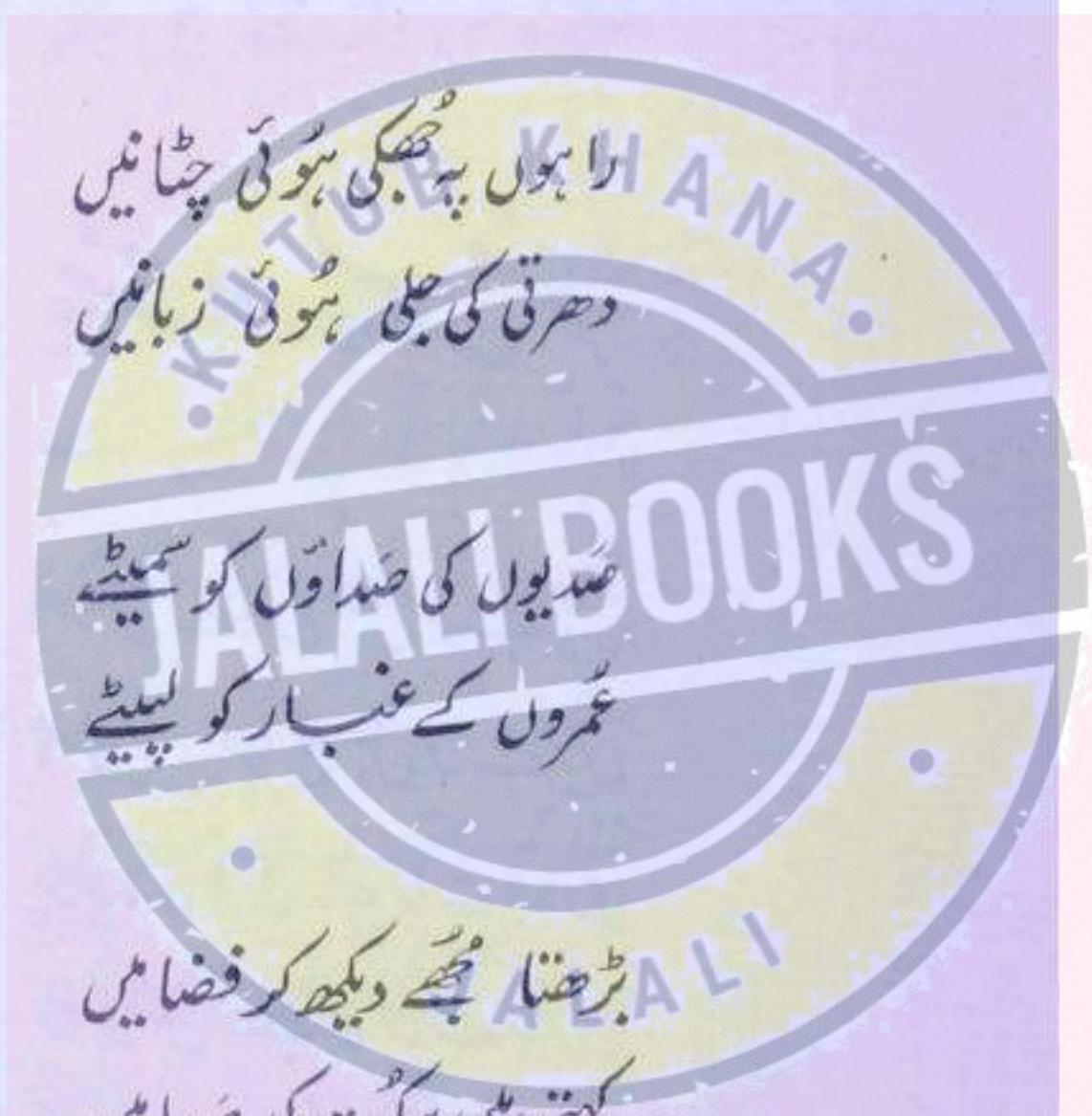
تاریخ کی آگ جل رہی ہے
اِک اور زباں نکل رہی ہے

اگست ۱۹۵۳ء

منظر اور پس منظر

احساس کے داغ جل رہے ہیں
ذہنوں میں چراغ جل رہے ہیں
پربت کی طرح ہے رات بھاری
خاموش ہے کائنات ساری
پلکوں سے جب اشک چھوٹتا ہے
دھرتی کا جمود ٹوٹتا ہے
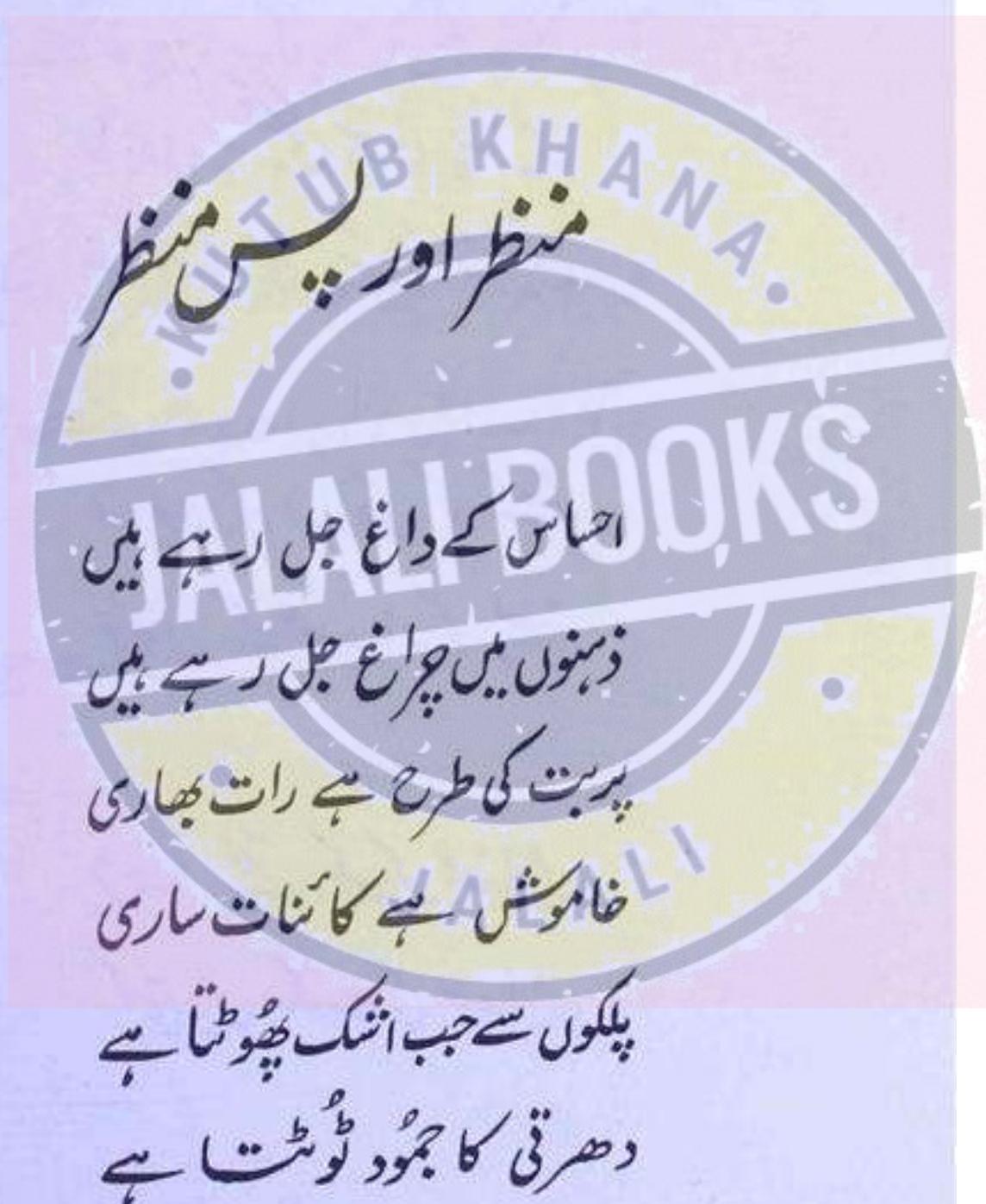
جھرنوں کی صدائیں آ رہی ہیں
پیڑوں میں ہوائیں گا رہی ہیں

جھیلوں میں نہا رہے ہیں تارے
پانی کو جلا رہے ہیں تارے
وادی میں بکھر گئے ہیں جگنو
سبزے میں اُتر گئے ہیں جگنو
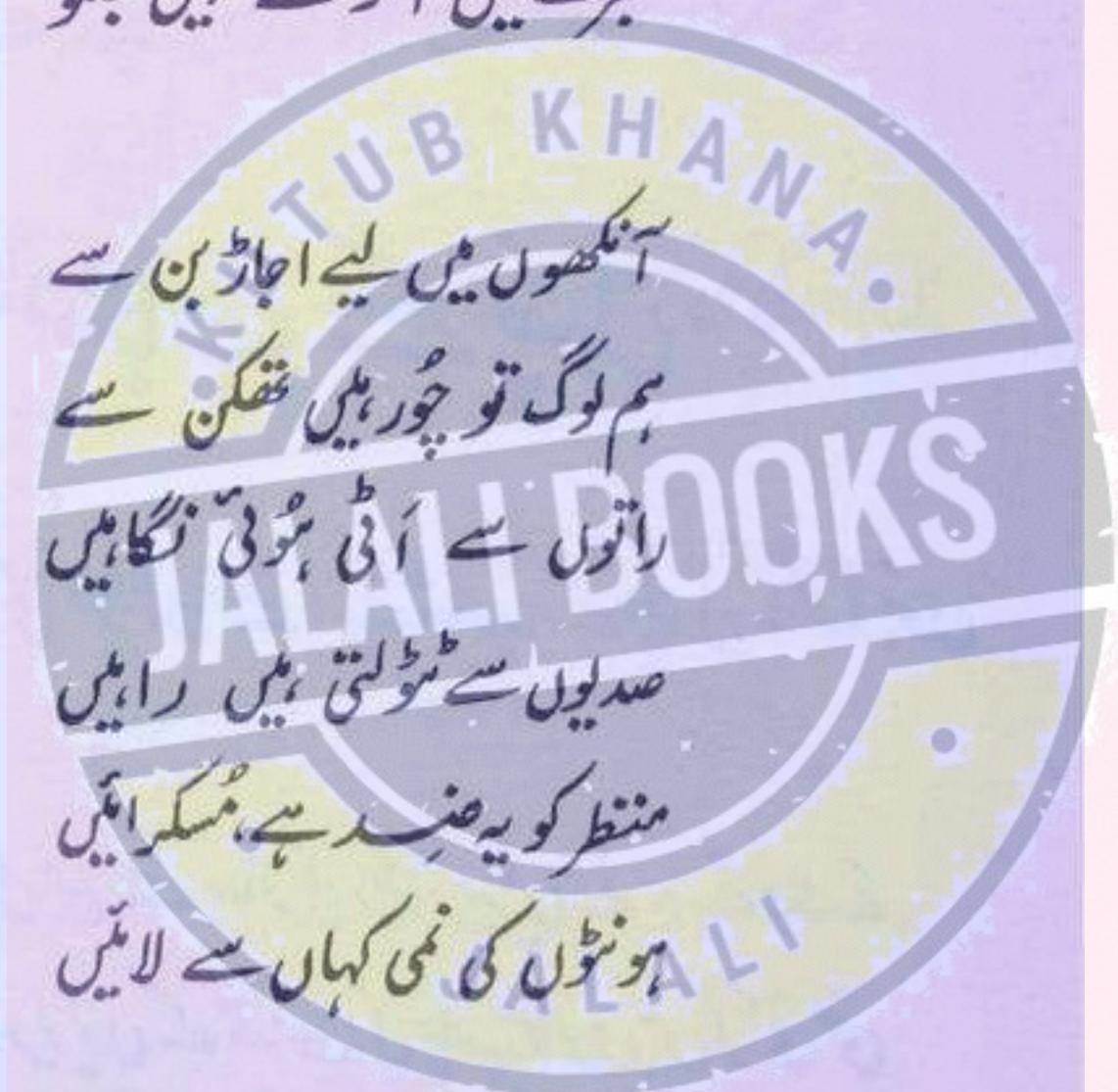
آنکھوں میں لیے اجاڑ بن سے
ہم لوگ تو چُور ہیں تھکن سے
راتوں سے اَٹی ہُوئی نگاہیں
صدیوں سے ٹٹولتی ہیں راہیں
منظر کو یہ ضد ہے، مُسکرائیں
ہونٹوں کی نمی کہاں سے لائیں

اگست ۱۹۵۳ء

شباب کے پھول

میں زندگی کی خزاں سے اپنے شباب کے پھول مانگتا ہوں

وہ پھول جن سے بہار کی رہگزر پہ میں نے دیے جلائے
بہار کی دیویوں کے قدموں کی چاپ کانوں میں گونجتی تھی
مرے ترستے ہوئے خیالوں کے آسمانوں میں گونجتی تھی
افق تک اپنے قلم سے میں نے شباب کے پھول یوں بچھائے
کہ جب بہاریں یہاں سے گزریں تو میری مہکار ساتھ جائے

میں زندگی کی خزاں سے اپنے شباب کے پھول مانگتا ہوں

وہ پھول جن پر بہار کے رُوپ میں چلے گرد بادِ صحرا
وہ پھول وُہ میرے شاہپارے، مری اُمیدیں، مرے ارادے
شفق میں ڈُوبے ہُوئے پھریرے، لہو میں بھیگے ہُوئے لبادے
یہاں سے وہ قافلے نہ گزُرے، فضا میں گونجی تھی چاپ جن کی
میں عمر بھر منتظر رہا ہُوں، گواہ گردش ہے رات دن کی

میں زندگی کی خزاں سے اپنے شباب کے پھول مانگتا ہُوں

جنوری ۱۹۵۲ء
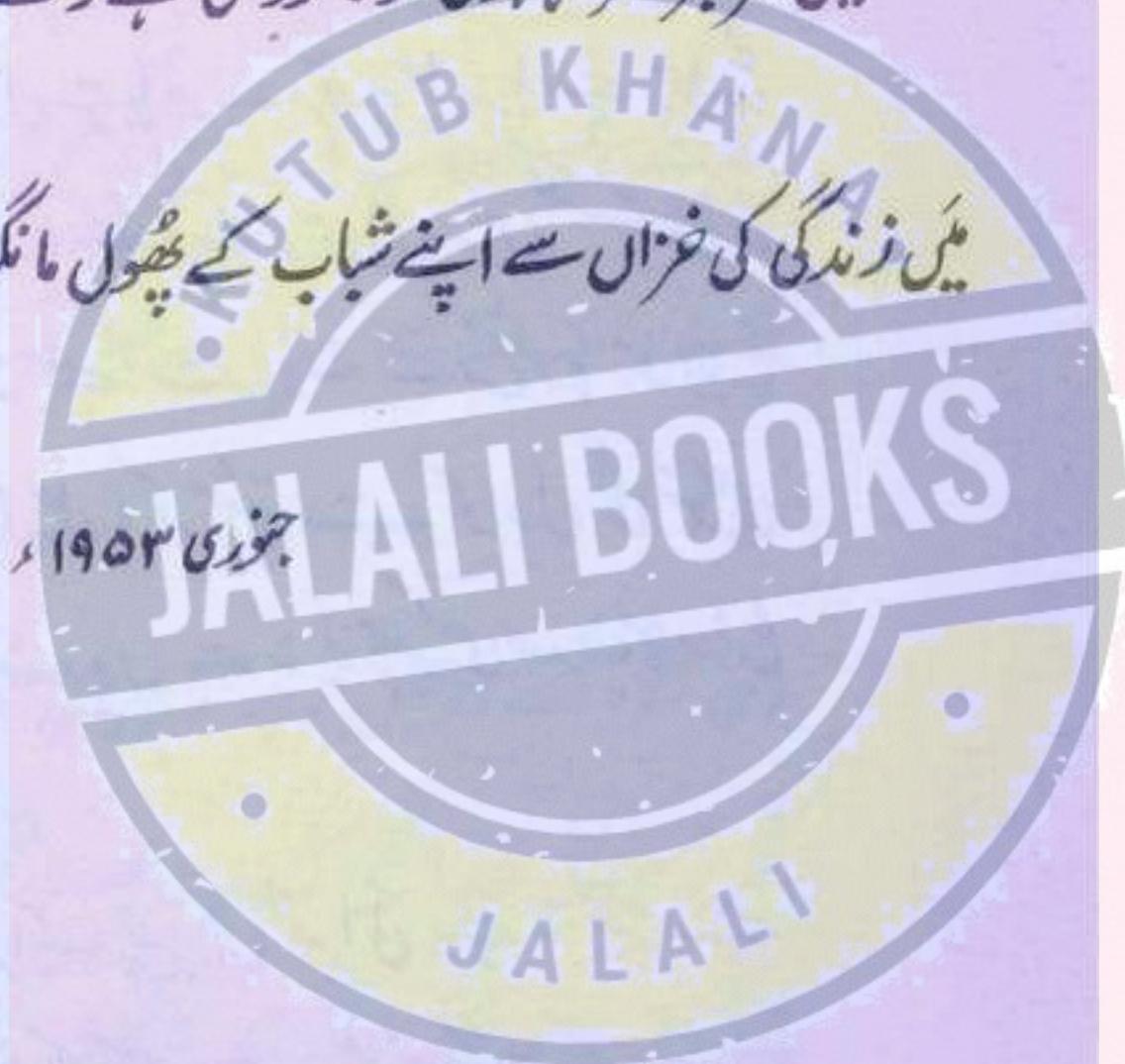
ایوانِ سحر میں

یہ شب ہے یا مرے دل کا سکُوتِ بے پایاں
یہ دل ہے یا مرے مرقد پہ جل رہا ہے چراغ
کچُھ ایسے ٹُوٹ رہی ہیں رگیں تخیّل کی
کہ جیسے تُندیِ مے سے چٹخ رہا ہو ایاغ
ہوا چلی، کہ مشیّت کو دِل لگی سُوجھی
سمندروں سے نہ پُوچھو کبھی صدف کا سراغ

ہر ایک چیز میں گہرائی ہے، تحیّر ہے
ہوا کے بھیس میں اُمڈے سکُوت کے دھارے
یہاں تو گُل بھی مرے ہم نصیب ہی نِکلے
کہ تیرگی میں گھُلے جا رہے ہیں بے چارے
اندھیری شام سے محسوس ہو رہا ہے مجھے
کہ جیسے جھیل کی تہ تک اُتر گئے تارے

نشیبِ شام سے نجمِ سحر کی چوٹی تک

تمام رینگتے کہرے، تمام سناّٹے

تھکے تھکے ہیں کچھ اس طرح وقت کے تیور

کہ جیسے شیر، ہرن کو چبا کے لب چاٹے

سُنا ہے ایسی ہی شب ہائے تار تھیں، جن میں

بڑے وقار سے اجداد نے سفر کاٹے
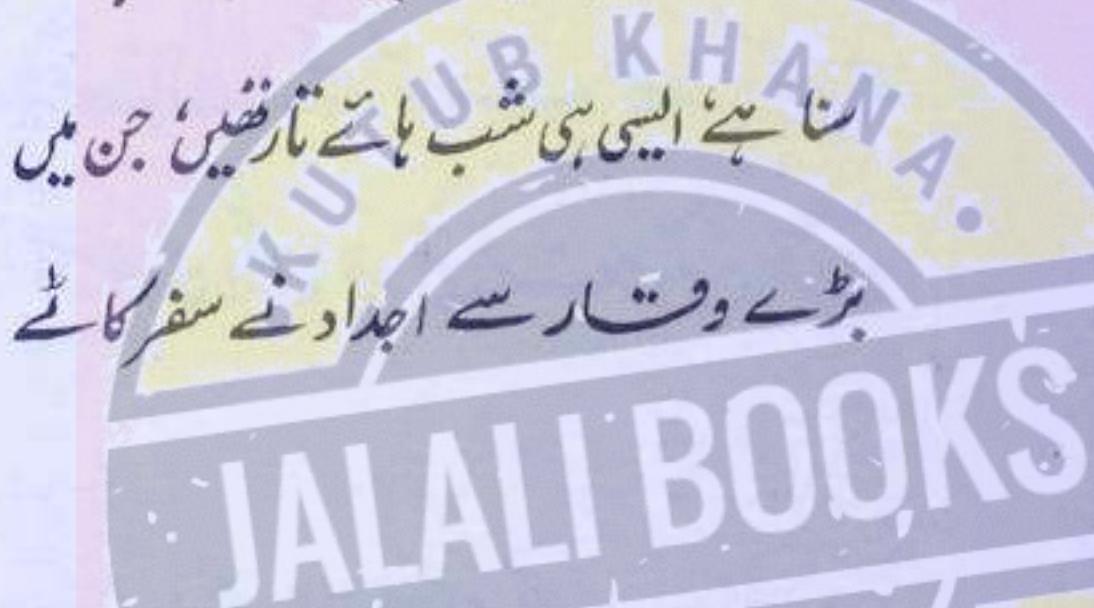
مری نگاہ سے اوجھل ہے کاروانِ سحر

مگر جرس کی صدا تھی کہ رات بھر نہ تھمی

سجے تھے اوس کے موتی قبائے گلشن پر

مجھے یہ وہم، کہ آغوشِ گل میں برف جمی

جو آنسوؤں نے سرِ بامِ دل جلائے تھے

بجھا گئی وہ دیئے، دامنِ صبا کی نمی

اُفق لرزنے لگا، رات کے قدم اُکھڑے
سحر کے بند دریچے پہ کیوں نہ دستک دُوں
ستارۂ سحری نے مجھے نہ پہچانا
تو کیا وطن میں پہنچ کر بھی اجنبی ہی رہوں؟
یہ اور بات، مجھے تاب ضبط ہو کہ نہ ہو
سحر کی انجمنِ نُور میں قدم تو دھروں

قدم بڑھا تو چھنکنے لگی ہیں زنجیریں
نظر اُٹھی تو دکھائی دیئے کئی احباب
کسی کے دوش پہ ہل تھا، کسی کے ہاتھ میں پھول
کسی کے پاس درانتی، کسی کے پاس کتاب
دمک رہا تھا وُہ پندار ان کے چہروں پر
دیا ہے اہلِ حکم نے جسے جنوں کا خطاب

گجر بجا کہ عروسِ سحر ہُوئی بیدار

تنی ہُوئی ہے فضا پر بسیط انگڑائی

اُٹھی افق سے وہ محبُوبۂ شگفتہ مزاج

جو شب کو پردہ نشیں تھی تو دن کو ہرجائی

زمیں سے تا بہ فلک رنگ لہلہانے لگے

مگر یہ دھند سی کیا ذہن پر اُتر آئی!

مَیں سوچتا ہُوں، سحر نے مُجھے شعور دیا

مگر یہی، کہ سلاسل کے سلسلے ہیں طویل

مچل رہی ہیں شعاعیں — اُبل رہا ہے لہو
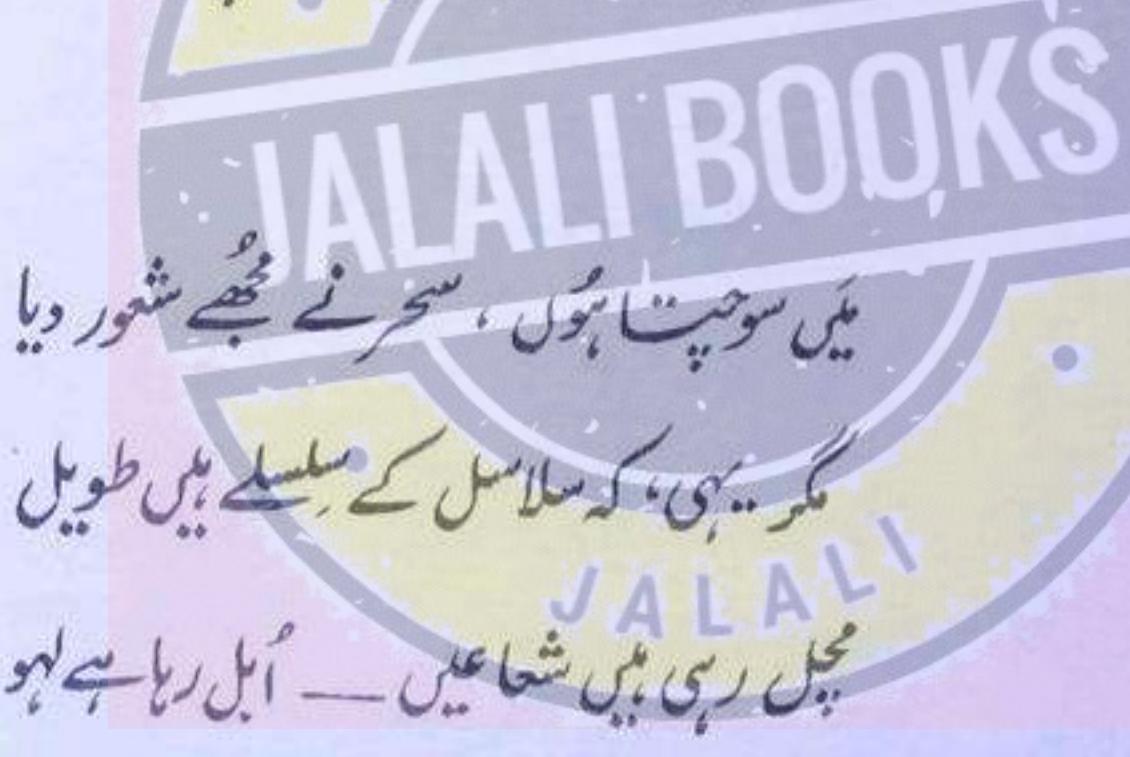
اُمڈ رہی تجلّی — اُبھر رہی ہے فصیل

چمک تو خوب تھی لیکن جھلس گئے ہیں بدن

نہ جانے شعلۂ نمرُود تھا کہ باغِ خلیل

سحر کا ایک ہی مفہوم ہے' ـــ طلوعِ سحر
مجھے فریب نہ دیں روشنی کی تفسیریں
شگفتِ گُل کو تو ہے انتظارِ موسمِ گُل
وہ لاکھ نوکِ سناں سے کلی کا دل چیریں
کچھ اور نام ہے اس کا، یہ فصلِ گُل تو نہیں
کہ بُوئے گُل کے لیے ڈھل رہی ہیں زنجیریں

نومبر ۱۹۵۲ء

فہرست

لوحِ خاک

دوام

محیط

دشتِ وفا

احمد ندیم قاسمی کی ۷۵ ویں سالگرہ پر خصوصی پیش کش
۱۔ ندیم کی نظمیں (دو جلدیں)
احمد ندیم قاسمی کی اب تک کی تمام تر نظمیں
۲۔ ندیم کی غزلیں
احمد ندیم قاسمی کی اب تک کی کہی ہوئی ساری غزلیں ایک ساتھ
۳۔ افسانے
احمد ندیم قاسمی کے خود منتخب کردہ چالیس بہترین افسانے
۴۔ احمد ندیم قاسمی (شاعر اور افسانہ نگار)
اردو کے نامور نقاد پروفیسر فتح محمد ملک کی خصوصی تصنیف